# ہماری ویب ای بُک

## ثنا غوری

SANA GHORI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

*Collection of Published Articles*
*By "Sana Ghori"*
*at Hamariweb.com*

# جنسی استحصال اور بچے

ہمارے ملک میں بچوں کے ساتھ جنسی تشدد ایک چھپا ہوا بلکہ اگر کھلے لفظوں میں کہا جائے تو ایک چھپایا جانے والا مسئلہ ہے۔ جنسی تشدد ایک ایسا موضوع ہے ۔ جس پر عام طور پر گفتگو کرنا ہمارے معاشرے میں بُرا تصور کیا جاتا ہے۔

دنیا کا حسن شرم وحیا سے قائم ہے۔ لیکن اگر آپکی بے جا شرم وحیا آپکے بچوں کی زندگی تباہ کرے، تو یہی قابل تعریف خوبی بدترین غفلت کہلائی جا سکتی ہے۔

یہ بات کم اہم ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے بچے جنسی بے حرمتی کا شکار ہوتے ہیں۔

اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کا بچہ اس کا شکار نہ ہو اور ایسا تب ہی ممکن ہے جب آپ اس مسئلہ سے آنکھیں چُرانے کی بجائے اِس مسئلہ کو پوری طرح سمجھیں۔

پاکستان کی قریباً چالیس فیصد آبادی پندرہ سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔ آبادی کا یہ حصہ ہمارا مستقبل اور ہماری چاہتوں کا مرکز ہے۔ لیکن

بد قسمتی سے اِن بچوں کو جہاں دیگر سینکڑوں مسائل اور خطرات کا سامنا ہے، اِن میں ایک گھمبیر مسئلہ بچوں کا جنسی استحصال بھی ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کرنے میں والدین، اساتذہ، حکومت سب کے سب مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور اِس مسئلہ کو حل کرنے کا بھاری بوجھ اِن بچوں پر ڈال رکھا ہے جو زندگی کے ابتدائی مرحلے میں سادہ تر مسائل حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

یہ مسئلہ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ شہری حقوق کے کارکنوں، ماہرینِ نفسیات اور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے مرتب کردہ جائزے کے مطابق پاکستان میں بچوں پر جنسی تشدد کے واقعات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ہر چار میں سے ایک بچی جبکہ ہر چھ میں سے ایک بچہ اَٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے اِس کا نشانہ بن رہا ہے۔ لیکن ماہرین نے ساتھ ساتھ یہ بھی متنبہ کیا کہ رپورٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے صرف اندراج شدہ واقعات پر مبنی ہیں جبکہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔

ماہرین نے اس امر پر افسوس کیا کہ جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچوں کی درست تعداد سرے سے دستیاب ہی نہیں کیونکہ سماجی شرم و حیا کی وجہ سے اکثر

واقعات سامنے نہیں لائے جاتے جسکی وجہ سے مجرمان بھی سزا سے بچ جاتے ہیں۔ جائزہ رپورٹ کے مطابق جنسی زیادتی بچوں کے ذہنوں پر ایسے نفسیاتی زخم چھوڑتی ہے جس سے اِن کی شخصیت نہ صرف جارحانہ ہو جاتی ہے بلکہ وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو کر منشیات اور بعض اوقات خود کشی کا راستہ اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

لڑکیوں کے جنسی استحصال کا زیادہ خطرہ (28 فیصد واقعات) افرادِ خانہ رشتہ دار ،اور قریبی جاننے والے جیسے ہمسائے وغیرہ سے ہوتا ہے۔ جبکہ لڑکوں کے لئے زیادہ خطرناک (54 فیصد واقعات) ان کے اساتذہ اور اجنبی افراد ثابت ہوتے ہیں۔ جبکہ معاشرے کے دیگر افراد جن سے بچوں کا تعلق رہتا ہے ، جیسے دکاندار وغیرہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے یکساں درجہ کے خطرے کا باعث ہیں۔

ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ ایسے موقع پر جہاں کہیں بچوں نے مزاحمت کی یا شور مچایا تو مجرم وہاں سے کھسک لئے اور یوں معاملہ چھیڑ چھاڑ سے آگے نہیں بڑھا۔ گویا اگر بچے یہ جانتے ہوں کہ ایسے موقع پر انہیں کیا کرنا ہے تو زیادہ شدید صورتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

بیان کیے گئے تمام تر تلخ اور بھیانک حقائق جاننے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ آپ اپنے بچے کو کیسے جنسی استحصال سے محفوظ رکھیں۔اِس سلسلے میں والدین اور بچے کے ساتھ رابطہ سب سے موثر اور اہم قدم ہے۔اپنے بچے سے جنسی زیادتی کے بارے میں گفتگو کیجیے۔یقینا والدین کے لئے اپنے بچّے سے اِس موضوع پر گفتگو کرنا ایک بہت.بڑا چیلنج ہوتا ہے لیکن اگر آپ اسے بچے کے لئے ذاتی حفاظت کا ایک سبق تصور کریں ( جیسے آپ اِسے آگ سے دور رہنے یا سڑک پار کرنے کی ہدایت دیتے رہتے ہیں )۔ تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس موضوع پر سیدھے سادے ، حقیقت پسندانہ انداز میں بات کی جا سکتی ہے۔

تمام موضوعات کو ایک ہی نشست میں نمٹانے کی کوشش نہ کیجیئے، بچے سے جنسی زیادتی اور ذاتی حفاظت کے موضوع پر ہونے والی گفتگو ایک مستقل جاری وساری سلسلہ ہونا چاہیے۔اِس گفتگو کو خواہ مخواہ اہمیت دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ سرسری اور بے تکلفانہ انداز میں کسی ایسے وقت گفتگو کیجیے جب بچہ خود کو محفوظ اور مطمئن محسوس کر رہا ہو۔

بچے سے گفتگو کسی بھی وقت کی جائے مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گفتگو میں کیا کہا جائے وہ خیالات جو بچے تک پہنچانا ضروری ہیں وہ یہ ہیں۔

☆تم نہایت خاص اور اہم ہو۔

☆تمھارا بدن تمھاری ملکیت ہے۔ بدن کے بعض حصّے تمھارے پرائیوٹ حصّے ہیں۔

اگر کوئی انہیں چھونے کی کوشش کرے تو تمھیں 'انکار' کا پورا حق ہے۔ میری طرف سے تمھیں ایسے موقع پر انکار کی پوری اجازت ہے۔ خواہ تمھیں چھونے والا کوئی بھی آدمی ہو خواہ تم اُسے جانتے ہو۔

☆کوئی تمھیں ایسے چھوئے جو تمھیں مناسب نہ لگے یا صحیح محسوس نہ ہو تو زور سے کہو۔۔۔ 'نہیں' چیخ کر کہو۔۔۔ 'نہیں' پھر بھاگ جاؤ اور کسی کو پوری بات بتا دو۔ اگر پہلا آدمی بات پر یقین نہ کرے دوسرے کو بتاؤ، تیسرے کو بتاؤ، حتیٰ کے کسی نہ کسی کو یقین آ جائے، یاد رکھو اِس میں تمھاری کوئی غلطی نہیں ہے، تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔

☆اگر کوئی تمھیں پریشان کرے تو مجھے ضرور بتاؤ میں وعدہ کرتا/کرتی ہوں کہ میں تمھاری بات پر اعتبار کروں گی/کروں گا۔ میں بلکل بھی ناراض نہیں ہوں گا/گی۔

گو ابتدائیہ میں یہ بات عجیب بھی لگتی ہے اور مشکل بھی کہ اپنے بچوں سے ایسے موضوعات پر بات کی جائے۔ لیکن اس مشکل کام کو انجام دینے سے آپکا بچہ زیادہ محفوظ اور زیادہ بہتر شخصیت کا مالک ہوگا۔

اس کام کی ابتداء کرنا ہی مشکل ہے۔ اور اس کی بنیادی شرط بچے اور آپکے درمیان خوشگوار تعلق ہے۔ اکثر والدین دن بھر میں جو گفتگو کرتے ہیں وہ احکامات اور دھمکیوں سے آگے نہیں بڑھتی (یہ کرو، وہ نہ کرو) اپنے بچے سے اس

طرح کا تعلق رکھیں کہ وہ اپنی بات ، اپنے روزانہ کے معاملات اور اپنے مسائل کے حل کے لئے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہ کرے۔ وہ اس اعتماد کے ساتھ آپ سے گفتگو کرے کہ آپ اس کی بات سنیں گے۔ مختصر یہ کہ ایسا تعلق قائم ہونے کے بعد ہی آپ اپنے بچے کو کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی بھی شخص چاہے وہ جاننے والا ہو یا اجنبی، اگر تمھارے جسم کو چھوئے یا پھر تم سے گندی باتیں کرے ، ننگی تصویریں دکھائے تو فوراً مجھے بتاؤ اگر میں کہیں نہ ملوں تو ارد گرد موجود بڑوں کو بتاؤ اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو چیخ چیخ کر لوگوں کو بلاؤ۔

اختتامیہ:

ہمارے معاشرے میں بچوں کی بہت بڑی تعداد اس ناسور سے بچی ہوئی ہے۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی بچہ اس سے قابل اعتبار حد تک محفوظ نہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر یا ایسے واقعہ کے بعد اپنے بچے کو چوبیس گھنٹے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنے کا خیال اپنے دل میں نہ لائیں۔ بچے کو بے انتہا احتیاط سے رکھنے اور بے جا سختی کے ذریعے اسے معاشرے سے کاٹ کر رکھ دینے سے یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے بچے کو جنسی بے حرمتی سے بچالیں۔ (اگرچہ اعداد و شمار کے مطابق گھر اس حوالے سے انتہائی غیر محفوظ جگہ ہے۔)

لیکن یہی بچہ بڑا ہو کر تمام زندگی معاشرے سے اپنا تعلق قائم کرنے میں مشکلات کا شکار رہے گا جسکا مطلب ہے زندگی کے ہر موڑ پر ناکامی ! لہذا بچے کو شیشے کی گڑیا بنانے سے بہتر ہے کہ اسے اپنے دفاع کرنے اور ہر طرح کے مشکل حالات سے مقابلہ کرنے کی تربیت دیں۔ یوں وہ نہ صرف ایسے حادثات سے بڑی حد تک محفوظ رہے گا۔ بلکہ ایسے کسی حادثے کی صورت میں اسکی شخصیت کو کم سے کم نقصان پہنچے گا۔

اور اس فطری طریقہ تربیت سے بچہ بڑے ہو کر بھی ہر مشکل کے وقت اپنے مددگاروں کو ڈھونڈنے کے بجائے اپنے مسائل خود حل کرنے کے قابل ہو گا۔ یعنی ایک پر اعتماد شخصیت اور کامیاب انسان۔

# جنسی استحصال اور بچے

ہمارے ملک میں بچوں کے ساتھ جنسی تشدد ایک چھپا ہوا بلکہ اگر کھلے لفظوں میں کہا جائے تو ایک چھپایا جانے والا مسئلہ ہے۔ جنسی تشدد ایک ایسا موضوع ہے۔ جس پر عام طور پر گفتگو کرنا ہمارے معاشرے میں برا تصور کیا جاتا ہے۔

دنیا کا حسن شرم وحیا سے قائم ہے۔ لیکن اگر آپکی بے جا شرم وحیا آپکے بچوں کی زندگی تباہ کرے، تو یہی قابل تعریف خوبی بدترین غفلت کہلائی جا سکتی ہے۔

یہ بات کم اہم ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے بچے جنسی بے حرمتی کا شکار ہوتے ہیں۔

اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کا بچہ اس کا شکار نہ ہو اور ایسا تب ہی ممکن ہے جب آپ اس مسئلہ سے آنکھیں چُرانے کی بجائے اِس مسئلہ کو پوری طرح سمجھیں۔

پاکستان کی قریباً چالیس فیصد آبادی پندرہ سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔ آبادی کا یہ حصہ ہمارا مستقبل اور ہماری چاہتوں کا مرکز ہے۔ لیکن

بدقسمتی سے اِن بچوں کو جہاں دیگر سینکڑوں مسائل اور خطرات کا سامنا ہے، اِن میں ایک گھمبیر مسئلہ بچوں کا جنسی استحصال بھی ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کرنے میں والدین ، اساتذہ، حکومت سب کے سب مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور اِس مسئلہ کو حل کرنے کا بھاری بوجھ اِن بچوں پر ڈال رکھا ہے جو زندگی کے ابتدائی مرحلے میں سادہ تر مسائل حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

یہ مسئلہ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ شہری حقوق کے کارکنوں ، ماہرینِ نفسیات اور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے مرتب کردہ جائزے کے مطابق پاکستان میں بچوں پر جنسی تشدد کے واقعات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ہر چار میں سے ایک بچی جبکہ ہر چھ میں سے ایک بچہ اَٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے اِس کا نشانہ بن رہا ہے۔ لیکن ماہرین نے ساتھ ساتھ یہ بھی متنبہ کیا کہ رپورٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے صرف اندراج شدہ واقعات پر مبنی ہیں جبکہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔

ماہرین نے اس امر پر افسوس کیا کہ جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچوں کی درست تعداد سرے سے دستیاب ہی نہیں کیونکہ سماجی شرم و حیا کی وجہ سے اکثر

واقعات سامنے نہیں لائے جاتے جسکی وجہ سے مجرمان بھی سزا سے بچ جاتے ہیں۔ جائزہ رپورٹ کے مطابق جنسی زیادتی بچوں کے ذہنوں پر ایسے نفسیاتی زخم چھوڑتی ہے جس سے اِن کی شخصیت نہ صرف جارحانہ ہو جاتی ہے بلکہ وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو کر منشیات اور بعض اوقات خود کشی کا راستہ اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

لڑکیوں کے جنسی استحصال کا زیادہ خطرہ (28 فیصد واقعات) افرادِ خانہ رشتہ دار ،اور قریبی جاننے والے جیسے ہمسائے وغیرہ سے ہوتا ہے۔ جبکہ لڑکوں کے لئے زیادہ خطرناک (54 فیصد واقعات) ان کے اساتذہ اور اجنبی افراد ثابت ہوتے ہیں۔ جبکہ معاشرے کے دیگر افراد جن سے بچوں کا تعلق رہتا ہے، جیسے دکاندار وغیرہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے یکساں درجہ کے خطرے کا باعث ہیں۔

ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ ایسے موقع پر جہاں کہیں بچوں نے مزاحمت کی یا شور مچایا تو مجرم وہاں سے کھسک لئے اور یوں معاملہ چھیڑ چھاڑ سے آگے نہیں بڑھا۔ گویا اگر بچے یہ جانتے ہوں کہ ایسے موقع پر انہیں کیا کرنا ہے تو زیادہ شدید صورتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

بیان کیے گئے تمام تر تلخ اور بھیانک حقائق جاننے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ آپ اپنے بچے کو کیسے جنسی استحصال سے محفوظ رکھیں۔اِس سلسلے میں والدین اور بچے کے ساتھ رابطہ سب سے موثر اور اہم قدم ہے۔اپنے بچے سے جنسی زیادتی کے بارے میں گفتگو کیجیے۔یقینا والدین کے لئے اپنے بچّے سے اِس موضوع پر گفتگو کرنا ایک بہت.بڑا چیلنج ہوتا ہے لیکن اگر آپ اسے بچے کے لئے ذاتی حفاظت کا ایک سبق تصور کریں ( جیسے آپ اِسے آگ سے دور رہنے یا سڑک پار کرنے کی ہدایت دیتے رہتے ہیں)۔ تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس موضوع پر سیدھے سادے، حقیقت پسندانہ انداز میں بات کی جا سکتی ہے۔

تمام موضوعات کو ایک ہی نشست میں نمٹانے کی کوشش نہ کیجیئے، بچے سے جنسی زیادتی اور ذاتی حفاظت کے موضوع پر ہونے والی گفتگو ایک مستقل جاری وساری سلسلہ ہونا چاہیے۔اِس گفتگو کو خواہ مخواہ اہمیت دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ سرسری اور بے تکلفانہ انداز میں کسی ایسے وقت گفتگو کیجیے جب بچہ خود کو محفوظ اور مطمئن محسوس کر رہا ہو۔

بچے سے گفتگو کسی بھی وقت کی جائے مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گفتگو میں کیا کہا جائے وہ خیالات جو بچے تک پہنچانا ضروری ہیں وہ یہ ہیں۔

☆تم نہایت خاص اور اہم ہو۔

☆تمھارا بدن تمھاری ملکیت ہے۔ بدن کے بعض حصّے تمھارے پرائیوٹ حصّے ہیں۔

اگر کوئی انہیں چھونے کی کوشش کرے تو تمھیں 'انکار' کا پورا حق ہے۔ میری طرف سے تمھیں ایسے موقع پر انکار کی پوری اجازت ہے۔ خواہ تمھیں چھونے والا کوئی بھی آدمی ہو خواہ تم اُسے جانتے ہو۔

☆کوئی تمھیں ایسے چھوئے جو تمھیں مناسب نہ لگے یا صحیح محسوس نہ ہو تو زور سے کہو۔۔۔ 'نہیں' چیخ کر کہو۔۔۔ 'نہیں' پھر بھاگ جاؤ اور کسی کو پوری بات بتا دو۔ اگر پہلا آدمی بات پر یقین نہ کرے دوسرے کو بتاؤ، تیسرے کو بتاؤ، حتیٰ کے کسی نہ کسی کو یقین آجائے، یاد رکھواِس میں تمھاری کوئی غلطی نہیں ہے، تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔

☆اگر کوئی تمھیں پریشان کرے تو مجھے ضرور بتاؤ میں وعدہ کرتا / کرتی ہوں کہ میں تمھاری بات پر اعتبار کروں گی / کروں گا۔ میں بلکل بھی ناراض نہیں ہوں گا / گی۔

گو ابتدائیہ میں یہ بات عجیب بھی لگتی ہے اور مشکل بھی کہ اپنے بچوں سے ایسے موضوعات پر بات کی جائے۔ لیکن اس مشکل کام کو انجام دینے سے آپکا بچہ زیادہ محفوظ اور زیادہ بہتر شخصیت کا مالک ہوگا۔

اس کام کی ابتداء کرنا ہی مشکل ہے۔ اور اس کی بنیادی شرط بچے اور آپکے درمیان خوشگوار تعلق ہے۔ اکثر والدین دن بھر میں جو گفتگو کرتے ہیں وہ احکامات اور دھمکیوں سے آگے نہیں بڑھتی (یہ کرو، وہ نہ کرو) اپنے بچے سے اس

طرح کا تعلق رکھیں کہ وہ اپنی بات، اپنے روزانہ کے معاملات اور اپنے مسائل کے حل کے لئے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہ کرے۔ وہ اس اعتماد کے ساتھ آپ سے گفتگو کرے کہ آپ اس کی بات سنیں گے۔ مختصر یہ کہ ایسا تعلق قائم ہونے کے بعد ہی آپ اپنے بچے کو کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی بھی شخص چاہے وہ جاننے والا ہو یا اجنبی، اگر تمھارے جسم کو چھوئے یا پھر تم سے گندی باتیں کرے، ننگی تصویریں دکھائے تو فوراً مجھے بتاؤ اگر میں کہیں نہ ملوں تو اردگرد موجود بڑوں کو بتاؤ اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو چیخ چیخ کر لوگوں کو بلاؤ۔

اختتامیہ:

ہمارے معاشرے میں بچوں کی بہت بڑی تعداد اس ناسور سے بچی ہوئی ہے۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی بچہ اس سے قابل اعتبار حد تک محفوظ نہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر یا ایسے واقعہ کے بعد اپنے بچے کو چوبیس گھنٹے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنے کا خیال اپنے دل میں نہ لائیں۔ بچے کو بے انتہا احتیاط سے رکھنے اور بے جا سختی کے ذریعے اسے معاشرے سے کاٹ کر رکھ دینے سے یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے بچے کو جنسی بے حرمتی سے بچالیں۔ (اگرچہ اعداد و شمار کے مطابق گھر اس حوالے سے انتہائی غیر محفوظ جگہ ہے۔)

لیکن یہی بچہ بڑا ہو کر تمام زندگی معاشرے سے اپنا تعلق قائم کرنے میں مشکلات کا شکار رہے گا جسکا مطلب ہے زندگی کے ہر موڑ پر ناکامی ! لہذا بچے کو شیشے کی گڑیا بنانے سے بہتر ہے کہ اسے اپنے دفاع کرنے اور ہر طرح کے مشکل حالات سے مقابلہ کرنے کی تربیت دیں۔ یوں وہ نہ صرف ایسے حادثات سے بڑی حد تک محفوظ رہے گا۔ بلکہ ایسے کسی حادثے کی صورت میں اسکی شخصیت کو کم سے کم نقصان پہنچے گا۔

اور اس فطری طریقہ تربیت سے بچہ بڑے ہو کر بھی ہر مشکل کے وقت اپنے مددگاروں کو ڈھونڈنے کے بجائے اپنے مسائل خود حل کرنے کے قابل ہوگا۔ یعنی ایک پر اعتماد شخصیت اور کامیاب انسان۔

# محبتوں کا لین دین

اپنے پیاروں کو وقت کا انمول تحفہ دیجیئے

کہتے ہیں زندگی گزارنے کے لیے محبتوں کا لین دین بہت ضروری ہے۔ اور جب تک انسان اپنی ذات کی نفی نہ کرلے یہ لین دین ممکن نہیں۔

اس مادیت پسند زمانے میں شخصی افراتفری بہت عام ہے۔ اپنے اطراف میں نظر دوڑائی جائے عجب احوال ہے کہ جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید مشکل ہے۔ ایک ہی خاندان کے اہلخانہ بھی کئی کئی دنوں تک ایک دوسرے کے حالات سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہر فرد پہلے سے زیادہ مصروف ہے اس کے پاس دوسروں کے لئے وقت نہیں۔ صاحب خانہ تو معاشی فکرو آگے بڑھنے کی جستجو میں مصروف ہیں ہی خاتونِ خانہ بھی وقت کی کمی کا شکار نظر آتیں ہیں۔ کہیں اولاد ماں باپ کی طرف سے عدم توجہی کا شکار نظر آتی ہے تو کہیں ماں باپ اولاد سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نفسا نفسی کی وجہ سے دلوں میں دوریاں بڑھتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ خاندانوں کے شیرازے بکھرتے نظر آتے ہیں۔ یہی نفسا نفسی معاشرے کی ایک اکائی یعنی فرد کی سوچ سے نکل کر تمام معاشرے میں بے حسی کی صورتحال پیدا کر رہی ہے۔

آج ہر شخص کہتا نظر آتا ہے جلدی کرو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے مگر کوئی نہیں سوچتا کہ اُس کا وقت کہاں گیا۔اِس صورتحال کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم نے خود بے جا مصروفیات میں خود کو پھنسا رکھا ہے۔ جدید تکنیکی مہارتوں کے اِس دور نے جہاں انسان کو بہت ساری سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی ہیں وہیں پر انسان کو بے شمار مسائل کا شکار بھی کردیا ہے۔ جس کی بناء پر جو کام اور رشتے ناطے پہلے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے وہ اب کم اہم فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے رویوں کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا نقطہ بحث ہے جس سے نگاہ نہیں پھیری جاسکتی۔ کیونکہ رشتوں کو وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر نظرانداز کرنے سے ڈپریشن کے مرض میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے اہل خانہ کی مرکزیت اور حیثیت کو نظرانداز کیے بغیر اپنے معمولات زندگی اور مصروفیات پر اَزِ نو نظر دوڑائی جائے۔

خواتین عموماً صبح سویرے اُٹھ جاتی ہیں۔ بچوں کو اسکول بھیجنا شوہر کے دفتر کی تیاری سے دن کا آغاز ہوتا ہے۔اِن کاموں کو نمٹانے کے بعد گھریلو دیگر ذمہ داریاں اور سسرال والوں کا خیال سب ہی ان کے دماغ میں ایک فہرست کی طرح

مرتب ہوتا ہے۔ ایک کے بعد ایک کام وہ کرتی چلی جاتیں ہیں۔ اور یوں زندگی کا ایک دن گزر جاتا ہے۔

اور یہی حال صاحبِ خانہ کا ہے۔ فکرِ معاش اور زندگی کی گھما گھی جو سورج چڑھتے ہی شروع ہو جاتی ہے رات گئے تک اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ اور وقت کی کمی کے باعث ایک ہی کمرے میں رہنے والے یہ دو افراد رفتہ رفتہ اجنبی ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم اپنی زندگی پر طائرانہ نگاہ دوڑائیں اور اپنے ان جملوں کا 'میں بہت مصروف ہوں، میرے پاس وقت نہیں۔' حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو ہمیں جلد احساس ہو جائے گا کہ در حقیقت نہ تو ہمارے پاس وقت کی کمی ہے اور نہ مصروفیت زیادہ بلکہ ہم نے اپنی زندگی کی ترجیحات میں اہم رشتوں کو آخر میں رکھ دیا ہے۔

رکھنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد گھریلو T.V خواب گاہوں میں پہ ڈرامے دیکھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ جبکہ مرد T.V ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد حضرات اپنا فراغت کا وقت موبائل فون، انٹرنیٹ پر صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن ذرا غور ڈرامے، موبائل فون، انٹرنیٹ اور وقتی دوستیاں یہ T.V کیجیے

سب کچھ کیا اُن رشتوں سے زیادہ اہم ہیں جو ہماری زندگی کا سرمایہ ہیں۔

زندگی کی مصروفیت تو کبھی ختم نہ ہوگی گھریلو ذمہ داریوں کا کوئی اختتام نہیں۔ لیکن جذبوں میں سرد مہری اور دلوں میں دوریاں، ایک دوسرے کے مسائل میں عدم دلچسپی آخرکار گھر کو مکان بنادیتی ہیں۔ رشتہ میاں بیوی کا ہو، ماں باپ کا اولاد سے ہو یا پھر ایک دوست کا دوست سے ہم سب کو ہی ہمہ وقت ایک Listening earکی ضرورت رہتی ہے۔ مگر وقت کی کمی کا رونا رو رو کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے بری و زماں ہو جاتے ہیں اور اپنے رشتوں سے دور۔

رشتوں کی خوبصورتی اسی طرح قائم رہتی ہے جب انھیں وہ توجہ پیار اور وقت دیا جائے جسکے وہ حقدار ہیں اور یہ وقت ملتا نہیں نکالنا پڑتا ہے۔

رات کو دیر تک جاگنا اور صبح بدحواسی میں جلدی جلدی اپنے معمولات زندگی میں دوسروں سے بے خبر ہو کر الجھ جانا عقلمندی نہیں۔ اگر تمام اہل خانہ اپنے دن کا آغاز صبح صادق سے کریں اور صوم صلواۃ سے فراغت کے بعد ناشتہ ایک ساتھ کریں اور ایک دوسرے سے گفتگو کریں تو یقیناً نہ صرف دن ذہنی یکسوئی کے ساتھ چست اور توانا گزرے گا بلکہ اہل خانہ کی محبت سے سرشار دلی سکون حاصل ہوگا۔ یہی کچھ اہتمام اگر رات کے کھانے میں بھی کیا جائے اور اہل خانہ کے مسائل

میں دلچسپی لی جائے تو گھر کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ ایسے ہی چھوٹے موٹے تحائف کا تبادلہ بھی اہم ہے۔ ہم عموماً گھر سے باہر اپنے اطراف کے لوگوں کے لئے تو بہت مہنگے تحفے تحائف خریدتے ہیں لیکن گھر والوں کے لئے ایک عام سی چیز تحفتاً خریدنا بھی فراموش کر جاتے ہیں ۔ بیوی کا شوہر کو تحفہ دینا، شوہر کا بیوی کو تحفہ دینا۔ اولاد کا ماں باپ کو تحفہ دینا۔ بہن بھائیوں میں تحائف کا تبادلہ چاہے وہ بہت معمولی نوعیت کے تحائف ہی کیوں نہ ہوں ایک عجیب خوشی سے سرشار کردیتے ہیں۔ ایک ایسی خوشی جو شاید باہر والوں کے مہنگے تحائف سے بھی حاصل نہ ہوتی ہو کیونکہ یہ محبتیں ہیں۔ جو روحانیت رکھتی ہیں اور یہ رشتے خدا نے بنائے ہیں ان کا خیال رکھنا ہماری سب سے اہم مصروفیت اور ترجیح ہونی چاہیے۔

۔ اپنے ہی Self centered آج انسان کا سب سے بڑا رشتہ وہ خود ہی بنتا جارہا ہے۔ جذبات اور خواہشات کے حصار میں۔ ایسے میں کسی دوسرے انسان کے لئے چاہے وہ اسکا اپنا ہی رشتہ کیوں نہ ہو کہ لئے سوچنا یا وقت نکالنا ناپید ہو گیا ہے۔ وقت کی کمی کے باعث لوگ اپنے پیاروں کو توجہ نہیں دے پاتے۔ ان کے مسائل اور حال دل سے آگاہ نہیں رہ پاتے اور خدانخواستہ جب یہ رشتے بچھڑ جاتے ہیں تو وقت بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

آج اس کرہ ارض کا سب سے خوبصورت تحفہ اپنی زندگی میں سے کچھ وقت اور توجہ اپنے پیاروں کو دینا ہے۔ اپنے پیاروں کو وقت کا انمول تحفہ دیجئے۔ اپنی شخصیت میں بدلاؤ لائیے۔ غیر ضروری اُلجھنوں اور عادتوں کو خود سے نوچ پھینکیں وقت کو اپنے ہاتھ میں لیجیے۔ اپنے پیاروں کو ساتھ لیتے ہوئے اپنی زندگی کو پریشانیوں کی ڈگر سے ہٹا کر خوشیوں کے راستے پر ڈال دیجئے۔

# ترقیاتی، "تعلیمی شعبے" میں روزنامہ جنگ کے کردار کا تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ

شرح خواندگی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے انتہائی کم پڑھے لکھے معاشروں میں سے ایک ہے۔ ہمارے لئے کیسی شرمساری کا مقام ہے کہ دنیا کے 112 ترقی پذیر ممالک میں اس کی پوزیشن 111 ہے۔

معاشرتی حقوق (CIVIL RIGHT) میں حق تعلیم کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ کیونکہ تعلیم کی اہمیت کسی معاشرے کی سیاسی زندگی میں تعارف کی محتاج نہیں۔ یہی ہمیں آزادی سے روشناس کراتی ہے۔ اس کے ذریعے باشعور ہو کر ہم ملک میں مضبوط سیاسی نظام پیدا کر سکتے ہیں۔ جمہوریت میں عوام کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق دیا جاتا ہے۔ اگر عوام پڑھے لکھے نہ ہوں گے تو بہتر نمائندہ منتخب نہیں کر سکیں گے۔

تعلیم حاصل کرنا ہر فرد کا بنیادی حق ہے ریاست کا فرض بنتا ہے کہ ہر شخص کو حصول تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ اس میں ذرائع ابلاغ پر بھی نہایت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تعلیمی شعبے کے حوالے سے اخبارات کی دلچسپی صرف

اتنی ہے کہ وہ اخبارات کے اندرونی صفحہ پر خبر لگا کر تعلیم کو رواج دلوانے والے عمل سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی ذمہ داریوں کو کافی سمجھتے ہیں۔

اس تناظر میں روزنامہ جنگ کہ اپریل 2010 کے شماروں کو تحقیق کے لئے منتخب کیا گیا۔ جنگ ایک بڑا اشاعتی اخبار ہے۔ جس کے قارئین کی تعداد (ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ) سب سے زیادہ ہے۔ چنانچہ اس روزنامہ کی معاشرتی اعتبار سے ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو ایسے مواد کی فراہمی ممکن بنائے جو ترقیاتی منصوبہ بندی کے تحت (پاکستانی عوام میں خصوصاً) تحریک دنیا پیدا کرنے اور تعلیمی اعتبار سے آگے بڑھنے کی جستجو اور آگاہی پیدا کرنے کا موجب بنے روزنامہ جنگ کے اپریل 2010 کے شماروں کا بغور جائزہ لے لیا گیا اور مواد کے تجزیے کے لئے جانچ موضوعات طے کئے گئے۔

خبر کے موضوعات:۔

سیاسی، علاقائی، بین الاقوامی، جرائم، کاروبار، کھیل، تعلیم

خصوصاً شعبہ تعلیم کی خبروں کا جائزہ

اخبار کے کس صفحے پر خبر شائع کی گئی

کتنے کالم میں خبر دی گئی

موضوع کے اعتبار سے خبروں کا تناسب

اشتہارات

خبر کا ذریعہ

ابلاغ برائے تعلیم کے بڑے اہم نتائج سامنے آتے ہیں۔ جبکہ "جنگ" اخبار بطور اہم ذریعہ ابلاغ کے اپنی پالیسیوں کی بناء پر یہ تو خیال کرتا ہے وہ جو خبر پیش کر رہا ہے اور جسطرح خبر پیش کی جارہی ہے وہ معاشرتی ترقی کے شعبہ "تعلیم" اور "شرح خواندگی" کو کم کرنے کے لحاظ سے نہایت موثر ہے۔ لیکن در حقیقت یہ صد فیصد خام خیالی اور اخبار مرتب کرنے والوں کی کوتاہیوں کو واضح کرتا ہے۔

تعلیم انسانی کردار کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ ہمارا معاشرہ جس روش پر چل رہا ہے وہاں سدھار کا واحد ذریعہ اور تبدیلی عمل فقط تعلیمی شعور سے ہی ممکن ہے۔ کیونکہ تعلیم کو جنم لیتی ہے۔ تذکرے کی ضرورت یوں (PURPOSTVENESS) مقصدیت محسوس ہوئی کہ روزنامہ جنگ جو عوام کی رائے کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس ہی کی رائے کا ترجمان اور عکاسی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِسے ملک کے تمام طبقوں کا نمائندہ اخبار کہا جاتا ہے پاکستان کے نہایت اہم مسئلے "شرح خواندگی میں اضافہ اور تعلیمی خبروں سے عوام کی آگاہی" کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو موضوع کی سنگینی اور معاشرے کی "اولین ترجیح" کی بنیادوں پر دینی چاہیئے۔

مقصد کا حصول یوں ممکن ہوتا ہے نظر نہیں آتا کہ تعلیمی خبروں کو نہ تو مناسب جگہ دی جاتی ہے اور نہ ہی قابل فہم بنایا جاتا ہے۔

روزنامہ جنگ کے صفحات کے مطالعے سے اندازہ ہوا جنگ کو عوامی رائے کا ترجمان کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کسی سیاسی جماعت یا حکومت کا "آرگن" نہیں۔ اسکے باوجود صفحہ نمبر اول پر شخصیات کے لئے جگہیں مخصوص ہوتیں ہیں۔ ہمیشہ چند شخصیات کا بیان مخصوص جگہ پر مخصوص کوریج میں چھپتا ہے مثلاً الطاف حسین صاحب کا ماہ اپریل 2010 کے شماروں میں ہمیشہ دو کالمی بیان صفحہ پر نظر آتا رہا چاہے وہ اہم بات کہیں یا نہ کہیں لیکن تعلیمی شعبے سے متعلق خبروں کے لئے جگہ نہیں۔

اشتہارات کی سب سے زیادہ بھرمار "جنگ" میں ہی ملتی ہے صفحہ اول پر نیچے کا نصف حصہ اشتہارات کے لئے مخصوص ہے اور چونکہ صفحہ اول کی اہمیت بھی اپنی جگہ ہے چنانچہ ان اشتہارات کے ریٹ کا تناسب اندرونی صفحات سے زیادہ ہے۔بڑے بڑے اشتہاری ضمیمے باقاعدہ مضامین کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں جس کی ایک تازہ مثال سندھ حکومت کی جانب سے اپنے ترقیاتی کاموں کی تشہیر کے سلسلے میں شائع کئے جانے والے ضمیمے ہیں۔

روزنامہ جنگ میں اہم ترین خبر کو صفحہ نمبر اول کے درمیان سے کچھ اوپر نمایاں کیا جاتا ہے ان اہم خبروں میں عموماً علاقائی بین الاقوامی یا سیاسی نوعیت کی خبریں شامل ہیں۔ صفحہ اول کو خبروں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اشتہارات کے ساتھ ساتھ تصاویر اخبار کی خوبصورتی اور تزئین میں اضافے اور خبر کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ اور اس طرح خبر کے لئے جگہ برائے نام ہی نظر آتی ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک عام فرد صفحہ اول کی سرخیوں کو ہی اہمیت دیتا ہے شاذ و نادر ہی اخبار کھولنے کی زحمت ہوتی ہے ساتھ ساتھ افراد کی قوت خرید نہ ہونے کہ باعث بسوں کے اسٹاپ پر لوگوں کا مجمع اخبار کے اسٹال پر دور سے پیچھے ہاتھ باندھے صرف سرخی پڑھ کر اپنی علمی پیاس بجھانے کی کوشش کرتا ہے ہمارے معاشرے میں وہ شخص پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے جو "پڑھ لکھ" سکتا ہے۔ لیکن اگر اس تعریف کو وسعت دی جائے تو "تعلیم یافتہ" کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔

ایک "پڑھ لکھ" سکنے والے فرد سے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اخبار کے

اندورنی صفحات میں دلچسپی کم لے گا اور صفحہ اول کی سرخیوں پر اکتفا کرے گا۔ لیکن ہمارے معاشرے کے "تعلیم یافتہ" ذرائع ابلاغ کے کلید بردار اور روزنامہ جنگ (جس کی مجموعی تعداد اشاعت پانچ لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے اور یہ دنیا کا سب سے بڑا اردو روزنامہ کی حیثیت سے سامنے آیا ہے) کیوں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے سنجیدہ روش اختیار نہیں کر رہا۔ تاکہ معاشرے کی نبض پکڑتے ہوئے پاکستان کے سب سے اہم مسئلہ تعلیم سے آگاہی اور شرح خواندگی میں اضافہ کو اس طرح حل کیا جائے جیسے ہماری قوم کی سوچ بن چکی ہے۔ کیوں نہ اُنہیں ان کی محدود سوچ کے ساتھ لیتے ہوئے ایسی حکمت عملی تیار کی جائے کہ نتیجتاً ایک بلند ذہنی سطح کے معاشرے کا نظام عمل میں لایا جاسکے۔

تحقیق کے دوران دلچسپ بات یہ سامنے آئی کہ تیس شماروں میں سے صرف ایک دن تیئس اپریل کو ایک خبر تعلیمی شعبے کی ایسی تھی جسے روزنامہ جنگ میں صفحہ اول پر قابلِ اشاعت سمجھا گیا جس کی سرخی یوں لگائی گئی۔

"سندھ بھر میں اسکول، کالجز اور جامعات میں ۲ چھٹیوں کا فیصلہ"

اس سے کہیں زیادہ اہم خبریں مہینے بھر میں اندرونی صفحات میں تعلیمی شعبے کی شائع کی گئی جنھیں نمایاں طور پر صفحہ اول میں شامل اشاعت کرنا چاہیے تھا لیکن ان خبروں کو عموماً صفحہ 4 ، صفحہ 5 ، صفحہ 6، صفحہ 8 ، صفحہ 11 میں

جگہ دی گئی۔

اندورنی صفحات میں تعلیم و صحت کے صفحہ پر شائع کی جانے والی خبریں یہ ہیں۔

شعبہ تعلیم کے حوالے سے ان خبروں کا جائزہ جنہیں صفحہ اول پر جگہ ملنی چاہیے۔

تاریخ

سرخی

صفحہ

سینٹی میٹر

کالم

اپریل 2

بی۔ایل سال اول کا پرچہ 13 اپریل کو ہوگا۔

4

2.5 cm

1

اپریل 3

اپریل 4

انٹر کامرس کے 1600 سے زائد پرائیوٹ طلبہ سے امتحانی فارمز کی وصولی۔

اپریل 5

جامعہ کراچی شعبہ مائیکرو بائیولوجی ایم ایس اور پی ایچ ڈی کی داخلہ فہرست آج جاری * ہوگی۔

صوبائی محکمہ تعلیم کی جانب سے بازار میں درسی کتب کی عدم دستیابی کا نوٹس، ٹیکسٹ * بورڈ کے افسر کا تبادلہ۔

4

6 cm

5 cm

3

3

اپریل6

کوئی اہم خبر نہیں تھی۔

اپریل 7
میٹرک کے امتحانات: طبیعات کے پرچے میں غلطی سے طلباء کو مشکلات کا سامنا۔
گورنر ہاوس کی ویجیلنس ٹیم کا مختلف اسکولوں پر چھاپہ اصلی امیدواروں کی جگہ امتحان
دیتے ہوئے تین افراد پولیس کی حراست میں۔

8

11 cm

3

اپریل 8
جولائی 2009 سے مارچ 2010 تک 1400 اسکول کھولے گئے (1500 فیڈر ٹیچر
مقرر)

4

10 cm

3

اپریل 9
میٹرک کے امتحانات: امتحانی مراکز کے 6 سینئر سپرنڈنٹس اور اساتذہ معطل۔

4

4.5 cm

3

اپریل 10
چیئرمین میٹرک بورڈ کی معائنہ ٹیم کے چھاپے، 19 طلباء پکڑے گئے۔

6

4 cm

1

اپریل 11

اپریل 12
طلباء کو درسی کتابیں زیادہ قیمت پر دینے کا نوٹس

6

5 cm

2

اپریل 13
سائنسی لیبارٹریوں کے لئے آلات کی خریداری میں 50 فیصد اضافہ (اطلاق سائنس اور فارمیسی کے شعبوں پر ہوگا)۔

5

5 cm

3

اپریل 14

غیر رجسٹرڈ تعلیمی اداروں کے خلاف سخت کاروائی کا مطالبہ

5

4 cm

2

اپریل 15

پی ایچ ڈی کا معیار بہتر کرنے کے لئے مقالہ دو غیر ملکی ماہرین کی جانچ سے مشروط

4

7 cm

3

اپریل 16

اسکولوں کو 2 سال کے دوران فراہم کئے گئے فرنیچر کی تفصیلات طلب ( اسکول سہولتوں سے محروم )

11

5 cm

2

اپریل 17

میٹرک بورڈ میں ڈائریکٹر ریسرچ کی تقرری کا معاملہ پیچیدہ۔

4

7 cm

3

اپریل 18

اپریل 19

میٹرک کے امتحانات ملتوی کرانے اور دیگر معاملات کے ذمہ دار 25 اسکول

4

8 cm

3

اپریل 20

اپریل 21

جامعہ کراچی جرمیات میں ڈاکٹریٹ کرنے والوں کے داخلے شعبہ عمرانیات منتقل۔

(باقاعدہ خط جاری کردیئے گئے)

11

8 cm

3

اپریل 22

اپریل 23

اپریل 24

اپریل 26

قومیائے گئے نجی تعلیمی اداروں کی واپسی کو روکنے کے لئے قانون سازی سرد خانے کی نذر

4

7 cm

3

اپریل 27

تعلیم پر 60 ارب روپے خرچ کرنے کے باوجود معیار بہتر نہیں

4

7 cm

3

اپریل 28

انٹر کے امتحانات شروع۔ سینکڑوں طلباء نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

5

6 cm

3

اپریل 29

اسکولوں اور کالجوں کے تدریسی اوقات میں ایک گھنٹے کا اضافہ

4

12 cm

3

اپریل 30

انٹر امتحانات 32 امیدوار نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

8

7 cm

3

یہ خبریں اس نوعیت کی تھیں جنھیں اصولن اخبار میں نمایاں مقام ملنا ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے ان تمام خبروں کا معیار تعلیمی

سرگرمیوں سے آگاہی تو ہوسکتا ہے لیکن کہیں بھی ترقیاتی حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی تحقیقی خبر، حکومت کو مشورے یا عوام میں شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں ہے۔

اور پاکستانی عوام کے وہ مسائل جو ناخواندگی کا باعث ہیں کی طرف نشاندہی نہیں کی گئی۔ مثال کے طور پر دیہات میں سینکڑوں ایسے اسکول ہیں جہاں عمارت نہیں اور درس اور تدریس کا سلسلہ کھلے آسمان کے نیچے مٹی کے فرش پہ جاری رکھا جاتا ہے اور سینکڑوں اسکول ایسے ہیں جن کی عمارت نہایت خستہ حالت میں ہے میلوں پیدل چل کر بچے اسکول آتے ہیں

اس کے علاوہ حکومت کی طرف سے تعلیم کی لئے مختص کردہ رقم کو بڑھا دیا گیا یہ اب 314 روپے فی کس فی سال ہے یعنی فی روز ایک روپے سے بھی کم۔ کیا یہ رقم قوم کے نونہالوں کے لئے کافی ہے۔

یہ تعلیم ہی تو جو ہمیں برے بھلے کی تمیز سکھاتی ہے ہمارے ملک کی 37 فیصد شرح خواندگی کا مطلب یہ ہے کہ 63 فیصد لوگ جاہل ہیں جو انسانی حقوق نگہداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھ سکتے۔

مزید یہ کہ معاشرتی لحاظ سے خاص طور پر پاکستان میں خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں منفی پیغامات کا چلن رہتا ہے۔

یہ تمام ایسے مسائل ہیں جنہیں باقاعدہ طور پر منصوبہ بندی اور تحقیق کے ذریعے اخباری مواد کی صورت میں اخبار میں جگہ ملنی چاہیے تاکہ عوام میں شعور پیدا ہو اور فیصلے کی قوت پیدا ہو۔ فیصلہ کا وقت اس وقت آتا ہے جب کوئی فرد، ذرائع ابلاغ ایسے سرگرمی کا (adoption) سے وابستگی اختیار کرتا ہے پھر معاشرے میں ترقی اور اختیار کرنے عمل آگے بڑھتا ہے۔

نہیں دی جاتی۔ خبر کا ذریعہ By Line روزنامہ جنگ میں تعلیمی شعبے سے متعلق کوئی کے طور پر "جنگ نیوز" تحریر کیا جاتا ہے جبکہ دوسرے شعبے جات اور مقامی (source) دی جاتی ہے۔ یعنی اس شعبے کو اتنی کم اہمیت By Line بین الاقوامی سیاسی خبریں باقاعدہ دی جاتی ہے کہ ابھی تک اخبار میں باقاعدہ تربیت یافتہ اس شعبہ سے وابستہ صحافی ہی نہیں جبکہ موجودہ معاشرتی بدحالی میں ایسے کارپردازوں کی ضرورت ہے جو معاشرے میں ترقی کو فروغ دینے اور افراد معاشرے کے ذہن میں مثبت تبدیلی حالات کے لئے تحریک پیدا کرنے کی ضرورت کو سمجھتے ہوں۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترقیاتی حکمت عملی کے تحت تعلیمی شعبے میں تحقیق اور اہل معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا نسبتاً زیادہ محنت طلب اور مسلسل محنت کا مطالبہ کرتا ہے۔

بد قسمتی سے پاکستان میں محنت نہ کرنے کا کلچر تیزی سے پھیل رہا ہے یہاں لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ کام کریں نہ کریں کام کرنے کا تاثر دیں اور اس کا ڈھول پیٹتے رہیں تو سب ٹھیک ہی رہتا ہے اور ترقی کے دروازے بھی کھلتے جاتے ہیں۔

اخبارات منافع طلبی کی جدوجہد میں اندھا دھن آگے بڑھنا ضروری سمجھتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اصل مقصد اشتہار پیش کرنا ہے اور چونکہ ابلاغی مواد کے بغیر اشتہارات پیش نہیں کئے جا سکتے لہٰذا مجبوراً کچھ ابلاغی مواد دے دیا جاتا ہے۔

روزنامہ جنگ جیسے بڑے اور سنجیدہ اخبار میں بھی صاف فریب دہی کے ساتھ رنگا رنگ اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔

اخبار ایک ایسا (Mass Media Channal) ہے جس کے ذریعے کسی ایک فرد یا چند

بہت سے لوگوں تک رسائی پاتے ہیں۔روزنامہ جنگ (Source) افراد پر مشتمل ماخذ
تک پیغام پہنچانے اور (Audience)ایک ایسا اخبار ہے جو ایک ساتھ بے شمار مخاطبین
علم و آگہی پیدا کرکے اطلاعات کی اشاعت کرنے کا دعویدار ہے۔

روزنامہ جنگ عوامی خدمت بہتر انداز میں کرسکتا ہے لیکن ابھی تک اس کردار میں
بڑی حد تک کمی ہے۔


کتابیات

۱۔ تعلیم

( تحریر: ڈاکٹر سی اے قادر (مرحوم

کتاب: تعلیمی نفسیات

۲۔ میر خلیل الرحمن اور جنگ

کتاب: صحافت

۳۔ شہریوں کے حقوق

تحریر: فرحانہ خٹک

کتاب: انسانی حقوق

۴۔ پاکستان میں انسانی حقوق

تحریر: اقبال احمد راشد

کتاب : انسانی حقوق

۵۔ ترقیاتی صحافت (Development Journalism)

تحریر : ڈاکٹر محمد انعام باری

کتاب : معاون ترقی ابلاغ

۶۔ پاکستان میں معاون ترقیِ ابلاغ (Development Support Communication In Pakistan)

تحریر : پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد زبیری

کتاب : معاون ترقی ابلاغ

۷۔ اختراع اختیار کرنے کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے

تحریر : Everett M. Rogers

تدوین و ترجمہ : راحت ناز

۸۔ ترجیحی ترقی کی حکمتِ عملی اور ابلاغ The Strategy of Growth and Communication

تحریر : Harry T. Oshima

تدوین و ترجمہ : سبین نور

# گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں

گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں۔ اسکا مطلب بہت سی تفریح اور مزہ۔ سارے خاندان بھر اور دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا بھرپور موقع۔ بچوں کی خوشی کی انتہا ہی نہیں۔ لیکن مائیں کچھ مضطرب نظر آتی ہیں کہ آخر دو ماہ گھر میں بچے وقت کیسے گزاریں گے۔ یعنی بہت سی بے ترتیبی گھر میں خوش آمدید کہنے کو ہے۔ ورنہ عام صورتحال میں تو بچے صبح اسکول جاتے ہیں۔ اسکول میں پانچ گھنٹے مسلسل اور متواتر نظم و نسق اور قواعد وضوابط کے مطابق گزارنے کے بعد بھی شخصیت پر منظم اثرات باقی رہتے ہیں۔ کچھ بچے دوپہر میں باقاعدگی سے ایک سے دو گھنٹے نیند پوری کرتے ہیں۔ بیدار ہونے کے بعد روزمرہ کے اُمور نبھاتے ہیں۔ ہوم ورک کرنا ٹی وی دیکھنا مدرسے یا ٹیوشن سینٹر کی طرف روانگی معمول کا حصہ ہوتی ہے۔ بچوں کے لئے یہ روٹین اُکتاہٹ کا سبب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے صبری سے ہفتہ اتوار کی چھٹی کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ نظم و نسق اور باقاعدگی بچوں کے لئے اکتاہٹ ضرور ہے لیکن مائیں اس روٹین سے کافی مطمئن نظر آتی ہیں۔

لیکن اب تو دو ماہ بچوں کو گھر میں رہنا ہے۔ ہر ماں پریشان ہے کہ آنے والی بے ترتیبیوں کو عادت نہ بنانے سے کیسے بچا جائے۔

☆ چھٹیوں کو موثر کیسے بنایا جائے۔

☆ کہاں کہاں جانے کا پروگرام بنایا جائے۔

☆ چھٹیوں میں اسکول کی جانب دیے گئے نصابی ہوم ورک کو کیسے اور کس وقت ختم کرایا جائے۔

یعنی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بچوں کی تو چھٹیاں ہو گئی ہیں لیکن والدین کے اوپر ایک اور اہم ذمہ داری آن پڑی کہ کس طرح اپنے بچوں کی چھٹیوں کو موثر بنائیں ۔ کہیں منصوبہ بندی کرتے کرتے ہی مہینہ نہ گزر جائے تو جلدی سے اپنے بچوں کے ساتھ سر جوڑ کے بیٹھ جائے ے۔ کاغذ اور قلم ہاتھ میں لیجیے، ترجیحات کی فہرست مرتب کیجیے۔

بے شک آپ بہت مصروف ہیں اور اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالنا مشکل اور بعض صورتحال میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں دنیا کے بہت سے کام آپ خوش اسلوبی سے کرتے ہیں لوگوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھتے ہیں کسی کی ناخوشگوار بات پر بھی جی حضوری کہہ جاتے ہیں تو ذرا لمحہ بھر کے لئے سوچئے کیا اپنی اولاد کے لئے کچھ وقت نہیں نکالا جا سکتا کیا اُن کی کسی غیر

سنجیدہ بات اور لاابالی رویے کو کچھ دیر کے لئے قبول نہیں لیا جاسکتا۔ بلکل ایسا ممکن ہے۔ یہ دن بچوں کے لئے ہیں۔ زندگی میں کام تو کبھی ختم ہی نہیں ہونے تو اپنے بچوں کی سنیئے وہ کیا چاہتے ہیں۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے اُن کے ذہنوں میں کیا منصوبہ بندی بنی ہوئی ہے۔

ہوسکتا ہے وہ کسی ہل اسٹیشن میں جانے کی خواہش کریں اگر آپ اس پہ رضا مند ہیں تو ٹھیک ہے جگہ کا تعین کیجیے۔ کتنے دن گزارنے ہیں اور جانے کے لئے کسی ذرائع آمدورفت کا انتظام کرنا ہے۔ اس پر مباحثہ discussion کیجیے۔

اور اگر آپ کے لئے کسی صورت ہل اسٹیشن جانا ممکن نہیں تو فوری طور پر اپنا تاثر reaction دکھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بچوں کو اعتماد میں لیجیے انُہیں اپنے شہر میں مقامی تفریح گاہوں میں بہت سا وقت گزارنے اور خوب مزہ کرانا کی پیشکش کیجیے۔

سب سے اہم بات کہ آگاہ کیجیے اپنے بچوں کو اپنے مسائل سے متعلق۔ یہ سوچ کہ اس نقطہ کو نظر انداز مت کیجیے کہ یہ تو بچہ ہے یہ کہاں سمجھ پائے گا۔ ایسا نہیں۔ آپکا بچہ آپکی نظر میں بچہ ہے ورنہ آجکل سات آٹھ سال کا بچہ بھی مسائل کو سمجھنے اور آپ سے دوستی کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

اگر آپکے بچے کی خواہش ہے کہ وہ کسی ہل اسٹیشن کے بڑے ہوٹل میں رہے یا جہاز کے ذریعے سفر کرکے دوسری جگہ جانا چاہتا ہے تو اس کی بات سکون سے سننے کے بعد اسے کو بڑھائے گا۔ اپنے بچے کو financial challenge سمجھائیے کہ یہ سب آپکے دھوکے میں مت رکھیے یا جھوٹی تسلی مت دیجیے۔

کیجیے کہ جس طرح شادی بیاہ تہوار کے لئے آپ پہلے سے ہی بجٹ بنالیتے ہیں try یہ بھی اسی طرح بچوں کی چھٹیوں کے لئے بھی بجٹ کا کچھ حصہ رکھ لیا جائے تاکہ آخر میں آپ کا بچہ اس حوالے سے کچھ غلط محسوس نہ کرے کہ گھر کے سارے اُمور ہی انجام دیئے جا رہے ہیں۔ اُس کے لئے کچھ نہیں کیا جارہا۔

اپنے بچے کی سنیئے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو اس کی سننے کے لئے تیار رکھیئے۔ اُن کی سنئے وہ کیا چاہتے ہیں۔ اپنی چھٹیوں کے حوالے سے ہو سکتا ہے وہ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اُنہیں کھل کر اظہار کرنے دیجیے اگر آپ انہیں آزادی نہیں دے سکتے تو غیر محسوس طریقے سے اپنے آپ کو بھی ان کے پروگرام کا حصہ بنالیجیے یا اس پروگرام سے زیادہ بہتر پروگرام کی پیشکش کر دیجیے۔

انفرادی اختلاف کی بڑی خلیج ہر جگہ موجود ہے۔ ضروری نہیں کہ آپکا بچہ ہے تو

ہر حال میں سمجھے گا یا آپ اس کی بات فوراً قبول کریں گے پر ہاں مباحثہ سب سے زیادہ اہم ہے اس سے بیچ کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔

ان سب کے ساتھ ساتھ اسکول کی جانب سے دیے گئے نصابی کاموں پر بھی نظر رکھیئے اب کراچی میں بہت سے تعلیمی ادارے اپنے سال کا آغاز اگست سے کرتے ہیں ایسے اداروں میں گرمیوں کی چھٹیوں کا کام نہیں دیا جاتا جبکہ وہ ادارے جہاں ماہ اپریل سے تعلیمی سال شروع ہوتا ہے میں باقاعدگی سے ہوم ورک دیا جاتا ہے تاکہ بچے اپنے کورس کی کتابوں سے کہیں دور نہ ہو جائیں۔

اکثر گھرانوں میں چھٹیوں کا سارا کام آخری دس دن میں ایک ساتھ ہی مکمل کروالیا جاتا ہے۔ جو کہ درست نہیں۔ اس طرح آپکا بچہ اسٹریس میں آسکتا ہے۔ چاہے ہل اسٹیشن کا رخ کیا جائے مقامی تفریح گاہوں کا یا پھر نانی دادی کے گھر پہ رہنے کا پروگرام ہو کم از کم آدھا گھنٹہ تدریسی کتب اور آدھا گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ اس سلسلے میں ٹائم شیڈول بنانے کے بعد اس کی پابندی کا خاص خیال رکھیں۔ ہوم ورک کا ٹائم سیٹ کرنے کے لئے بچے کی مشاورت کے بعد وقت کا تعین کرنے سے اس کی شخصیت میں اعتماد بھی بڑھے گا اور پڑھائی میں دلچسپی بھی پیدا ہوگی۔ اگر چھٹیوں کی خوشی میں کسی صورت بھی بچہ ہوم ورک کے لئے تیار نہیں ہو پا رہا تو کھیل ہی کھیل میں اسے

جلد ختم کر لے گا۔written work سبق یاد کروادیں ۔ اس طرح وہ
تعلیم کو صرف پڑھنے تک محدود رکھنا زیادتی ہے۔ تعلیم سے مراد صرف کتابی تعلیم نہیں
کیونکہ تعلیم میں انسان کی ہر وہ بات موجود ہے جو وہ اپنے گرد و پیش سے یکھتا ہے
شامل ہے۔

چھٹیوں کا یہ وقت اپنے بچے کو بہت کچھ یکھانے اور خود یکھنے کے لئے بہت ہی خاص ہے۔اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالئے ۔ وقت کو بانٹئے تھوڑا تھوڑا ہر کام روز کی agenda کا حصہ بنیادوں پر نمٹاتے جایئے۔ بچوں کی چھٹیوں کی منصوبہ بندی کو اپنے بنایئے اور یاد رکھیئے۔ اپنے بہت ضروری اور کم ضروری کاموں کی فہرست بنا لیجیے۔ یعنی اگر کوئی کام بہت ضروری نہیں تو آگے پیچھے دھکیلئے اور بہت ضروری کام نمٹانا ہے تو اسے بچوں کو بتایئے ، اپنی منصوبہ بندی میں اسے بھی شامل کریں تاکہ وہ ناراض نہ ہوں۔
زندگی کا ہر لمحہ آپکی گرفت میں ہونا چاہیے۔ یہ تو ایک طرح کا پزل ہوتا ہے اسے آپ نے حل کرنا ہے اور خود اپنے لئے کارآمد اور مفید بنانا ہے وقت کو اس لئے سرمایا کہا جاتا ہے لیکن اسے خرچ کرنے کا کوئی بہترین مصرف بھی آپ ہی کو تلاش کرنا ہے۔ اور یہ وقت صرف اور صرف آپ کے بچوں کا ہے۔ زندگی مشکل

صحیح لیکن وقت سے پہلے ان معصوم ذہنوں پر اس کے اثرات نہ پڑنے پائیں۔ انہیں
تتلیاں پکڑنے دیجیے تاکہ کل کوئی معصوم خواہش چبھن نہ بن پائے۔

# بیوٹی پارلر

نئے دور کے نئے تقاضے۔ خواتین ہوں کہ مرد حضرات خوبصورت بننا اب سب کے اختیار میں ہے۔جیب میں اگر پیسہ ہو تو پھر سانولی رنگت کی فکر کیا موٹے نقوش چند ہفتوں کا کھیل۔ موٹاپا پندرہ دن میں غائب۔ اُلجھے ہوئے بال صرف اور صرف تین سٹنگز میں نرم و ملائم جگمگاتے کے لوگ رشک کریں آپ پہ۔ خواتین کے چہرے پر غیر ضروری بالوں کی وجہ سے پریشانی ہو یا مردوں کے داڑھی کے اوپر اور پیشانی پر بال۔ اب لیزر سے سب غائب۔ سب کچھ ممکن ہے بس تھوڑی خود پہ توجہ بہت سا پیسہ اور وقت درکار ہے۔ اور یقینا بہت سے قاری مضمون پڑھتے ہوئے زیرِ لب دھرا بھی رہے ہوں گے کہ ہم تو بھرپور طریقے سے اپنے اوپر توجہ دیتے ہیں اور تقریبًا روز ہی بیوٹی پارلرز، مین سیلونز MenSaloonsکا رخ کرتے ہیں اور بھئی ایسا کیوں نہ کیا جائے جبکہ آج کل ہر گلی محلے میں چار پانچ خوبصورت بنانے کے کارخانے کھلے ہوئے ہیں۔ خوبصورت نظر آنے کی خواہش ہر شخص کرتا ہے۔ خواتین اِس حوالے سے زیادہ حساس ہوتی ہیں اِس لئے شہر بھر میں بیوٹی پارلرز کی بھرمار ہوتی جارہی ہے۔ بیوٹی پارلرز میں حالیہ چند برس میں بے حد ترقی ہوئی ہے۔ حکومت کی جانب سے بیوٹی

پارلر کھولنے کے لئے کوئی طریقہ واضح نہیں کیا گیا نہ حکومت سے کوئی اجازت لینا ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کے لائسنس کا اجراء کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر دوسرا شخص اسے معقول کاروبار سمجھتے ہوئے شروع کر رہا ہے۔ کراچی میں کئے گئے سروے کے مطابق کراچی کے 18ٹاؤنز میں اس وقت 14,838 بیوٹی پارلرز ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ان بیوٹی پارلرز میں ایک لاکھ سے زائد خواتین ورکرزکام کرتی ہیں اور صرف 3ہزار بیوٹی پارلرز رجسٹرڈ ہیں۔ صوبائی حکومت ان سے ٹیکس بھی وصول کر رہی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انسانی جلد جیسے حساس معاملے کے لئے بیوٹی پارلرز میں کام کرنے والی خواتین کو تین ماہ کا بیوٹیشن کورس کرایا جاتا ہے اور یہ کورس سندھ ٹیکنکل بورڈ کراتا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری حکومت کی نظر میں فولادی مشینوں کے متعلق کورسز اور انسانی جلد کے متعلق کورسز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تین ماہ کا بیوٹیشن کورس کرنے والی خواتین اپنا بیوٹی پارلر کھول لیتی ہیں یا کسی اور بیوٹی پارلر پر کام کرتے ہوئے انسانی جلد پر تجربات شروع کر دیتی ہیں۔

ذرا غور کیجیے ہم سب کس نادانی سے اپنے آپ کو ان بیوٹیشن ورکرز کے حوالے کر دیتے ہیں جو بیوٹی پروڈکٹس کا نام پڑھنے سے بھی قاصر ہیں۔ 90 فیصد بیوٹیشن اگر تعلیم یافتہ ہوں بھی تو وہ اُن کیمیکلز کے بارے میں ناواقف

ہیں جو کسی بھی پروڈکٹ میں شامل ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے جب اِن پروڈکٹ کے اجزاء ترکیبی کا علم ہی نہ ہوگا تو مختلف قسم کی جلد پر اِن کے کیا اثرات ہو سکتے ہیں اس سے انہیں کیا غرض۔ چونکہ بیوٹی پارلرز پیسہ کمانے کا سب سے آسان نسخہ ہے تو اِس منافع بخش کاروبار میں شہر کے متوسط علاقوں میں قائم دولت کی ہوس میں مبتلا افراد غیر معیاری پروڈکٹس اور غیر تربیت یافتہ افراد کو کام پر رکھ کر لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہے ہیں۔

اِس بات کا اندازہ ہمارے شہر میں تیزی سے بڑھتی ہوئی اسکن ڈیزیز سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق جلدی امراض میں مبتلا خواتین میں سے 8 سے 10 روزانہ بیوٹی پارلرز سے متاثر خواتین ہسپتال کا رخ کرتیں ہیں۔ درجنوں واقعات ایسے سامنے آئے ہیں جن میں خواتین کے جسم پر بال آجاتے ہین ی یا پھر ان کے سر کے بال غائب ہو جاتے ہیں ۔ چہرہ اور جسم کے دوسرے اعضاء جھلس جاتے ہیں۔ جبکہ ناقص انتہائی خطرناک قسم کے کیمیکلز والی مہندی کے استعمال سے شدید الرجی اور ہاتھوں میں کالے دھبّے پڑنے کی شکایت تو بہت عام ہے۔

ایک دن میں گورا کرنے والے فیشلز تو موجود ہیں اور فوری طور پر ان کا رزلٹ اچھا نکلتا ہے لیکن دو دن بعد ہی چہرے پر روکھا پن ، جلد کا بے جان ہو جانا، جھریاں پڑ جانا اور رنگت خراب ہو جانا جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک تاثر یہ بھی ہے کہ یہ کیمیکلز جسم کے بیرونی حصّوں پر ہی اثر انداز ہوتے ہیں جبکہ ایسا ہر گز نہیں۔ بیوٹی پروڈکٹس میں شامل یہ خطرناک کیمیکلز جلد میں جذب ہو کر اندرونی نظام کو بھی شدید متاثر کرتے ہیں۔

خواتین کی اکثریت ان غیر معیاری بیوٹی پارلرز کا شکار ہو کر اپنا چہرہ چھپانے پر مجبور ہیں اور شدید ذہنی اُلجھاؤ کی وجہ سے نفسیاتی مریضہ بن گئی ہیں۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا خوبصورتی اتنی ہی اہم چیز ہے کہ اِس کو حاصل کرنے کے لئے خود کو ان غیر معیاری بیوٹی پارلر کے حوالے کر دیا جائے؟

چہرے کی خوبصورتی کا تعین خواتین خود تو اس قدر نہیں کرتیں جس قدر معاشرہ کرتا ہے۔ ہم نے ہی کسی انسان کے اچھے یا بُرے ہونے کا پیمانہ ظاہری خدوخال کو بنا لیا ہے۔ شادی شدہ خواتین اگر میک اپ نہ کریں یا اپنے ظاہری حسن کا خیال نہ رکھیں تو کہا جاتا ہے کہ شاید اس کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں۔ بیٹی اگر معمولی شکل و صورت کی ہو تو ماں ہی اُسے بات بے بات طعنہ دے کر اُس میں احساس کمتری پیدا کر دیتی ہے۔ دوسری طرف بیویوں کو یہ فکر رہتی ہے کہ وہ اگر خوبصورت نظر نہ آ ئیگی تو ان کے شوہرِ نامدار دوسری خواتین کے حسن کے دیوانے ہو سکتے ہیں۔ گویا سجتے سنورتے رہنا ایک مجبوری بن گیا ہے۔ رشتے

طے کرنے کے لئے بھی پہلا معیار ظاہری حسن رکھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی بیوٹی پارلر کا رح بنتا جارہاStatus Symbol کر کے خود کو اعلیٰ دکھانا ہمارے معاشرے میں ایک ہے۔

سارے مسائل کا واحد حل اپنی سوچ کی چلن کو بدلنا ہے جب فرد واحد اپنی نگاہ وسیع رکھے گا تو رفتہ رفتہ یقیناً تمام معاشرے کی سوچ میں بدلاؤ آئیگا۔

خوبصورت نظر آنا آپکا حق ہے مگر اس کے لئے اپنے آپ کو کسی اور کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا سراسر غلط ہے۔ جب آپ زندگی کے دوسرے معاملات کو انتہائی سمجھداری کے ساتھ سنبھالتی ہیں تو پھر اپنے ظاہری حسن کی نگہداشت ذرا سی سوجھ بوجھ کے ساتھ خود بہتر انداز میں کر سکتی ہیں۔ بجائے اسکے کہ آپ بہت سا وقت اور پیسہ برباد کریں۔ جبکہ سوال صرف مادی چیزوں کا نہیں۔ خطرناک کیمیکلز آپ کے اندرونی اور بیرونی نظام کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ بالآخر خوبصورتی کا خواب پایہ تکمیل ہونے کی بجائے اسکن ڈیزیسز ہسپتال کے چکر لگانا مقدر بن جاتا ہے۔ خوبصورت بننا ایک دن میں ممکن نہیں۔ گھر میں باورچی خانہ میں ہی آپ کے خوبصورت بننے کا بہت سا سامان موجود ہے۔ صرف ہلدی ایک چمچ لے کر اُسے پانی میں گھول کے پی لیا جائے تو رفتہ رفتہ رنگت نکھر جائیگی۔ اُبلی ہوئی لونگ کا پانی پینے سے جھریاں نہیں آتیں۔ لونگ

بادام، چاول کا آٹا مرکب بنا کر رکھ دیا جائے اور استعمال سے پہلے لیموں کے چند، قطرے شامل کر لیے جائیں تو یہ اسکرپ مارکیٹ میں دستیاب خطرناک کیمیکلز سے بنائے گئے اسکرپ کے مقابلے میں انتہائی فائدہ مند ہے۔ روزانہ کورن فلور کا ماسک یا ملتانی مٹی کے ماسک کو چہرے پہ لگا دیا جائے تو کسی بیوٹی پارلر میں فیشل کی ضرورت نہیں رہے۔ اگر خمیر کو معمولی سے دودھ میں پیسٹ بنا کر چہرے پہ لگایا جائے تو ڈیڈ اسکن، بلیک ہیڈس اور وائیٹ ہیڈس سے مکمل نجات مل سکتی ہے۔ سرسوں کے تیل میں ایلو ویرا کے پتے کاٹ کر پکائیں اور اس تیل کو چہرے اور جسم پر مساج کریں تو یقیناً کسی کریم کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس کے علاوہ بھی نجانے کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو قدرتی طور پر آپ کی خوبصورتی میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ یہ بات یاد رکھئے کہ مختلف قسم کی کریموں کا مرکب استعمال کر کے آپ کی رنگت ایک ہفتے میں نکھر ضرور جائے گی لیکن طبی ماہرین کے مطابق ایسی پروڈکٹس تیزی سے اسکن کینسرز میں اضافہ کر رہی ہیں۔
اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

خوبصورتی کے لئے بنیادی شرط صحت مند چمکدار جلد ہے۔ چہرے پہ موجود بالوں کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہونا ٹھیک نہیں۔ غیر ضروری بالوں کے خاتمے کے لئے صرف اور صرف کسی ماہر ڈرماٹالوجسٹ ہی سے رابطہ کریں۔ بہت سی مائیں کم عمری میں ہی اپنی بچیوں کے چہرے کی ویکسنگ کروا دیتی ہیں۔ جو کہ انتہائی غلط

اقدام ہے۔ اول تو چہرے کے بالوں کو یوں مستقل طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا واحد حل لیزر ٹریٹمنٹ ہی ہوتا ہے جو کہ

ایک مہنگا عمل ہے۔ ساتھ ہی لیزر ٹریٹمنٹ ایک جلدی امراض کا ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے کوئی بیوٹی پارلر یا صرف بیوٹیشن نہیں!

پرانے زمانے میں مائیں بچوں کے ماتھے کا رواں دیسی ٹوٹکوں سے نکالتی تھیں۔ جب کہ بہت حد تک یہ ٹھیک بھی ہیں۔ بچیوں کے پیدا ہونے سے ایک سال کی عمر کے درمیان اگر ماں کے دودھ کو روئی کی مدد سے چہرے پر لگایا جائے تو یقینی طور چہرے کے بال ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائینگے۔

بھوؤں کو تراش کے خوبصورت بنانا ٹھیک ہے لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مستقل آئی برو بنوانے سے خصوصاً چھوٹی عمر میں بھوئیں ترشوانے سے آنکھ کا اوپری حصّہ جسے پپوٹا کہتے ہیں وہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اس طرح چہرے کی خوبصورتی متاثر ہوتی ہے۔ بھوؤں کی یہ تراش خراش جلد کو سخت کر دیتی ہے جس کی وجہ سے چہرے کی معصومیت میں کمی آجاتی ہے۔

اختتامیہ:

خوبصورت بننا آسان ہے فقط خود پہ توجہ دیجیے۔ غیر معیاری پروڈکس اور غیر تربیت یافتہ بیوٹیشنز کے ہاتھوں خود کو برباد مت کریں۔ پانچ وقت نماز کے لئے وضو کرنا اپنی خوبصورتی کو بڑھانے کا سب سے اہم نسخہ ہے۔ جس سے نہ صرف باطنی بلکہ سو فیصد ظاہری حسن بھی حاصل ہوتا ہے۔

مرد ہوں یا خواتین ہم سب کو ہی یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ظاہری حسن سے کہیں زیادہ اہمیت باطنی حسن کی ہے۔ جو شخص اندر سے خوبصورت اور پاک و صاف سوچ کا مالک ہوگا باہر سے بھی اتنا ہی پر سکون اور خوبصورت نظر آئیگا۔ پھر سانولی رنگت ہو یا موٹے نقوش یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ فقط باطنی خوبصورتی ظاہری خوبصورتی کی آئینہ دار ہے۔

جیب بھلے اجازت نہ دے لیکن بچے کی فرمائش پوری کرنے کے لیے آپ دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ " بھئی ہم کماتے کس کے لیے ہیں، بچوں پر خرچ نہیں کریں گے تو کس پر کریں گے۔" آج کل کے بچے کافی ذہین ہیں۔ وہ والدین کے سامنے اپنی خواہشات اور مطالبات پیش کرنے کے لیے مختلف طریقے آزماتے ہیں۔ کئی والدین بچوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ کچھ والدین کا رویہ تو یہ ہوجاتا ہے کہ یہاں بچے کے منہ سے کوئی بات نکلی، وہاں اس کی خواہش پوری کر دی گئی، دونوں میں سے کوئی ایک طرز عمل کی مخالفت کر رہا ہوتا ہے کہ بچے کی ہر ضد پوری نہ کی جائے۔ بعض صورتوں میں ماں اور باپ دونوں ہی کوشش کرتے ہیں کہ بچے کی ہر خواہش پوری کر دیں۔ یہ طرز عمل اختیار کرکے ماں باپ تو اپنے خیال میں نباہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اولاد کو خوشی کے چند لمحات فراہم کرنے کے لیے اس کی ہر بات مان لینی چاہیے۔ لیکن ایک خواہش پوری ہوتے ہی بچہ دوسری فرمائش کر دیتا ہے۔ معصوم ذہن ہر بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا کہ والدین کو اس کی ایک خواہش پوری کرنے کے لیے کن مشکلات کا سامنا پڑا یا وہ مزید فرمائشیں کرکے اُلجھنیں تو نہیں بڑھا رہا؟ ظاہر ہے کہ ننھا ذہن ان باتوں کا ادراک نہیں کر پاتا۔

عام طور پر والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر بچے کی بات نہ مانی جائے تو وہ ضدی ہوجاتا ہے ، معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب والدین بچوں کی محبت میں ان کی ہر خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں تو بچے کی ضد بڑھنے لگتی ہے۔ جب بچہ اپنے والدین کے دل میں اپنی ہر خواہش کا احترام پاتا ہے تو پھر نوبت انوکھے لاڈلے کے چاند مانگنے تک آتی ہے۔ والدین ہر خواہش پوری کر دیتے ہیں تو بچہ بھی ہر روز نئی خواہش کرنا اپنی روش بنالیتا ہے۔ اس نہج پر پہنچ کر والدین کو سختی کا خیال آتا ہے ، کیوں کہ جیب اجازت نہیں دیتی کہ مزید خواہشات کو پورا کیا جائے۔ نتیجتاً بچے کو سختی سے سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے ، کیوں کہ بطچہ اب اتنا ضدی ہو چکا ہوتا ہے کہ ملنے جلنے والوں کے سامنے بھی اپنی کسی خواہش کے پورا نہ ہونے پر رونے دھونے سے باز نہیں آتا۔ آخر کار ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ گھر آنے والوں کے سامنے بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی ذرا غور کیجیے کہ ایک غلط رویہ کتنے مسائل جنم دیتا ہے۔ حد سے زیادہ لاڈ پیار اور حد سے زیادہ سختی دونوں صورتوں میں بچہ مختلف نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا شکار ہوجاتا ہے ، جو اٹھارہ بیس برس کی عمر میں شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ مسائل اتنے سنگین ہو جاتے ہیں کہ بچے کی پوری شخصیت ہی بگاڑ کا شکار ہوجاتی ہے اور یہ بگاڑ تاعمر اس کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی شخصیت میں اعتدال نہیں رہتا ہے۔

خواہشوں اور ضرورتوں کے

درمیان فرق بھلا دینے والا انسان جب اپنی ہر بات منوانے کے درپے ہو جاتا ہے تو اس سے نا صرف ان کا خاندان متاثر ہوتا ہے، بل کہ اس کے مزاج میں پیدا ہونے والا خود پسندی کا عنصر اس کے لیے عملی زندگی میں بھی کئی مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ بات رویے میں اعتدال کی ہے۔ مناسب طرز عمل اختیار کیجیے، تاکہ یہ پودے میٹھے ثمر دینے والے تناور اور مضبوط درخت بن سکیں۔ بچوں کی ہر بات ماننے کی صورت میں ابتداً اس میں ضد اور پھر بغاوت جنم لیتی ہے۔ اگر شخصیت متوازن اور مضبوط نہ ہو تو نوجوان عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد مختلف انفرادی اور معاشرتی مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ بعض اوقات عارضے کی سورت میں عمر بھر ان کی ذات کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور باقاعدہ نفسیاتی علاج کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ والدین کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اپنے بچے کے لیے انہیں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی ہے کہ اپنے بچے کو وقت دیں، ان کی بات سمجھیں۔ ان کی کسی بے وجہ خواہش کے جواب میں انہیں سمجھا کر قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لاڈ پیار اپنی جگہ لیکن غلطی کی صورت میں بچے کو ضرور سمجھائیں۔

بچے کے مزاج کی ناہمواری دور کرنے کے لیے پر تشدد راستہ اختیار کرنا تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بہ جائے اگر اسے کسی غلطی کا احساس دلانا مقصود ہو تو کچھ مختلف انداز سے اس تک یہ بات پہنچائیں۔ مثال کے طور پر کچھ دیر

کے لیے ایک جگہ بٹھا دیں اور اس سے بات نہ کریں، عموماً بچے اس گھریلو " سوشل بائیکاٹ " کا گہرا اثر لیتے ہیں اور اپنے والدین کی ناراضی برداشت نہیں کرتے۔ اسی ناراضی کے خوف سے دوسری بار غلطی سے اجتناب کرتے ہیں۔

والدین کو اپنے بچے کی ہر شرارت کو بدتمیزی یا اپنے لیے پریشانی تصور نہیں کرنا چاہیے۔ بچوں کی معصوم شرارتیں، کوتاہیاں نظرانداز کرنا سیکھیں۔ ممکن ہو تو اپنے اندر اتنی برداشت پیدا کیجیے کہ غصے میں آنے کے بہ جائے آپ ان کی معصوم شرارتوں سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ضد، جھوٹ اور ہٹ دھرمی کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ دوسروں کے سامنے یعنی باہر کے کسی فرد یا عزیزو اقارب کے سامنے برا بھلا نہ کہین، بلکہ تنہائی میں ذرا نرمی یا سختی سے سمجھا دیا جائے۔ یہ رویہ رفتہ رفتہ بچے میں مثبت تبدیلی لائے گا اور اس کی انا بھی مجروح نہیں ہو گی، بلکہ وہ آپ کا احترام کرے گا کہ میرے والدین میرے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔

والدین اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ براتاؤ کریں۔ بچے کے سوالات کو صرف یہ سوچ کر نظرانداز کر دینا درست نہیں کہ وہ آپ کی بات کیا سمجھے گا۔ بچوں کے معاملات سے لاتعلقی جھنجھلاہٹ یا دوسروں کے غلط رویے کی وجہ سے پیدا ہونے

والا غصہ اپنی اولاد پر اُتارنا یہ سب باتیں بچے کو آپ سے دور کر دیتی ہیں۔ یہ طرز عمل انتہائی خطرناک اور غیر مستحکم شخصیت کو جنم دیتا ہے۔

ہر وقت کی روک ٹوک بچپن کی رنگینی چھین لیتی ہے، اس سے گریز کیجیے۔ اچھے برے وقت کا فرق بچے کو سمجھا دیجیے، وقت بہت بڑا استاد ہے۔ کوئی بھی انسان ابتدائی عمر میں اپنے ساتھ رکھے جانے والے رویوں اور معاشرے کے برتاؤ سے اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس لیے والدین کو بچوں کے ساتھ اپنے رویے کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہوئے صحیح سمت کا تعین کیجیے اور اس سے بچوں کی تربیت کا عمل آگے بڑھایے کیوں کہ ہماری اولاد ہی ہمارا اصل سرمایہ ہے۔

# عید الفطر مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی تہوار

اس خوشیوں بھرے دن کے لیے ہر گھر میں بڑھ چڑھ کر اہتمام کیا جاتا ہے
اب وقت آگیا ہے عید کی تیاریوں میں تیزی لانے کا۔ تو کمربستہ ہو جائیں ، ہنسیں کھیلیں، کھائیں پئیں خوشیاں بانٹیں اور عید منائیں

عید الفطر کا سنتے ہی ساری دنیا کے مسلمانوں کے ذہن میں سب سے پہلا لفظ جو آتا ہے وہ ہے خوشی اور کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی تہوار جس کو پورے اہتمام سے منانا ہم سب کی مذہبی ذمہ داری ہے۔ رحمتوں اور برکتوں والے ماہ رمضان کے روزے رکھنے کے بعد عید کی صورت میں جو خوشیوں کی سوغات ملتی ہے اِس کی اہمیت ایک مسلمان روزہ دار ہی سمجھ سکتا ہے۔اِس خوشیوں بھرے دن کے لیے ہر گھر میں بڑھ چڑھ کر اہتمام کیا جاتا ہے اور اِس اہتمام میں گھر کی صفائی سجاوٹ اور سب سے بڑھ کر کپڑوں کی تیاری سرفہرست ہے۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ رمضان بازار میں لگائے گئے اسٹالوں پر خواتین کا ہجوم روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ جوں جوں عید قریب آرہی ہے ۔ خواتین میں خریداری کے رجحان میں تیزی دیکھنے میں آرہی ہے ۔ اکثر خواتین خریداری کا آغاز رمضان سے پہلے ہی شروع کر دیتی ہیں کیونکہ گھریلو ذمہ داریوں کے بڑھ جانے کے باعث

رمضان کے آخری عشرے میں خرید وفروخت تھکن کا سبب بنتی ہے تاہم آخری لمحوں تک کچھ نہ کچھ لینا باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً چوڑیاں، مہندی، جوتے وغیرہ۔ عید کے دن نزدیک آتے ہی ہر گھر میں افراتفری کا ماحول نظر آتا ہے۔ عید کی شاپنگ اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ہر طبقہ اپنی بساط سے بڑھ کر خریداری کرتا ہے۔ روزہ کھلنے کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے تاکہ بازاروں کی طرف رُخ کیا جاسکے پھر رات دیر تک گھر سے باہر بھی رہا جاتا ہے۔ ویسے یہ بے ترتیبی اپنے اندر ڈھیر سارا حُسن رکھتی ہے اور ہمارے لئے ہر سال کے اِس تہوار کو یادگار بنا دیتی ہے۔

لباس کی تیاری

عید کی بات ہو اور خواتین کے لباس کا ذکر نہ کیا جائے تو عید کا تصوّر ہی ماند پڑ جاتا ہے۔ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین عید کے موقع پر مختلف اور جاذبِ نظر دکھنا چاہتی ہیں۔ خوشیوں کے تہوار آئیں تو سَجنے سنورنے کی خواہش ہوتی ہے۔ گئے وقتوں کا سولہ سنگھار اور طرح کا ہوتا تھا اب ماڈرن دور میں لباس کی تراش خراش اور ایمبرائیڈری میں نفاست کے ساتھ ساتھ مہارت اور دلآویزی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عید کے کپڑوں کی تیاری کا مرحلہ ہو تو ہر خاتون کے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے۔ آج کل کونسا رنگ فیشن میں ہے؟ کیسا کپڑا پہنا جا رہا ہے؟ سلائی کے کیسے انداز اپنائے جا رہے ہیں اور گلوں کے

ڈیزائن کیسے بن رہے ہیں۔ لیکن اِن سے پہلے یہ سوال توجہ طلب ہے کہ آپ پہ کیا اچھا ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج جس قدر فیبرک کا مٹیریل، کوالٹی ،رنگ، اسٹائل اور سلائی کڑھائی کے طریقوں میں جدت اور نیا پن نظر آرہا ہے اتنا شاید کسی دور میں نہیں تھا یہاں تک کہ خریداری کے لئے اگر بازار جایا جائے تو بعض اوقات یہ سمجھ نہیں آتا کہ کیسا کپڑا خریدیں۔ کون سا رنگ لیں اور سلوائیں کس انداز سے۔ تاہم یہ ہماری تخلیقی صلاحیتوں کا امتحان ہی ہوتا ہے۔ ذرا سے ڈیزائننگ اور اپنی شخصیت کا خیال کرتے ہوئے اگر لباس تیار کیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ آپ مختلف نظر آئیں گی۔ عید کے دنوں میں بازاروں میں ریڈی میڈ گارمنٹس جا بجا نظر آتے ہیں۔اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ درزی ہو یا درزن رمضان شروع ہوتے ہی آرڈر لینے سے انکار کردیتے ہیں۔ بازار میں دستیاب ریڈی میڈ گارمنٹس بلاشبہ خوبصورت نظر آتے ہیں لیکن اَسی فیصد کپڑوں کا فیبرک معیاری نہیں ہوتا۔ جلد بازی میں خوبصورت تراش خراش سے بنایا گیا جدید انداز کا سوٹ خرید بھی لیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ ایک دھلائی میں ہی خراب ہو جائے۔ لہٰذا لباس کے انتخاب میں کپڑوں کے مٹیریل کو خاص اہمیت دیجیے۔ سادہ لباس مگر معیاری ہو تو آپ کے حسنِ ذوق کو فوراً داد مل جائیگی اور سراہنے والی ایک ہی نظر آپ کو اعتماد کی بے پایاں دولت دے جائیگی۔

اگر آپ اِس عید پر ریشمی لباس کا انتخاب کرنا چاہتی ہیں تو جامہ وار، کتان بنارسی، کمخواب اور شیفون تمام اقسام کے فیبریکس پر موجودہ فیشن کو ملحوظ رکھتے ہوئے، لباس تیار کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی لون، کاٹن، کھڈی کے ساتھ تائی اینڈ ڈائی ڈوپٹے والے سوتی ملبوسات بھی بہترین ہیں۔ قیمضوں کی لمبائی پچھلے دو سالوں کی طرح اس سال بھی ذیادہ ہے لباس کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے تیار کڑھائی والے گلے بازار میں با آسانی دستیاب ہیں جو کسی بھی عام سادہ لباس کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ائیر لین کھلے چاک والی قیمضیں گھیر والے فراک نما بند چاک والی قمیضیں تو کافی عرصہ سے فیشن میں ہیں ساتھ ہی سادہ قمیضوں کے ساتھ چوڑی دار پاجامے فیشن میں ان ہیں۔ ان چوڑی دار پاجاموں میکسکی اسٹائل کی فراکوں کے ساتھ بھی پہنا جاتا ہے۔ نیو فیشن ٹرینڈ میں " ٹیل فراک " ڈیزائنز آؤٹ لیٹس پر نظر آرہے ہیں۔اس کے علاوہ " ڈھاکہ پاجامے " اس عید کا سب سے الگ، نیا اور خوبصورت فیشن ہے۔یہ ڈھاکہ پاجامے تقریبات اور عید موقع پر اگر انگ رکھا اسٹائل قمیضوں کے ساتھ بنوائے جائیں تو نہایت خوبصورت لگیں گے۔

دھاگے کے کام والی دل فریب لیسیں عام ملتی ہیں۔جو لباس کی آرائش کو بڑھاتی

ہیں ۔آستینوں کی بناوٹ کے بھی نت نئے انداز دیکھنے میں آئے ہیں ۔ بیل بوٹے سلیو فیشن سے آؤٹ ہیں ، چوڑی والی آستینیں بنوائی جارہی ہیں ۔ بغیر آستینوں کے قمیض بھی رواج بنتے جارہے ہیں تاہم کچھ روایت پسند گھرانوں میں خواتین اپنے ستر بطور خاص خیال رکھتی ہیں یہ خواتین جہاں شرعی پردے کی پابندی اختیار کرکے دنیا و آخرت سمیٹتی ہیں وہیں ہاتھوں پر نمایاں ہونے والے غیر ضروری بالوں کی افزائش کے بعد ویکسنگ وغیرہ کی جھنجھٹ سے بھی بچ جاتی ہیں ۔

اچھا نظر آنا آپکا حق ہے۔ لباس وہ انتخاب کیجیے جو آپ کی شخصیت میں اعتماد پیدا کرے ساتھ ساتھ نفاست بھی نظر آتی رہے اور رنگوں سے لے کر اسٹائل تک آپ کسی مرحلہ پر بھی سلیقہ اور مہارت کے محاذ پر پسپا نہ ہوں۔

مہندی

عید الاضحیٰ پہ کام کاج کی مصروفیات میں مہندی لگانا کسے یاد رہتا ہے۔ لیکن عید الفطر میں مہندی لگانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ عید سے دو تین روز قبل گلی محلے میں بنے پارلر کے باہر تنبوں بندھے نظر آتے ہیں جہاں مہندی لگانے والی ماہر خواتین اور لڑکیاں بہت کم پیسوں کے عوض اپنی بہنوں کے ہاتھوں میں مہندی کے خوبصورت رنگ بھرتی ہیں جس کی خوشبوؤں سے عید کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ عید پر مہندی بہت ذوق و شوق کے ساتھ ہاتھوں اور پیروں

پر لگائی جاتی ہے۔ موجودہ جدت کے دور میں مختلف ملکوں کے ڈیزائن لگائے جاتے ہیں جن میں عربی، افریقی، پاکستانی اور انڈین زیادہ مقبول ہیں۔ عربی مہندی کے ڈیزائن آدھے ہاتھ پر بنائے جاتے ہیں۔اِن میں زیادہ تر پھول، پتے اور صراحی دار ڈیزائن ہوتے ہیں۔ جبکہ افریقی سوڈانی مہندی اسٹائل میں باریک لائنیں، نقطے اور مختلف اشکال شامل ہوتی ہیں۔پاکستانی اور انڈین مہندی کے اسٹائل کی مہندی لگانا وقت طلب کام ہے۔ کیوں کے ہاتھ بھرا ہوا نظر آتا ہے تو ہر کونے کی فلینگ پہ توجہ دی جای ہے۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی مہندی کا رنگ گاڑھا اور دیرپا ہو۔اِس کے لئے ضروری ہے کہ

مہندی سوکھنے کے بعد اُسے کھرچنے اور پانی سے دھونے سے اجتناب کیا جائے بلکہ کسی * بھی تیل اور روئی کی مدد سے سوکھی مہندی کو ہاتھ سے اُتار لیا جائے۔ *ایک پیالی میں لیمن جوس ڈالیں اور اِس میں تھوڑی سی چینی مکس کریں کہ وہ گاڑھا پیسٹ بن جائے اِس لیکویڈ کو کاٹن کی مدد سے مہندی کے اوپر لگائیں جتنی دیر یہ شیرہ مہندی پر لگا رہے گا اتنا ہی زیادہ رنگ آئے گا۔

توے کے اوپر چند لونگ رکھیں اور اِن کو ڈھکن سے کور کرکے بھاپ بننے دیں۔ جب* مہندی خشک ہو جائے تو ہاتھوں پر بھاپ لیں۔اِس سے بھی مہندی کا رنگ زیادہ ہوتا ہے۔

ایک برتن میں پانی لیں اور اِس میں ڈیپرین حل کرکے ہاتھ سے مہندی اتار کر اِس* پانی میں چند منٹ ڈبوئیں۔

جب مہندی خشک ہو جائے تو اِس پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں۔*
مہندی کا رنگ زیادہ دن برقرار رکھنے کے لئے جب غسل کریں یا پانی سے کام کرنا ہو*
تو ہاتھوں پر تیل مثلاً سرسوں ، زیتون یا ناریل کا تیل لگالیں ۔
جب مہندی کا رنگ پھیکا پڑ جائے تو اِسے کاسمیٹک بلیچ لگا کے اتار دیں۔ *

زیور ، چوڑیاں ، پرس اور سینڈلز

خواتین کی عید چوڑیوں اور زیور کے بغیر ادھوری ہے۔ یہی چیزیں تو زینت کا سامان رکھتی ہیں۔ لباس کے میچنگ کی چوڑیاں خریدنے خاص طور پر چاند رات کو بازار جایا جاتا ہے۔ تاہم وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں۔ نوجوان لڑکیاں عید کی چوڑیاں پہلے ہی خرید لیتی ہیں کیوں کہ بازاروں میں رش کی وجہ سے اکثر من بھاتی چیز ملنا دشوار ہوتا ہے۔ مارکیٹ میں اِس سال بلاشبہ چوڑیوں کے دیدہ زیب ڈیزائنز آئے ہیں۔ سادہ ، مینا کاری ، گلیٹر، کندن اور جڑاؤ نگوں والی دلفریب چوڑیاں خواتین کی ساری توجہ کھینچ لیتی ہیں۔ نئے دور کے تقاضوں نے روایات کو بدل ڈالا ہے۔ اب چوڑیوں سے زیادہ کڑے اور بریسلیٹ پہننا فیشن بن گیا ہے۔
ظاہر ہے زیور کے بغیر تو عید پھیکی ہے۔ پر اب سونے کے زیورات کم ہی پہنے جاتے ہیں۔ اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مناسب قیمت میں بازاروں میں میچنگ

جیولری دستیاب ہے جو سونے چاندی کے زیورات کے مقابلے میں بہت ہی خوبصوت تاثر دیتے ہیں۔

اب بات ہوجائے سینڈلز کی۔ لباس کی طرح جوتوں کا انتخاب بھی مزاج کے بھید کھول دیتا ہے۔ عید کے دنوں میں ہر طرح کی ورائٹی مارکیٹ میں دستیاب ہوتی ہے۔ اگر صرف میچنگ کی سینڈل لینا مقصود ہے تو مناسب قیمت میں کراچی کے ہر بازار میں یہ سینڈلز دستیاب ہیں۔ لیکن اگر آپ ایسی سینڈل یا چپلیں خریدنا چاہتی ہیں جو ہر سوٹ کے ساتھ مناسب لگے تو بہتر یہ ہے کہ معیاری جگہ سے ہی سینڈلز کی خریداری کی جائے۔ کہتے ہیں 'مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار'۔ تو جناب جوتوں کی خریداری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ بجٹ میں اضافہ کرکے مہنگی سینڈل خریدنا زیادہ بہتر ہے کیوں کہ یہ یقینا دیرپا اور آرام دہ ہونگی۔

ہینڈ بیگز یا پرس بھی خواتین اور بچیوں کی عید کی تیاری میں شامل ہوتے ہیں۔ بچیاں تو شاید عیدی رکھنے کے لئے ان کی خریداری کرتی ہیں اور خواتین عید کے موقعے پر آنے جانے کے لئے ہینڈ بیگز کو اہم سمجھتی ہیں۔ نوجوان لڑکیاں عموماً چھوٹے ہینڈ بیگز پسند کرتی ہیں۔ عید کے موقعے پر بازاروں میں نہایت سستے داموں یہ ہینڈ بیگز دستیاب ہیں۔

اب وقت آگیا ہے عید کی تیاریوں میں تیزی لانے کا۔ تو کمربستہ ہو جائیں، ہنسیں کھیلیں، کھائیں پئیں خوشیاں بانٹیں اور عید منائیں۔

## عروسی ملبوسات

کبھی موسم سرما کا ذکر تو کبھی موسم گرما کی فکر۔ کبھی بہاروں کے چرچے چار سو لیکن ان تمام موسموں سے ہٹ کر ایک موسم شادیوں کا بھی ہوتا ہے۔ ویسے تو شادی بیاہ کی تقریبات سال بھر ہوتی ہیں لیکن چند ماہ سال بھر میں ایسے بھی ہیں جن میں شادی بیاہ کی تقریبات عروج پر ہوتی ہیں۔ اور یہ ماہ اُسی عروج کے ہیں۔

اس خوشیوں بھری تقریب میں شریک رشتہ داروں عزیز و اقارب کے لئے مرکز توجہ دلہا دلہن کی جوڑی ہوتی ہے جو اپنی خوبصورت زندگی کا آغاز آنکھوں میں ڈھیروں خواب سجائے کر رہے ہوتے ہیں۔

اس تقریب میں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر خاص توجہ دی جاتی ہے تاکہ ان لمحات کو یادگار بنایا جاسکے۔ لہٰذا دلہا ہو یا دلہن اپنے لباس کو نہایت اہمیت دیتے ہیں۔ دوسروں سے مختلف نظر آنے کی خواہش دل میں لے لباس کی خوبصورتی پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ شریک خواتین خاص طور پر دلہن کے لباس کی بناوٹ پر ہر پہلو سے غور کرتیں ہیں اور دلچسپی رکھتیں ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لباس کی تراش و خراش اور مختلف نظر آنے کے شوق و جستجو میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دنیا بھر میں عروسی ملبوسات مخصوص خطے کی ثقافت اور مذہب سے ہم آہنگ تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن پاک و ہند میں ان کی بناوٹ پر جو توجہ دی جاتی ہے اسے تمام دنیا میں قابلِ ستائش گردانا جاتا ہے۔

عروسی لباس دلہن کے لئے آنے والے والی زندگی کا رنگ لیے ہوتا ہے۔ ہماری خطے کی مخصوص ثقافت میں دلہن کے لئے سرخ لباس مستقبل کی خوشیوں کا ضامن سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اب خواتین مختلف رنگوں کو بھی اپنا رہیں ہیں۔ خاص طور پر پیازی اور اُنابی رنگ ۔ کچھ خواتین ہلکے کام والے ملبوسات پر نگاہ ہی نہیں ڈالتیں۔ عموماً تمام ہی خواتین یہ چاہتی ہیں کہ ان کا لباس مختلف ہو۔ اسٹائل میں بھی اور کوالٹی میں بھی۔

عروسی ملبوسات کی بناوٹ میں ہنر مندوں کی محنت قابل ذکر ہوتی ہے۔ مختلف رنگ اپنی بہار کے عروج کو چھو رہے ہوتے ہیں تو ان پر بنا نفیس کام لباس پر سے نظریں نہیں ہٹانے دیتا۔ ماہر کاریگر ان پر کڑھائی ، گوٹے کے ساتھ کام، دبکا، کورا دبکا، موتی دھاگے کا کام، ذری کی کڑھائی ، اوگیزا پہ کام، دردوزی کا کام، سیکوینس Beads، پرل ورک Patch work، شیشے کا کام، پیچ ورک Cut work، کٹ ورک Squins ریشم کا کام اور کندن کا کام جدّت اور ثقافتی Pearl work،

ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر بناتے ہیں۔

ہمارے ملک میں عروسی ملبوسات ہر رینج میں دستیاب ہیں۔ ہر خاص و عام اپنی مالی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں خرید سکتا ہے۔ نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات تیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں شرارا، غرارا، لہنگا چولی، مرمیٹ کٹ لہنگا، چوڑی دار پجامہ اور لہنگا شامل ہے۔

کراچی میں عروسی ملبوسات مختلف بازاروں کے ساتھ ساتھ ڈیزائن آؤٹ لیٹس پر بھی موجود ہیں اس کے علاوہ پاکستان سے باہر ہونے والے پاکستانی اور بھارتی عوام کے لیے انٹرنیٹ کے ذریعے ملبوسات کی وسیع رینج مہیا کی جاتی ہے۔

ڈیزائنرز جب کے بعض صورتوں میں انفرادی حیثیت سے کامdesigners مختلف کرنے والے افراد بھی یہ ملبوسات بین الاقوامی منڈی میں فراہم کرتے ہیں۔ کراچی شہر میں ایسی بہت سی خواتین ہیں جو عروسی ملبوسات کو آرڈر پر تیار کرتی ہیں اور ملک سے باہر بھی اپنے کام کے اعلیٰ نمونے فراہم کر رہی ہیں۔ عروسی ملبوسات کی تیاری کا کام ایک صنعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ شہر کے مختلف بازاروں میں ایک جیسے ملبوسات دستیاب ہوتے ہیں۔ اکثر خریدنے والا یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ جب ڈیزائن ایک ہے تو قیمت میں فرق کیسے ممکن ہے۔ اس سوال کے

جواب کے لئے شہر کے مشہور ڈیزائنر سے ملا گیا ہے اور موجودہ عروسی لباس کے فیشن کے بارے میں بھی معلومات لی گئی ہیں۔ قیمت میں فرق مٹیریل اور اسٹیچنگ یعنی سلائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غیر معیاری کپڑا لے کر سستے مٹیریل سے کام کیا جاتا ہے۔ یعنی اصلی اسٹونز کی جگہ پلاسٹک کے اسٹونز اور غیر معیاری موتی، کندن دھاگہ وغیرہ لگایا جاتا ہے جس سے قیمت میں اچھا خاصا فرق آ جاتا ہے۔ گہری نگاہ رکھنے والے لباس ہاتھ میں لیتے ہی پرکھ لیتے ہیں لیکن جنہیں تجربہ نا ہو ان کے لے یہ ایک مسئلہ ہے۔ شادی اور ولیمے کی دو تقریبات ہوتی ہیں ۔ سرخ اور میرون رنگ صرف شادی کے لئے مناسب سمجھا جاتا ہے۔ ولیمے میں فوُن اور میرون دونوں ہو سکتے ہیں۔

آج کل پنک اور گرے، فُون اور انگوری ، فیروزی اور پیازی رنگ فیشن میں ہیں۔ کچھ دنوں پہلے تک سیلف جامہ وار کا کپڑا عروسی جوڑے کی تیاری میں استعمال ہو رہا تھا جو کہ اب فیشن سے بلکل آؤٹ ہے۔ موجودہ فیشن میں شفون کا کپڑا استعمال کیا جا رہا ہے۔ میں یہ شفون کے designer outlets غرارا اسٹائل بلکل ختم ہو گیا ہے۔ تمام شرارے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مرمیٹ اسٹائل اور کلیوں والا شرارا پہنا جا رہا ہے۔

red سرخ کے لباس کو مختلف بنانے کے لئے رنگوں کے امتزاج کا سہارا لیا جا رہا ہے۔
فیشن میں اس وقت سب سے زیادہ چل رہا ہے۔ دوپٹہ کے and bottle green
اندر چار پانچ ماربل کے ڈائی کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ لباس میں جدّت اور انوکھیت کا
عنصر نظر آئے۔
بناؤ سنگھار کا لفظ صنفِ نازک سے مشروط ہے۔ یہ صنف جب شادی جیسے خوبصورت
بندھن میں بندھنے کا تصور کرے تو خیالوں کے جھرونوں میں اس کا سنگھار اسے اس دنیا
کی سب سے خوبصورت اور مختلف لڑکی کی صورت میں گُدگدانے لگتا ہے۔ یہی خواہش
اس کے ذوق کو جھنجوڑتی ہے اور وہ اپنی شادی میں بہترین سے بہترین لباس زیب تن
کرنا چاہتی ہے۔
matching عروسی لباس کے ساتھ ساتھ چند سالوں سے میچنگ اسیسریز
کا رواج بڑھ گیا ہے جب کے پہلے صرف سنہری اور چاندی کے رنگ accessories
والا زیور، چوڑیاں پرس اور سینڈل پہنے جاتے تھے لیکن اب ان چیزوں کو لباس کی
مناسبت سے اعلیٰ فنی مہارت کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔
عروسی لباس کو ہماری ثقافت میں روزِ اول سے اہمیت حاصل ہے اور آج بھی اس کی
بناوٹ اور خریداری کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زمانہ کروٹ بدل

رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی کپڑوں کے ڈیزائنوں میں تبدیلی کے نت نئے روپ نظر
آرہے ہیں۔

## وائٹ گولڈ

عید الاضحیٰ آنے کو ہے۔ بڑی عید خوشی کا تہوار لیکن موجودہ حالات میں تو خوشی کی خبریں معلوم ہوتی ہے جیسے کسی کی میت پر آدمی لطیفہ سنا دے۔ کیا کیا جائے!
پاکستانی قوم جن مصائب کا شکار ہے اُس میں خوشی کی کوئی خبر سماعتوں میں گونجے! تو ڈر پہلے لگنا شروع ہو جاتا ہے کہ اے خدا آگے بھی بس خیریت ہی رکھنا۔
گھر سے باہر نکلتے ہی جا بجا قربانی کے جانوروں کی بھیڑ نظر آنے لگتی ہے۔ دیکھ کہ طبیعت خوش ہوئی کہ چلو کراچی جیسے شہر میں جہاں ہر دو دن بعد دہشت گردی کا خونخوار جانور دھاڑیں مارتا ہوا داخل ہوتا ہے اور ٹارگٹ کلنگ کے نوکیلے پنجوں سے معصوم عوام پر وار کرتا ہے وہاں قربانی کے یہ معصوم جانور آنکھوں کو بہت بھائے۔
مہنگائی کے اِس دور میں جانوروں کو گھاس پوس اور چارہ کھاتے دیکھ کر ذہن میں ایک عمدہ خیال گردش کرنے لگا کہ ہم بھی تیل، گھی، مصالحوں کے بغیر یوں ہی کچی سبزیاں کھا لیا کرتے تو آج مہنگائی کا رونا نہ روتے۔ لیکن کیا کیا جائے صاحب کہ اِس ڈیڑھ انچ کی زبان کے چٹخارے نے مار ڈالا۔

......یکایک ہماری زبان سے دیوداس کے ڈائیلاگ "ٹرانسلیٹ اِن ٹو مہنگائی" یوں نکلے
"مشرف نے کہا ٹماٹر کھانا چھوڑ دو"
"کائرہ نے کہا چینی کھانا چھوڑ دو"
"راجہ پرویز اشرف نے کہا بتی جلانا چھوڑ دو"
ڈر ہے کہ کہیں آگے یہ حکم نہ مل جائے کہ
" بچے پیدا کرنا چھوڑ دو"
بات بھی درست ہے نہ پاکستانی پیدا ہوں گے نہ وسائل کی کمی کا چرچہ ہوگا۔
اور جو حیات ہیں اُنھیں تو ویسے بھی مر جانا ہے۔ عوام کہتی ہے ہمارے پاس آگے بڑھنے
ہیں یہ الگ بات کے سارےoptions نہیں۔ ارے ایسا کیسے بھئی بہتoptions کے
!اَبدی سکون" یعنی مرنے کے لئے کھلے ہیں۔ پھر بحث کیسی"options
۔option مہنگائی سے مرنے کا
۔option خودکش بم دھماکوں سے مرنے کا
۔option ڈُرون حملوں سے مرنے کا
۔option خراب موسم میں ہوائی جہاز سے سفر کرکے مرنے کا

۔option ہمارگٹ کلنگ میں مرنے کا

پہ غور کر ہی رہے تھے کہ اچانک ٹیلی وژن پہ "بریکنگ نیوز" option ہم ابھی اپنے

لکھا آیا جسے دیکھتے ہی دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، پسینے آنا شروع ہو گئے۔ دماغ میں بتی

۔option اِن.بریکنگ نیوز کی وجہ سے 'ہارٹ اٹیک" کا option جلی..ایک اور

ہارٹ اٹیک کا سوچ ہی رہے تھے کہ آواز آئی "وائٹ گولڈ۔ یہ وہ بیل ہے جس کی قیمت

"فقط پچیس لاکھ ہے۔

ہم تو وائٹ گولڈ کا تصور نہیں کر سکتے تو وائٹ گولڈ پہ کیا کان دھرتے۔ لیکن پچیس لاکھ

کے بیل کی صدا" نے چشمہ لگا کر ٹیلی وژن کی اسکرین پہ توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔

جناب! بیل کیا تھا۔ بس اِس قبیل سے تعلق رکھنے والی عجب مخلوق کا تاثر دے رہا تھا چھ

فٹ کا خوبصورت سفید بیل۔

پر پچیس لاکھ! یہ بات کچھ معدے کے لئے ذود ہضم نہ تھی۔ مزید خبر پہ توجہ دی

گئی تو معلومات میں یوں اضافہ ہوا۔

یہ وہ بیل ہے جس کا نام اِس کے مالک نے وائٹ گولڈ رکھا ہے۔ یہ بیل یومیہ تین کلو" دودھ پیتا ہے۔ روٹی پسند نہیں البتہ ڈبل روٹی اور چارہ کھا لیتا ہے۔ خالص مکھن تو بہت ہی پسند ہے۔ جبکہ سب سے زیادہ ڈرائی فروٹ کا شوقین ہے۔"

مالک نے یومیہ خوراک کا تخمینہ "ہزار روپے" بتایا ساتھ ہی یہ بھی کہ "چھ آدمی اِس کے انڈر کام کرتے ہیں یعنی نوکر ہیں اِس بیل کے" جو اس کی دیکھ بھال کے لئے معمور کےے گئے ہیں۔ دل سے ایک آہ نکلی واہ رے بیل تیرے قسمت۔

دل سے جو آہ نکلتی ہے وہ اثر رکتی ہے
پَر نہیں لیکن طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ہماری آہ کا کیا اثر ہونا ہے نہ ہمارے پَر ہیں نہ پرواز کی طاقت کہ پیٹرول بہت مہنگا ہے۔ لیکن کہیں اندر ہی اندر جلن ضرور محسوس ہوئی۔ سنا تھا آدمی آدمی سے جلتا ہے۔ "یہاں تو آدمی بیل سے جلتا ہے" حد ہو گئی ہم بیل سے جلیں یہ ہمیں زیب نہیں دیتا۔ پر ذرا غور کیجے ے۔ ہمیں جلن کیوں کر نہ ہو اِس مہنگائی کے دور میں جہاں ہم فروٹ کی شکلیں بھول گئے ہی وہاں "ڈرائی" کا

سوال کیا۔ لیکن "واہ رے وائٹ گولڈ تیری قسمت"۔
ہمارے سامنے تو کوئی چلغوزے کا نام لے لے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا طعنہ دے دیا ہو۔ لیکن "واہ رے وائٹ گولڈ تیری قسمت"۔

گھی کے پراٹھے پرانی بات ہوئی۔۔برائے نام تیل والی روٹی جسے پراٹھا کہو تو پراٹھا بُرا مان جائے۔ دوسری طرف ڈبل روٹی اور دیسی مکھن "واہ رے وائٹ گولڈ تیری قسمت"۔

ہم تو خود کسی کے انڈر کام کرتے ہیں اور وہاں چھ آدمی نوکر "واہ رے وائٹ گولڈ تیری قسمت"۔

خدا سے شکوہ کیا کہ " کاش ہم وائٹ گولڈ ہوتے " اندر سے جواب آیا "پھر قربان بھی ہونا پڑتا" ہم نے پھر شکوہ کیا "بار بار مہنگائی کے ہاتھوں قربان ہونے سے بہتر ہے ایک بار ہی قربان ہو جائیں"۔ اندر سے پھر جواب آیا "یہ حالات بھی تمھاری بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ دیکھ لینا یہ بیل پچیس نہیں اپنے مالک کو تیس لاکھ دے کر جائیگا"۔

اُس لمحہ ہم نے خود سے سوال جواب کا سلسلہ ترک کر دیا۔ سچ میں ہم وہی عوام ہیں جو ملکی حالات سے اعصاب شکن ہو گئے ہیں۔ ہر کمی کوتاہی کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہراتے ہیں بحیثیت قوم اجتماعی طور پر کہاں کھڑے ہیں۔

بہت آسانی سے پچیس لاکھ کا بیل خرید لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بھئی خدا نے استطاعت دی ہے تو کیوں نہ قربانی کے لئے بہترین جانور خرید لیا جائے....!

تو جناب قربانی کے لئے اتنا مہنگا جانور خریدنے سے کئی درجہ بہتر عمل یہ ہے کہ کم مالیت کے جانور خرید کر قربانی کر لی جائے تاکہ بقیہ رقم کسی مسکین گھرانے کو بطور عطیہ دی جا سکے۔

جب ہم نے یہ خبر دیکھی کہ ایک ماں نے اپنے چار بچوں کو زہر دے کر خود بھی زہر کھالیا کیونکہ وہ بچے کا دودھ نہیں خرید سکتی تھی ماں تو جہانِ فانی کو خیر باد کہ گئی پیچھے چار بچوں کو موت اور زندگی کے بیچ جھولتے دکھایا گیا۔ ایک تین سالہ بچی کو آدھ کھلی آنکھوں میں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں دیکھا تو جی پھوٹ پھوٹ کے رونے کو چاہا۔ کہ اِس معصوم کو کیا پتا کہ اِس کی ماں

کتنی مجبور تھی جو اپنی ننھی گڑیا کو موت کے حوالے کر گئی۔

یہ بھی آپ کہیں گے کے حکومت کی غلطی ہے۔ ہم قربانی کے لئے مہنگے سے مہنگا جانور خرید سکتے ہیں تو کیا قربانی کا فریضہ سادگی سے ادا کرتے ہوئے کچھ رقم سے غریب و لاچار افراد کی کفالت نہیں کر سکتے؟ ہو سکتا ہے ہماری اس چھوٹی سی نیکی کی روش اختیار کرنے سے ہم لوگوں کے چہرے کی مسکراہٹیں لوٹا سکیں۔ ہم میں سے ہر ایک انفرادی طور پر ایثار، قربانی، محبت، اخوت اور دین کے اُصولوں سے کوسوں دور جا چکا ہے۔ پر اللہ رب العزت سے اُمید ہے کہ وہ ہمیں معاف فرمائے۔ اور اِس عید الاضحی پر ہم قربانی کی اصل روح کو سمجھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کریں۔

## وہ ایک روشن روایت کا بیج بو رہے ہیں

فضاء میں لاشوں کی بو بس گئی ہے۔ یہ اُڑتی دھول اور دھواں۔ طیارے بم برسا کر جا چکے ہیں، اب سناٹا ہے۔ ایک ماں رو رہی ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا جس نے مجھے ماں کے لفظ سے آشنا کیا، ہائے شہید ہو گیا ہے۔ تو کچھ دور ایک بوڑھا باپ آہ وزاری کر رہا ہے۔ وہ دیکھو! ایک غازی سر پہ صافہ باندھے کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ اپنے جسم کو زمین پر گھسیٹ رہا ہے۔ لیکن وہ مطمئن ہے کہ خدا نے اُسے غازی کے مرتبہ پر فائز کیا۔ پھر جسم کی معذوری کیا معنی۔ مگر یہ حوّا کی بیٹیاں کون ہیں؟ ان کے چہرے وحشت زدہ کیوں ہیں؟ یہ زندہ ہیں لیکن جسم مردہ کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی غازی کہلایا کوئی شہید۔ لیکن یہ شکستہ حال عورتیں! نہیں نہیں، عورتیں نہیں ان میں کچھ نابالغ لڑکیاں بھی ہیں۔ انہیں آخر کیا ہوا ہے جو یہ زندگی کی طرف نہیں لوٹتیں۔

شام میں بشارالاسد کی حکومت کے ظلم و بربریت نے قیامتِ صغریٰ برپا کر دی ہے۔ معصوم بچوں، بوڑھوں کسی کو نہ بخشا جارہا۔ یہ کیسا امتحان ہے کہ اپنی ہی زمین پر رہنے کا حق مانگتے یہ لوگ انصاف کے لیے پکارتے ہیں، مگر ظلم کو حق بہ جانب ہونے کی سند دے دی جاتی ہے۔ مسلم اُمہ بیانات تک محدود ہے۔ ایک

لمحے کے لیے کیا ہم تصوّر کر سکتے ہیں کہ کوئی فوجی جدید ہتھیار سے لیس ہمارے گھر میں داخل ہو اور نوجوانوں کو یرغمال بنالے، نو مولود بچوں کو آگ میں ڈال دے اور عورتوں کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنائے۔ نہیں ہر گز نہیں۔ میرا قلم یہ لکھتے ہوئے بھی انکاری ہے تو تصور کیسا، کہ روح کانپ جاتی ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے، جس کا سامنا آج شام کی عورتیں اور بچیاں کر رہی ہیں۔

دس ہزار سے زاید شامی پناہ گزین ترکی کے کیمپوں میں موجود ہیں، جہاں ہر دس میں سے تین خواتین کسی نہ کسی طور پر اس بربریت کا نشانہ بنی ہیں۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل اور اقوام متحدہ نے اس مسئلے پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق عصمت دری سے متاثرہ خواتین کی صحیح تعداد کا شمار ابھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے پناہ گزین کیمپوں میں موجود ڈاکٹرز، انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے کارکنوں اور زندہ بچ جانے والے گواہوں سے معلومات لی جارہی ہے تاکہ شام کی فوج کی طرف سے کی گئی اس جارحیت اور حملے کی رپورٹ تیار کی جاسکے۔

یہ سب پہلی دفعہ نہیں ہو رہا۔ جنگ کے دوران اپنے مخالفین کو مات دینے کے لیے خواتین کو نشانہ بنایا جاتا ہے، تاکہ کسی قوم کی عزت وقار کو پیروں تلے روند دیا جائے اور اُس میں دوبارہ کرنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا جائے۔ کیسی

عجیب جنگیں ہیں اور کیا انسانیت ہے کہ عورتوں کو جبراً جسمانی غلامی کا نشانہ بنایا جائے۔ جنسی تشدد جنگ کا ایک ہتھیار ہے جسے مدِمقابل کی ہمت توڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن شام کے نوجوانوں نے الاسد حکومت کے اس گھٹیا حملے کا جواب دیا ہے اور اُن عورتوں بچیوں کو اپنانے کا اعلان کیا ہے، جو اس گھناؤنے فعل کا نشانہ بنی ہیں۔

ایک نوجوان مصعب جانی ریاست میں موجود عصمت دری کی متاثرہ خواتین سے شادی کرنے کی حمایت کرتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے، "عزت اور وقار شام کے لیے سب سے زیادہ اہم ہیں، اور ہماری خواتین ہماری عزت ہیں۔ یہ بات مخالفین اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن لوگوں نے ہمارے ساتھ ایسا کیا ہے۔"

عام طور پر کسی بھی مرد کے لیے ایسی متاثرہ خواتین کو اپنانا نہایت مشکل ہوتا ہے، لیکن یہ نوجوان ایک ایسی روشن روایت کا بیج بو رہے ہیں، جو خصوصاً اُمت مسلمہ کے لیے ایک مثالی عمل ہے۔

32 سالہ بصام مصرے کہتا ہے، "میری خواہش ہے کہ میں ان متاثرہ لڑکیوں میں سے کسی سے شادی کرنے کا اعزاز حاصل کرلوں۔ میں اس اذیت سے تڑپ اٹھتا ہوں کہ شام کی عزت پر وار کیا گیا۔ لیکن اس وقت سوال ان معصوم لڑکیوں کے ساتھ کھڑے

"رہنے کا ہے۔

میڈیا کے مطابق ان لڑکیوں میں زیادہ تعداد 15 سال سے کم عمر بچوں کی ہے۔ ترکی کی سرحد کے قریب گاؤں میں مختلف مساجد میں اس سلسلے میں باقاعدہ وعظ دیے گئے ہیں اور یہ فتویٰ جاری کیا گیا ہے کہ "ہماری ہر بچی یا عورت جس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا ہے، سے شادی کرنا کسی نوجوان مرد کے لیے ایک اعزاز اور تمغے سے کم نہیں۔ آپ ان سے محبت کریں ان سے شادیاں کریں۔ یہ یقیناً انقلاب ہے۔ اپنی حدود کا خیال رکھیں تو خدا کی طرف سے ان نوجوانوں کو بہت اجر ملے گا۔"

میڈیا نے بہت کچھ دکھایا، مگر یہ خبر شاذونادر ہی شہ سرخیوں کا حصہ بنی کہ خواتین اور بچیاں شام کے تنازعے میں سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا گیا ہے۔

اقوام عالم نے شام کے مسئلے پر بیانات دیے۔ ظلم سے باز رہنے کی تنبیہ کی۔ افسوس کا اظہار کیا۔ لیکن یہ نوجوان عملی طور پر مؤذنِ صبح ٹھہرے جو واقعتاً خوشیوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ یہ وہی نوجوان ہیں جو غیرت کے نام پر قتل کر دیتے ہیں، لیکن آج جب اسد حکومت کے بُزدل فوجیوں نے اُن کی عزت پہ

وار کیا، تو اُنھوں نے اُسے اپنے لیے اختتام تصور کرنے کے بجائے نئی شروعات کی، سہارا دیا، زندگیاں بنائیں۔

یہ ایک امید ہے کہ ہم اس جہالت اور درد کے بعد پھر سے ایک دوسرے سے محبت کریں۔ شام میں جہاں درد ہے، خوف ہے، بچوں کی لاشیں ہیں تباہ شدہ مکانات ہیں۔ معذور مرد اور کتنے ہی ایسے خاندان ہیں جو سرپرستی سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہیں دوسری طرف مجھے ایک اُمید نظر آتی ہے، فتح دکھائی دیتی ہے۔

ایک نئی ریاست کا منظر نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ شام کے عوام کی انسانیت سے اُمید اب بھی باقی ہے۔ شام میں عصمت دری کے واقعات اور بڑے پیمانے پر قتل کے بعد بھی طلوع صبح ہو رہی ہے، کیوں کہ بسام مصرے اور مشب جانی جیسے مرد موجود ہیں۔ وہ اپنی قوم کی خواتین کے دکھ کو سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کے خلاف ہیں کہ جنگ کے دوران خواتین کی عصمت دری اور بچوں پر تشدد کیا جائے۔ یہ ایک نا قابل قبول اور بھیانک گناہ ہے۔

میری یہ تحریر پیغام ہے شام کی اُن عورتوں کے لیے، جنھوں نے قربانی دی۔ وہ عظیم ہیں اور عزت کے قابل ہیں۔

## ٹپوری اسٹائل

یار سن آج کاشان کے گھر چل کر نیٹ چلائیں۔۔۔ کیسا۔۔۔!
عدنان نے عاصم کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُسے متوجہ کیا۔
عاصم: رہنے دے یار تجھے یاد نہیں پچھلی دفعہ کیا ہوا تھا ہم ایک امریکن آنٹی سے چیٹنگ کر رہے تھے اور پیچھے سے کاشان کی باجی نے دیکھ لیا۔ جا کر خالہ سے وہ ایک کی دو لگائی تھی کے بابے خدا معافی! میں تو خود سوچنے پہ مجبور ہوگیا کہ ایسا میں کیا کر رہا تھا کہ خالہ نے وہ عزت کی رےٹرھ لگائی کے بھئیے نہ پوچھو۔
عدنان: ویسے یہ تو تُو ٹھیک کہہ رہا ہے یہ کاشان کی باجی ہے بہت فسادن عورت۔
عاصم: لڑکی بول لڑکی عورت بول دیا نہ تو قسم خدا کی گلی کے نکڑ سے وہ جوتی سر پہ آئے گی کہ بن داس۔
عدنان اور عاصم نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کے چار ہاتھوں سے تالی بجائی اور زور سے ہنستے ہوئے ایک ساتھ بولے پر ہٹا یار۔۔بم پھاڑ"
عدنان اور عاصم ایسا عموماً اُس وقت کرتے تھے جب وہ اپنی بے فکری کے لمحات دوستی کے سکون سے پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہوں یا یوں کہیے کہ "ہٹا یار۔بم

پھاڑ"اِن دونوں کی دوستی کا سلوگن تھا۔

عاصم نے فوراً ہی جیب سے ایک مین پوری کا پیکٹ نکالا اور عدنان کی طرف اُچھال دیا عدنان نے پیکٹ کیچ تو کرلیا لیکن پھر غور سے پیکٹ کے آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ عدنان کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر عاصم سے رہا نہ گیا وہ جھنجھلا کے بول اُٹھا۔

"ابے کھا نہ، دیکھ کیا رہا ہے۔"

عدنان: تو جانتا ہے یہ زہر ہے۔ نشہ ہے اس میں۔تو نے نوٹ نہیں کیا ہم اتنے دنوں سے اسے کھا رہے ہیں اس کی طلب بڑھتی جارہی ہے۔ میٹرک کے بورڈ کے امتحان قریب ہیں اور ہم نجانے کن تفریحوں میں پڑے ہیں۔

عاصم: ابے چھوڑ امتحان کو۔ امتحان میں اچھے نمبر لے بھی لے تو کیا ہوگا تو کون سا منسٹر لگ جائے گا اور سن ہمارے گھر والوں کو کون سی فکر ہوتی ہے اپنی۔پاس ہو گئے تو ہو گئے نہیں ہوئے تب بھی نہیں پوچھیں گے۔ وہ تو ہم ہی اتنے قابل ہیں کہ ایک رات پڑھ کر ہی امتحان پاس کر جاتے ہیں۔

عاصم نے اپنی ایک آئی برو اُٹھا کر عدنان کو دیکھتے ہوئے اپنی قابلیت جتائی۔

!کیسا۔۔۔

عدنان: ہاں یار ویسے یہ تو ہے اگر ہم پڑھ لیں تو ہاپ کر جائیں گے ایمان سے۔

عدنان گلی کے کونے والے گھر کے چبوترے پہ ٹیک لگاتے ہوئے بولا وہ قدرے سنجیدہ تھا۔

چل عاصم مان لیا ہمارے گھر والوں نے ہم سے کبھی پاس ہونے نہ ہونے پر سوال نہیں" کیا۔ لیکن ہماری اپنے ملک کی کی طرف سے بھی تو یہ ذمہ داری ہے۔ ذرا سوچ آج ہم اچھا پڑھ لیں گے۔ ملک کا نام روشن کریں گے۔ آگے جائیں گے اور پڑھنے کا جی چاہنے لگے گا۔ ایک دفعہ کی عزت کے بعد ہمارے اندر کتنا جذبہ ہو گا آگے بڑھنے کا۔ ذرا سوچ بے دوسرے ملکوں میں ہماری وجہ سے ہمارے ملک کا نام روشن ہو گا۔

عاصم: ابے ہٹا کون سا ملک۔ سیاست میں ٹی وی پر آکر اپنے رنچھوڑ لائن والے سبزی والے اور خالہ جان کے بیچ ہونے والی لڑائی کی طرح تُو تُو میں میں کر رہے ہوتے ہیں۔ اب تو میری اماں نے انڈیا کے ڈرامے چھوڑ دئے چینل بدلو تو

ہمارے رہنما ایسی دھاسو لڑائی کر رہے ہوتے ہیں کہ اماں کو ڈرامہ اور معلومات دونوں مل جاتیں ہیں۔ تو ملک کی بات کرتا ہے۔

عدنان بڑے انہماک سے عاصم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کی باتیں سننے میں محو تھا۔

عدنان: یار تیرا دماغ بھی کیا اُدھم ایٹم ہے۔

عاصم: لے اور سن اپنی تو ہسٹری میں ہی مسئلہ ہے۔ میزائل بنائے ہم نے نام کیا رکھے۔ غوری میزائل، غزنوی میزائل، سب افغانی نام۔ میں اگر اس ملک کو چلا رہا ہوتا نہ تو بیٹا ایسا چلاتا اور نام رکھتا۔ گجر میزائل، بنگش میزائل، سندھی میزائل، بلوچی میزائل، پنجاب میزائل۔ پختون میزائل اور اور بہت سے زبانوں پہ نام تاکہ یہ فساد تو نہ ہوتے جو ابھی ہو رہے ہیں۔ اور سب چھوڑ کیا آیا دماغ میں اردو میزائل۔ سارے مسائل کا حل۔ اتحاد کا اتحاد سب مل کہ رہتے ایک دم چکاس۔ زبانوں کے نسلوں کے فساد ہی ختم۔

عدنان: بات تو تیری دل کو لگتی ہے لیکن عاصم ہم کس زبان کی بات کرتے ہیں۔ تو اور میں جو زبان بول رہے ہیں کیا یہ اردو زبان ہے۔

عاصم: ابے ڈھکن اردو نہیں تو فارسی میں بات کر رہے ہیں ہم۔

عدنان: یہ چکاس، بن داس، اَبے، اُدھم، کَش، بابے، ابے لے، مطلب کے بغیر اور دماغ کی دہی۔ کیا یہ اُردو زبان کے لفظ ہیں۔

اِس بار عاصم خاموش تھا اور عدنان بول رہا تھا۔

عدنان: کیا ہم نے کبھی اپنے ٹیچرز کے سامنے اِس زبان میں بات کی ہے؟ نہیں نا۔ کیا ہم اپنے گھر والوں کے سامنے اِس زبان میں بات کرتے ہیں، نہیں۔ تو ہم اتنے قریبی دوست ہیں ایک دوسرے سے کیوں اس خود ساختہ زبان میں بات کر رہے ہیں۔ میری امّی ہمیشہ کہتی ہیں کہ بیٹا انسان اپنی اِس ڈیڑھ انچ کی زبان سے جانا جاتا ہے۔

عاصم: یار بھاشن تو تیرا دھاسو ہے۔

عدنان: عاصم پھر تو نے۔۔۔

عاصم: اچھا اچھا اب نہیں۔

عدنان: ہم ہر وقت اپنے بڑوں کو کوستے رہتے ہیں۔ لیکن اپنا آپ تو ہم خود ہی بگاڑ رہے ہیں۔ ہر بچہ جانتا ہے کہ ملک کے حالات سیاست دانوں کے ہاتھوں خراب ہو رہے ہیں لیکن ملک تو تیرا بھی ہے ملک تو میرا بھی ہے۔ ہمارے اوپر اپنے طور سے بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ہم ابھی سولہ سال کے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تو محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا تھا۔ ہم سب صرف اگر اپنی زبان کلام، اُٹھنے بیٹھنے بری عادتوں پہ تھوڑا سا قابو پالیں گے تو ہمیں ہی فائدہ ہوگا۔ سب کو فائدہ ہوگا۔ اپنا کل سدھرے گا۔
یہ کہہ کر عدنان خاموش ہو گیا آدھے گھنٹے دونوں یوں ہی خاموش ہوا میں تکتے رہے کہ اچانک اللہ اکبر کی صدا نے دونوں کو چونکا دیا۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ کھڑے ہوئے اپنے کپڑے جھاڑے، گرم جوشی سے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا جیسے کسی نئی زندگی کے آغاز کی تیاری میں ہوں۔ اور یہ کلامات زبان پہ تھے۔
اچھا میرے بھائی میں اب چلتا ہوں مجھے والد صاحب کے ساتھ نماز ادا کرنی ہے آپ "کہاں جائے ے گا؟"

جی جی ضرور آپ جایئے۔ مجھے گھر پہ توجہ دینی ہے والدہ صاحبہ نے کچھ کام کہا تھا میں"

"گھر میں ہی نماز مغرب پڑھو گا۔

"جی ٹھیک ہے خدا حافظ"

"فی امان اللہ"

اور دونوں مختلف سمتوں میں اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔

## اچھا سوچیے ---- اچھا کہیے

تنقید اور دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھنا دلوں میں فاصلے پیدا کرتا ہے
مہمانوں کے سامنے بہو کے کھانا رکھنے پر ساس صاحبہ کو کچھ کمی محسوس ہوئی جس پر انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا "کھانا رکھنے کا صحیح ڈھنگ یہ نہیں اِسے یوں پیش کیا جاتا ہے۔" مہمانوں کے سامنے اس براہ راست تنقید سے ماحول کا رنگ ایک دم بدل گیا، اور بہو بیگم نگاہیں چراتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ اس کے بعد ساس صاحبہ نے گھر کی فضا میں ایک بگاڑ سا محسوس کیا۔ لہٰذا انہوں نے بہو کی اچھائیوں اور روشن پہلوؤ ں کو تلاش کرنا شروع کیا، تو بہو بھی ان کی گرویدہ ہونے لگی۔ دراصل لب ولہجہ تبدیل ہو تو بات کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے یوں بہو نے رفتہ فتہ اپنی کمزوریوں اور عیوب کا اعتراف کر لیا اور اُن کو سدھارنے کی سعی کی۔
خواتین کی سخت زبان اور تنقیدی رویہ ہمیشہ ہی موضوع بحث رہا ہے۔ ساس کی بہو پر، نند کی بھاوج پر اور دیورانی کی جٹھانی پر تنقید کا سلسلہ کوئی نیا نہیں۔ خاندان بھر کی خواتین ایک دوسرے کی خامیوں پر کڑی نگاہ جمائے موقع کے

انتظار میں ہوتی ہیں۔ سر کے بال سے پیر کی جوتی تک گھر کی سجاوٹ سے لے کے برتنوں کے انتخاب تک تمام ظاہری اور باطنی پہلو تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ دراصل دوسروں کو تنقید کا نشانہ اُس وقت بنایا جاتا ہے جب انسان اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہو، یہی وجہ ہے کہ بعض تنقیدیں فقط گمان ہی کا شاخسانہ ہوتی ہیں۔

خواتین کی یہ تنقید مختلف رشتوں میں گمبھیر مسائل پیدا کرتی ہے اور مشترکہ خاندانی نظام کے لیے تو یہ ایک زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر وقت دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھی جائے تو گھر کے ماحول پر اِس کا اثر پڑتا ہے اور ایک تناؤ کی فضا قائم ہو جاتی ہے نتیجتاً نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے مرد حضرات دلوں کے فاصلوں میں حصے دار بن جاتے ہیں۔

اگر ہم یہ سوچ کر کسی پر تنقید کرتے ہیں کہ اس طرح ہم براہ راست اس میں بہتری پیدا کر سکیں گے تو یاد رکھیں ایسا ہر بار ممکن نہیں، جیسے آپ کو کسی خاتون کے لباس پر اعتراض ہے اور آپ اس لباس کی خامیاں بتا کر اسے درست کرنا چاہیں تو یہ خاصا مشکل امر ہوگا۔ ایک مشہور گجراتی کہاوت ہے کہ "اندھے کو اندھا نہ کہو بلکہ دھیرے سے پوچھو کہ اے بھائی تمھاری آنکھیں کیسے گئیں؟" بالکل اسی طرح بات کے لہجے اور انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے

جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گلاب ہیں
لہجے کے فرق سے انہیں تلوار مت بنا

رشتے کی نوعیت چاہے کچھ بھی ہو محض دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھی جائے تو دلوں میں فرق پیدا ہو جاتے ہیں۔ رویوں میں ذرا سی تبدیلی سارے معاملات کو سدھار سکتی ہے۔ یہ کچھ مشکل نہیں اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ اس کی ذات میں بہت سی خوبیاں ہیں اور چند کی نشاندہی کر دی جائے تو مخاطب جھٹ سے اس بات کا اعتراف کرے گا کہ نہیں اس میں فلاں خامی بھی ہے، لیکن بد قسمتی سے اس مثبت رویے کے بجائے ہر کوئی ناقدانہ انداز اپناتا ہے۔

معاشرے میں فقط خامیوں اور کمزوریوں پر نگاہ رکھی جائے تو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ناپسندیدگی کا گمان ہوتا ہے۔ بات خواہ چار دیواری کی ہو، خاندان کی یا ملازمت اور دفتری ماحول کی۔ ہم میں سے بہت سارے لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی کی تعریف اِس کے سامنے نہیں کرنی چاہیے۔ درحقیقت اگر کسی کے عمل کو پسند کرتے ہوئے سراہا جائے، کسی کے عاجزانہ مزاج سے متاثر ہو کر یہ کہا جائے کہ اُن کا یہ روّیہ انتہائی متاثر کن اور قابل قدر ہے، تو یہ چیزیں ایک طرح کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہےں۔ جو دوسروں کو اچھائیوں پر قائم رہنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں بلکہ انہیں مزید اچھے

روّیوں اور اچھی عادات اپنانے میں بھی معاونت کرتی ہیں۔

اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہر شخص اور ہر جگہ صرف اچھائیاں اور خوبیاں ہی ہوتی ہیں اور برائیاں نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ لوگوں اور ماحول میں موجود خامیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے اور انہیں دور کرنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ مقصود فقط اتنا ہے کہ بات کا انداز بدل دیا جائے تاکہ مزاج میں تلخی اور ماحول میں تناؤ پیدا کیے بغیر اصلاح کی جاسکے۔

اچھا سوچنا اور اچھائی پر نظر رکھنا ہمارے مزاج میں بھی ایک مسرور کن احساس پیدا کرتا ہے۔ اپنے اندر اور باہر کے ماحول کو بہتر کرنے کے لیے ضروری ہے کے ہر چیز کے روشن پہلوؤں کو اہمیت دی جائے اور لوگوں پر تنقیدی نگاہ رکھنے کے بجائے ان کے اچھے روّیوں کو سراہا جائے اور ان کی تعریف کی جائے۔ خوش کلامی اختیار کی جائے۔ جب کوئی چیز خامیوں سے پاک نہیں، پھر تنقید کس کام کی۔

اگر دوسروں کی اچھائیوں پر نظر رکھی جائے تو خامیاں خود بہ خود چھپ جاتی ہیں۔

دراصل ہمارے مزاج پر جب تنقیدی سوچ کا غلبہ ہو جاتا ہے تو ہم شاید پہلے سے یہ طے کر بیٹھتے ہیں کہ سامنے والا خواہ کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو

ہم نے اس کی تعریف سے پہلے اس کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا ہے۔ ایسے میں ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ بعض اوقات سامنے والا کس قدر تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر وہ ظاہر بھی نہ کرے تو اسے قلبی طور پر شدید ضرب لگتی ہے جب کہ اگر ہم کسی کم تعریف کے مستحق فرد کو بھی پہلے سراہیں تو یقیناً اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور اس کے دل میں ہمارے لیے جگہ بن جائے گی۔ تعریف اور حوصلہ افزائی کے بعد اگر ہم نرم الفاظ میں اس کی خامیاں بھی بتائیں گے تو وہ یقیناً اسے توجہ سے بھی سنے گا اور پھر انہیں دور کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ دوسری طرف ہمارا حلقہ احباب وسیع ہونے کے ساتھ لوگوں پر ہماری شخصیت کا اچھا تاثر بھی پڑے گا۔

☆دوسروں کو تنقید کا نشانہ اُس وقت بنایا جاتا ہے جب انسان اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہو، یہی وجہ ہے کہ بعض تنقیدیں فقط گمان ہی کا شاخسانہ ہوتی ہیں☆خواتین کی یہ تنقید مختلف رشتوں میں گمبھیر مسائل پیدا کرتی ہے اور مشترکہ خاندانی نظام کے لیے تو یہ ایک زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے ☆ہر وقت دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھی جائے تو گھر کے ماحول پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ایک تناؤ کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

# کیوں وہ تشدد پر اتر آئی ہیں؟

گہرا گلابی رنگ کی ساڑھیاں پہنے بہت ساری عورتیں مجمعے کی صورت میں سروں پہ پلو ٹکائے کوئی خاص تربیت حاصل کرنے کے مشن پر ہیں۔ نہ کسی عورت کے ہاتھ میں دیا سلائی، نہ کپڑا، نہ برتن نہ جھاڑو، اور کتاب اُس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بل کہ ان سب کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بانس نما ڈنڈے ہیں۔ گھیرے کے بیچوں بیچ دو عورتیں ڈنڈا چلانے کی تربیت دینے میں مصروف ہے۔ ان میں سے ایک، جو اُن عورتوں کی سربراہ معلوم ہوتی تھی، نہایت برق رفتاری سے اور مہارت کے ساتھ ڈنڈے کے داؤ پیچ یوں دوسری عورت کو سکھا رہی ہے جیسے اس چین سے کنگ فو کی خاص مہارت حاصل کی ہو۔ یہ بھارت کی ریاست اُترپردیش کا ایک گاؤں ہے، جہاں یہ "سربراہ عورت" جسے سب سمپت دیوی کے نام سے جانتے ہیں، مظلوم عورتوں کو اپنے تحفظ کے لیے تربیت دے رہی ہے، تاکہ یہ عورتیں اپنے اوپر ڈھائے جانے مظالم سے چھٹکارے کے لیے اب کسی کی محتاج نہ رہیں۔ کتنی مُنَظَّم ہیں یہ خواتین۔ کیا ان کو دیکھ کہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ پڑھی لکھی نہیں، حالاں کہ عورت کی پڑھائی کا تصور اب بھی ان کے گاؤں میں معیوب ہے۔ وقت اور حالات کی سختی نے ان عورتوں کے چہرے سے صنفِ نازک کی نازکی ختم کر دی ہے۔ کیا روپ دار چہرہ ہے اُس سربراہ عورت کا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ خواتین دور دراز سے سمپت

پال کے ساتھ آکر ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مختلف این جی اوز ان سے رابطہ کرتی ہیں اور ایک گاؤں میں بنیاد پانے والا یہ گروپ دو سال بعد اپنی پہچان بناتے ہوئے گلابی گینگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بھارت میں مظلوم عورتوں کے تحفظ کے لیے سرگرم ڈنڈا بردار خواتین کا گلابی گینگ 2006 میں سمپت پال دیوی نے تشکیل دیا، جس کی وجہ بڑے پیمانے پر خواتین پر کیا جانے والا گھریلو تشدد تھا۔ گروپ کی خواتین گلابی ساڑھی پہنے ہاتھ میں ڈنڈا اُٹھائے اپنی ریاست کی خواتین کے لیے سرگرم رہتی ہیں۔ یہ عورتوں پر ہونے والے ظلم اور دیگر مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ گلابی گینگ میں 22 سے 50 سال تک کی خواتین شامل ہیں، جو مظلوم عورت کی آواز پر ذات پات کی تفریق کے بغیر لبیک کہتی ہیں اور ظلم کو مٹانے کے لیے حرکت میں آجاتی ہیں، جس کے لیے انہیں خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ گلابی گینگ کی خواتین نے گذشتہ کئی سالوں سے انصاف کی جنگ لڑتے ہوئے بھارت میں اور ملک سے باہر بھی نام روشن کیا ہے۔جب ریاست اپنے عوام کو تحفظ دینے میں ناکام ہو جائے، تو گلابی گینگ جیسے گروپ منظر عام پر آتے ہیں۔ لیکن گلابی گینگ کی یہ خصوصیت ہے کہ اسے درپردہ حکومتی حمایت حاصل ہے۔ یہ گروہ نہایت منظم طریقے سے کام کر رہا ہے اور اب تک دس ہزار خواتین اس کا حصہ بن چکی ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود چند سوالات ہیں جو ذہن میں پیوست ہوئے جاتے ہیں۔ عورت معاشرے میں تہذیبی اقتدار کی امین ہے۔ پھر ایسا کیا ہوتا ہے کہ معاشرے کی تہذیب کو بالائے طاق رکھے یہ عورتیں تشدد پر آمادہ

ہیں؟ ہم پاکستانی معاشرے کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس حوالے سے صورت حال نہایت ابتر نظر آتی ہے۔ آج بھی کاروکاری غیرت کے نام پر قتل، حق بخشوانے، ونی اور وٹہ سٹہ جیسی رسومات جاری ہیں۔ بہت سے علاقوں میں لڑکیوں کے لیے تعلیمی سہولیات تقریباً ناپید ہیں اور بعض علاقوں میں موجود لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہی نہیں۔ شہری زندگی کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں۔ شہروں میں بھی ایک طبقہ یہی زاویہ نگاہ رکھتا ہے۔ تعلیم لڑکی کو دلوائی جاتی ہے تو صرف اس حد تک کے وہ "پڑھ لکھ" سکے، جب کہ اس کے شعوری طور پر عملی زندگی میں قدم رکھنے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی، جو بہر حال ساری زندگی اس کے لیے مسائل پیدا کرتی ہے۔ عورت کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے جیسے وہ شوہر یا باپ کی ملکیت ہو۔ بیٹی کے طور پر وہ اپنے باپ کی ملکیت ہوتی ہے اور وہ جس سے چاہے اپنی بیٹی کی شادی کر سکتا ہے اور شادی کے بعد اس کی زندگی پر مکمل طور پر شوہر کی اجارہ داری ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں باپ پیسے کے عوض اپنی بیٹی فروخت کر دیتا ہے اور بعض جگہ اسے نام نہاد رسومات کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ لڑکی کو خرید کر شادی کرنے والا شادی کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ وہ جب چاہے اپنی بیوی سے ہر طرح کی کام مشقت لے سکتا ہے۔ یہ تصورات عورت کو ہی نہیں پورے معاشرے کو نقصان پہنچا رہے ہیں، جس کے رفتہ رفتہ خطرناک نتائج حالیہ چند سالوں میں دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہیں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ کہیں بااثر افراد نے ان کے پیچھے

کتے چھڑوا دیے۔ کہیں سرعام کوڑے مارے گئے اور فخر سے سینہ تان کر اسے اپنی غیرت اور پشتوں سے چلی آنے والی روایت کا نام دیا گیا۔ یہ انتہائی ظلم اور انصاف کے تقاضوں کے قطعی برعکس ہے۔ ملک بھر میں اس وقت 14000 چودہ ہزار این جی اوز مختلف مقاصد کے لیے کام کر رہی ہیں، لیکن تبدیلی کی کوئی خاطر خواہ صورت نظر نہیں آتی۔ قوانین بے تحاشہ بنا دیے گئے، لیکن عمل درآمد نہ کروایا جاسکا۔ قوانین کی کی پاسداری نہ ہونے کی وجہ سے ہی یہ عالم ہے کہ ہمارا معاشرہ حد درجہ تشدد پسندانہ روش اختیار کر چکا ہے، جس کا مظاہرہ احتجاج کے موقع پر ہوتا رہتا ہے۔ لوگ مختلف معاملات پر احتجاج کرنے نکلتے ہیں تو غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ کیا یہ غم و غصہ منظم طریقے سے معاشرے کی بہتری کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ گلابی گینگ کی چند سو عورتیں جو رفتہ رفتہ منظم ہوتے ہوئے ایک بڑی طاقت بن کر سامنے آئیں اور معاشرے میں بہتری پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ کیا ہم بھی اسی منظم طریقے سے احتجاج نہیں کر سکتے۔ تشدد کی حمایت کسی بھی طور پر نہیں کی جاسکتی۔ نہ ایسے گروپس کو سراہا جاسکتا ہے جو قانون ہاتھ میں لیں۔ لیکن حکومت کے ساتھ مل کر قوانین کی پاسداری اور معاشرے میں بڑھتے منفی رجحانات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح گھریلو تشدد، زبردستی کی شادیوں، جہیز کے مطالبات اور خواتین کو ہراساں کرنے کے واقعات کی روک تھام کے ساتھ عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں طور پر روزگار اور قرضوں کی فراہمی کو ممکن بنایا

جاسکتا ہے۔ معاشرے میں بہتری کا جذبہ رکھنے والوں کو مُنتظم ہو کر ایسے اقدام کرنے کی ضرورت ہے جس کے دور رس نتائج برآمد ہوں۔ اپنی زندگی کے نصب العین اور مقاصد کا واضح تصور رکھنا انسانیت کا تقاضہ ہے اور کھوئی ہوئی انسانیت کی تلاش ہم سب کا فرض۔

## لوگ ہار رہے ہیں

موسم کے بدلتے ہی اسپتالوں میں مریضوں کا تانتا بندھ گیا۔ کوریڈور میں داخل ہوتے ہی اس غیر معمولی رش پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ لیکن چند قدم آگے بڑھنے کے بعد منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک او پی ڈی سیکشن کے ہال پر میری نگاہ مرکوز ہو گئی۔ وہاں بہت سارے لوگ اپنی باری کے انتظار میں تھے۔ میرے لیے یہ بات حیرت انگیز اس لیے تھی کہ اس او پی ڈی سیکشن کے باہر ایک بڑا سا بورڈ شعبہ نفسیاتی امراض کا لگا ہوا تھا۔ اس ہسپتال میں برسوں سے آنا جانا ہے، لیکن اس سال یہ پہلا چکر تھا۔ میرے لیے یہ بات آج اہمیت کی حامل اس لیے تھی کہ شعبہ نفسیاتی امراض اوپی ڈی میں اس سے پہلے جب نگاہ پڑتی بمشکل گنتی کے افراد نظر آتے۔ ہال میں موجود پنکھے کی آواز اور باہر کا شور ہی شاید اس ہال میں کسی کے ہونے کا گمان دیتا۔

لیکن آج اس جگہ تقریباً 150 افراد موجود تھے۔ جو نہایت تشویش ناک بات تھی۔

ذہن کے کسی گوشے میں خطرے نے نقب لگائی اور ایک نیا سوال جنم پایا۔

کیا ہمارے ملک میں ذہنی امراض وبائی امراض کے مقابلے میں دُگنی رفتار سے عوام الناس کو دبوچ رہے ہیں۔ یہ یقیناً لمحہ فکریہ ہے۔ گذشتہ پانچ برسوں کے

دوران نفسیاتی امراض کی شرح میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ اگر کراچی جیسے بڑے شہر کی بات کی جائے تو تقریباً ایک کروڑ افراد مختلف نفسیاتی بیماریوں، ڈپریشن، بے چینی (انزائٹی) اور ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔

شہر میں جاری کشیدگی، ہدفی قتل، قتل و غارت، دہشت گردی اور بڑھتی ہوئی رہزنی کی وارداتوں کے باعث کراچی کی 50 پچاس فیصد آبادی مختلف نفسیاتی امراض کا شکار ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی معاشی فرق یا تفریق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر پہ چڑھ کر بولتے الیکٹرانک میڈیا کے سحر نے خواہشات کی پیاس سے ہر شخص کو ہوس زدہ کر دیا ہے۔ وسائل کی کمی اور مسائل کی زیادتی۔ ہر شخص مصروف ہے ہر کوئی اپنی جنگ کے محاذ پہ تنہا سپاہی۔ لیکن یہ جنگ بھی عجیب ہے، جس میں فرد واحد آپ ہی اپنی ذات کو نشانہ بناتا ہے اور بس بھاگتے رہنا چاہتا ہے۔

انسانی حقوق کی کمیشن کی رپورٹ 2011 کے مطابق موجودہ پاکستان کی آبادی کے 34 فیصد لوگ کسی نہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔ لیکن ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ صرف کراچی کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے یہاں اس مرض کی شرح 34 فیصد سے زائد ہے۔ جہاں شہر میں جاری لسانی وفرقہ وارنہ فسادات نے اس بیماری کے جانور کی پرورش کی وہیں بجلی کا بحران اس کی پرورش میں مدد دیتا رہا ہے۔

ڈیلی ویجز پر کام کرنے والے لاکھوں مزدور توانائی کے بحران کے باعث بند فیکٹریوں کی وجہ سے بے روزگار ہوئے۔ تو کہیں آئے دن کی ٹارگٹ کلنگ کی وجہ سے شہری زندگی مفلوج ہو گئی۔ کبھی کسی سیاسی جماعت نے ہڑتال کی کال دی تو کبھی کوئی علاقہ بند کروانے کے لیے اپنے چیلوں کو دندناتا چھوڑ گیا۔ "بند کرو بند کرو" کی آوازیں آئیں۔ ایسے میں کوئی کیا کمائے گا اور کیسے اپنے خاندان کی کفالت کر سکے گا۔ ایسے میں لوگ ہمت ہار رہے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔

عالمی بینک کی گذشتہ برس کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ذہنی امراض والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق 1990 سے 1994 کے دوران عوام میں ذہنی امراض ہونے کی تعداد بہت کم تھی۔ 15 پندرہ سال یا اس سے زائد کے افراد میں یہ شرح 17.9 تھی، جب کہ ناخاندہ افراد کے مقابلے میں خواندہ افراد میں ہائپر ٹینشن کی شرح 20 فیصد سے کم تھی۔

2004 میں کراچی کے 40 سال یا اس سے زائد عمر کے افراد میں نفسیاتی امراض کی تعداد میں 40 فیصد تک اضافہ ہوا ہے، جو نہایت سنگین صورت حال ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ عوام امن و اماں کی خراب صورت حال کے باعث تفریحی مقامات کا رُخ نہیں کر رہے۔ حبس زدہ ماحول میں ایک عام فرد کے لئے یہ صورتحال قطرہ قطرہ

زہر کی صورت اثر انداز ہوتی ہے اور نتیجتاً ایک عام فرد ڈپریشن کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ مرض غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ متاثرہ فرد خود اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ابتدائی کیفیات میں مایوسی، اُداسی، غم کا شدید احساس، اضطراب، بے چینی یا خلل کی کیفیت، بے خوابی یا نیند کی زیادتی، بھوک کی کمی یا زیادتی، وزن میں اُتارچڑھاؤ، موت وہلاکت کے تخیلات اور خود کشی کے تصور کا ذہن میں پایا جانا قابلِ ذکر ہےں۔

سول اسپتال کراچی اور جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر (جے، پی، ایم، سی) کی او پی ڈیز میں روزانہ 120 سے 150 مختلف نفسیاتی عوارض میں مبتلا لوگ علاج کی غرض سے آتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق ذہنی بیماریوں بشمول ڈپریشن میں مبتلا مریضوں کی تعداد میں حالیہ دنوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے لوگوں کے مزاج میں غصہ چڑچڑا پن رچ بس گیا ہے، جس کی وجہ اطراف کا ماحول ہے۔ اس کی ایک وجہ ذرائع ابلاغ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا پر دکھائے جانے والے تشدد کے واقعات کی ڈراموں کی صورت میں منظر کشی ہے، جس کے باعث ایک عام فرد خود کو اس صورت حال میں رکھ کر سوچنا شروع کردیتا ہے۔ یوں ایک انجانا خوف اس کے نفس پر حاوی ہونے لگتا ہے۔ لوگ post stress disorder میں مبتلا ہو کر بے چینی اور تشدد کا شکار نہ ہوں تو بھی خوف کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں۔

کی کیفیتpanic attack اس طرح جھوٹی افواہیں معمولی خبریں ہمیں ہراساں کرکے میں مبتلا کر دیتی ہےں۔ ایسے میں بظاہر ایک انسان نارمل نظر آتا ہے، لیکن اضطراب کی کیفیت رہتی ہے۔ یہ مرض غائب دماغی سے شروع ہوتا ہے۔ متاثرہ (Anxiety) فرد زیادہ تر شدید غصے اور اضطراب کی حالت میں مستقل لڑنے جھگڑنے لگتا ہے، چوں کہ اس مرض سے آگاہی اور شعور ہمارے معاشرے میں نہ ہونے کے برابر ہے، چناں چہ متاثرہ فرد کی ذہنی کیفیت اور اُلجھن کو سمجھنے کی بجائے اُسے مزید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ مرض شدت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ مرض موروثی بھی ہو سکتا ہے، جب کہ انسانی جسم میں موجود مختلف کیمیکل تبدیلیاں بھی اس کا سبب بنتی ہیں۔ اس مرض میں مبتلا فرد بعض اوقات خود سوزی کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات اس کیفیت میں اپنے اطراف کے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

اس کی چند مثالیں کچھ عرصے سے ہم اپنے معاشرے میں دیکھ رہے ہیں۔ معمولی نوعیت کی ناچاقی کی بنیاد پر قتل جیسا انتہائی سنگین قدم اُٹھانا۔ اولاد کا ماں باپ کو مار دینا۔ معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دینا۔ ایک ماں کا اپنے بچوں کو پانی کے ٹینک میں پھینک کر خود بے ہوش ہو جانا۔ قبرستان میں خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی کرنا۔ یہ تمام واقعات انتہائی افسوس ناک مگر تلخ حقیقت ہیں جو ہمارے معاشرے کی بدحالی کا ثبوت ہے۔ معاشرہ

جس روش پہ چل رہا ہے، اس میں بیمار ذہنوں کی پیداوار ایک لازمی امر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آگاہی دی جائے اور اسباب تلاش کیے جائیں، تاکہ نفسیاتی امراض کے شکار افراد کو بروقت سمجھ کر ابتدا ہی میں علاج کیا جاسکے۔

ہم چاہیں تو اب بھی اپنے گھر اور معاشرے کو اس صورت حال سے نکال سکتے ہیں۔ صرف اپنی ذمے داری محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ ایک ہی خاندان کے افراد بھی کئی کئی دن تک ایک دوسرے کے حالات سے ناواقف رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل میں عدم دل چسپی، معاشی فکر اور آگے بڑھنے کی جستجو میں ہم ایک دوسرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہر شخص مصروف ہے مصروفیت میں کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے ہی گھر کا کوئی فرد تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ اسے راستہ سجھائی نہیں دے رہا یا اس کا رویہ ویسا نہیں رہا جیسا وہ تھا۔ اگر ایسا ہے تو ایسے فرد کے قریب جاکر اس کے مسائل اور بے چینی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر ضروری ہو تو معالج سے رجوع کرکے مناسب طریقہ علاج پر توجہ دی جائے۔

کاش ہمارے حکمراں اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھ سکیں، کیوں کہ حکومتی

پالیسیاں اور امن و امان کی صورت حال براہ راست ذہنوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ اس معاملے میں درست سمت کا تعین نہ کرنا اور اس مسئلے کے تدارک میں غفلت جرم ہے۔

# بچوں میں نافرمانی کا رجحان اور سدِباب

شعبہ ابلاغِ عامہ
فیڈرل اردو یونیورسٹی

بچوں کے رویوں میں تبدیلی سے غفلت برتنا ایک سنگین معاشرتی جرم ہے

بچوں میں ضد اور ہٹ دھرمی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ والدین کی بات کو نہ ماننا ایک رویّہ بنا گیا ہے۔ عموماً بچے والدین کے بار بار منع کرنے پر بھی شرارتیں کرنے، دوسرے بچوں کو تنگ کرنے، مہمانوں کے سامنے بدتمیزی کرنے سے باز نہیں آتے۔ بچے بلاوجہ رونے لگیں، منہ پھیر کر لیٹ جائیں، جگہ چھوڑ کر چلیں جائیں یا منہ بسور کر بیٹھ جایئں تو فوراً پتا چل جاتا ہے کہ وہ غصے میں ہیں اور ان میں موجود غصہ والدین کی نافرمانی کی وجہ بنتا ہے۔

ان حالات میں والدین کو طیش میں آنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ آخر بچے ایسا کیوں کرتے ہیں۔ صرف اس صورت میں بچوں کی نافرمانی کی اصل

وجہ اور تہ نشین محرکات کا پتہ چل سکتا ہے۔ ورنہ نافرمانی کا جواب غصے سے دینا حالات کو پیچیدہ بناتا ہے۔

وجوہات:

☆ ہمارے بچوں میں بڑھتی ہوئی نافرمانیوں کی سب سے بڑی وجہ معاشرے میں جاری مسلسل تبدیلیاں اور عمومی طرز زندگی میں بدلاؤ ہے۔

☆ اس تیز رفتار زندگی میں والدین کے پاس بچوں کو دینے کے لئے معیاری وقت کی کمی ہے جس کی وجہ سے والدین اور بچوں کے درمیان بہترین تعلق اور اعتماد کا رشتہ قائم نہیں ہو پاتا۔ اور اس اعتماد کی کمی کے باعث وہ والدین کی باتوں کو رد کیے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ نافرمانی کی عادت پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

☆ ساتھ ہی بیرونی اثرات بچے کی صحبت بھی اس ضمن میں ایک وجہ ہے۔ عموماً والدین یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کے بچوں کے ساتھی کس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆ والدین کی بچوں کے معاملات میں فعال دلچسپی میں کمی اس نافرمانی کا نتیجہ ہے۔

☆ اس کے علاوہ اعلیٰ درجے کے اسکولوں کا تجارتی بنیادوں پر کام اس کی بڑی وجہ بنتا ہے جہاں تربیت پر توجہ کم ہی دی جاتی ہے۔

☆ الیکٹرانک میڈیا بھی بچے کے اوپر اپنے اثرات مرتب کر رہا ہے۔

☆ نا سازگار خاندانی حالات بھی بچے کے رویّے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ بچے کے گرد و پیش کے معاشرتی حالات، اس کا درونِ خانہ افراد سے تعلق میں بگاڑ۔ اس کی وجہ بنتے ہیں اگر بچے کے گھر گلی مدرسے کے اکثر لوگ لڑائی جھگڑوں اور فساد وغیرہ میں الجھے رہتے ہوں تو اس میں سرکشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

☆ بنیادی مادی ضرورتوں کا پورا نہ ہونا بھی بچے کے رویّے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بچوں کا گھر کے لوگوں، محلے کے بچوں اور اسکول کے ساتھیوں سے ہر وقت الجھنا تشویش ناک ہے۔ جو کہ ان کے جذباتی عدم توازن اور جذباتی صحت سے محرومی کا واضح ثبوت ہے۔ بچے کی تربیت میں والدین کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ بچے کا گھر میں جو وقت گزرا ہوتا ہے اس کے اثرات عمر بھر اس کی شخصیت پر حاوی رہتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے کردار کو صحیح خطوط پر استوار کرنے اور نافرمانی کے رویّے کو ختم کرنے کے لئے زیرِ نظر تجاویز نہایت مفید ہیں۔

تجاویز:

بچہ عمرِ طفولیت سے بلوغت تک نشونما کے مختلف منازل سے گزرتا ہے۔ ہر منزل کی اپنی خصوصیات ہیں۔ ماہیرن کی رائے کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرکے رویّوں میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

☆ابتدائی عمر دو سے چھ سال تک کا عرصہ ہوتی ہے۔ یہ دور گھریلو ماحول اور اہل خانہ تک محدود ہوتا ہے۔بچہ عموماً ایسے کام کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دوڑنے اور بھاگنے والے ہیں۔ وہ ایک جگہ خاموش بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ بہت جلد اکتاہٹ اور بوریت محسوس کرتا ہے۔اس دور میں بچے کو کنٹرول کرنا خاصہ مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ بلا وجہ روک ٹوک نہ کی جائے۔اس طرح خاص طور پر اس عمر کے بچوں میں ضد کا رجحان بڑھتا ہے۔

بچے کو کھیل میں مشغول رکھ کر نظم و ضبط کے ساتھ کچھ آزادی دی جائے۔ چونکہ بچے کی شخصیت کی تعمیر اس عمر میں بہت تیزی سے ہوتی ہے لہٰذا محبت میں اعتدال ، نیند اور خوراک کا خیال رکھنا نہیایت ضروری ہے۔ شروع دن سے ہی بچّے کے دل میں نصب العین پیدا کرنا اہم ہے۔

☆درمیانی عمر میں سات سے بارہ سال کے بچے شامل ہیں اس عمر میں بچہ دنیا سے متعلق واضح فہم حاصل کرلیتا ہے۔بے تحاشہ سوالات کرکے ہر چیز کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ والدین اکثر تنگ آ کر بچے کو جھڑک دیتے ہیں جس کے ردِ عمل کے طور پر بچہ والدین کی بات بھی سننے سے انکاری ہو جاتا ہے۔

اس عمر میں گھریلو ماحول، کھیل کود کے ساتھی اور اسکول اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا نگرانی نہایت اہم ہے۔ اسکول اور اساتذہ کے کام کا دائرہ اور ان سے رابطہ ضروری ہے تاکہ یہ باہمی تعاون بچے کی انفرادی مسائل الجھنوں کو سمجھنے اور باہمی مشوروں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائے لیکن یہ عمل تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ والدین کا اساتذہ سے رابطہ ہی نہیں ہوتا۔ والدین فیس جمع کرکے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی صحبت، دوست، احباب اور ہم جماعت کے اثرات سے بچانا ضروری ہے۔

بچے کو گھر اور تعلیمی ادارے میں ایسی خوشگوار فضا ملنی چاہیے جو بچے کو مسرت اور (شادمانی توازن اور مطابقت سے ہمکنار کردے۔

☆قربِ بلوغت کا عرصہ تیرہ سے سترہ سال کا ہوتا ہے۔ یہ ذہنی پختگی کا دور ہے اس میں بچے بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ معمولی نوعیت کی معاشرتی بے اعتدالیاں، ناانصافیاں شدید ردِ عمل پیدا کردیتی ہیں۔ اس عمر میں خاص طور پر بچے کی عزت نفس کو مجروح کرنے سے گریز کیا جائے۔ اس دور میں بچوں کو خاص طور پر رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور منفی سوچوں سے بچے رہیں۔ ان کی تخلیقی قوتوں کو سائنس، مصوّری اور موسیقی جیسے وسیع میدانوں

میں مصروف کر دینا چاہیے تاکہ خلافِ معاشرہ حرکات کے لئے ذہن بے کار نہ رہے۔ یاد رکھے بلوغت کا وقت بہت حساس ہوتا ہے۔ اس میں بچوں کی خاص طور پر باپ سے دوستی اور رہنمائی بہت ضروری ہے۔ تاکہ اس دوستی کی بنیاد پر بچے والدین کی باتوں کو رَد نہ کریں۔

:عمومی اقدامات

بچے چاہے جس عمر سے تعلق رکھتے ہوں چند عمومی اقدامات ایسے ہیں جن کا مشترکہ طور پر اپنایا جانا ضروری ہے۔ معمولی باتوں میں بچے کو انتخاب کی آزادی اور فیصلے کا شعور دینا چاہیے۔ رہنمائی کرنے والوں کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنا فیصلہ بچے پر مسلط کریں۔

فیصلوں اور نتائج کے بارے میں احساس ذمہ داری پیدا کرنا پہلا قدم ہے تاکہ خود اعتمادی پیدا کی جاسکے۔ جب روزِ اوّل سے بچوں میں صحیح اور غلط کا شعور پیدا کر دیا جائیگا تو اپنے غلط اقدام پر ان میں شرمندگی بھی پیدا ہوگی۔ بچوں کو بتایا جائے کہ معاشرتی اقدار کیا ہیں تربیت سے اُسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور اپنے کردار کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔

مثبت سرگرمیوں کی تلاش، منفی سرگرمیوں سے باخبر رہنا اور منفی سرگرمیوں کی مذمت کرنا والدین کا فرض ہے بچے کی جذباتی تعلیم و تربیت اور فرمانبرداری

کا جذبہ پیدا کرنے کا ایک سنہری اصول یہ بھی ہے کہ والدین اور اساتذہ خود اپنی جذباتی زندگی میں صحت اور توازن کا ہمہ وقت خیال رکھیں۔ اگر رہنمائی کرنے والوں کی اپنی زندگی خلش، اضطراب، محرومیت، تلخ کلامی، لڑائی جھگڑوں اور بدمزگیوں سے پاک ہوگی تو بچے کی جذباتی زندگی میں بھی صحت اور توازن کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

اختتامیہ:

بچوں کے رویوں میں تبدیلی سے غفلت برتنا ایک سنگین معاشرتی جرم ہے اگر ان پر بر وقت توجہ نہ دی جائے تو وہ بڑے ہو کر اپنی ذات، اپنے خاندان، سارے معاشرے بلکہ بسا اوقات پوری دنیا کے لیے باعثِ زحمت بن جاتے ہیں۔

## پولیو

صبح سویرے اپنے گھر سے پانی کی دو بوند پیئے بغیر وہ سوزوکی میں سوار مختلف علاقوں کی جانب رواں دواں ہوتی ہیں۔ آج شہر کا کون سا حصّہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔ آج کہاں زندگی کی دو بوند معصوم بچوں کو پلانی ہے۔

سفر شروع ہوا۔ مخصوص مقام پر پہنچ کر خواتین کی ٹولیاں شہر کراچی کی مختلف بستیوں میں پہنچنے لگیں۔ فقط 250 روپوں کی یومیہ اُجرت کے عوض یہ خواتین صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کی سیاہی پھیلنے تک اپنے کام میں مگن رہتی ہیں۔ اتنی دہاڑی پہ تو کوئی اور کام بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس میں وقت نہ لگے اور شاید پیسے بھی زیادہ مل جائیں۔ لیکن یہ خواتین ایک عظیم مقصد کی تکمیل کے سرگرداں ہیں۔

دو بوند پولیو کے قطرے پلانے پر معمور یہ خواتین اس بات کو جانتی ہیں کہ یہ صرف ان کا کام نہیں ایک قومی فریضہ ہے جس کی ذمہ داری انہیں دی گئی ہے۔

یہ ورکرز پاکستان کی آئیندہ نسلوں کو پولیو جیسی موروثی بیماری سے ہمیشہ کے

لئے نجات دلانے کی غرض سے گرمی سردی ذاتی اُلجھنوں کو طاق میں رکھے گھر سے نکلتی ہیں۔ پاکستان افغانستان اور نائجیریا ایسے تین ممالک ہیں جو پولیو پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں اور اس وقت دنیا بھر سے ستر فیصد سے زائد مریضوں کا تعلق پاکستان سے ہی ہے۔ پاکستان دنیا کے اُن ممالک میں شامل ہے جہاں ڈونرز ایجنسیاں کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں تاکہ اس مرض کا خاتمہ کیا جاسکے لیکن پاکستان میں پولیو پر تاحال قابو نہ پایا جاسکا۔

پاکستان میں گزشتہ سترہ سالوں سے جاری پولیو مہمات کے باوجود پاکستان میں پولیو وائرس رپورٹ ہو رہا ہے۔ ملک کے قبائلی علاقوں سمیت سب سے بڑے شہر کراچی کی مضافاتی آبادی گڈاپ ٹاؤن میں کالعدم تنظیموں کی جانب سے دھمکیوں کے بعد رواں برس چلائی جانے والی مہمات کے دوران ساڑھے تین لاکھ سے زائد بچے پولیو کے حفاظتی قطرے پینے سے محروم رہے۔

لیکن رواں برس کراچی کے علاقوں گڈاپ اور بلدیہ ٹاؤن میں تقریباً چار 4 ماہ کے وقفے کے بعد سیوریج کے پانی کے نمونوں میں پولیو وائرس کی تصدیق کی گئی۔ بلدیہ ٹاؤن سے سیوریج کے پانی سے پہلی بار 12 نمونے حاصل کیے گئے۔ جن میں پولیو پی تھری کی تصدیق ہوئی۔ اس صورتحال کے باعث دھمکیوں کی فکر نہ کرتے ہوئے یہ ورکرز ان علاقوں میں زندگی کے خوشیوں کے دو بوند پلانے پہنچ گئیں۔

لیکن شر پسند عناصر نے ان کے جذبے اور خلوص کو پیروں تلے روند ڈالا اور سفاکی سے ان سادہ دل غریب عورتوں سے اُن کی زندگی چھین لی ۔ کیسے دکھ کا مقام ہے۔ ممتا کے فطری جذبے سے سرشار معصوم بچوں کو گود میں لے کر زندگی کے دو بوند دینے کی خواہش رکھنے والی ان عظیم خواتین کو ہی زندگی سے دور کر دیا گیا۔

17 دسمبر سے 19 دسمبر تک چلائی جانے والی رواں برس کی اس آخری انسداد پولیو مہم کے دوران سندھ بھر سے 44 لاکھ 33 ہزار 680 بچے پولیو کے حفاظتی قطرے پلانے کے لئے 6 ہزار 455 ٹیمیں فرائض انجام دے رہی تھیں۔ پولیو کے خلاف گھر گھر جا کر معصوم بچوں کو پولیو کے حفاظتی قطرے پلانا قومی مشن ہے۔ لیکن چند فرسودہ اور جاہلانہ سوچ کے حامل افراد کی جانب سے ورکرز کو نشانہ بنایا گیا جس کی وجہ سے اس مہم کو فوری طور پر روکنا پڑا۔

یہ نہایت افسوس ناک عمل ہے ۔ یہ معصوم جانوں کے نقصان کے ساتھ ہی ایک قومی مسئلہ ہے۔ نجانے کتنے ہی بچے اب پولیو ویکسینیشن کے دو قطرے پینے سے محروم ہو جائینگے ۔ وہ لیڈی ہیلتھ ورکرز جو اس قوم کے بچوں کو اپاہج ہونے سے بچا رہی ہیں ان کی زندگی نہایت قیمتی ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت ان رضا کاروں کو مکمل تحفظ فراہم کرے ۔ اور ان عظیم خواتین کے لئے جنھوں نے

اپنی جانوں کی قربانی دی ہے معاوضے کا اعلان کیا جائے۔ ساتھ ہی لیڈی ہیلتھ ورکرز کی یومیہ اُجرت میں بھی اضافہ کیا جائے۔ پولیو جیسی خطرناک بیماری جو ہماری نسلوں کو تباہ کر رہی ہے ہمیں اسے جڑ سے ختم کرنا ہوگا۔ شرپسند عناصر ہمارے قوم کے مستقبل سے ہرگز نہیں کھیل سکتے۔ انسداد پولیو مہم کے رضاکاروں کے ساتھ آج پوری قوم کھڑی ہے۔ یہ من حیثیت القوم ہم سب کا مسئلہ ہے اور ہم سب کو مل کر ملک دشمن عناصر کا مقابلہ کرنا ہے۔

# دو بوند زندگی

18 دسمبر کراچی پریس کلب کے باہر ایک اور احتجاج۔ لیکن یہ احتجاج کچھ مختلف ہے۔ اس میں اکثریت خواتین کی تھی جن میں 16 سال سے لے کر 40 سال تک کی پولیو رضاکار اور لیڈی ہیلتھ ورکرز موجود تھیں۔ جنھوں نے ہاتھوں میں احتجاجی بینرز اور کتبے اٹھا رکھے تھے جن پر پولیو رضاکاروں کی ہلاکت کے خلاف احتجاجی نعرے درج تھے۔ حالیہ 17 دسمبر کو شروع ہونے والی پولیو مہم کے پہلے دن ایک رضاکار اور مہم کے دوسرے دن 4 خواتین رضاکاروں کو شہید کر دیا۔ 250 روپے کی یومیہ اُجرت کے عوض یہ رضاکار گلی گلی دو بوند زندگی معصوم بچوں کو پلانے کی غرض سے نکلتے ہیں۔ اس دہاڑی میں تو کوئی اور کام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ان کا جذبہ ہے کہ یہ خود غرضانہ سوچ کی پاداش میں نہیں پلتے۔ ایک عظیم مقصد ہے۔ پاکستان کے مستقبل کو اپاہج ہونے سے بچانے کا عزم۔

پاکستان، افغانستان اور نائجیریا ایسے تین ممالک ہیں جو پولیو پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔ اس وقت دنیا بھر سے ستر فیصد سے زائد مریضوں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں ڈونرز

ایجنسیاں کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں لیکن پاکستان میں پولیو پر تاحال قابو نہ پایا جاسکا۔ سترہ سال سے جاری اس مہم کے باوجود کیس رپورٹ ہوئے جس سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے امیج کو شدید ٹھیس پہنچی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اگر پاکستان میں پولیو کے پھیلاؤ پر جلد قابو نہ کیا گیا تو پاکستان پر بین الاقوامی سفر سے قبل پولیو کے قطرے پینے کی شرط عائد ہو سکتی ہے۔ جس کی مثال سعودی عرب ہے۔ جہاں پر پاکستان، افغانستان اور نائیجیریا سے سفر کرنے والے تمام افراد کو پولیو کے قطرے پینے لازم قرار دیئے گئے ہیں۔ ایسی کیا وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر ہم اب تک اس موذی مرض سے اپنے ملک کو پاک نہ کر سکے۔ فقط اگر سندھ کی بات کی جائے تو گزشتہ سال 4 لاکھ 44 ہزار بچوں کو والدین کی جانب سے پولیو کے قطرے نہ پلائے جانے کا انکشاف ہوا۔ 33 ہزار خاندانوں نے انسداد پولیو مہم میں رجسٹرڈ ہونے کے باوجود بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے سے انکار کرکے ملک کے آفت زدہ اور دہشت گردی کے شکار صوبے خیبر پختونخواہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ لوگوں کو صحیح اُمور پر آگہی فراہم نہ کی گئی جس کی وجہ سے 33 ہزار 780 خاندانوں نے دانستہ طور پر اپنے 5 سال سے چھوٹے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے سے انکار کر دیا۔ تو کہیں ناقص منصوبہ بندی کرپشن اور بدعنوانی کے باعث اربوں روپے خرچ کرنے کے باوجود حکومت پولیو پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی جس کے بعد ڈونرز کی بڑی تعداد نے پاکستان کو فنڈز دینا بند کر دئے۔ اس سلسلے میں حکومت

پاکستان نے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک اور ورلڈ بینک سے پولیو مہم کے 35 ملین ڈالرز قرض بھی مانگ لیا۔

شہر کے مختلف اضلاع میں انسداد پولیو مہم کے دوران بڑے پیمانے پر بدعنوانیوں اور کرپشن کا انکشاف ہوا۔ عالمی ادارے صحت کی جانب سے انسداد پولیو مہمات کے لئے ملنے والی امداد میں کرپشن اور بدعنوانیوں کے پیش نظر فنڈز براہ راست پولیو کارکنوں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا اس سلسلے میں تنظیم کی جانب سے شناختی کارڈ طلب کے ے گئے۔ تاکہ انہیں بنک کے ذریعے براہ راست ادائیگی کی جائے۔ تو 80 فیصد سے زائد شناختی کارڈز جعلی قرار دیئے گئے۔ بعد ازاں اس معاملے کو سلجھایا گیا اور غلط فہمی ظاہر کیا گیا۔ ان ساری وجوہات کے ساتھ ساتھ سب سے اہم مسئلہ جو اس موذی بیماری پر قابو نہ پانے کی وجہ بنا وہ انتہا پسندوں کی جانب سے ویکسی نیٹروں کی ملکی اور غیر ملکی ایجنسیوں کے آلہ کار بننے کے خدشے کے پیش نظر سامنے آیا۔ ان خدشات کو ڈاکٹر شکیل آفریدی کے اسامہ بن لادن پر حملے میں ملوث ہونے کے بعد تقویت ملی۔ ملک کے قبائلی علاقوں سمیت سب سے بڑے شہر کراچی کی مضافاتی آبادی گڈاپ ٹاؤن میں کالعدم تنظیموں کی جانب سے دھمکیوں کے بعد رواں برس چلائی جانے والی مہمات کے دوران ساڑھے تین لاکھ سے زائد بچے پولیو کے حفاظتی قطرے پینے

سے محروم رہے۔
لیکن ساتھ ہی کراچی کے علاقے گڈاپ ٹاؤن اور بلدیہ ٹاؤن میں تقریباً 4 ماہ کے وقفے کے بعد سیوریج کے پانی کے نمونوں میں پولیو وائرس پی تھری کی تصدیق کی گئی جس کے بعد نئی حکمت عملی طے کرنے کے ساتھ ہی پولیو ورکرز اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر دھمکیوں کے باوجود اپنا فریضہ انجام دینے ان بستیوں میں پہنچ گئے۔ اور نتیجتاً ان معصوم خواتین کو زندگی سے محروم کر دیا گیا۔ یہ رضاکار اپنی آئندہ نسلوں کو محفوظ بنانے کے لئے کام کر رہی تھیں۔ یہ حملے یقیناً پاکستان کے مستقبل کو اپاہج بنانے کی سازش کا شاخسانہ ہے اور ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت کیے جا رہے ہیں۔
عالمی ادارہ صحت نے کہا ہے کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کا انسداد پولیو مہمات سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ میڈیا کی غلط خبروں کے ذریعے ڈاکٹر شکیل آفریدی کا تعلق پولیو مہمات سے جوڑا گیا۔ جس سے پولیو مہمات کے دوران ویکسینیشن میں مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور یہی پولیو رضاکاروں پر حملے کی وجہ بنی۔
ادارہ صحت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے مطابق ڈاکٹر شکیل کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے اس نے انسداد پولیو مہم کے ذریعے اسامہ کی ہلاکت میں امریکہ کی مدد

کی تھی۔ جبکہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے جسے کوئی عام شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ دو قطرے پولیو ڈراپس سے کسی کے ڈی این اے کی جانچ کیسے کی جا سکتی ہے۔ دراصل ڈاکٹر شکیل آفریدی نے غلط بیانی کی کہ اس نے پولیو مہم کے ذریعے ایسا کیا۔ اس غلط بیانی سے لوگ گمراہ ہوئے۔ ڈاکٹر شکیل نے ہیپاٹائٹس پروگرام کے نام پر خون کے نمونے حاصل کیے تھے۔ اور امریکی سی آئی اے کو معلومات فراہم کی۔ ذرائع کے مطابق ڈاکٹر شکیل آفریدی کے منظر عام پر آنے اور ان کی گرفتاری کے بعد کالعدم تنظیموں کی جانب سے صحت کے حوالے سے ملک کے شمالی علاقوں خصوصاً شمالی اور جنوبی وزیرستان میں کام کرنے والے ملکی اور غیر ملکی فلاحی تنظیموں پر سخت پابندیاں عائد کرتے ہوئے انہیں علاقوں سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جبکہ گڈاپ ٹاؤن میں پولیو مہمات کے دوران جولائی سے اب تک رضاکاروں کے قتل کے نتیجے میں گڈاپ میں مسلسل دھمکیوں اور خوف کے باعث 22 ہزار سے زائد 5 سال سے کم عمر کے بچے پولیو کے قطرے پینے سے محروم ہیں۔

صوبائی وزیر صحت ڈاکٹر صغیر احمد نے کہا ہے کہ پولیو رضاکاروں پر حملے کے بعد سندھ بھر میں اس وقت تک انسداد پولیو مہم نہیں چلائی جائے گی جب تک سیکورٹی ادارے کلیئرنس نہیں دے دیتے۔ 17 دسمبر کو شروع ہونے والی انسداد پولیو مہم کو بھی اس لئے روکا گیا کیونکہ مہم کے پہلے دن ایک رضاکار اور مہم کے دوسرے دن 4 خواتین کو شہید کر دیا گیا۔ ہم مزید 55 ہزار پولیو

رضاکاروں کی جانوں کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔ انہوں نے کہا کہ 17 دسمبر سے 19 دسمبر تک چلائی جانے والی رواں برس کی اس آخری مہم کے دوران سندھ بھر کے 44 لاکھ 33 ہزار 680 بچوں کو پولیو کے حفاظتی قطرے پلانے کے لئے 15 ہزار 514 ٹیمیں تشکیل دی گئی اور انہیں دو ہزار 504 ایریا انچارج سپروائزر کر رہے تھے۔ اسی طرح کراچی میں 13 لاکھ 43 ہزار 853 بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کے لئے 6 ہزار 455 ٹیمیں فرائض انجام دے رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ پولیو کے خلاف گھر گھر جا کر معصوم بچوں کو پولیو کے قطرے پلانا قومی مشن ہے لیکن فرسودہ اور جاہلانہ سوچ کے حامل افراد کی جانب سے پولیو رضاکاروں کو پشاور اور کراچی تک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نشانہ بنایا گیا جس کی ہم مذمت کرتے ہیں۔ جبکہ جامعہ بنوریہ سائٹ کے مہتمم شیخ الحدیث مولانا مفتی نعیم نے کہا کہ ہم نے اس ویکسین پر تحقیق کی ہے اور اسے مختلف لیبارٹریوں سے تجزیئے کرائے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے جس سے انسان کو کوئی نقصان پہنچے یا نسل کشی ہو۔ اس لئے پولیو ویکسین کے خلاف جھوٹا پراپگنڈہ عوام کو گمراہ کرنے کے لے ے کیا جارہا ہے اور اس کے پیچھے وہی لوگ ہیں جن کے ذاتی مقاصد ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بیماری کی روک تھام کے لئے تدابیر اختیار کرنا سنت نبوی ﷺ ہے لہذا پولیو جیسی مہلک بیماری کی روک تھام کے لئے حفاظتی قطرے پلانے چاہییں۔ قطرے پلانے سے متعلق تمام علماء کا متفقہ فتویٰ آچکا ہے۔

انہوں نے کہا کہ پولیو کے قطرے پلانے والوں کا تعلق این جی اوز

سے ہوتا ہے اور ڈاکٹر شکیل آفریدی نے این جی اوز کے نام پر اسامہ بن لادن کی مخبری کی جس کی وجہ سے لوگوں میں خوف پایا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو حقیقت بتائی جائے۔

علماء کرام میڈیا اور منبر و محراب کے ذریعے عوام میں اس جاہلانہ سوچ کے خلاف شعور بیدار کریں تاکہ لوگ پولیو جیسی مہلک بیماری سے آگاہ ہوں۔

دوسری جانب شدت پسندوں کی جانب سے ہلاک ہونے والوں کے غم میں صوبے بھر کی لیڈی ہیلتھ ورکرز کی جانب سے 18 سے 22 دسمبر تک 5 روزہ سوگ منایا جارہا ہے۔

## یہ عوام سوالیہ نظروں سے حکمرانوں کو تک رہی ہے

اتارو گاڑی سے سب کو۔ جلدی کرو۔ ورنہ سب کہ سب مارے جاؤ گے۔ لگا دو آگ اس کو چلاکے خاک کر دو۔ چلو بھائیوں یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ ہم حق بجانب ہیں۔ یہ ڈرائیور کیوں چیخ رہا ہے۔ ہٹ جاؤ۔ تمھاری کون سی اپنی گاڑی ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ ہے۔ اسے جلانا تو ہمارا حق بنتا ہے۔ آخر ہم غصہ کس پہ اتاریں گے۔ ہمارے لوگ مارے جا رہے ہیں۔ حکومت خاموش ہے۔ کہاں ہے حکومت ہم خود منصف بن جائیں گے۔ چلاؤ بھائیوں۔ ہٹاؤ اس ڈرائیور کو یہ بھی ڈرامے باز ہے۔ سارے ایجنٹ ہیں۔ ہمارا حق ہمیں واپس کرو۔ چلاکے راکھ کردو سب کو۔

اور غلام نبی جو اس بس کا ڈرائیور تھا چیختا رہ گیا۔ رحم کرو رحم بابا۔ میری زندگی کی ساری جمع پونجی میری گاڑی نہ جلاؤ۔ مجھے جلا دو۔ خدا کے لئے میری جان لے لو۔ میری یہ روزی روٹی ہے۔ میرے معصوم بچوں کی خوشیاں اس سے ہیں اسے مت جلاؤ۔ یہ حکومت کا مال نہیں۔ نہ میں کسی تنظیم سے ہوں۔ پیسہ پیسہ جمع کیا ہے میں نے اس گاڑی کے لئے یہ تو میری قسطوں پہ لی ہوئی گاڑی ہے۔ کہاں سے بھروں گا میں اس کا روپیہ۔

غلام نبی فریاد کرتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے سامنے اس کی گاڑی جل کے خاک ہو گئی۔ یہ غلام نبی ہے جس کی تمام جمع پونجی مزدا کی شکل میں راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ ہڑتال یا احتجاج کسی کا بھی ہو مشتعل عوام کا پہلا نشانہ بنتی ہے پبلک ٹرانسپورٹ گاڑیاں اور دوسری املاک ۔اور جلانے والے کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے محض کوئی بس ، ویگن یا دیگر املاک کو ہی نہیں جلنے والے املاک کے توسط سے پلنے والے پورے خاندان کو زندگی بھر جلنے کے لے ے چھوڑ دیا ہے۔

پاکستان بھر میں ذرائع نقل و حرکت کے لئے لاکھوں کی تعداد میں پبلک ٹرانسپورٹ سڑکوں پر دوڑ رہی ہے۔ سڑکوں پر دوڑتی اس پبلک ٹرانسپورٹ کی وجہ سے لاکھوں افراد اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ شہر کی سڑکوں پر رواں دواں پبلک ٹرانسپورٹ میں کئی بسیں اور ویگنیں بہت قیمتی اور مہنگی اور کئی بس گزارا ہوتی ہیں۔ آئے دن کی ہڑتالوں میں گاڑیوں کو نذر آتش کرنے کی خبریں اب اتنی عام ہوچکیں ہیں انہیں سن کر اب تو اس پر توجہ بھی نہیں جاتی۔

شہر بھر میں تقریباً 15 ہزار سے زائد پبلک ٹرانسپورٹ چلتی ہیں جنہیں زیادہ تر ڈرائیور حضرات قسطوں پر حاصل کرتے ہیں اور روز کی ہونے والی کمائی سے وہ ایک خطیر رقم اس کی قسط ادا کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ شر پسند عناصر حکومت سے

ناراضگی اپنے ذاتی غصے کو بجھانے کے لئے پبلک ٹرانسپورٹ کو آگ تو لگا دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس سے واقف ہی نہیں ہوتے کہ آیا اُن کا یہ فعل کسی غریب انسان کی زندگی پہ کیا قیامت لا سکتا ہے۔ جبکہ حکومت کی طرف سے جلنے والی گاڑیوں کا معاوضہ دینے کی کوئی خاطر خواہ پالیسی سامنے نہیں آ سکی اس سلسلے میں کراچی ٹرانسپورٹ اتحاد کے صدر ارشاد بخاری کا موقف ہے کہ ان جلائی جانے والی گاڑیوں کے ذمہ دار وہ عناصر ہیں جو ہڑتال کی کال دیتے ہیں اور ہڑتال شروع ہونے کی رات سے ہی گاڑیاں جلانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ خوف پیدا ہو اور لوگ گھروں سے نہ نکلیں۔ ایسے میں ہڑتال والے دن بھی گاڑیاں جلائی جاتی ہیں۔ ہمارا یہ موقف ہے کہ جو لوگ گاڑیاں جلاتے ہیں ان کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے اور سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر ہڑتال کی کال دینے والوں کے خلاف مقدمہ درج کئے جائیں۔ دوسرا ہمارا یہ موقف ہے کہ جو گاڑیاں جلا دی گئی ہیں ان کو معاوضہ دینا حکومت کا کام ہے۔ یہ حکومت کی اخلاقی۔ قانونی اور مسلمان ہونے کے ناطے بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ جن کی گاڑیاں جلائی گئی ہیں انہیں معاوضہ دیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ دور حکومت میں اب تک 500 سے زائد گاڑیاں جلائی گئی ہیں انہیں معاوضہ دیا جائے۔ جبکہ حکومت کی جانب سے صرف 100 کے قریب گاڑیوں کا معاوضہ دیا گیا ہے وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔ اس سے قبل 2007 میں پرویز مشرف دور حکومت میں ٹرانسپورٹر کو معاوضہ دیا گیا تھا اور فی کس دو لاکھ روپے ایک گاڑی کا

معاوضہ دیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ٹرانسپورٹ نہ چلائےں تو ہم کیا کریں ۔ ہم تو شہریوں کی مشکلات سفر میں کمی کرتے ہیں۔ سہولیات فراہم کرتے ہیں۔

ایسے میں حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ٹرانسپورٹروں کو تحفظ فراہم کرے۔ 19 نومبر کو قوم پرستوں کی جانب سے کی جانے والی ہڑتال کے دوران غلام نبی کی ویگن کو آگ لگا دی گئی تھی غلام نبی اس ویگن کا جزوی طور پر مالک تھا اور ایک ہاتھ سے معذور ہے۔ آج کسمپرسی کی زندگی گزارنے پہ مجبور ہے ۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتا ہے کیونکہ اس کے بچوں کی معصوم خواہشات کو پوری کرتی ویگن آج خاک ہو گئی ہے ۔ گھر کے اخراجات بچوں کی اسکولوں کی فیس وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا وہ روزانہ اس اُمید کے ساتھ ویگن کے اڈے پر جاتا ہے کہ شاید حکومت کی جانب سے جلنے والی گاڑیوں کے معاوضے کے حوالے سے کوئی خبر مل سکے لیکن اڈے پر موجود ہر شخص اسے دلاسہ تو دیتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔

یہاں صرف غلام نبی ہی نہیں کتنے ہی ایسے ڈرائیور موجود ہیں جو قسطوں پر ویگن لے کر چلاتے تھے اور ان کی ویگن شر پسندوں کے قہر کا نشانہ بن گئی۔ اگر کوئی بدنصیب کسی یونین کی کسی اتحاد کا رکن نہیں ۔ تو جلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔

آخر ان واقعات کا ذمہ دار کون ہے۔ کیا ایسی قانون سازی ہونا ضروری نہیں جس میں ہڑتال یا احتجاج کی کال کے دوران ذمہ دار ہڑتال یا احتجاج کی کال دینے والے کو سمجھا جائے۔

نائب امیر جماعتِ اسلامی کراچی اور سابق رکن قومی اسمبلی نصر اللہ شجیع نے اس مسئلے پر بات کرتے ہوئے کہا کہ بنیادی طور پر حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ متاثرہ ڈرائیورز کو معاوضہ دیں۔ جس طرح کے حادثات جنم لے رہے ہیں اس میں ٹرانسپوٹرز کے تحفظات بجا ہیں۔ کراچی کے حالات سے آج ہر شخص متاثر ہو رہا ہے۔ حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ قابو پانا اب نا گزیر ہو گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی قانون سازی کی جائے کہ جس میں ذاتی املاک کو نقصان پہنچنے کی مد میں جو اخراجات ہیں ان کی ذمہ داری حکومت اٹھائے۔ شہر میں ہنگامہ آرائی کی وجہ سے جو ملزمان گرفتار ہوتے ہیں انہیں قانوناً ایک مخصوص جرمانے کے عیوض رہا کیا جاتا ہے۔

مزید انھوں نے کہا کہ حکومت معاوضوں کا اعلان ضرور کرتی ہے لیکن اکثریت اس سے محروم ہے ۔گاڑیاں جلانا تو ایک طرف حکومت اپنے کاموں کے لئے ٹرانسپورٹرز کی جن گاڑیوں کو روکتی ہے ان کو بھی معاوضہ نہیں دیا جاتا جو کہ بہر حال غریب ڈرائیورز حضرات کے لئے پریشانی کا باعث ہے اس سلسلے میں جلد ہی قانون سازی کرنی

ہوگی۔ ورنہ ہمارے مظلوم عوام میں اشتعال بڑھتا رہے گا۔ بیروزگاری ذہنی مسائل کو جنم دے رہی جو کہ بہرحال ایک قومی مسئلہ ہے۔

غلام نبی روزانہ اپنی رہائش گاہ کے سامنے اس جگہ جاتا ہے جہاں اس کی مکمل جلی ہوئی ویگن اینٹوں پر کھڑی ہے۔ اپنی عمر بھر کی جمع پونجی لگا کر قسطوں پر خریدنے والی گاڑی جل گئی لیکن ہر ماہ قسط تو اسے ہر حال میں ادا کرنی ہے۔ یہ ادائیگی اور گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ یہی پریشانی غلام نبی اور اس جیسے سینکڑوں افراد کو پریشان رکھے ہوئے ہے۔

امن وامان کی دن بدن خراب ہوتی صورتحال سے ہر خاص وعام متاثر ہو رہا ہے فوری طور پر حکمت عملی اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ غلام نبی جیسے کتنے ہی لوگ ہمت ہار کر ذہنی مریض بنتے جائیں گے۔ یہ عوام سوالیہ نظروں سے حکمرانوں کو تک رہی ہے۔

# پڑوسیوں کی سازش

بندر ڈاکٹری پڑھ کر آیا تو اس نے جنگل میں ایک ہسپتال قائم کر لیا۔ جہاں وہ تمام جانوروں کا علاج کرنے لگا۔ لومڑی خالہ نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک اسکول کھول لیا تھا۔ جس میں تمام جانوروں کے بچے پڑھنے آتے تھے۔ جنگل میں ٹوٹو اور پے ٹو خرگوش مل کر لذیذ کھانوں کا ایک ہوٹل چلا رہے تھے اور بھالو میاں کا بہت بڑا جنرل اسٹور تھا۔ اسی طرح سب جانوروں نے مختلف کاموں میں لگے رہتے تھے ۔سب نے مل جل کر جنگل کے ماحول کو بہت خوبصورت بنا دیا تھا۔ شیر واس جنگل کا بادشاہ تھا۔ تمام جانور اس سے بہت ڈرتے تھے لیکن وہ کسی پر ظلم نہ کرتا اور نہ ہی کسی جانور کو تکلیف میں دیکھ سکتا تھا۔ جنگل کی زندگی یونہی پر سکون انداز میں گذر رہی تھی کہ ایک دن دوسرے جنگل سے چند لومڑیاں شیر و بادشاہ سے ملنے آئیں۔ انہوں نے اپنے بادشاہ کی طرف سے شیر و بادشاہ کو بہت سے تحائف پیش کئے اور دوستی کا پیغام بھی بھیجا۔ لومڑیوں کے آنے کی خبر پورے جنگل میں تیزی سے پھیل گئی۔ شیر و بادشاہ نے لومڑیوں کی خوب مہمان نوازی کی اور ان کو جنگل کا مکمل دورہ کرایا۔ جنگل کا ماحول اور جانوروں کا آپس میں سلوک و اتفاق دیکھ کر وہ دل ہی دل میں حسد کرنے لگیں ۔ چند روز گذارنے کے بعد لومڑیاں واپس اپنے جنگل میں چلی گئیں۔ ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد وفد میں سے دو

لومڑیاں اسی جنگل میں واپس آئیں اور شیر و بادشاہ سے یہاں مستقل رہنے کی درخواست کی۔ لومڑیوں نے شیر و بادشاہ کی خوشامد کرتے ہوئے اپنے جنگل کے بادشاہ کی برائیاں کرنا شروع کردیں۔انھوں نے شیر و بادشاہ کی ہمدردیاں لینے کے لئے اپنے جنگل کے بادشاہ کے ظلم وستم کے بارے میں بتانا شروع کردیا۔ لومڑیوں کی ساری باتیں سن کر شیر و بادشاہ نے انہیں اپنے جنگل میں مستقل طور پر رہنے کی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر بندر اور ہشیار کتے کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہیں ان لومڑیوں سے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر بندر نے ہشیار کتے کو ان دونوں لومڑیوں کے پیچھے لگا دیا اور کہا: ان کے تعاقب میں رہو اور دوبارہ جنگل میں آمد کا مقصد پتا کرنے کی ذمہ داری لگاتے ہوئے کہا: " مجھے اپنے جنگل سے بہت پیار ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ دونوں لومڑیاں ہمارے جنگل کا سکون تباہ کرنے کے مشن پر آئی ہیں۔"

بس پھر کیا تھا۔ ہوشیار کتے نے اپنی پوزیشن سنبھال لی اور لومڑیوں کے شب و روز پہ نظر رکھنے لگا۔ ابتداء میں کچھ دن تو اُسے کوئی غیر مشکوک حرکت نظر نہ آئی کیوں کہ لومڑیاں جنگل کے تمام جانوروں کے ساتھ اپنے مراسم بڑھا رہی تھیں اور ہر جانور کو تحفے تحائف دے کر اپنا گرویدہ بنائی جا رہی تھیں۔۔ چونکہ شیر و بادشاہ کا جنگل اپنے امن اور بھائی چارے کی وجہ سے مشہور تھا ہی

ساتھ ہی اِس جنگل کی ایک اور خوبی تھی اور وہ یہ کہ آس پڑوس کے جنگلوں کے مقابلے میں یہاں پھلوں کے درخت اور رس والے پھلوں کی بیلیں سب سے زیادہ تھیں۔ تو پڑوس سے آئی لومڑیوں نے ہوشیار کتے کو تحفتاً ایک خوبصورت چھڑی دی تاکہ کُتا پھل باآسانی توڑ سکے۔ یوں ہوشیار کتا بھی اُن لومڑیوں کی طرف سے بے فکر ہوگیا کہ وہ تو بہت اچھی اور ملنسار ہیں۔ یوں ایک دن ہوشیار کتے نے بندر ڈاکٹر سے لومڑیوں کی خوب تعریف کی اور اُسے کہا: "ڈاکٹر بندر صاحب آپ بلاوجہ فکر کر رہے تھے۔ ہمارے پڑوسی تو بہت ہی اچھے ہیں۔"

ابھی کُتا اور بندر گفتگو میں مصروف ہی تھے کہ جھاڑیوں کے پیچھے کسی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ دونوں بغیر کچھ کہے اُس سرگوشیوں کی طرف لپکے اور چھپکے سے جھاڑیاں ہٹا کر دیکھا تو اُنھیں یقین نہ آیا کہ پڑوسی لومڑیاں اپنے جنگل کے بادشاہ کو قہقہے لگا کر جنگل کا احوال بتا رہی تھیں،اور اپنے کسی مشن کے تکمیل ہونے کی عنقریب خوشخبری بھی دے رہی تھیں۔ ہوشیار کتے نے بندر کے کان میں کہا: "آخر یہ کس مشن کی بات کر رہی ہیں۔" بندر نے ہوشیار کتے کو جواب دیا: "تم خاموشی سے اُن کی باتیں سنو پر مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ پڑوس کا بادشاہ ہمارے جنگل میں اتنی رات کو چھپ کر کیوں آیا ہے۔
"

بس پھر کیا تھا دونوں کی تشویش مزید بڑھ گئی ۔ ایک لومڑی جو بڑی تھی گرمجوشی

سے اپنے بادشاہ سے کہنے لگی: "سردار ہم نے تمام جانوروں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اب ہر کوئی ہم پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ اب ہم اِن میں پھوٹ ڈلوائیں گے اور یہ کام ہم نے آج ہی سے شروع کر دیا ہے۔" اور دوسری لومڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: "بتا چھوٹی اپنا کارنامہ۔"

چھوٹی لومڑی جو کہ ناک میں سے آواز نکال کر بولتی تھی اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگی: "سردار آج ہم نے ٹوٹو کو کہا کہ پے ٹو کھانا اچھا نہیں پکاتا۔ اور تمھارے کھانے کی تو بات ہی اور ہے۔ پھر ہم نے پے ٹو خرگوش کے ڈھابے کے کچن میں جا کر چائے میں چھپکے سے نمک ملا دیا اور خاموشی سے ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئیں۔ اتنے میں پے ٹو خرگوش ٹوٹو کے لئے چائے لے کر آیا۔ چائے منہ کو لگاتے ہی ٹوٹو خرگوش غصے میں لال پیلا ہو گیا اور پے ٹو خرگوش سے لڑنے لگا ساتھ ہی ہوٹل الگ کرنے کی بھی بات کہہ دی۔ یہی تو ہم چاہتی تھیں۔ اسی طرح جنگل کا ہر جانور دوسرے کا دشمن بن جائے اور سب ایک دوسرے کو نوچ کھائیں تاکہ آپ اِس جنگل کے بادشاہ بنیں اور یہ مزیدار پھلوں اور خوبصورت بیلوں والا جنگل ہمارا ہو صرف ہمارا اور پتہ ہے سردار اِس جنگل میں تو بہتہ جھرنہ بھی ہے۔ ہمارے جنگل کا پانی ایسا کہاں۔ خوب مزہ آئیگا جب یہ جنگل صرف اور صرف ہمارا ہوگا۔"

پڑوس کے جنگل کا بادشاہ جو کالی چادر اوڑھے اب تک خاموش بیٹھا تھا آہستہ سے دھاڑتے ہوئے بولا: "ہا۔ ہا۔ ہا میں تم دونوں لومڑیوں سے بہت خوش ہوا۔ جنگل ہاتھ لگتے ہی میں تمھیں اِس جنگل کا سب سے اچھا اور عالیشان غار دونگا۔ رہی بات شیرو کی تو اُسے ختم کرنا میری ذمہ داری کیوں کہ جب وہ اکیلا ہوگا اور سب جانور لڑ مر رہے ہونگے تو اُس پر وار کرنا مشکل نہیں، بس تم اپنا کام جاری رکھو۔"

یہ کہہ کر پڑوسی جنگل کا بادشاہ اپنے جنگل کا رُخ کرکے چل پڑا۔ اب ڈاکٹر بندر اور ہوشیار کتے کی تو یہ حالت تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔ اُن پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ اتنی بڑی چال۔ لیکن دونوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ اور دونوں اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ صبح اُٹھ کر دونوں ایک دوسرے کے گھر کی طرف آرہے تھے کہ مل کر معاملے کی گھتی کو سلجھایا جائے کہ راستے میں عجب عجب منظر دیکھے۔ کہیں میاں بھالو دکان کے باہر اپنے گاہک سے لڑ رہے ہیں، کہیں لمبو زرافہ اور ہاتھی بحث کر رہے ہیں اور ایک جگہ تو دو ہرن ہاتھاپائی تک اتر آئے ہیں۔ اب ڈاکٹر بندر اور ہوشیار کتا جب آمنے سامنے ہوئے تو دونوں ہی جنگل کے حالات سے رنجیدہ تھے۔ لیکن اُنہیں پتہ تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اُن دونوں نے شیرو بادشاہ کے غار کا رُخ کیا اور شیرو بادشاہ کو رات کے واقعے اور لومڑیوں کے

مشن کے بارے میں بتا دیا۔ شیر و بادشاہ کو تو بہت غصہ آیا اُس نے غصّے سے دھاڑتے ہوئے کہا: "ابھی ان کمبخت لومڑیوں کو جنگل سے باہر پھینک دیتا ہوں۔"

پر ڈاکٹر بندر جو کافی ہوشیار تھا بولا: "تحمل سے کام لیجیے شیر و بادشاہ۔ ہم لومڑیوں کو ایسا سبق دینگے کہ آئیندہ وہ ہمارے جنگل کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکیں۔ آپ اپنے جنگل کے جانوروں پر بھروسہ رکھیے۔" یوں شیر و بادشاہ خاموش ہو گیا۔

اب ڈاکٹر بندر اور ہوشیار کتے نے اپنے منصوبے پر عمل کیا اور وہ جنگل کے تمام جانوروں کے پاس ایک ایک کرکے گئے اور پڑوسیوں کی سازش کے بارے میں بتایا۔ یوں ٹوٹو نے بھی سب کچھ جان کر پے ٹو سے معافی مانگی۔ رفتہ رفتہ تمام جانور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ اگلی صبح ماجرہ ہی اور تھا۔ لومڑیاں جہاں پھوٹ ڈلوانے جاتیں وہ جانور دوسرے سے اور ملنے لگتا اور اس کی اچھائیاں بیان کرتا۔ دو دنوں میں تو لومڑیوں کو یقین ہو گیا کہ اِس جنگل میں پھوٹ ڈال کر اس پر قبضہ کرنے کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تمام ہی ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یوں لومڑیوں کو ناکامی ہوئی اور وہ کسی کو الوداع کہے بغیر ہی جنگل سے چلی گئیں۔ یوں تمام جانوروں نے سکھ کا سانس لیا اور جنگل کی زندگی میں وہی رونق واپس لوٹ آئی۔

یقیناً ایک انگلی دشمن کا بال بھی بیکاں نہیں کر سکتی لیکن پانچ انگلیاں مل کر دشمن کا منہ توڑ سکتیں ہیں۔اِن جانوروں نے اتفاق اور بھائی چارے سے اپنے جنگل کی حفاظت کی اور دشمن کی سازش کو ناکام بنا دیا۔

## کمیٹی "سپنے سچ کر دکھانے والی پری"

خواہشات کی تکمیل کے لیے پیسے بچانے کا یہ طریقہ اپنا کر خواتین منہگائی کو ہرا ہی دیتی ہیں

بلا ضرورت پیسے خرچ کرنے سے خود کو روکے رکھنا بہت کٹھن ہے۔ اگر ایک فرد طے شدہ طرزِ زندگی سے کہیں بڑھ کر اخراجات کرلے تو مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے وسائل سے بڑھ کر خرچ کرنے کو عاقبت نااندیشی کہا جائے گا۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی منہگائی میں درمیانے طبقے کے خاندان اپنی عزتِ نفس مجروح ہونے سے بچانے کے لیے محتاط رویوں کے ساتھ کئی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ اشیائے خورونوش، تعلیم اور صحت کی مد میں ہونے والے ناگزیر اخراجات گلے میں پھنسنے والی وہ ہڈی بن کر رہ گئے ہیں کہ جسے نہ تو اُگلا جا سکتا ہے، نہ نگل پاتے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی تو جیسے تیسے پوری ہو ہی جاتی ہیں، لیکن آسائشوں سے آراستہ خوابوں بھری زندگی کی لذتیں پانے کے لیے سفید پوش طبقہ کے افراد مستقل سخت محنت میں جُتے رہتے ہیں، تاکہ منہگائی کا مقابلہ بھی کیا جاسکے اور خوابیدہ خواہشات کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھ سکیں۔ جہاں مرد اپنے خاندان کو بہتر معیارِ زندگی دینے کے لیے سرگرم ہوتے ہیں، وہیں خواتین بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

گھر کے اخراجات کو قابو میں رکھنا اور بچت کے طریقوں کو اپنانا فطری طور پر اس صنف کی صلاحیتوں میں قدرت نے شامل کیا ہے۔ عام طور پر خواتین کو فضول خرچ اور نا سمجھ سرمایہ کار کہا جاتا ہے، جو کہ سراسر غلط ہے۔ سونے کے زیورات خریدنا عورت کی کم زوری ہے۔ دراصل ہر عورت زیور خریدتے وقت یہ جانتی ہے کہ زیور کی صورت میں یہ روپے مستقبل میں نہ صرف اس کے لیے بلکہ اس کے اہل خانہ کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوں گے۔ ورنہ اخراجات میں سے بچائی گئی رقم روزمرہ استعمال میں چٹ ہو جائے گی۔پُرآسایش زندگی کا خواب ہو یا اپنے خاندان کی ضرورتیں اور اہم مسائل حل کرنے کا سوال، ہر عورت اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کا تانا بانا بنتی رہتی ہے۔ یہ منصوبہ بندی اگر درست انداز سے کی گئی ہو اور بروقت اس پر عمل شروع ہو جائے تو گھر کے اخراجات بھی قابو میں آجاتے ہیں اور زندگی کی چھوٹی بڑی خواہشات پوری ہونے کا راستہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اس ضمن خواتین بچت کے مختلف راستے تلاش کرتی ہیں۔

پاکستانی خواتین کمیٹی ڈالنے یا بیسی ڈالنے کی سرگرمی میں کافی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتی ہیں، کیوں کہ کمیٹی کی رقم میں سود یا کسی قسم کی اضافی رقم شامل نہیں کی جاتی، اس لیے اس رقم غیر شرعی نہیں۔ سمجھ دار خواتین اپنے

خانگی بجٹ میں سے رقم کا مخصوص حصہ کمیٹی کے لیے الگ کر دیتی ہیں۔ یہ کمیٹیاں عموماً پانچ سو 500 سے 5000 ہزار تک ماہانہ رقم پر طے کی جاتی ہیں۔ ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق اس رقم کا انتخاب کرتا ہے کہ جو ماہانہ اخراجات میں سے الگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ کمیٹیاں ایک سال سے تین سال اور بعض اوقات پانچ سال کے طویل عرصے کے معاہدے پر طے کی جاتی ہیں۔ کمیٹی میں شامل ہر ممبر اپنی ضرورت کے مطابق کمیٹی کا نمبر لے لیتا ہے۔ کچھ کمیٹیوں کی شروع ہی میں قرعہ اندازی کر لی جاتی ہے۔ فیگر کا تعین کرکے تمام ناموں کی پرچیاں پہلے ہی نکال لی جاتی ہیں۔ پھر باری آنے پر ہر ممبر اپنی رقم لیتا ہے۔ کچھ کی ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے، پھر ترجیحی بنیادوں پر کمیٹیوں کی تقسیم بھی کی جاتی ہے۔ عام طور پر خواتین شادی بیاہ جیسی بڑی تقریبات، گھر کی تعمیر، کسی بڑی مشینری، مثلاً کار، فریج کی خریداری یا زیور بنوانے کے لیے اِس بچت کو کام میں لاتی ہیں۔ کمیٹی کے ذریعے تھوڑی تھوڑی بچت کے بعد یکمشت بڑی رقم ملتی ہے۔ خواتین کمیٹی کھلنے کا انتظار کرتی ہیں اور اس طرح اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل خود کرتی ہیں، ان کے لیے اپنے شوہروں پر دباؤ نہیں ڈالتیں۔ یوں گھر کا ماحول بھی پر سکون رہتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی خواہش کو مارنا آسان نہیں، لیکن وقتی طور پر طے شدہ رقم پس انداز کرنے سے بڑے فائدے کو خوش آمدید کہا جا سکتا ہے۔ اور جو

خواتین ایسا نہیں سوچتیں، انہیں ایک دفعہ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد سرمایہ کاری کے لیے اپنے اطراف کا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔ بظاہر لوگوں کے پاس پیسہ نظر آتا ہے، مگر ہر طبقہ منہگائی اور وسائل کی کمی کا رونا رو رہا ہے۔ خوشیاں پیسوں سے کشید نہیں کی جاسکتیں، مگر اس مادیت پسند دور میں پیسے کی اہمیت سے انکار کرنا خودفریبی ہے۔ مالی وسائل اور اخراجات پر اگر کوئی سنجیدگی سے غور کرسکتا ہے، تو خواتین ہی ہیں وہی اخراجات پر قابو پاسکتی ہیں۔

# خیال رکھیے! دوریاں درمیاں نہ آجائیں

شادی شدہ زندگی کے چمن میں محبت مہکتی رہنی چاہیے

شوہر کے لیے بیوی اور بیوی کے لیے شوہر دنیا کی چند بڑی نعمتوں میں سے ہے ں۔ قرآن نے تو میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس بھی فرمایا ہے۔ خالق کائنات نے مردوزن کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش کا سامان رکھا ہے اور اس فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مذہب نے نکاح جیسا خوب صورت تعلق انسان کو دیا، تاکہ صنفِ مخالف کی کشش، جو فطری طور پر انسان میں موجود ہے، اُسے حیوانیت سے الگ کیا جاسکے۔ شادی نہ صرف تہذیب یافتہ معاشرے کی ضرورت بلکہ یہ زندگی کی حقیقت بھی ہے۔

شادی ایک نئی زندگی ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہوتا ہے کہ اپنے ڈھنگ سے ایک عمر گزارنے کے بعد کسی کا زندگی میں آنا ہر لمحے اُسے اپنے فیصلوں میں شامل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہی تو اس رشتے کا خوب صورت تقاضا ہے۔ رفیقِ حیات ایک ایسی ہستی ہے جسے محبت، دوستی، وفا، جیسے خوب صورت لفظوں کا پیکر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشوں سے یہ رشتہ

پروان چڑھتا ہے۔ اگر اِس خوب صورت رشتے کی روزِ اوّل سے دیکھ بھال کی جائے تو کوئی شک نہیں کہ آخری سانس تک ابتدائی دنوں کی تازگی کے احساس کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک سے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں بلکہ ایک ہی کمرے میں خاصا وقت گزارتے ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتے بڑھتے یہ ایک کمرے میں ساتھ رہنے والے دو انسان رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ہی ان جان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر اختلاف کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن ایک سرد مہری کی سی کیفیت طاری ہوتی چلی جاتی ہے۔ دونوں فریق اپنی ذات کے علاوہ ہر موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہیں، مگر خود اپنی محبت ہی کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اور یوں بظاہر مضبوط نظر آنے والا یہ رشتہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نازک ہوتا چلا جاتا ہے۔ بعض حالات میں تو ایسا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے کہ جس کا ازالہ ممکن نہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کے محبت ختم ہو گئی۔ اکثر لوگوں سے یہ جملہ سننے کو ملتا ہے کہ "اب پہلے کی سی محبت کہاں" حالاں کہ ایسا سوچنا درست نہیں۔ ذرا سی سوجھ بوجھ سے اِس رشتے کی رنگینی کو برقرار رکھنا نہایت آسان ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ ہر جذبے کا اظہار ضروری ہے اب چاہے وہ محبت ہو، غصہ ہو یا ناراضگی۔ شادی کو کام یاب بنانے کے لیے محبت اور اپنے رفیقِ حیات سے

اِس کا اظہار ایک بنیادی شرط ہے۔ محبت اور وار فتگی کا اظہار ایک ایسا ہتھیار ہے، جو شریکِ زندگی کو تمام تر ناراضگی کے باوجود مسکراہٹ کے بندھن میں باندھ دیتا ہے۔ محبت کے اظہار کا کوئی ایک طریقہ نہیں اِس کا انحصار ہم آہنگی اور تعلقات کی نوعیت پر ہے۔ کوئی لفظوں کی خواہش رکھتا ہے تو کسی کو معمولی سا تحفہ بھی خوش کر جاتا ہے۔ کوئی اپنے کیے گئے فیصلے کی تائید کو محبت کا اظہار تصوّر کرتا ہے۔ دراصل محبت کا اظہار اِس ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ اپنے شریکِ زندگی سے تعاون کے لیے نہ صرف تیار ہیں بلکہ اِس میں آپ کی خوشی اور راحت بھی پوشیدہ ہے۔ یہ احساس دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

ہمارے ہاں ویسے عام طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ محبت کا اظہار شوہر کی طرف سے ہو۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے، تو اظہار وہ بھی کرتی ہے تاہم اِس کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنی چال ڈھال، ناز و انداز، لباس، آنکھوں اور طرزِ گفتگو سے اِس کا اظہار کرتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات عورت اپنے اظہار کو اشاروں تک محدود کر دیتی ہے۔ دونوں ہی فریق محبت کے اظہار اور اپنی اہمیت کو تسلیم کرانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف زبان سے اظہار کافی

نہیں ہوتا۔ اِس کے لیے عملی طور پر ثابت کرنا پڑتا ہے۔ زبان سے لاکھ کہا جائے کہ آپ کو اپنے شریکِ حیات کے ہر دکھ اور پریشانی کا پوری طرح احساس ہے، لیکن وہ کبھی بیمار ہوگیا اور آپ نے اس کا حال نہیں پوچھا تو آپ کے الفاظ بے جان ہو جائیں گے۔ عملی طور پر جنسِ مخالف پر یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اُن کی خواہش اور دکھ سب اہم ہیں۔

جہاں محبت کا اظہار ضروری ہے، وہیں غصّے اور ناراضگی کا اظہار بھی بے حد اہم ہے۔ اپنے جذبات کو اندر ہی اندر گھوٹتے رہنا اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا غلط ہے۔ اگر وہ فریق جسے تکلیف پہنچی ہے، خاموشی اختیار کیے رہے گا، تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ جھگڑے کے بعد مصالحت نہ کرنے کی صورت میں غصّہ دبا دیا جاتا ہے اور یوں لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ بلاجواز طرزِ عمل یا غلط رویے کے سامنے چُپ رہنے کی بجائے گفتگو کے ذریعے باہمی اختلافات دور کرنے کی کوشش تعلق میں ایک نئی جان ڈالتی ہے۔

ہماری نئی نسل میں شادی کے بعد اولاد پیدا کرنے میں وقفے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بھی اختلاف کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اولاد ایک ایسا بیج ہے جو مرد و زن کے درمیان محبت کا ایک تناور درخت بن کر اِس رشتے کی حفاظت کرتا ہے۔ ایک کامیاب شادی ایک کامیاب اولاد کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ شادی کے بعد میاں بیوی کو اولاد پیدا کرنے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ شادی کے ابتدائی

برسوں میں پیدا ہونے والی اولاد والدین کو جلد بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ وہ نہ صرف جلد اُن کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے، بلکہ ماں باپ میں زیادہ مضبوط تعلق کا سبب بھی بنتی ہے۔ وہ لوگ جو جان بوجھ کر اولاد پیدا نہیں کرتے اِن کی زندگیوں کو اکثر بے سکون دیکھا گیا ہے۔ کم از کم ہمارے ہاں تو ایسا ہی ہے۔

محبت کا اظہار، ناراضگی، اولاد، جہاں یہ سب پہلو اِس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جاتے ہیں، وہیں ازدواجی تعلقات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ازدواجی تعلقات انسانی ضرورت کا ایک مخفی گوشہ ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات کو صرف حیوانی جذبات کی تسکین کا آلہ کار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ زندگی کا متبرک وظیفہ ہے۔ یہ صرف جسمانی اور سماجی ضرورت ہی نہیں بلکہ روحانی صحت کے قیام کی خاطر بھی از خود ضروری ہے۔

ذرا غور کیجیے۔ مرد و زن نکاح کرکے جب شادی جیسے بندھن میں بندھتے ہیں تو یہ صرف دو افراد کے درمیان رشتہ ہی نہیں بلکہ ایک خاندان کی بنیاد بھی بنتا ہے۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ روزِ اوّل سے حقوق و فرائض کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

میاں بیوی کے تعلق کو لفظ لباس سے تعبیر کیا گیا ہے، تو کیوں نہ اپنے لباس کو اپنے لیے پُر وقار بنایا جائے۔ یہ وہ خوب صورت رشتہ ہے جو ذہنی سکون،

محبت، صحت، ایک دوسرے کی سچی ہم دردی اور رازداری جیسی نعمتیں عطا کرتا ہے۔
لہذا اپنے رفیقِ حیات کا خیال رکھیے۔

# اسلام، پاکستان اور اقلیتیں

دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی انسانی حقوق کی حق تلفی ہو رہی ہو تو پھر اس کے خلاف قانون حرکت میں آ جاتا ہے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بڑی سرعت کے ساتھ متحرک ہو کر انسانی حقوق کے تحفظ یقینی بناتے ہیں پاکستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی جہاں ایک جانب معمول بنتا جا رہا ہے کہ وہیں دوسری جانب انسانی حقوق کے نام مخصوص لابیاں پاکستان کے اسلامی تشخص اور نظریاتی شناخت کو پائمال کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی ہیں تاہم گزشتہ کئی روز سے ملکی اور بین الاقوامی میڈیا کی شہ سرخیوں میں جگہ پانے والا رمشا کیس ایک جانب جہاں انسانی حقوق کی پامالی کا منہ بولتا ثبوت ہے تو دوسری جانب یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی پر ایک سوالیہ نشان بھی ہے۔

مملکت خداداد پاکستان کے مقتقہ آئین پاکستان کے تمام شہریوں کو بلاامتیاز، رنگ، نسل، زبان، علاقہ، مذہب، قومیت، فرقہ، عقیدہ اور نظریات کے یکساں حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے چنانچہ 1973 کے آئین کی دفعہ 4 کے مطابق تمام شہریوں کو یکساں قانونی تحفظ کی ضمانت تو دی گئی ہے نیز قانونی جواز کے بغیر حکومت کوئی ایسا اقدام کرنے کی مجاز بھی نہ ہوگی جو شخصی آزادی، تحفظ

اور عزت و شہرت کے لئے ضرر رساں ہو اور اسی طرح کسی شخص کو کسی بھی ایسے اقدام سے جو قانون کی رو سے غلط یا غیر قانونی نہ ہو اس سے بھی اسے نہیں روکا جاسکتا گویا باالفاظ دیگر قانون کی حاکمیت کو یقینی بنائے جانے پر زور دیا گیا۔ اس آئین کے ابتدائیہ میں ہی مذہبی اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کا بھی ذکر کیا گیا۔

کسی بھی ریاست میں قانون کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اس کی بنیاد پر افراد کو یکساں حقوق وانصاف ملتا ہے وہیں اس کی بنیاد پر ریاستی امور اور معاملات میں ایک نظم قائم کرکے اس کا اطلاق ریاست کے تمام باسیوں کے لیے ترقی خوشحالی اور فلاح کا سبب بنتا ہے۔ نسل وزبان، رنگ اور مذہب اور نظریات کے تمام تر اختلافات کے باوجود ریاست کے تمام افراد امن وسلامتی اور یگانگت کے ساتھ قانون پر عمل پیرا ہونا اپنے لیے مفید خیال کرتے ہیں جبکہ اس کے بالکل برعکس قانون کی عدم موجودگی یا قانون پر عمل پیرا نہ ہونے کی صورت میں لاقانونیت، بربریت، استحصال اور ناانصافی ظلم کا وہ ماحول جنم لے لیتا ہے کہ جو ریاست کو انارکی، انتشار اور بربادی سے دوچار کردیتا ہے اور پھر معاشرہ میں 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کی عملی تصویر دکھائی دینے لگتا ہے۔

ڈاون سنڈروم' نامی بیماری کا شکار رمشا مسیح کو 16 اگست کو میرا جعفر سے پولیس نے ' اس وقت اپنی تحویل میں لے لیا تھا جب اہل علاقہ نے مقدس اوراق کی بے حرمتی کے الزام پر اس کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ بعد ازاں رمشا مسیح کی ضمانت بھی ہو گئی اور وہ رہا ہو گئی۔ اس پورے واقعہ کی روئیداد نہ صرف قومی بلکہ عالمی میڈیا اور خصوصا سوشل میڈیا پر کئی روز سے جاری ہے اور آئے روز نئے انکشافات اور نئی معلومات کی بنیاد پر یہ معاملہ پاکستان ہی نہیں اسلام اور ملک کی مذہبی قیادت اور سوچ رکھنے والوں کے لیے ندامت کا سبب بنتا جا رہا ہے قطع نظر اس کے رمشاء نے اوارق مقدسات کی بے حرمتی کی نہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ گرفتاری کے بعد رمشاء کے حوالے سے متعلقہ پولیس حکام نے جو اقدامات کیے کیا وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قانون اور آئین کے مطابق تھے ۔ اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں منتقل کر دیا گیا اور اس کے بعد اس معاملے کو جس بھونڈے انداز میں سامنے لایا گیا اس نے اس تاثر کو مزید فروغ دیا کہ پاکستان وہ ملک ہے کہ جہاں اقلیتوں کے کوئی گنجائش نہیں ہے اور آج جب بہت سے حقائق سامنے آ چکے ہیں تو ایسے میں باوجود اس کے رمشاء کی ضمانت پر رہائی عمل میں آ چکی ہے کیا اس کے گھر والوں کے لیے اب یہ معاملہ ہر لمحہ سر پر موت کی تلوار کی مانند نہیں لٹکتا رہے گا۔ ایک رمشاء ہی کیا اطراف میں نظر دوڑائیے ہم میں سے کتنے ایسے مسلمان ہیں جو آئے روز صرف اوراق مقدسات کی ہیں بلکہ ان پر محفوظ احکامات مقدسات کی سراسر کھلم کھلا توہین کر رہے ہیں

کیا اب یہ بات بڑی حد تک واضح نہیں ہو چکی کہ ذہنی معذور رمشاء سے جو عمل سرزد ہوا در حقیقت اس کو ایک خاص انداز میں سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ اس طرح عام کیا گیا کہ جس سے جو انگلیاں رمشاء مسیح پر اٹھنا تھیں ان کا رخ اب کسی ذہنی معذور اور اسلام دشمن فرقہ یا اقلیت پر نہیں بلکہ ایک شخص پر ہے کہ جو خود کا نہ صرف مسلمان گردانتا ہے بلکہ اپنے تئیں اسے یہ بھی یقین ہوگا وہ دیگر پاکستان مسلمانوں سے زیادہ بہتر اور باعمل مسلمان ہے جب در حقیقت اس نے اپنے اس اقدام ذریعے اپنے دین اور اپنے ایمان کو پیروں تلے روندنے میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی۔ رمشاء کم عمر قرار دی جارہی ہے اور ذہنی معذور بھی ثابت ہو چکی ہے۔ اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس کے اہل خانہ کو اب اس ساری صورتحال کے سامنے آنے کے بھی اندھی حمایت بھی حاصل ہو چکی ہے خود حکومت پاکستان اور پاکستان کے ذمہ دار مذہبی قیادت اس معاملے میں مضطرب ہے جبکہ رمشاء کو حاصل ہونے والی مغربی اور سیکولر لبرل افراد کی حمایت کے بعد قوی امکان ہے کہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے اہل خانہ کو جلد ہی کسی بھی مغربی ملک میں پناہ بھی مل جائیگی۔ لیکن مستقبل کے پاکستان میں ناجانے مزید کتنی ہی رمشائیں اس جیسے افسوسناک اور قابل مذمت فعل کا شکار ہو کر پاکستان کے اسلامی اور اسلام کے آفاقی تصور انسانیت کو داغدار کرنے کا سبب بنتی رہیں گی انسانی حقوق تنظیموں کی جانب سے جمع کیے جانے والے اعداد وشمار کے مطابق سال 1927 سے 1985 تک کے 58 سال کے عرصہ میں بلاسیفی قانون کے تحت درج ہونے

والے مقدمات کی مجموعی تعداد دس (10) تھی اور سال 1985 سے جنوری 2011 تک کے عرصے میں عدالتوں میں اب تک تقریبا ۴ ہزار مقدمات درج ہو چکے ہیں ان اعداد و شمار کو ساری دنیا اور خصوصا اسلام اور پاکستان کے اسلامی تشخص مخالف سیکولر قوتیں اور لابیاں صرف حیرت سے ہی نہیں دیکھ رہی بلکہ ان کی بنیاد پر پاکستان کے خلاف بھرپور پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور رمشاء مسیح جیسے کیسز ان سیکولر اور پاکستان مخالف قوتوں کے لیے سنہری مواقع ہوتے ہیں کہ جن کو جواز بنا کر پاکستان کو ساری دنیا میں بدنام کیا جاتا ہے اور بدقسمتی سے اس میں ان لوگوں کا بڑا حصہ ہے جو علم کی کمی اور خود کو سب سے برتر مسلماں سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو علماء حق کے ساتھ نہیں ہوتے نہ ان کی محافل میں جاتے ہیں نہ اس سے قربت رکھتے ہیں یہ لوگ اپنے تئیں کسی بھی اقدام کو اسلامی فعل سمجھتے ہیں اور اس کے نقصانات پوری امت مسلمہ بھگتی ہے

اگر اس سلسلے کو روکنا ہے تو قانون پر عمل درآمد کرانے کی ضرورت ہے۔ ناکہ قانون کو ختم کرنے کی سازشوں کا سہرا بن کر ملک کی سالمیت، وقار اور اپنے دین کامل مذہب اسلام کی اصل تعلیمات کو روندنے کی۔

اسلامی معاشرہ ایک متوازن معاشرہ ہے اسلام نہ صرف ریاست کے مسلمان شہریوں

کے لئے حقوق کا تعین کرتا ہے بلکہ غیر مسلم شہریوں کے لئے بھی یکساں حقوق رکھتا ہے۔ کسی فرد واحد کی وجہ سے ہمارے دین اسلام اور پاکستان کے آئین میں اہانت کے قانون میں ترمیم پر سوال اُٹھانا قطعاً درست اقدام نہ ہوگا۔

اگر ہر شخص قانون بنائے اور اسے چلانے کی کوشش کرے تو افراتفری پھیل جائے گی ایسے حالات کے لئے 'جنگل کا قانون' کی اصطلاح ہے۔ ایسے حالات پیدا کرنے والے کو حکومت گرفتار کرتی ہے۔ اور قانون کے مطابق سزا دیتی ہے نا کہ سزا دینے کے بجائے قانون ہی ختم کر دیا جائے۔ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ تمام عالمی برادری سزا نہیں قانون کے ختم کرنے پر زور دے رہی ہے۔

عدلیہ کے ذریعے قانون پر عمل درآمد کیا جانا ضروری ہے۔ اب گناہ گار چاہے مسلمان ہو، یہودی ہو، عیسائی ہو ہندو ہو یا کسی دوسرے مذہب کا پیروکار۔ قانون سب کے لئے برابر ہے۔ جسے ریاست تسلیم کرکے نافذ کرنے کی پابند ہے۔

ہمارے ملک میں اکثریت کا تعلق اسلام سے ہے۔ درحقیقت قرآن و سنت کی روشنی میں وضع کیے گئے قوانین سب انسانوں کے حقوق کا بھرپور تحفظ کرتے ہیں۔ مغرب میں ان قوانین کو انسانی حقوق کے خلاف بتایا جاتا ہے اور اسلام کو جابرانہ نظام زندگی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ایک اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ غیر مسلم رعایا کی جان و مال اس کی عزت وآبرو کی حفاظت اسی طرح سے ہوتی ہے جس طرح مسلمان کی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کاروبار، تجارت اور ہر قسم کا پیشہ اختیار کرنے کا حق ہے۔ غیر مسلم رعایا سے کئے گئے معاہدوں کی پاسداری اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو اپنے مذہب اور عقیدے پر عمل کی آزادی دی جاتی ہے۔

سبحان اللہ یہ ہے میرا دین کامل، مدعا فقط سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔ ایک فرد کی ذاتی عناد سے تعلیمات اسلامیہ کے منافی کےے جانے والے شخصی فعل کے سبب ساری اسلامی تعلیمات اور پاکستانی قوانین کو نشانہ بنانا درست نہیں۔ اپنے ذہنوں کو غلامی کے طوق سے آزاد کرنے کی ضرورت ہے۔اس واقعے کی بابت مذہب پر کوئی سوال اٹھانا درست نہیں۔

قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح "نہیں کرتے۔"

(الشعراء 151 - 152)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے۔

"اور ان میں سے کسی بد عمل اور منکر کی بات نہ مانو"

(الدھر 24)

جہاں معاشرے میں قانون اور اس پر عمل ضروری ہے وہیں اس کا تقدس سب سے زیادہ اہم ہے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مجھے ہے حکم اذان لاالٰہ الااللہ

## میری آزادی

"ابا سے چھپ کر ٹیرس پر جا کر سگریٹ پینے کا مزا ہی اور ہے۔"
ریحان نے سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے خود کلامی کی۔ نجانے یہ لوگ ابا اماں سگریٹ پینے کا منہ کیوں کرتے ہیں جبکہ ابا خود ڈبل پتی پان کھاتے ہیں اور اماں کے پان دان میں بھی تمباکو بھرا پڑا ہے جو نہ صرف اماں کھاتی ہیں بلکہ پڑوسن خالہ ثریا اور چچی سلطانہ کو بھی دیتی ہیں یعنی یہ خواتین بھی اچھی خاصی نشے کی عادت میں اپنی زندگی گزار رہی ہیں تو میں تو ایک گبرو خوبرو جوان ہوں یہ سگریٹ تو میرا اسٹیٹس سمبل ہے۔ کیا بھرم والی چیز ہے یہ بھی۔ یونیورسٹی میں درخت کے نیچے جب دوستوں کے ساتھ یہ سگریٹ میرے ہاتھ میں ہوتی ہے تو میں کسی انڈر ورلڈ ڈان سے کم نہیں لگتا۔
ریحان پہلی منزل کے ٹیرس پہ اپنے خیالات میں گم ہوا میں گھور رہا تھا وہ اِس بات سے بے خبر تھا کہ نیچے سے اُس کی اماں اور چھت پہ سے اُس کے ابا اُسے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اچانک ایک زنانہ جوتی نیچے سے اوپر آئی اور اُس کی سگریٹ زمین پہ گر گئی۔ ریحان اِس شدید حملے کو سمجھ نہ پایا تھا

اور نیچے کی طرف دیکھ کر معاملے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اوپر سے بھاری بھر کم مردانہ جوتا اُس کے سر پر پڑا اور اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اوپر سے آنے والے جوتے کے بھاری پن سے اُس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ابا نے چھاپہ مار دیا ہے اور اماں کو تو وہ نیچے دیکھ چکا تھا جو کمبخت کی سدائیں لگاتے نہ تھکتی تھیں۔

بہر کیف ابھی تو جوتے برسائے گئے تھے ابا کے تھپڑ کا خیال آتے ہی ریحان نے اپنے گال پہ ہاتھ رکھا اور اپنے کمرے میں بھاگ کر گھس گیا۔ ساتھ ہی دروازے پر کنڈی بھی لگا دی۔

اب حال یہ تھا کہ ریحان اوپر سے نیچے تک پسینے میں شرابور سر پکڑے بیٹھا تھ یکایک دروازے کی دھڑ دھڑ نے اُس کی سانسوں کو اور تیز کر دیا۔ باہر ابا تھے جو اپنی آواز کا پورا جادو جگا رہے تھے۔ "تم نہیں سدھرو گے کتنی دفعہ سمجھایا کیوں اپنی جوانی کے دشمن بنے بیٹھے ہو۔ ارے دروازہ کھولو۔۔۔! کچھ علم ہے یہ سگریٹ تمھارے پھیپھڑوں کو ختم کر دیگی وقت سے پہلے مر جاؤ گے۔ ریحان نے دروازہ کھولے بغیر عاجزی سے فریاد کی،

ابا اِس دفعہ معاف کر دیں اگلی دفعہ شکایت کا موقع نہ دونگا"۔"

کچھ دیر بعد باہر خاموشی چھا گئی۔ یعنی حالات قابو میں آ چکے تھے۔ بات آئی گئی ہو گئی وقت گزرتا چلا گیا۔ لیکن ریحان کی سگریٹ پینے کی عادت پختہ ہوتی گئی۔

ریحان والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اس لئے خود ہی اپنی ذات سے سوالات کرکے اُن کے جوابات تلاش کرتا رہتا۔

آج کا نوجوان کیا کرے۔ ماضی میں نوجوانوں کے پاس کتاب تھی اب وقت کی کمی ہے۔ ہماری اسٹڈیز بہت ہیں۔ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر معلومات کا خزانہ انڈیل رہا ہے صرف ایک بٹن کی جنبش ہوتی ہی کتنی طویل ہے۔ یہ تمام ابلاغ کے ذرائع افراد کو ایک لڑی میں پرو رہے ہیں اور تعلقات کی نہج انہیں قریب سے قریب کر رہی ہے۔ پر ہمارے بڑے یہ سمجھتے ہی نہیں نجانے کیوں۔

آج ریحان کا ایک دوست یونیورسٹی میں گاڑی لے کر آیا تھا تو کراچی کی سڑکوں پر گشت کا پروگرام بننا ضروری تھا۔

یوں دونوں دوستوں نے کار میں ریپ میوزک تیز آواز میں سننا پسند کیا۔ ریحان

کے دوست عاصم نے کراچی کے پوش علاقے کی طرف رخ کیا اور کار لکڑی کے ایک خوبصورت دروازے پر روکی۔

ریحان کی تشویش بڑھتی جارہی تھی اُس سے رہا نہ گیا۔ آخر بے صبری میں کہنے لگا۔

"آخر تم مجھے کہاں لے کر آئے ہو۔"

عاصم نے پر اطمینان لہجے میں جواب دیا۔ یہ ہماری نئی نسل کی تفریح کا نیا زاویہ ہے۔ نیا کلچر شیشہ۔ تم ایک کش لگاؤ مزا آجائے گا۔ شیشہ سے آشنائی سے بہت دن نہیں ہوئے پر یہ کشش کا سامان رکھتا ہے۔ واہ خوشبو اور ذائقہ چلو تو میرے دوست طبیعت بحل جائیگی۔

اندر داخل ہوتے ہی ریحان کو وہاں کا ماحول کچھ عجیب لگا پر اُسے مزہ آرہا تھا۔ نیم تاریک خوابناک ماحول، ہلکی پھلکی موسیقی، مترنم آوازوں اور بہترین ریفریشمنٹ کا سامان رکھتی تھی۔Relaxation سروس کی بدولت یہ جگہ

شیشہ کا کش لیتے ہی اُسے بہت اچھا لگا۔ 22 سالہ ریحان یہ بات اچھی طرح جانتا

تھا کہ اِس فینسی حقہ کا ایک کش سو سگریٹ پھونکنے کے برابر ہے پر وہ اِس خیال کو جھٹکتے ہوئے پھر عاصم سے مخاطب ہوا۔

یہاں تو لڑکیاں بھی شیشہ پی رہی ہیں۔ ایک مسلمان ملک میں کم از کم ایسی بیرونی" تفریح کی گنجائش نکلنی چاہیے ورنہ جذبات و احساسات کے اظہار کی قید میں نوجوانوں کی تخلیقی سرگرمیاں ماند ہو سکتی ہیں۔ نوجوانوں کو زندگی کا لطف اٹھانا چاہیے۔ اب یہ لطف صرف پارک نہیں دیتے۔ پارک میں جاگنگ ہو سکتی ہے واک ہو سکتی ہے پر نوجوان لڑکے لڑکیاں آزادانہ ہر موضوع پر بات چیت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ پارک گھٹن "زدہ ماحول کا منظر پیش کرتے ہیں۔

عاصم نے ریحان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"بلکل یہ ماحول کتنا رومان پرور ہے۔"

ریحان سگریٹ کے بعد شیشہ کا شوقین ہوگیا۔ شیشہ کے ہوٹلوں میں جانا اب اس کا معمول تھا۔ بات یہاں ختم نہ ہوئی نام نہاد آزادی، اپنا آپ معاشرے میں منوانے کی خواہش میں وہ شراب پینے کو بھی عیب نہ سمجھتا تھا۔ اُس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی۔ ریحان کی اماں کو اپنے بیٹے کی سرگرمیوں پہ شبہ ہوا تو گھر سے جیب خرچ کا سلسلہ روک دیا گیا۔ اب ریحان نے ابا کی جیب سے

پیسے چرانے شروع کر دیے۔ اِس نوجوانی کے نشے کا خمار اُسے ہیروئن کی سگریٹ تک لے گیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ریحان اب چوبیس سال کا ہو گیا تھا۔ لیکن زندگی کے ہنگاموں سے دور ہسپتال کے ایک کمرے میں بے بسی سے دیواروں کو گھور رہا تھا۔ نشے کی عادت نے اُس کے پھیپھڑوں اور گردوں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ ہسپتال کے کمرے کے باہر بیٹھی اُس کی اماں کی سسکیوں کی آواز وہ سن سکتا تھا۔ اپنے ابا کی اداس آنکھیں اُسے سینے میں خنجر کی طرح لگ رہی تھیں۔ پر صد افسوس وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

وہ خود سے مخاطب تھا۔

"کیا یہ ہے ہماری نئی نسل کی آزادی۔ کیا آج کا نوجوان آگے بڑھنے کی جستجو میں صحت کا شعور، معاشرتی حدود سب بھول گیا ہے۔ آج سیل فونز، ایس ایم ایس، انٹرنیٹ چیٹنگ اور طویل گفتگو کے بعد بھی ہم تفریح کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اور یہ تفریح ہمارے جسم، روح اور دماغ کو کیسے چھلنی کر رہی ہے۔ ہم اِس سے بالکل ناواقف ہیں۔

کیا یہ ہے ہماری جدید معاشرت۔

بلا وجہ پریشان ہوتی ہیں"۔

# امتحان میں یقینی کامیابی ۔۔۔ ممکن ہے

"امتحان کا وقت شروع ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی ہے"

"اَرے یار اب پچھتائے کیا ہُوَت جب چڑیا چُگ گئی کھیت"

"چڑیا نے ابھی کھیت چُگا نہیں"

تو سمجھو چڑیا کا پیٹ بھر گیا"

"رب کی پناہ ! تمھاری زبان سے کبھی اچھے حروف ادا ہونے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔

کاش کہ تم نے کچھ پڑھ لیا ہوتا تو آج یہ نہ کہتے"

کمرا امتحان کے باہر اکثر دوستوں کے درمیان اِس قسم کے جملوں کا تبادلہ سننے میں آتا ہے۔ چند فقرے پہلے، تو چند امتحان ختم ہونے کے بعد۔ جبکہ بعد کے فقرے تو اور زیادہ بے محل لگتے ہیں۔ جیسے آدمی کسی میت پہ کوئی لطیفہ سنا دے۔

بظاہر تمام ہم جماعت خوش گپیوں میں مگن امتحان ختم ہونے پر سکون کا سانس لینے کا چرچہ کرتے ہیں۔ کینٹین پر دھاوا بول کے خوب مزے سے امتحان کے دوران ہونے والی باتوں سے آلو کے گرما گرم سموسے کی طرح مستفید ہوا جاتا ہے کہ

فلاں کا منہ دیکھا تھا بیچارے کو کچھ نہیں آتا تھا" "اور تم نے اُس کا حال دیکھا سر نے کیسے" اُس کے نقل کے تمام آلہ کار اپنی دسترس میں لے لے ہے" یعنی تقریباً تمام ساتھیوں کو طنز ومزاح کا نشانہ بنانے کے بعد قریبی ساتھی سے اپنا اور امتحانی پرچہ کا احوال بیان کیا جاتا ہے۔ ہر کوئی خود کو معیار کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔

کوئی خود کو افلاطون اور آئن اسٹائن تصور کرتا ہے تو کوئی وقت کی کمی کا رونا روتا ہے۔ کہیں امتحانی پرچہ میں نقص نکالے جاتے ہیں تو کہیں سے "دیکھا جائے گا" کی صدائیں سُنائی دیتی ہیں۔

حقیقت کا علم تو نامہ اعمال ملنے کے بعد ہی ہو پاتا ہے۔ کسی کی آنکھوں سے مسکراہٹ ٹپکتی ہے تو کوئی ٹوتھ پیسٹ کا چلتا پھرتا اشتہار نظر آتا ہے۔ کہ خوشی کی حد ہی نہیں نتیجہ جو اچھا آیا ہے تو خوشی کیوں کر نہ ہو۔

دوسری جانب چند ساتھیوں کے چہرے کی ہوائیاں اُڑی ہوئیں ہیں۔ ذہن میں اماں کی جھاڑو کا تصور ہے تو کوئی اَبا کے طنز میں ڈوبے جملوں کی کڑواہٹ محسوس کرتا ہے۔........! یہ وہ ساتھی ہیں جن کا نتیجہ مایوس کُن ثابت ہوا ہے۔ اَرے بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ اگلا جملہ سننے کو یہ ملتا ہے کہ "اگلے سال دیکھ

لیں گے اور دیکھنا اِس دفعہ پورے سال بس پڑھائی ہی ہو گی" جبکہ نتیجہ ہمیشہ کی طرح مایوس کن ہی نکلتا ہے۔

ہاں ! یہ بات ضرور ہے کہ اپنی صلاحیتوں پر شبہات کا اظہار کرتے ہوئے خود سے بہتری کی اُمید چھوڑ دینا غلط ہے۔

ایک دفعہ نمبر کم آنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اگلی مرتبہ بھی نتیجہ وہی نکلے گا۔ اچھے کی اُمید بہر حال رکھنی چاہیے۔

ہم بھی اُسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو تمام معاملات ڈھٹائی سے اگلے سال پر ڈال دیں۔ ہم اُس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں یہ ہم نے مانا۔ لیکن اگر پہلے سے پورے سال کا لائحہ عمل تیار کر لیا جائے اور ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعلیمی سرگرمیوں میں حصّہ لیا جائے تو ہمیں صد فیصد یقین ہے کہ کامیابی آپکا مقدر ہو گی۔

اِس ضمن میں سب سے پہلے درسگاہ میں باقاعدہ حاضری کو یقینی بنایا جائے۔ ہمارے اسکول میں پڑھنے والے ساتھیوں کے لئے ایسا کرنا مجبوری ہے جبکہ کالج اور یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے طلبہ و طالبات اکثر اس معاملے میں

لاپرواہی دکھاتے ہیں۔اور غیر حاضری کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے تسلسُل اختیار کر جاتا ہے۔
جو کہ غلط ہے۔ درسگاہ میں حاضری کامیاب سال کے لئے پہلی سیڑھی کی حیثیت رکھتی ہے۔

سال شروع ہونے کے تین ماہ بعد پہلے کے مضامین کی مشق ضروری ہے۔ یعنی جو مضامین اِس عرصے میں پڑھائے جا چکے ہیں۔ اُن کی تیاری کر لی جائے۔اِس طرح تعلیمی سال کے آخر میں بوجھ نہیں پڑے گا۔

امتحان سے کچھ عرصے قبل اپنے معمولاتِ زندگی کو تبدیل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی باقاعدہ طور پر
دوسری غیر نصابی سرگرمیوں سے کنارا کرتے ہوئے پڑھائی کے لئے وقت مقرر کیا جائے۔

گروپ اسٹڈی کا طریقہ کار بھی نہایت مناسب ہے۔ایک موضوع پر دو تین ساتھی مل کر اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں اِس طرح سب ایک دوسرے کا نقطۂ نگاہ سے واقف ہونگے ساتھ ساتھ سمعی بصارت میں آواز گونجنے کے اپنے فائدے ہیں۔ دوران امتحان غیر شعوری طور پر کسی پہلو کے ذہن میں آتے ہی اُس مدعا کو شاملِ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ چند طلبہ و طالبات انگریزی آتی ہو نہ آتی ہو خود کو

صفحہ اول میں شامل کرنے کے لئے انگریزی کو حربہ سمجھتے ہیں۔ انگریزی لکھنا پڑھنا صحیح طرح آتی ہو تو الگ بات ہے۔ لیکن خوامخواہ انگریزی کا وبال سر پہ اُٹھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ کوشش کی جائے کے اظہار کے لئے وہ زبان استعمال کی جائے جس پہ مکمل عبور حاصل ہو۔

جو اسباق یاد ہیں اُن پر رسہ کُشی کرنے کی ضرورت نہیں۔ یعنی اکثر دیکھا گیا ہے جو مضامین یاد ہیں اُنہیں کو بار بار پڑھ کر حفظ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس کی جگہ اُن مضامین کو پڑھا جائے جن کے بارے میں آگہی کم ہے۔

ایامِ امتحان میں اور امتحانی پرچہ ملنے کے بعد دونوں صورتوں میں پہلی شرط ذہن کو پر سکون رکھنا ہے۔ بلا ضرورت فکر و پریشانی کو اپنا ساتھی نہ بنایا جائے اِس طرح دماغی کار کردگی کے ساتھ ساتھ جسمانی کارکردگی بھی متاثر ہوگی۔

اکثر امتحانی پرچہ ہاتھ لگتے ہی کہیں اندر سے آواز آتی ہے کہ " مارے گئے ایک سوال بھی نہیں آتا" جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ امتحانی پرچہ میں موجود تمام سوالات کا بغور جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایک سوال کے کئی پہلو نکلتے ہیں۔ ایک طویل گہری سانس کھینچنے کے بعد پرچہ شروع کرنا بہتر ہے۔

عموماً پرچہ پانچ سوالات پر محیط ہوتا ہے۔ ہر سوال کے لئے تیں منٹ کا وقت رکھنا چاہیے۔ ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کس سوال کے کتنے نمبر ہیں۔ یا وہ سوال کونسا ہے جو کم وقت میں ہو سکتا ہے۔ جو سوال کم وقت لے اُسے آخر کے لئے رکھ دینا چاہیے۔

پرچہ ختم کرنے کے بعد ایک دفعہ حل شدہ کاپی کا جائزہ لینا بہتر ہے۔ تاکہ یہ تَسلی کر لی جائے کے کہیں کچھ رہ تو نہیں گیا یا اگر کچھ غلط ہے تو اُسے درست کر لیا جائے۔

اللہ کا نام لے کر کاپی نگراہ امتحان کو سونپ دی جائے۔ نتیجہ نکلنے تک بارگاہِ الٰہی میں کامیابی کی دُعا کرتے رہنا چاہیے۔ اور نتیجہ نکلتے ہی شکرانے کے نوافل کا اہتمام کرنا بہترین عمل ہے۔ تاکہ رب راضی ہو جائے اور ہمیشہ دنیا و آخرت کی کامیابی مقدر بنے۔

# اپنی پہچان کی جنگ

عورت اور مرد کے روایتی طرز زندگی کا انداز بدل رہا ہے۔ مرد و عورت کو برابر حقوق ملنے چاہیے۔ مرد و عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں ۔ مرد و عورت معاشرے کے اہم رُکن ہیں۔

یہ وہ جملے ہیں جو گاہے بگاہے کانوں میں صدا دیتے ہیں۔ مگر کیا حقیقت اِس طرح ہے ؟ کیا عورت کو وہی مواقع ماحول اور حقوق حاصل ہیں جو ہمارے معاشرے میں ایک مَرد کو حاصل ہیں۔ آج ہم پاکستانی معاشرے کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو صورتحال کچھ مختلف نظر آتی ہے۔

اکیسویں صدی کے اِس دور میں بھی عورت اپنی پہچان کے ان گنت مسائل کا شکار ہے۔ پاکستان کے دور افتادہ علاقوں کے دیہاتوں میں صورتحال انتہائی افسوس ناک ہے۔ آج بھی کاروکاری، قرآن سے شادی، وٹہ سٹہ ، غیرت کے نام پر قتل جیسی رسومات موجود ہیں۔

تعلیمی سہولیات تقریباً ناپید ہیں اور جن علاقوں میں موجود ہیں وہاں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں کہ یہ پڑھ لکھ کر کیا کریں گی۔ ان کا کام

چولہا، چکی ہے۔اِس موقع پر لوگوں کے ذہن سے یہ حقیقت اوجھل ہو جاتی ہے کہ ایک عورت نسلوں کے لئے نشانِ منزل ہے جو معاشرے کے باشعور افراد تیار کرتی ہے۔

شہری زندگی کی صورتحال بھی اِس سے کچھ مختلف نہیں شہروں میں بھی ایک طبقہ یہی زاویہ نگاہ رکھتا ہے۔ تعلیم لڑکی کو دلوائی بھی جاتی ہے تو صرف اِس حد تک کے وہ "پَڑھ لکھ" سکے۔ جبکہ شعوری طور پر عملی زندگی میں قدم رکھنے پر خاطر خواہ توجہ نہیں جاتی۔ جو بہرحال آگے کی زندگی میں اُس کے لئے مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ وہ اپنے گرد و نواح پر نظر دوڑاتی ہے تو احساسِ محرومی اور بے قدری کا احساس اُسے ذہنی تناؤ میں بتلا کر دیتا ہے۔ جبکہ والدین اپنی کوتاہی سے بے خبر رہتے ہیں کہ آج کے دور میں بھی اپنی بیٹی کو تعلیم نہ دلوا کے اُنھوں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

اسلام عورت کو علم حاصل کرنے سے نہیں روکتا نہ ہی کسی ایسے ہنر کو سیکھنے سے منع کرتا ہے جو اِن کے لئے معاش کے حصول کا ذریعہ بن سکیں۔ اسلام جائز طریقے اختیار کرنے پر پابندی نہیں لگاتا۔ البتہ مغربی معاشرے کی بے حیائی، بے راہ روی اور بے لگام آزادی کی اسلام تائید نہیں کرتا۔

ایک بچہ مذہب اور اخلاق کا درس آغوشِ مادر سے حاصل کرتا ہے اگر ماں ہی غیر تعلیم یافتہ اور محدود سوچ کی حامل ہوگی تو وہ کس طرح اپنی اولاد کے شعور

کی پرورش کرے گی لیکن افسوس ہماری آنکھیں نہیں کھل رہیں اور ہم اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں۔

اکثر لڑکیوں کو یہ کہہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا جاتا ہے کہ "جو کرنا ہو اب اپنے گھر میں شادی کے بعد کرنا" جبکہ اکثر شادی کے بعد بھی اُس کی یہ خواہش خواہش ہی رہ جاتی ہے۔

شادی کے بعد عورت اپنی تعلیم کو مکمل کرنا چاہے۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہے اور اپنی جہد مسلسل کے ذریعے اپنی زندگی کی ہر ناکامی کو دور کرنا چاہے تو اُسے ایک نئی صورتحال کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر وہ گھر کے معاملات یا بچے کی نگہداشت و تربیت کو متوازن انداز چلاتے ہوئے نوکری کرنا چاہے تو کبھی شوہر کے طنز و طعنہ ہوتے ہیں تو کبھی سسرال والے اپنی باتوں کے ذریعے نشتر چبھوتے ہیں۔ اور اِس طرح اُس چھوٹی سی بچی کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش خود کو منوانے کی خواہش اور اپنی پہچان کی جنگ لڑتے چلے جانا اُس وقت بھی کم نہیں ہوتا جب وہ ایک مکمل عورت بن کر معاشرے کو بنانے والے ذمہ داران میں شامل ہو جاتی ہے۔

آج بھی پاکستان میں متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورت اپنے مقام سے

ناواقف ہے اور اپنی اہمیت کو فراموش کر بیٹھی ہے۔ عورت کا ایک روپ بیٹی ہے۔
اسلام نے اِس کے حقِ زندگی، حقِ تعلیم و تربیت کی تاکید پورے زور و شور سے کی ہے۔
ہمارے شہری علاقوں میں جہاں نسبتاً تعلیم عام ہے لڑکیوں نے لڑکوں کے مقابلے میں تمام تعلیمی شعبوں میں بہترین کارکردگی کے تمغے حاصل کیے۔ مگر جب یہ لڑکیاں اپنی تعلیمی قابلیت کی بنا پر عملی زندگی میں قدم رکھنا چاہتی ہیں تو جا بجا رکاوٹیں اُنکا مقدر بنتی ہیں۔ اکثر یہ کہہ کر روک دیا جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کیا ہمیں لڑکی کی کمائی کی ضرورت پڑ گئی جو ہم تم سے نوکری کروائیں۔ نوکری کرنے والی لڑکیوں کو ہمارے معاشرے میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ والدین کو یہ تشویش ہوتی ہے کہ رشتے اچھی جگہ سے نہ آئینگے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت پڑھے لکھے والدین بچپن ہی سے غیر محسوس طریقے سے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ الگ الگ سلوک کرتے ہیں اور کبھی کبھی انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔ لڑکی ماں کی جانب سے ملنے والے اشاروں کو سمجھنے لگتی ہے وہ اپنے کاموں سے آگاہ ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنی جنس سے بھی آگاہ ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ اپنے عورت ہونے کا مطلب بھی سمجھنے لگتی ہے۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے سمجھ جاتی ہے کہ جس گھر میں اِس کی پرورش ہو رہی ہے

یہاں اِس کا قیام عارضی ہے۔اِس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ اُس کی ماں کا گھر اور تھا لیکن وہ اُس کے باپ کے گھر رہ رہی ہے۔تاہم اِسے کسی قسم کا سوال کرنے پر جھڑک دیا جاتا ہے۔

بہت چھوٹی سی عمر ہی میں ماں باپ کے لہجے سے اِس میں یہ بات پختہ ہونے لگتی ہے کہ اِس کے وجود کے ساتھ شاید کوئی غلط چیز جڑی ہوئی ہے۔ والدین کو اپنا انداز بدلنا ہوگا۔ خواتین کو فیصلہ سازی کا حق نہیں دیا جاتا۔آج بھی والدین جہاں چاہتے ہیں لڑکیوں کی شادیاں کر دیتے ہیں اور اِس معاملے میں انہیں بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جنہیں اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر ہر فیصلہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے جیسا وہ اپنے شوہر یا باپ کی ملکیت ہے۔ بچی کے طور پر وہ اپنے باپ کی ملکیت ہوتی ہے اور باپ جس سے چاہے اپنی بیٹی کی شادی کر سکتا ہے۔پاکستان کے بعض علاقوں میں باپ پیسے کے عوض اپنی بیٹی فروخت کر دیتا ہے اور بعض جگہ نام نہاد رسومات کی بناء پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات لڑکی جائداد کی طرح اِس کے شوہر یا آجر کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے۔اور شادی کے بعد وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جب چاہے اپنی بیوی کے جسم کو استعمال کر سکتا ہے۔ایسی سوچ رکھنے والے شخص سے یہ

کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ عورت کے دیگر حقوق کا خیال رکھے گا۔ یہ تصورات عورت کو ہی نہیں پورے معاشرے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ایک لڑکی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اِس کی زندگی کے بارے میں اہم فیصلے کرتے ہیں۔اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خود کیا چاہتی ہے یا اِس کی اپنی بھی کوئی خواہش ہو سکتی ہے۔ جبکہ اسلام نے شریک زندگی کے انتخاب کے معاملے میں مرد و عورت دونوں کو پسند ناپسند کا اختیار دیا ہے۔

بیشتر خواتین چاہتی ہیں کہ وہ اپنا ہنر دوسروں تک منتقل کریں اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو نوازیں اور معاشرے کو فائدہ پہنچائیں لیکن وہ اپنے خاندانی رسم و رواج اور بعض قطعی نام نہاد قسم کے بندھنوں میں اِس قدر جکڑی ہوتی ہے کہ کوشش کے باوجود باہر نہیں نکل پاتی اور اِس کی ساری خواہشیں اِس کے اندر ہی مر جاتی ہے ں۔

یہ انتہائی ظلم اور انصاف کے تقاضوں کے قطعی برعکس سلوک ہے۔ جو ہمارے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ اکثر و بیشتر دیکھنے کو ملتا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ رویہ صرف ان پڑھ ، جاہل افراد یا گاؤں دیہات ہی نہیں بلکہ بعض اوقات پڑھے لکھے اور معزز خاندانوں کے افراد میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

یہ بات عورت کو معلوم ہونی چاہیے کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں اِس کا جسم اِس کا ذہن اِس کا دل اور اِس کا دماغ سب پر اِس کا اپنا اختیار ہونا چاہیے اور وہ اِس کا حق رکھتی ہے۔
مسئلہ صرف شعوری کوشش سے حل کرنے کا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تضاد پایا جاتا ہے۔ دراصل ہم معاشرتی ذہنی غلامی کا شکار ہیں جبکہ ہمارے دین اسلام میں عورتوں کو واضح حقوق دے گئے ہیں۔
اسلام نے عورت کو بحثیت بیٹی ، بہن ، بیوی ہی حقوق نہیں دے بلکہ بحثیت ماں اِس کے قدموں کے نیچے جنت کا مژدہ سنایا گیا اور دنیا میں حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق اِس کو ٹھہرایا گیا۔
حقیقت یہ ہے کہ مرد و عورت کو زندگی کا سفر ساتھ کرنا ہے تو پھر امتیازی سلوک کیسا۔
عورت وہ پھول ہے جو تصویرِ کائنات کو محبت کی خوشبو سے مہکا دیتی ہے۔ عورت مردوں کا ضمیمہ نہیں بلکہ اس کی اپنی ایک مستقل حیثیت ہے۔
دستِ حنا سے گیسوئے گیتی سنوار دو
تم عارضِ حیات کو آؤ نکھار دو

## مجھے ہر حال میں یہ کام کرنا ہے اگر ایسا نہ ہو سکا تو بڑی مشکل ہو گی

یہ وہ جملہ ہے جو اکثر خواتین دہراتے نظر آتی ہیں۔ کم و بیش 90 فیصد گھریلو خواتین اپنی ذمہ داریوں کو بوجھ جان کر اِس طرح خود پہ سوار کر لیتی ہیں کہ گویا یہ نہایت پریشان کن سفر ہے۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ خواتین مردوں کے مقابلے میں زیادہ نفسیاتی و ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ کیونکہ خواتین پر اُمورِ خانہ کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کو انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ درحقیقت جب ہم اپنے کسی کام کو دل سے قبول کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ ایک بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی کسی بھی صورتحال میں ہم صرف پریشان ہی ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف تو پورے گھر کا نظام متاثر ہوتا ہے اور دوسری طرف گھریلو ماحول کی خرابی کے باعث ہماری ذہنی اور جسمانی قوت بھی متاثر ہوتی ہے رفتہ رفتہ ہر ذمہ داری ایک شکوہ کا روپ اختیار کر جاتی ہے۔

بنیادی نفسیاتی وجہ ہے کہ بحثیت انسان ایک عورت بہت کچھ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ لیکن گھریلو ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے اپنی ذات کو ناکارہ اور بیکار سمجھنے لگتی ہیں۔ جیسے اُن کا وجود گھر میں زم ہو گیا ہے۔ جبکہ ایسا

سوچنا غلط ہے۔ ایک عورت مکان کو گھر بناتی ہے اُسے سنوارتی ہے۔ اُس گھر کے افراد اُس کے گو نا گو تابع ہوتے ہیں اور عزت کرتے ہیں۔ اسلام نے خاتون خانہ کو گھر کی ملکہ یا کردار ساز ہونے کا مرتبہ دیا ہے اور یقیناً یہ ایک اعلیٰ رتبہ اور اعزاز ہے۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی ذات کو ناکارہ اور بیکار سمجھنا اپنے ساتھ ناانصافی ہے۔

اگر گھریلو خواتین اپنی ذات کو اِس نظریے پر رکھ کے دیکھیں تو یقینا سوچ کا یہ انداز زندگی کو نہایت خوبصورت بنادے گا اور پھر ذمہ داریاں بوجھ محسوس نہ ہوں گی۔

اپنے کاموں میں دلچسپی بڑھے گی اور بے وقعتی کا احساس نہ رہے گا۔ کیوں کہ اپنی نظروں میں بلند ہو کر ہی دوسروں کی نظروں میں بلند ہوا جا سکتا ہے۔

اپنی سوچ کو تبدیل کرتے ہوئے ہر معاملے میں خود کو حالات کا ہدف قرار دینے اور کڑھتے رہنے کی بجائے اپنے آپ کو بہتری کے لئے تیار کر کے معاملات کو آسانی سے سلجھایا جاسکتا ہے۔ فقط اپنے کاموں کو خود پر بوجھ نہ بنائیں۔

کثرت کار کی شکایت اور کام کی زیادتی یا تھکن سے چور ہونے جیسے جملے ہی

اعصاب شکن ہوتے ہیں۔ ہر گھریلو ذمہ داری آپ کے لئے چیلنج ہے جس کو قبول کرتے ہوئے آپ اپنی شخصیت کو منوا سکتیں ہیں۔ نہ ہی مسائل کو اپنے اوپر سوار کیجئے اور نہ ذمہ داریوں کو بلا وجہ لٹکائیں ۔ کام ایسی ترتیب اور نظم سے کیجیے کہ ایک طرف کام کی زیادتی نہ معلوم ہو اور دوسری طرف وہ بہ آسانی تکمیل پا جائے۔

☆اپنی شخصیت کو تباہ کرنے کا پہلا قدم 'خود رحمی' ہے۔ اپنے آپ کو مظلوم گردانتے ہوئے کام کی دہشت ذہن پر مسلط کرنا دُرست نہیں۔ اپنے کاموں میں دلچسپی لیجیے تو زندگی سہل معلوم ہوگی۔۔

☆ گھریلو اُمور جیسے کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی ستھرائی کر لینا، بچوں کی دیکھ بھال یہ تمام فرائض منصفی تو ہیں ہی ۔ ساتھ ساتھ خود کو بدلتی دنیا کے ساتھ ساتھ رکھنا بھی ضروری ہے۔

☆ اکثر صاحبِ خانہ کسی اہم مسئلے پر خاتونِ خانہ کی رائے اِس لئے لینا مناسب نہیں سمجھتے کیوں کہ اُن کے خیال میں یہ وقت کا ضیاں ہے۔ اور اس طرح غیر محسوس طریقے سے اپنے کمتر ہونے کا احساس پروان چڑھتا ہے۔ دراصل یہ حالات بھی گھریلو خواتین کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ خواتین اپنے آپ کو بہت محدود کر لیتی ہیں۔ جبکہ گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔

☆ وقت کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ ہر ذمہ داری تیزی سے مکمل کرنے کے لئے اپنی پوری قوتیں صرف کر دیں۔

☆ بے وقت آرام یا ٹیلی ویژن کے سامنے وقت ضائع کرنے کے بجائے ایسے مشاغل تلاش کیجیے جو آپ کی ذہنی یکسوئی کا سبب بنے۔ اِس طرح آپ کی قابلیت کھُل کے سامنے آ ئیگی اور بے وقعتی کا احساس ختم ہوگا۔

☆ اپنی شخصیت پر مثبت اثر ڈالنے اور اپنا رویہ بہتر بنانے کے لئے مسکراہٹ بلاشبہ ایک مضبوط ہتھیار ہے۔ اپنے اندر محسوس کریں تو زندگی اب بھی بچپن میں تتلیاں پکڑنے جیسے ہی خوبصورت ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوشیوں کی کشید کریں۔ بچے کی معصوم شرارتوں پر چیخنے چلانے کی بجائے ایک چھوٹا سا قہقہہ بھی آپ کو خوشی سے ہمکنار کر کے کثرتِ کار کے احساس کو کم کر سکتا ہے۔

☆ گھر گرہستی چلانا یقیناً کسی عورت کے لئے محاذ سے کم نہیں۔ اپنے اوپر اعتماد کیجیے۔ آپ اپنے مسائل کا بہتر حل تلاش کر سکتی ہیں۔ اِس بات پر یقین رکھیں کے اللہ کسی شخص پر اِس کی استطاعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔

☆ ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھتے ہوئے جسم سے زیادہ ہمارا دماغ تھکن محسوس کرتا ہے۔ چوں کہ جسم تابع ہے دماغ کے۔ اس لئے جسم بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ دماغ تھکتا نہیں ہے بلکہ نفسیاتی طور پر تھکن کا احساس ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے بے اطمینانی، عدم دلچسپی اور اُلجھیریں ہوتی ہیں۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں میں خوبی اور جدت پیدا کیجیے۔ اِس طرح آپ کا دماغ اُس ذمہ داری کو

نہ صرف قبول کریگا بلکہ آپ آسودگی بھی محسوس کریں گی۔ مثلاً کھانے کا اہتمام کرتے ہوئے نت نئے تجربات کریں۔ نئے اور مختلف انواع کے کھانے تیار کیجیے۔ ضروری نہیں کہ ایسا مہمانوں کی آمد پر ہی کیا جائے۔ بلکہ خود اپنی ذاتی خوشی اور دلچسپی کے لئے ایسا کیا جاسکتا ہے۔

☆ اپنے شریکِ حیات سے گفتگو کے لئے خاص وقت نکالئے۔ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیجیے۔اِس طرح شخصیت پر بہت مثبت اثرات مرتب ہونگے۔آپ کی نظر میں خود اپنی ذات کی اہمیت بڑھے گی۔ سات ہی اپنے انمول ہونے اور گھر کی ملکہ امور کردار ساز بننے کا خوبصورت احساس پیدا ہوگا۔

:اختتامیہ

کہتے ہیں کہ اگرایک بیج بو کہ اُس کی دیکھ بھال کی جائے اور پودا بننے سے لے کر تناور درخت بننے تک اس کا خیال رکھا جائے تو زندگی کا مصرف مل جاتا ہے۔

ایک عورت گھر بناتی ہے۔ رشتوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اپنی اولاد کو معاشرے کے ساتھ چلنے کا اہل بناتی ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو اُس سے وابستہ تمام رشتے مسکراتے ہیں۔ جب وہ دکھی ہوتی ہے تو سارا گھر اُداس ہوتا ہے۔ اتنی محبت اور مرکزیت کے بعد بے وقعتی کا احساس کیوں ۔ ذمہ داریاں جو آپ کو پہچان دیتی

! ہیں اُس کا بوجھ کیسا

گھر اور چار دیواری کسی نعمت سے کم نہیں۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیجیے وہ شکر اور صبر کرنے والوں کو زیادہ نوازتا ہے۔

# پیرس سے گوجرانوالہ

آہ۔۔۔ پیرس بھی کیا خوب صورت جگہ ہے خوشبوؤں کی دنیا خوبصورت عمارتیں پیارے پیارے چہرے بس پاپا آپ اس دنیا کے سب سے اچھے باپ ہیں جو مجھے اس سال چھٹیوں میں یہاں وزٹ پہ لائے So lucky I am وحید کے لب پہ یہ جملے تھے کہ اسے تیز بارش اور شور نے پریشان کر دیا۔ کسی کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا کہ یار یہ آج ابّے کو کیا ہوا یہ چلّا کیوں رہے ہیں کہ بارش اور تیز ہو گئی وہ ہڑبڑا کہ اُٹھا اور اپنے اطراف کی دنیا کو غور سے تکنے لگا۔

اسے شور اور آوازوں کی پرواہ نہ تھی اس کا دل تو زور زور یہ سوچ کے منہ کو آرہا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا وہ صرف خواب تھا یہ پیرس نہ تھا بلکہ کراچی کے علاقے سرجانی ٹاؤن کا چھوٹا سا مکان تھا۔ سترہ سالہ وحید پریشانی میں زور زور سے سر کھجانے لگا۔ لیکن اب ابّے کی آواز اور الفاظ اُسے ٹھیک طرح سنائی دے رہے تھے۔

"نا تو کیا نیند میں پاپے پاپے کی رٹ لگا رہا تھا۔ اُٹھ جا ہٹ حرام دیکھ

ذرا دن چڑھ گیا ہے گا ویسے ہی گھر میں پانی نہیں تھا تے دو ڈول تو میں تیرے اوپر پھینک دیے نا۔ ہور میں کی کراں توں وی ناں اُٹھتا ہی نہیں۔ چل شاباش پتر اُٹھ جا۔ وحید نے جھٹ سے اپنے ابّے کی طرف لپک کے اُس کی ٹانگیں پکڑیں اور چاپلوسی دکھاتے ہوئے اُنہیں دبانے لگا۔ وحید کا باپ بیٹے کی اس حرکت پر مسکرا اُٹھا اور زور دار قہقہے کے ساتھ وحید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

بول پتر اب کی ہویا۔ نا اب کیا فرمائش اے تیری'۔'

وحید نے آؤ دیکھا نا تاؤ بغیر روکے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بولا۔

وہ ابا مجھے چھٹیوں میں پیرس بھیج دے نا'۔'

وحید کے باپ نے بیٹے کو غور سے دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا 'پتر توں وی صویرے صویرے مذاق کر رہا ہے گا۔ مسخری نہ مار چل کالج کی دیر ہو رہی ہے۔ میں تینوں چھوڑ کے علاقے میں دودھ سپلائی کر لوں گا'۔

وحید کو یک لخت غصہ آگیا۔ غصّہ سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

ابا جب میں ایک دودھ بیچنے والے کا بیٹا ہوں تو کیوں پڑھایا تو نے مجھے بڑے کالج میں' کیوں مجھے بڑے بڑے خواب دیکھنے پہ مجبور کر دیا۔ مجھے پتہ ہے مجھے بھی دودھ ہی بیچنا پڑے گا۔ بلا وجہ ابا تو نے لاکھوں روپے میری

پڑھائی میں ڈال دے۔ اب بھی میں جانتا ہوں تو نے پیسے جمع کر کے رکھے ہیں پر نہیں تو مجھے نہیں دے گا کہ میں چھٹیوں میں کچھ تفریح ہی کر لوں۔ وحید کے باپ کو اپنے بیٹے کی بد تمیزی پہ غصہ آنے کی بجائے بہت پیار آ رہا تھا۔ اور کیوں نہ ایسا ہوتا اُس کا اس دنیا میں وحید کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ وحید کی ماں کے انتقال کو پانچ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ وحید ان کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلہ تھا۔ وحید کا باپ قاسم پہلے پہل ایک چھوٹی سی دودھ کی دکان چلاتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا باڑہ بنا لیا اور کراچی کے مختلف علاقوں میں دودھ فروشوں کو سپلائی کا کام شروع کیا۔ اب اس کے نام کے ساتھ چودھری لگایا جانے لگا تھا کیوں کہ پیسہ کی ریل پیل ہونے لگی تھی۔ چھوٹا موٹا دودھ بیچنے والا قاسم آج اپنی دن رات کی محنت کی وجہ سے قاسم چودھری بن گیا تھا۔ اُسے اپنے کام سے محبت تھی۔ قاسم چودھری کی کل کائنات وحید ہی تو تھا۔ وحید کو اس نے شہر کے بہت بڑے کالج میں پڑھایا۔ وحید اپنے دوستوں میں یہ بتاتے ہوئے بہت شرم محسوس کرتا کہ اُس کا باپ ایک دودھ سپلائی کرنے والا ٹھیکیدار ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ قاسم چودھری چاہتا تو وحید کو دنیا کے ہر کونے میں بھیج سکتا تھا لیکن اس نے اپنا ایک ایک روپیہ وحید کو ڈاکٹر بنانے کے خواب کو پورا کرنے کے لئے بچا کر رکھا تھا۔

وحید باپ سے جواب کا منتظر تھا لیکن قاسم چودھری اپنی سوچوں میں مگن اپنے بیٹے پہ نظریں جمائے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وحید چلّایا ابا تو سن رہا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔

ہاں ہاں پر دیکھ پتر تیرے چاچے نے ہمیں اس باری گجرانوالہ بلایا ہے تو پیرس چھوڑ گجرانوالہ چل'۔

وحید پیرس اور گجرانوالہ کے تال میل پر ششدر رہ گیا۔ قاسم چودھری وحید کے ذہن میں اس کی آگے کی پڑھائی کی فکر نہیں ڈالنا چاہتا تھا وہ تو بس اپنے بیٹے کی چھٹیوں کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ اور کچھ بھی تھا وحید تھا بہت فرمانبردار۔ قاسم چودھری کی بات پہ جی ابا جیسے تیری مرضی کہہ کے خاموش ہو گیا۔

تین دن بعد سے چھٹیاں تھیں قاسم نے گجرانوالہ کی ٹکٹ کروائی اور چار دن بعد دونوں اپنے سفر پہ روانہ ہوئے۔ پہلے پہل وحید منہ بسورے ٹرین میں بیٹھا رہا لیکن ٹرین جیسے ہی پنجاب میں داخل ہوئی صبح سویرے باہر کا نظارا خوبصورت کھیت، کسانوں کو کام کرتا دیکھ کے اس کا موڈ بہتر ہوتا گیا۔ ٹرین سے باہر کچے پکے گاؤں کے مکانات نظر آ رہے تھے وہ نظریں گاڑھے ایک ایک نظارے کو غور

سے دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف اپنے ملک کی خوبصورتی دیکھ کے اور دوسری طرف یہاں کے لوگوں کے مسائل۔ یہ سفر وہ کتنی ہی دفعہ کرچکا تھا لیکن آج اُسے ہر نظارہ کچھ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ قاسم چودھری تمام راستے اپنے بیٹے کے بدلتے تاثرات پہ غور کرتا رہا۔ گجرانوالہ کا سفر اب ایک گھنٹے کا رہ گیا تھا کہ وحید نے اپنی خاموشی توڑی۔

ابا میرا ملک کتنا خوبصورت ہے۔ آج میں نے سب کچھ الگ طرح سے محسوس کیا۔ ابا' یہاں لوگوں کے پاس رہنے کے لئے اچھی جگہ۔ میں نے راستے میں بچے دیکھے جو گندے پانی میں نہا رہے تھے۔ کتنے ہی بچے ایسے تھے جن کے پیروں میں جوتی نہیں تھی۔ کپڑے نہیں تھے کسان کتنی محنت کرتے ہیں یہاں۔ کیا ملک ہے میرا کتنا خوش قسمت ہوں میں اتنے بڑے کالج میں پڑھتا ہوں اتنا اچھا کپڑا پہنتا ہوں جو چاہتا ہوں کھاتا ہوں۔

قاسم چودھری اپنے بیٹے کی بات کاٹتے ہوئے بولا' چل چل پتّر زیادہ دماغ پر زور نہ دے میں پڑھا لکھا نئیں پر سمجھتا سب ہوں اور چاہتا تھا کہ تجھے بھی سمجھ میں آجائے اور قدر ہو۔ اور تو سمجھ گیا ہے۔ اور ہاں تیار ہوجا اب وہاں جاتے ہی اصلی گھی کے تیری چاچی کے ہاتھ کے پراٹھے کھانے کے لئے اور لوٹا ہاتھ میں لئے باتھ روم کے باہر کھڑے اپنی باری کا انتظار کرنے کے لئے۔

ہوا میں ایک زور دار قہقہہ گونجا اور وحید کی گرمیوں کی چھٹیوں کا خوبصورت آغاز شروع ہوا۔

# کہانی ایک لڑکی کی

شہناز کی آنکھیں نم تھیں ۔ وہ جھاڑن سے پھٹک پھٹک کے صوفوں کی صفائی میں مگن تھی کہ جیسے اپنا سارا غصّہ گدیوں کو پیٹ پیٹ کے نکال رہی ہو۔آواز کچھ بلند ہوئی تو سارہ نے کچن سے آواز لگائی۔ 'شہناز کیا کر رہی ہو کیا آج میرے گھر کے فرنیچر کو توڑنے کا ارادہ ہے'۔ سارہ کی آواز کان میں پڑتے ہی شہناز چونک گئی اور جواب میں بس 'جی بی بی جی معاف کردیں' کہہ کہ اپنا سر گھٹنوں میں چھپائے زار وزار رونے لگی وہ ابھی تیرہ سال کی تو تھی آنکھ کھلتے ہی ماں باپ کو جھگڑتے دیکھا اور بھائی بہنوں کو روٹی پہ ٹوٹتے ۔اُس کی ساری بہنیں اور ماں گھروں میں کام کرنے جاتیں اور اپنا نام تو اسے کم ہی سننے کی عادت تھی زیادہ تر بنگلے والی سیٹھانیاں اسے ماسی کی بیٹی کہہ کر بلاتیں تھی۔ شروع میں ماں کے ساتھ ہی کام پہ جایا کرتی پھر آٹھ سال کی ہوئی تو اُسے اپنا علیحدہ کام کرنے کے لئے گھر بلا۔ آج اُسے وہ دن یاد آرہا تھا کہ جب اُس کی ماں مختاراں ایک بنگلے میں یہ کہہ کہ چھوڑ گئی تھی کہ 'بی بی آپ فکر نہ کرو یہ اب میری جگہ کام کرے گی کوئی بھول ہو جائے تو اپنی دھی سمجھ کر معاف کر دینا آپ سکھا دینا اِس کو سب کچھ آپ مارو گی بھی تو میکوں قسم ہے مالک دی میں کچھ کا نئاں اکھیساں۔'

اس کے ساتھ ہی مختاراں نے شہناز کے سر پہ ہاتھ رکھا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔ شہناز معصومیت سے گھر کی دیواروں کو دیکھ رہی تھی کہ سیٹھانی کی آواز نے اسے ہلا کے رکھ دیا۔ اب کیا کھڑی ہی رہو گی وہاں رکھی ہے جھاڑو جلدی کام کرو میرے بچے اسکول سے آنے والے ہیں۔ جھاڑو کا وزن اس کے چھوٹے ہاتھ اُٹھا نہیں پا رہے تھے لیکن وہ یہاں وہاں ہاتھ مار کر کسی طرح اپنا کام پورا کرنے میں لگی رہی ۔ اُسی وقت ٹی وی پر کارٹون کی آواز سن کر وہ چپکے سے سیٹھانی سے نظریں بچائے پردے کی آڑ سے کارٹون دیکھتی رہی ۔ وہ بڑی معصومیت سے مگن چوہے بلّی کی جنگ پہ مسکرا اٹھی کہ ایک بھاری ہاتھ اُس کے سر پہ پڑا۔ یہ اُس کی بنگلے والی سیٹھانی تھی۔ 'او ماسی کی اولاد تو یہاں کام کرنے آئی ہے یا تفریح کرنے چل کام کر۔' اور شہناز کے ناپختہ ذہن کو اُسی وقت اپنی حیثیت کا احساس ہو گیا کہ آخر وہ کیا ہے۔ وقت گزرنا گیا لوگوں کی ڈانٹ پھٹکار کی اب وہ عادی ہو چکی تھی۔ باسی کھانا کھانا اور اُترن پہننا اُس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا اُس سے آگے بھی کوئی دنیا ہے وہ اِن باتوں سے بے خبر تھی۔ لیکن اب وہ بڑی ہو رہی تھی۔ آج اُسے رونا کسی کی مار یا پھٹکار سننے کی وجہ سے نہ آیا تھا بلکہ آج اُس کی نئی مالکن سارہ نے اُسے کچھ ایسا کہا کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے پہ مجبور ہو گئی۔ وہ رو رہی تھی کہ سارہ نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی روتی ہوئی شہناز کے پاس آکر اُس کے سر

پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا 'کیا ہوا شہناز میری کوئی بات بری لگ گئی ہو تو میں معافی مانگتی ہوں' شہناز نے گھبرائی ہوئی آواز میں جھٹ سے جواب دیا 'نہیں بی بی جی آپ میری مالکن ہی نہیں بڑی بہن جیسی ہو۔ آپ مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔ آپ نے تو مجھے بہت پیار دیا ہے کہ آج تک کوئی میرے بارے میں ایسا نہ سوچ سکا جیسا آپ سوچتی ہو۔ میں پڑھوں گی بی بی جی میں ۔۔۔ آپ نے کہا میرا دماغ بڑا تیز ہے میں پانچ مہینے میں پانچویں جماعت تک پڑھ سکتی ہوں آپ آپ پڑھاؤ گی مجھے۔ آپ کی بات سن کہ میں پچھلے تین دن سے ہواؤں میں اُڑ رہی تھی کہ میں بھی پڑھوں گی میں بھی سیٹھانی والی زندگی گزاروں گی میں کچھ کر دکھاؤں گی کہ میری اماں اور بہنوں کو گھروں میں کام نہ کرنا پڑیگا۔ آپ جانتی ہیں ہم میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں کوئی نہ کوئی خواب بسا رہتا ہے۔ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم غریب پیدا ہوئے ہم جیسا ہر بچہ ڈاکٹر اداکار، سیٹھ بننا چاہتا ہے۔ میڈا خواب استانی بنن دا ھئی۔ پر میڈے خواب حقیقت نہیں بنے گا۔ میں نے اگر پڑھ بھی لیا تو کیا ہوگا کچھ نہیں میں رہوں گی تو ماسی کی بیٹی نہ' اور وہ پھر سے رونے لگی۔ سارہ شہناز کے لئے پانی لائی اور اُسے خاموش ہونے کا کہتی رہی جب شہناز چپ ہو گئی تو سارہ نے کہنا شروع کیا۔ 'دیکھو شہناز ماسی کی بیٹی ہونا کوئی جرم نہیں۔ تمھیں تو فخر ہونا چاہیے کہ تمھاری ماں ایک محنتی عورت ہے۔ ذرا سوچو اگر ہر بچہ جس کے ماں باپ اُنھیں پڑھا نہیں سکتے اگر وہ یہ سوچنے لگے کہ میں پڑھ لکھ کر کیا

کروں گا تو یہ معاشرہ تبدیل کیسے ہوگا۔۔۔ اگر خدا نے تمیں موقع دیا ہے کہ تم آگے پڑھو تو تمھیں اپنے جیسے ہر بچے کے لئے مثال بننا چاہیے۔ اور اسی طرح تبدیلی آئیگی ۔ تمھیں دیکھ کر تم جیسے کتنے بچے آگے بڑھنے کی کوشش کرینگے۔ جو محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کو اپنا مصرف بنائینگے۔ تم ہو یا کوئی عام نوجوان ہر کوئی آگے بڑھنے کو صرف دولت کمانے سے تعبیر کر رہا ہے لیکن شہناز ایک بات عمر بھر یاد رکھنا آگے بڑھنا صرف دولت کمانا یا بہترین منصب کا پانا نہیں ۔ ضروری نہیں کہ تمھاری پڑھائی تمھارے گھر والوں کی زندگی کو بدل دے۔ لیکن ہاں تمھاری پڑھائی بہت سے بچوں کے لئے آگے بڑھنے کی نوید ضرور ہوگی۔ اِس دنیا کی رنگارنگی اِن کے دم سے ہے جو اپنے آپ کو بدلتے ہوئے اِس معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اِس بات کی پرواہ تک نہیں کرتے کہ اِس محنت کا انہیں کیا صلہ ملے گا اور کچھ مل بھی سکے گا یا نہیں وہ ہر معاملے کو صرف دولت کے ترازو میں نہیں تولتے بلکہ کچھ کر دکھانے کا جذبہ لئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔۔ تمھیں بھی ایسے ہی آگے بڑھتے رہنا ہے۔ میں جانتی ہوں ہماری قوم کے ہر بچے ہر نوجوان پر خدا کا خاص سایہ ہے۔ ایک قدم تو آگے بڑھاؤ تم اپنے اندر توانائی اور ولولہ محسوس کرو گی۔ اور یہی جوش تمھیں بڑے کاموں پر اُکسائے گا۔ تم جو اپنے طبقے کے ہر بچے اور نوجوان کی فکر کرتی ہو سب کی زندگیاں بدل سکتیں ہیں۔ تبدیلی کے لئے کچھ سوچنا ہی کافی نہیں بلکہ عملی اقدام بھی ضروری ہے اور اِس کے لئے دل میں

عزم درکار ہے تاکہ خوابوں کو حقیقت کا روپ دیا جاسکے۔ ہر انسان کو اس دنیا میں کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اِس کے لئے کسی بڑے باپ کی اولاد ہونا یا پیسے کی فراوانی ضروری نہیں بس قدم بڑھاؤ اپنے مقصد کی طرف راستے خود بہ خود بنتے چلے جائینگے۔ آج پاکستان کا ہر نوجوان مایوس نظر آتا ہے۔ کیوں آخر کیوں، آج کا بچّہ، آج کا نوجوان چاہے تو سب کر سکتا ہے۔ اِس ملک کو مایوسی سے نکال سکتا ہے۔ آگے بڑھو خود تبدیل ہو جاؤ۔ مقصد کو اپناؤ تو دوسروں میں بھی تبدیل ہونے کی تحریک پیدا ہوگی۔

شہناز کی آنکھوں میں عجب چمک تھی کی اُسے اپنی زندگی کی اہمیت کا علم ہو گیا ہو۔ آج اُسے احساس ہوا کہ وہ کتنی اہم ہے وہ کمزور اور غریب نہیں اُس میں ہمت ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے جسم میں بجلی سرایت کر گئی ہو۔ وہ اپنے اندر ایسی توانائی محسوس کر رہی تھی جس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی میں کروں گی میں آگے بڑھوں گی میں ہمت نہیں ہاروں گی اگر ہم سب اپنی اپنی خواہشات، تمناؤں اور آرزوؤں کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے تھوڑی تبدیلی بھی لائیں گے تو یہ دنیا واقعی ایک جنت نظیر جگہ ہو جائیگی۔

# خواتین کی ملازمت حقوقِ نسواں کا سوال نہیں

معاشرے میں مردوں یعنی لڑکوں کو یوں پروان چڑھایا جاتا ہے کہ وہ بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانے والے بنیں، مضبوط ہوں، فیملی کی کفالت کریں، بیوی بچوں کی ضروریات پوری کریں، کمزوری کا مظاہرہ نہ کریں اس سے مردوں کی اپنی صحت متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر ان میں یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ فیملی کی ضروریات پوری کرنا، گھر کی سربراہی، معاشی خود کفالت انہی تک محدود ہے۔ اپنی بہن، بیٹی، بیوی سے نوکری کروانا برا تصور کرتے ہیں۔ اکثر تو یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ اگر گھر کی خواتین کو ملازمت پر جانے دے دیا جائے تو رویہ یہ برتا جاتا ہے گویا اُن پر احسان کیا جا رہا ہو۔ اس بات سے قطع نظر کے عورت ہو یا مرد بحثیت انسان دونوں ہی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اگر ایک مرد اپنے خاندان کو بہتر زندگی دینے کے لئے محنت کرتا ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک عورت بھی اپنے گھر والوں کو بہتر معیار زندگی دینا چاہتی ہے۔

مردوں کو قدرتی طور پر عورتوں کا محافظ اور معاون بنایا گیا ہے یہ بات صد فیصد درست ہے۔ لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ قدرت نے عورت کو کم صلاحیتوں سے نوازہ ہے بلکہ دراصل عورت کی اپنی اولاد اور گھر کے لئے قربانی

کے ثمر کے طور پر اسے یہ تحفہ دیا گیا ہے کہ مرد اسکا محافظ اور معاون بن کر رہے۔
دنیا بھر میں اگر ترقی یافتہ قوموں میں نظر دوڑائیں تو وہاں کی عورت ملک کی معاشی ترقی میں مردوں کے شانہ بشانہ اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم ، تحقیق ، ، سیاسی سمجھ ہر سطح پر ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے حصہ لیتی ہے جبکہ ہمارے معاشرے میں خواتین کے حوالے سے یہ صورتحال حوصلہ افزاء نہیں ہے۔ اکثریت کو اپنی صلاحیتیں بھرپور طریقے سے .بروئے کار لانے کے مواقع باہم نہیں ملتے۔
حکومت کی جانب سے خاص خواتین کے لئے مختلف روزگار اسکیمیں وقفے وقفے سے متعارف کروائی جاتی رہی ہیں۔ اس میں نیشنل ووکیشنل اینڈ ٹیکنکل ایجوکیشن کمیشن ، اسمال اینڈ میڈیم انٹرپرائز اور پبلک سیکٹر ڈیولپمنٹ جیسے پروگرام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گھریلو صنعت کے لئے قرضوں کی سہولیات بھی موجود ہیں۔ ان تمام اسکیموں سے کم پڑھی لکھی خواتین کے علاوہ ہر طرح کا ہنر رکھنے والی خواتین مستفید ہو سکتی ہیں یا اپنا کاروبار کھولنا چاہیں تو یہ اسکیمیں ان کی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان حکومتی اسکیموں کی کامیابی کچھ فیصد سے زیادہ نہیں مگر بہرحال خواتین روزگار کے حصول کے لئے ان اسکیموں سے مدد کا سوچ

سکتی ہیں۔

لیکن یہاں سب سے پہلے اہم مسئلہ ہمارے معاشرے کی سوچ کی تبدیلی کا ہے۔ معاشرہ کی روایتی سوچ تبدیلی کے لئے ابھی اور وقت مانگ رہی ہے۔ سوال دراصل نچلے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کا ہے۔ مہنگائی جس تواتر سے بڑھ رہی ہے وہاں خاندان کے ایک فرد کی کمائی سے گزارہ ممکن نہیں۔ ایک کمانے والا اور دس کھانے والے۔ اس صورتحال سے گھرانے ترقی کرنے کی بجائے معاشی ابتری کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ خواہشات تو درکنار ایک متوسط گھرانہ اپنی ضروریات کو پورا نہیں کرپاتا۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی اس مستقل صورتحال سے لوگ جن معاشی مسائل کا شکار ہو رہے ہیں اس کے سبب رفتہ رفتہ نفسیاتی عوارض پیدا ہوتے جارہے ہیں۔ ہر شخص جھنجھلاہٹ اور جلدی میں نظر آتا ہے۔ بات بے بات غصّہ ہونا چھوٹی سی بات پہ لڑائی جھگڑا ہمارے معاشرے میں لوگوں کے مزاج کا حصّہ بن گیا ہے۔ اس کی واحد وجہ وہ معاشی بدحالی ہے۔ جو ہر گھر پر آہستہ آہستہ اپنا قبضہ جما رہی ہے اور اس حقیقت سے انکار کرتا شخص خود فریبی ہے۔

شادی شدہ خواتین ہوں یا غیر شادی شدہ اپنے ہنر، تعلیم اور صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔ ایک پڑھی لکھی برسرروزگار عورت نہ صرف اپنے

خاندان کے لئے بلکہ مجموعی طور پر پورے معاشرے اور قوم کے لئے کرامت ثابت ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں خواتین پڑھی لکھی باہنر، باصلاحیت ہی کیوں نہ ہوں اُن کی ملازمت کو کشادہ سوچ کے ساتھ قبول نہیں کیا جاتا۔ ایک سروے کے مطابق تو ے فیصد افراد خواتین کی ملازمت کے حق میں نہیں جبکہ متوسط طبقے کی ملازمت کرنے والی خواتین سے جب اس سلسلے میں بات کی گئی تو تقریباً سب کا جواب یہ تھا کہ "ہم اپنے گھر والوں کو بہتر معیارِ زندگی دینا چاہتی ہیں۔ اپنے خاندان کو مالی طور پر مستحکم دیکھنا چاہتی ہیں لیکن قدم قدم پر ہمارے یہاں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ کبھی معاشرہ اور کبھی اپنے گھر والے ہمیں مجرمانہ نظروں سے دیکھتے ہیں کہ جیسے ہم کسی گناہ کے مرتکب ہوں۔ جبکہ ہم گھر اور ملازمت کی ذمہ داری دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں"۔

گھریلو معاملات سنبھالنا خواتین کی اولین ترجیح ضرور ہے۔ گھر کی اہمیت سب سے پہلے ہے لیکن اگر معاشی طور پر خاندان کی ضرورت ہو تو نوکری ضرور کرنا چاہیے۔ خواتین گھر کی ذمہ داریوں کو ساتھ لیتے ہوئے ملازمت کریں تو یہ بہت اچھا رہتا ہے۔ اس طرح اپنی تعلیمی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانے اور ان میں مزید نکھار پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آج کا مرد خواتین کی خواہشات پوری کرنے سے قاصر ہے۔ جب خواتین خود ملازمت کرتی ہیں تو انہیں مردوں کی سخت محنت اور پیسوں کی قدر کا اندازہ ہوتا ہے۔ دنیاوی سمجھ بوجھ پیدا ہوتی ہے۔ زندگی میں بہت سے تجربات اور مشاہدات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اطراف میں موجود لوگوں کے رویوں کا اندازہ ہوتا ہے جو نوکری کرنے سے پہلے کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ ہماری اکثر گھریلو خواتین بے ہنگم زندگی، ترش رویے، بے مقصد شب و روز، متعین ہدف پر کام کرنے سے ہماری اور اپنی ذات پر عدم اعتماد کے ساتھ گزار رہی ہیں۔ جبکہ ملازمت کرنے یا اپنے گھر کے اندر رہتے ہوئے اپنے شوق کے مطابق روزگار کا ذریعہ حاصل کرنے سے صورتحال کو بدلہ جاسکتا ہے۔ مالی فوائد اور باعزت زندگی دونوں کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ پہ نگاہ ڈالی جائے تو انہی قوموں نے ترقی کی ہے جنھوں نے اپنے لئے درست سمت میں بڑھنے کا راستہ اپنایا۔ ایک گھرانہ ایک خاندان اس ملک کی اکائی ہے۔ ایک گھرانہ ترقی کرے گا تو ملک ترقی کرے گا۔ یہاں خواتین کی ملازمت حقوقِ نسواں کا سوال نہیں بلکہ مجموعی طور پر معاشی صورتحال کو بہتر بنانا ہے۔ اپنی حدود میں رہتے ہوئے دین کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے ایک عورت باعزت معاشی مستحکم خاندان بنا سکتی ہے۔ لیکن مرد کے سہارے کے بغیر یہ ممکن

نہیں۔

# ان ہاتھوں کا امتحان نہ لو

اُس سڑک پر گاڑی موڑتے ہی فضا میں بسی بارود کی بو سے سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔ گاڑی رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی تھی۔ وحشت کا یہ عالم تھا جیسے پُل صراط پر چلنے کے لیے کمربستہ ہوں۔ آس پاس کی عمارتیں بہت دور سے ہی سیاہ نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ بچوں کی چیخ وپکار سے دل دہل رہا تھا، نوجوان لڑکیاں ننگے پیر ننگے سر آہ وزاری کرتی نظر آئیں۔ کوئی کسی لاش کے سرہانے چپ چاپ بیٹھا ہے، تو کوئی اپنے خوبصورت آشیانے کو خاک ہوتا دیکھ کر دھاڑیں مار رہا ہے۔

ایک نوجوان اپنی شریک حیات کی لاش ہاتھوں میں اُٹھائے یہاں وہاں بھاگ رہا ہے کہ اسے دیکھو! شاید یہ بچ جائے، شاید یہ سانس لینے لگے۔ لیکن نہیں اُس کی سانس تو بند ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ قیامت ایسی ہی ہو گی۔

نہ یہ فلسطین ہے، نہ غزہ، نہ شام، افغانستان اور عراق بھی نہیں۔ یہ مملکتِ خداداد پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کے علاقے عباس ٹاؤن میں برپا ہونے والی قیامت کا منظر ہے۔ بظاہر یہ آزاد فضاء ہے۔ کوئی دشمن دور دور تک نظر ہی

نہیں آتا، لیکن روز لوگ مارے جاتے ہیں جیسے چپ چاپ طاعون کی بیماری لوگوں کو کھا رہی ہو۔

کراچی کو گذشتہ کئی برسوں سے ایک سازش کے تحت آگ و خون میں نہلایا جارہا ہے۔ یہاں کے معصوم عوام کو، جن میں خواتین، بزرگ، نوجوان، حتیٰ کہ معصوم وشیر خوار بچے تک شامل ہیں۔ بے دری سے قتل کیا جارہا ہے۔ اس نوعیت کا تازہ واقعہ رواں ماہ میں ہوا، ابوالحسن اصفہانی روڈ پر واقع عباس ٹاؤن بم دھماکے سے لرز اُٹھا، جس میں 50 سے زاید افراد منٹوں میں لقمہ اجل بن گئے اور 150 کے قریب شدید زخمی ہوئے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ قریبی عمارتوں میں بھی آگ لگ گئی اور دکانوں سمیت دیگر املاک کو نقصان پہنچا۔ دہشت گردی کے اس واقعے کے متاثرین اس بات پر بھی مشتعل تھے کہ کوئی حکومتی نمائندہ ان کی مدد تو کجا تعزیت تک کے لیے نہیں آیا۔

بہرحال، سانحہ عباس ٹاؤن کے بعد بھی حسب روایت حکومت نے ایک بار پھر متاثرین کی مالی مدد کا وعدہ اور اعلانات کیے۔

دہشت گردی کے منڈلاتے بادلوں نے سندھ اور خصوصاً کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ہمارے سیاست داں اور حکم راں سیاست بازی کے چکروں ہی سے نکل نہیں پا رہے۔ متاثرین کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے وہ ایک دوسرے پر الزامات لگا کر بری الزمہ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، جب کہ ایسے ناسازگار

حالات میں اس طرح کی بیان بازی کسی کے مفاد میں نہیں ہے۔ ماضی میں دیکھا گیا ہے کہ جب دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے ہیں تو مرنے والوں کے لواحقین اور زخمیوں کے لیے حکومت کی جانب سے امداد کا اعلان تو کیا جاتا ہے، لیکن عموماً امداد کی رقم ان کو نہیں مل پاتی۔ دہشت گردی کا کوئی بھی واقعہ اپنے اطراف بہت سے الم ناک اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ جانی و مالی نقصان تو اپنی جگہ، لیکن ایسے روح فرسا واقعے کے اثرات سے متاثرین کا باہر آنا تادیر ممکن نہیں ہوتا، اور کبھی تو ان اثرات میں سلگتے عمر بیت جاتی ہے۔

دہشت گردی دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو، اس کی روک تھام اور اس کا سدباب خالصتاً ریاست کی بنیادی اور اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف اور روک تھام کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے اور دہشت گردی کے واقعات کے اسباب کا تعین کرنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ دہشت گردی کے واقعے کے بعد اس سے متاثر ہونے والے افراد کو فوری طور پر اس کے اثرات سے نکالنے کے لیے ہر حکومت متاثرین کا مالی نقصان پورا کرنے اور امداد اعلان کرتی ہے، مگر یہ امداد ملے گی یا نہیں اور ملے گی تو کب تک؟ اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔

زیادہ پرانی بات نہیں جب کراچی کے علاقے پی آئی ڈی سی کے قریب واقع سی آئی ڈی سینٹر کی عمارت میں زور دار دھماکا ہوا، جس میں میں پولیس اہل کاروں سمیت کئی افراد جاں بحق اور درجنوں زخمی ہوگئے۔ دھماکے سے پوری عمارت زمین

بوس ہو گئی، جب کہ آس پاس کی عمارتوں اور خصوصاً سی آئی ڈی سینٹر عمارت کے بالکل سامنے واقع مدینہ بستی کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ حسب روایت حکومت نے نہ صرف اس واقعے میں زخمی اور جاں بحق ہونے والوں کے لیے امداد کا اعلان کیا، بل کہ مدینہ بستی کے زمین بوس ہونے والے مکانات کی مکمل تعمیر کا وعدہ بھی کیا اور وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ نے صوبائی وزیر داخلہ ذوالفقار مرزا کے ساتھ دھماکے کی جگہ کا دورہ کیا اور امدادی سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور متاثرین کو مکمل امداد کی یقین دہانی کرائی۔

سی آئی ڈی کے سانحے کے بعد حکومتِ سندھ کی جانب سے جاں بحق ہونے والے ایف سی اور پولیس اہل کاروں کے لواحقین کے لیے بیس بیس لاکھ روپے فی کس اور پلاٹ دینے جب کہ اس سانحے میں زندگی سے محروم ہو جانے والے شہریوں کے لواحقین کے لیے پانچ لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ شدید زخمی ہونے والوں کو پچاس پچاس ہزار روپے فی کس اور گرنے والے گھروں کی تعمیر کے لیے مالی امداد کا اعلان کیا گیا، لیکن کیا شہریوں کے لواحقین اور مالی نقصان اٹھانے والوں کو حکومتی امداد ملی؟ یہ تو ایک واقعہ ہے ایسے کئی واقعات ہیں جن میں دہشت گردی کا شکار یا کسی تباہی سے متاثر ہونے والے عام افراد کے لیے حکومتی امداد کا اعلان تو کیا گیا، لیکن عموماً ایسا ہوا نہیں۔ زیادہ پرانی بات نہیں 2011 کے ستمبر میں اس وقت کے ایس ایس پی سی آئی

ڈی چوہدری اسلم کے ڈیفنس میں واقع ان کے گھر پر دہشت گردی کے واقعے میں نہ صرف ان کا گھر تباہ ہوا بلکہ کئی پولیس اہل کاروں کے علاوہ دو عام شہری بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ زخمی ہونے والے عام شہریوں میں زیادہ تر خواتین اور بچے شامل تھے۔ اس واقعے میں چوہدری اسلم کے گھر کے اطراف بھی دس سے زاید گھروں کو شدید نقصان پہنچا اور ایک بار پھر حکومت وقت نے جاں بحق ہونے والے عام شہریوں کا جانی و مالی نقصان پورا کرنے کے لیے اعلانات کی بھرمار کردی۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں حیدری مارکیٹ کے قریب دو بم دھماکوں کے نتیجے میں دو بچوں سمیت 8 افراد جاں بحق اور 21 زخمی ہوگئے تھے، جب کہ قریبی دکانوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ اس دھماکے کے بعد بھی حکومت کی جانب سے امداد کے اعلانات کیے گئے، مگر یہ اعلانات بھی طفل تسلی ثابت ہوئے۔ سانحہ حیدری مارکیٹ کے متاثرین کے لواحقین نے بتایا کہ انہیں حکومت کی جانب سے اعلان کردہ امداد کا ایک پیسہ بھی نہیں ملا نہ ہی سانحے میں جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین کو اور نہ ہی زخمی ہونے والوں کو۔

دہشت گردی کے واقعات ہوں یا بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری میں ہونے والی قیامت خیز آتش زدگی اور تباہی اور ہلاکت کے دیگر سانحے، ان میں متاثرین اپنوں کو کھودینے کے ساتھ بعض اوقات اپنے معاشی وسیلے سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔ ایسے

سانحات میں گھر کی کفالت کرنے والا جان سے گزر جائے تو متاثرہ گھرانے پر غم کا پہاڑ ٹوٹنے کے ساتھ اسے معاشی مسائل کا طوفان بھی آ گھیرتا ہے۔ ایسے میں متاثرین کو امداد سے محروم رکھنا یا انھیں امداد کے لیے ترسانا خود ایک ظلم ہے۔ اس نوعیت کی امداد احسان نہیں، انسانی زندگی کا مداوہ نہیں، یہ ریاست کی عدم کارکردگی کا ہرجانہ ہے۔ اگر ریاستی ادارے عوام کے جان ومال کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتے تو کم از کم متاثرین کی اشک شوئی اور ان کے مالی نقصان کے ازالے سے تو گریز اور اس میں تاخیر نہ کریں۔ روز اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھاتے پاکستانیوں کے ہاتھ شل ہو چکے ہیں، ایسے میں ان کے ہاتھوں کو امداد سے بھی محروم یا اس کا منتظر رکھ کر حکمراں ان ہاتھوں کا امتحان کیوں لیتے ہیں؟

## شناخت ہی نہیں تو ووٹ کیسا

"اس دفعہ میں تبدیلی لاؤں گا۔ انقلاب کوئی لائے نہ لائے میں اپنا ووٹ دے کر انقلاب ضرور لاؤں گا۔ میرا ووٹ تم دیکھوگے کتنا اہم ہے۔ اب چاہے شاہین ہو کہ شیر، تیر ہو کہ ترازو سب میرے ووٹ کے محتاج ہیں اور وہ سونامی خان وہ بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ کرکٹ کا بزرگ اور سیاست کا نابالغ کچھ تو کرے گا۔ لیکن دیکھو! آج میں کتنا اہم ہوں کہ میں جس کو چاہوں اقتدار میں لاؤں اور جسے چاہوں حکومت کے ایوانوں سے دور کر دوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر تمھارا شناختی کارڈ بن گیا؟ اب تو تم اکیس سال کے ہو چکے ہو۔ ووٹ ڈالنے کے لیے تو شناختی کارڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"نہیں، وہ تو نہیں بنا اور نہ ہی آگے کوئی امید نظر آتی ہے، کیوں کہ اپنی شناخت کے لیے مجھے باپ کے نام کی ضرورت ہے اور میں تو یہ ہی نہیں جانتا کہ میرا باپ کون ہے"

یہ کراچی کے ایک رفاہی ادارے میں پلنے والا نوجوان ہے، جو انقلاب کی بڑی

بڑی باتیں تو کرسکتا ہے مگر ووٹ نہیں ڈال سکتا، کیوں کہ ووٹ کے لیے لازمی ہے شناختی کارڈ اور کارڈ کے حصول کے لیے ضروری ہے بنیادی دستاویز یعنی والدین کا شناختی کارڈ۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ایسے لاکھوں افراد اس مملکت خداداد میں موجود ہیں جو شناختی کارڈ حاصل کرنے کا بنیادی حق تو رکھتے ہیں، لیکن ملکی قوانین کی وجہ سے وہ اس حق سے محروم ہیں۔ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ جی ہاں یہ رفاہی اداروں میں پلنے والے لاکھوں لاوارث بچے اور نوجوان ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا وجود کسی کی لغزش کا نتیجہ ہے اور ان کا پیدا ہونا ہی ان کے لیے جرم بن گیا۔ ماں کی آغوش کی جگہ کسی رفاعی ادارے یا فلاحی تنظیم کا پالنا ان کا نصیب بنا۔ یہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں یہاں چھوڑ کر جانے والے ان کے ماں باپ تھے یا پھر انھوں نے یہ کام بھی کسی اور کو پیسے دے کر کروایا تھا۔ یہ تو وہ ہیں جن بہ طور رحم جینے کا حق دے دیا گیا، ورنہ ان جیسے کتنے ہی بچے کچرے کے ڈھیر پر پڑے پڑے ہی مر گئے۔ انھیں زندگی بھر شناخت کا مسئلہ رہتا ہے۔

پاکستان بھر میں روزانہ صرف ایدھی ہوم کے باہر رکھے گئے جھولوں میں سے سیکڑوں بچے ملتے ہیں اور کچھ کچرے کے ڈھیر میں جانوروں کی خوراک بننے سے بچ

جائیں تو اپنی پہچان کی جنگ میں پل پل اس معاشرے کی ہتک اور نفرت آمیز نگاہوں کا نوالہ بنتے رہتے ہیں۔

بے شناخت بچے پاکستان کے تقریباً ہر شہر میں رہتے ہیں۔ کہیں ایدھی ہوم ان کا گھر ہے اور کہیں یتیم خانہ۔ "پالنا" اور "غنچہ اطفال" بھی ایسی ہی جگہوں کے نام ہیں، جہاں کے بہت سے مکینوں کو اپنے ماں باپ کا پتا نہیں۔

صرف ایدھی کے ملک بھر میں تین سو پینسٹھ مراکز ہیں، جہاں ہر سال سوا دو سو کے قریب بچوں کو جھولوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انھیں اپنانے کے لیے ہزاروں بے اولاد جوڑوں کی درخواستیں ایدھی فاؤنڈیشن کے پاس پڑی ہوتی ہیں۔ عبدالستار ایدھی کے بقول اب تک ان کے ادارے سے بیس ہزار بچوں کو بے اولاد جوڑوں نے گود لیا ہے۔ یہ بچے آج ایک بہتر زندگی گزار رہے ہیں، لیکن شناختی کارڈ ان کا بھی نہیں بنا۔

حکمرانوں اور سیاست دانوں کے لیے سماج کے بہت سے سلگتے مسائل کی طرح یہ بھی یقیناً کوئی مسئلہ نہیں، کیوں کہ ووٹ تو انہیں مل ہی جاتے ہیں اور اقتدار میں آ کر تو انھیں کروڑوں پاکستانیوں کو درپیش بنیادی مسائل یاد نہیں رہتے تو وہ ان چند لاکھ افراد کے کرب پر کیا توجہ دیں گے۔ لیکن پیپلز پارٹی کی

گذشتہ حکومت نے ایسے بے شناخت بچوں کے حوالے سے کچھ پیشرفت کی اور اس سلسلے میں دو ہزار نو میں سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے خصوصی تعلیم و سماجی بہبود کا اک اجلاس ہوا تھا، جس میں انکشاف کیا گیا کہ تمام لاوارث بچوں کی ولدیت کے خانے میں صدر آصف علی زرداری یا سماجی شخصیت عبدالستار ایدھی کا نام لکھنے کی تجویز پر غور کیا جا رہا ہے، تاکہ ان کی قانونی دستاویزات بنائی جا سکیں۔ کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر ساجد میر نے اس پر وزارت سماجی بہبود اور وزارت داخلہ کی قائمہ کمیٹی کا مشترکہ اجلاس بلانے کو کہا، جس پر صرف کاغذی کارروائی ہی ہوئی۔ مجوزہ اجلاس کے سلسلے میں غور بھی ہوا، لیکن ہوا کچھ نہیں۔

قانونی دستاویزات بہر حال نادرا کو تیار کرنی ہیں اور نادرا والے تو پھر نادرا والے ہیں۔ ان کو پاس سو جواز ہیں۔ مثلاً والدین کے نام کا پتا نہیں تو ب فارم کیسے بنے گا، ب فارم نہیں ہوگا تو شناختی کارڈ کیسے بنے گا۔ سب سے بڑی مجبوری "بے چارے" نادرا والوں کو یہ ہے کہ ابھی تک کسی بھی حکومت نے انہیں یہ ہدایت ہی نہیں دی کہ ایسے افراد کے شناختی کارڈ بنائے جائیں۔

سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ لگانے والے ہوں یا 'ہیوی مینڈیٹ' اور 'پاکستان کھپے" کی صدائیں دینے والے، کسی نے بھی اس مسئلے کی سنگینی کو '

سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اور اگر کہیں ایوانوں میں کوئی صدا بلند کی بھی گئی تو وہ بھی پانچ سال میں یہاں وہاں ہی بھٹکتی رہ گئی۔

ملک کوئی بھی ہو کچھ حقوق دنیا میں آنے والے ہر انسان کو حاصل ہیں۔ شناخت کا حق بھی انہی بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو باقی حقوق مل ہی نہیں سکتے۔ باپ کا نام نہ ہو، بے فارم نہ ہو تو اسکول میں داخلہ نہیں ملتا۔ شناختی کارڈ، پاسپورٹ، بینک اکاؤنٹ ان سب کے لیے بھی باپ کا نام چاہیے۔ کئی بچے ایسے بھی ہیں جو جیلوں میں کسی شناخت کے بغیر ہی اپنے جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ان لوگوں کو وکالت نامہ سائن کرنے کے لیے بھی ایک نام کی ضرورت ہے، جس کی کوئی ولدیت بھی ہو۔ ایسے لاوارث بچوں کی شناختی دستاویز کے لیے پاکستان میں کوئی قانون ہی موجود نہیں ہے۔ نہ ہی نادرا کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے افراد کے شناختی کارڈ بنائے۔ ایدھی ہوم کے مردہ خانوں میں ہر روز ایسے نومولود بچوں کو غسل دیا جاتا ہے جو پاکستان کے بڑے شہروں میں کوڑے دانوں یا دیگر مقامات پر ملتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ بے شناخت بچے کسی غلطی کا نتیجہ ہی ہوں۔ بلکہ لاکھوں ایسے بچے بھی ہیں جن کے اصل ماں باپ تو ہیں لیکن وہ کسی حادثہ کی وجہ سے ان سے بچھڑ کر لاوارثوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔

دیگر ممالک کی طرح اسلامی ممالک میں بھی اس طرح کے مسائل کے حل کے لیے قانون سازی کی گئی ہے۔ الجزائر، مراکش، تیونس اور لیبیا میں اس طرح کے بے شناخت بچوں کو شناخت دینے کے واضح قانون موجود ہیں جو انھیں قانونی تحفظ فراہم کرنے کے علاوہ تمام بنیادی حقوق کا تحفظ بھی دیتے ہیں۔

دنیا میں آنے والا ہر بچہ معصوم ہوتا ہے، جب کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر سر راہ ملنے والے بچوں کا بھی کوئی قصور نہیں ہوتا۔ لیکن لاوارث ہونے کا احساس اس وقت شدت اختیار کر جاتا ہے جب اپنے ہی ملک میں انہیں شناخت نہ دی جائے۔ ملازمت کیا، ووٹ کیا، اچھی زندگی کیا، کچھ بھی ان کو میسر نہیں، کیوں کہ ان کے پاس شناخت موجود نہیں۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں جب انہیں اپنی پہچان کا سفر اتنا تکلیف دہ نظر آتا ہے، تو اکثر بے راہ روی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس روش کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ روح جو انسان کا روپ لیے معصوم آنکھوں اور خوب صورت کلکاریوں کے ساتھ زمین پر اتری یا ملکی قوانین جو انسان کو انسان ماننے کو تیار نہیں؟

حکمرانوں اور حکومتی اداروں کی بے حسی دیکھتے ہوئے عدلیہ ہی سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ناکردہ گناہوں کی سزا جھیلتے ان افراد کے مسئلے پر توجہ دے۔ سپریم کورٹ اس مسئلے کا از خود نوٹس لے اور جس طرح تیسری جنس کا شناختی

کارڈ بنوانے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح بے شناخت افراد کے حوالے سے قانون سازی کا
حکم دیا جانا چاہیے۔

## بڑھتے مدارس، گھٹتے اسکول، وجوہات کیا ہیں

میرے گھر پہلے بیٹے کی ولادت نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ ایسا لگا جیسے میں پہلی دفعہ ماں بنی ہوں۔ میرے دو بڑی بیٹیوں نے مجھے ممتا کے احساس سے سرشار کردیا تھا، لیکن بیٹے کی ولادت پر مبارکباد کا سلسلہ ہی مختلف تھا۔ اکلوتے بیٹے کے آتے ہی گھر میں اس کے مستقبل کی باتیں ہونے لگیں۔

میری بیٹیاں کراچی کے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں، لیکن بیٹے کے لیے ان سے بھی بہتر تعلیمی ادارے کی فکر خاندان بھر کو تھی۔ دل میں کہیں یہ خیال ہچکولے لیتا رہا کہ جس مالکِ حقیقی نے طویل عرصے بعد اولادِ نرینہ کی نعمت عطا کی ہے میرا بیٹا اسی رب کی راہ میں وقف ہو اور دینی تعلیم حاصل کرے۔ میں اپنے بیٹے کو حافظِ قرآن بنانا چاہتی تھی۔

اپنی تمام تر تعلیم اور زندگی کے نشیب وفراز سے گزرنے کے باوجود یہ میری زندگی کا نیا پہلو تھا کہ ہم "اَپر مڈل کلاس" کے لوگ صوم وصلوٰۃ کا خیال رکھتے ہیں اور زکوۃ اور حج کے احکامات پر بھی عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اپنی اولاد کو دینی مدرسے میں تعلیم دلانے سے خائف ہیں۔ میری اتنی

مخالفت تو بیٹیوں کو شہر کے "جدیدیت پسند" اسکولوں میں داخل کرانے پر بھی نہیں ہوئی جتنی بیٹے کے دینی مدرسے میں داخلے کی خواہش پہ کی گئی۔ دور پرے کی خالہ ہوں یا رشتے کے چچا، سب ہی نے دینی مدارس کی شان میں وہ "قصیدہ گوئی" کی کہ میں نے کان پکڑ لیے۔ زندگی میں ہارنا سیکھا ہی نہیں، اس لیے قدم پیچھے نہیں ہٹائے، تاہم غور کرنا شروع کر دیا کہ دینی مدارس کے حوالے سے منفی سوچ کیوں پائی جاتی ہے؟ اور وہ کون سے ادارے ہیں جو میرے بیٹے کی صحیح دینی اور دنیاوی تربیت کر سکیں، اسکول، مدارس، سرکاری اسکول، نیم سرکاری اسکول، بڑے نام والا انگریزی میڈیم اسکول، کوئی چھوٹا انگریزی میڈیم اسکول، انگریزی تعلیم بمعہ دینی تعلیم دینے والا ادارہ، حفظ القرآن بمعہ عربی جمع انگریزی اسکولغرض یہ کہ ساڑھے تین سال کے عرصے میں سارے شہر کی خاک چھان لی۔

میری تلاش آخر ایک ایسے تعلیمی اداروں پر ختم ہوئی جنھیں عُرف عام میں "حفظ قرآن بمعہ عربی بمعہ انگریزی میڈیم اسکول" کہا جانا چاہیے۔ یہ ایسے ادارے تھے جن پر دونوں فریق، یعنی میں اور میرے اہل خانہ متفق ہو سکتے تھے، کیوں کہ اس اسکول میں دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ لیکن ان کی فیسیں ہوش اُڑا دینے والی تھیں۔ اس زمرے میں آنے والے اول درجے کے اسکول کی (اس وقت تک) ماہانہ فیس 9 ہزار روپے تھی، دو ماہ کی ایک ساتھ ادائیگی کی شرط اور داخلہ فیس پینتالیس ہزار روپے تھی، جب کہ اس نوعیت کے

دوسرے اور تیسرے درجے کے اسکولوں کی ماہانہ فیس چار سے ساڑھے چار ہزار روپے، دو ماہ کی یکجا ادائیگی، اور داخلہ فیس اور دیگر مدوں میں کُل ملا کر تیس ہزار روپے ادا کرنا تھے۔ چناں چہ میرا انتخاب دوسرے نمبر پر آنے والا ایک اسکول ٹھہرا۔ یہی وہ وقت تھا جب دل میں یہ سوال پیوست ہوگیا کہ دینی تعلیم کے لیے عام مدارس سے گریز کیوں کیا جاتا ہے؟ اور اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کے خواہش مند جو لوگ ایک ساتھ حفظ قرآن اور عربی اور انگریزی تعلیم دینے والے اسکولوں کی فیس کا بار نہیں اُٹھا سکتے، وہ کیا کرتے ہیں؟

ان سوالات پر غور نے تحقیق کا راستہ دکھایا اور نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آئی ایک طرف دینی مدارس کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، دوسری طرف سرکاری تعلیمی اداروں کی تعداد تو بڑھی ہے مگر ان میں پڑھنے والے روز بہ روز گھٹتے جارہے ہیں۔ کم آمدنی والا طبقہ اور افلاس کا شکار خاندان بھی اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانا چاہتے ہیں، لیکن انھیں سرکاری اسکول اپنی بدحالی کے باعث ان کے اس خواب کو تعبیر دینے سے قاصر ہیں اور نجی اسکولوں کی فیس ادا کرنا ان کے بس میں نہیں، لہٰذا ان کی منزل دینی مدارس ہوتے ہیں۔

ملک بھر میں پانچ مکاتب فکر کے دینی مدارس قائم ہیں، جن میں دیوبندی مکتبہ فکر کے مدارس "وفاق المدارس العربیہ" کے زیر اہتمام، بریلوی مکتبہ فکر کے "تنظیم المدارس اہلسنت، پاکستان"، اہلحدیث مکتبہ فکر کے مدارس "وفاق المدارس السّلفیہ" اور شیعہ مکتبہ فکر کے مدارس "وفاق المدارس الشیعہ" کے زیر انتظام چل رہے ہیں، جب کہ رابطہ المدارس الاسلامیہ" کے زیر اہتمام قائم مدارس میں بھی لاکھوں طلبہ زیرِ تعلیم" ہیں۔

یہ تو ہوئی دینی مدارس کی بات، اب ذکر ہو جائے سرکاری اسکولوں کا۔ اگر صرف سندھ خصوصاً کراچی میں سرکاری اسکولوں اور ان میں پڑھنے والوں کے حوالے سے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ کراچی میں 3600 سرکاری اسکول قائم ہیں، جن میں لڑکوں کے لیے1098 لڑکیوں کے لیے 884 اور مخلوط تعلیمی ادارے 1651 ہیں۔

دوسری طرف سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر میں 20 ہزار سے زاید دینی مدارس طلبہ کو دینی تعلیم دے رہے ہیں، جن میں سے صرف سندھ میں مختلف مکاتب فکر کے تقریباً 6 ہزار مدارس قائم ہیں۔ یہ وہ مدارس ہیں جو حکومتی ریکارڈ میں موجود ہیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت ملک میں 189 مدارس قائم تھے۔ 2002 تک یہ تعداد 13 ہزار تک جا پہنچی۔ اور اب، غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، ملک میں 40 ہزار کے

قریب مدارس کام کر رہے ہیں۔ اگر صرف کراچی کی بات کی جائے تو 2003 میں پولیس کی جانب سے کرائے جانے والے سروے کے مطابق شہر میں مختلف مکاتب فکر کے 869 مدارس قائم ہیں۔ اور اب سن 2013 ہے، تو آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ ان مدارس کی تعداد کہاں تک پہنچ چکی ہو گی!

حکومت کے ایوانوں میں چاہے جمہوریت کا سورج طلوع ہو، یا آمریت کی رات مسلط ہو، پاکستان میں دہرے معیار تعلیم جیسے اہم ترین مسئلہ اہل اقتدار کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس مسئلے پر اسمبلیوں کی نشستوں پر براجمان مرد و خواتین لب کشائی کی زحمت کرتے ہیں۔ وجہ فقط اتنی ہے کہ حکمراں طبقے کے رکن افراد اور سرکاری ایوانوں میں پہنچنے والوں کے پاس انگریزی میڈیم اسکولوں کی بھاری فیس دینے کے لیے رقم موجود ہے، اور رہا دین و آخرت کا مسئلہ، تو مولوی صاحب گھر آ کر ان کے بچوں کو صرف ہزار روپے کے عوض قرآن مجید پڑھا دیتے ہیں، تو وہ اس بکھیڑے میں کیوں پڑے ں کہ اسکول میں دینی تعلیم ہونی چاہیے یا نہیں۔

یہ ہے وہ تلخ حقیقت جو اس سارے مسئلے کی بنیاد ہے۔

سرکاری اسکولوں کی زبوں حالی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ چناں چہ غربت کا شکار

والدین کے لیے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں پڑھانا وقت کا ضیاع ہے۔ دوسری طرف مدارس کی مفت تعلیم اور وہاں کھانے کی سہولت ان کے لیے کشش رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی میں سرکاری اسکولوں میں 5 لاکھ 42 ہزار 6 سو طلبہ زیر تعلیم ہیں، جب کہ شہر کے صرف دیوبندی مکتبہ فکر کے مدارس میں پڑھنے والوں کی تعداد چار لاکھ کے قریب ہے۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکاری اسکولوں میں طلبہ وطالبات کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہ دینے کے باعث مدارس میں پڑھنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ماضی میں بیشتر سرکاری تعلیمی ادارے نہ صرف اچھی تعلیم بلکہ تربیت کا ذریعہ بھی تھے۔ ہمارے ہاں اپنے علم اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر نام کمانے والوں کی ایک بڑی تعداد ان ہی اسکولوں کی پڑھی ہوئی ہے۔ مگر حکم رانوں کی توجہ سے محروم ہو کر یہ اسکول تعلیم کے بجائے اپنے طلبہ میں ناکامی اور احساس کم تری بانٹ رہے ہیں۔

خدارا ہمارے حکم راں سوچیں کہ ملک کے مستقبل کے معماروں کے ساتھ وہ کیسا خوف ناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ مدارس پر الزامات تو لگائے جاتے ہیں، مگر کسی ایسے یکساں نظام تعلیم کے بارے میں نہیں سوچا جاتا جو طلبہ کو دنیاوی اور دینی دونوں طرح کی تعلیم فراہم کرے۔ آخر ہمارے یہاں تعلیم کے معاملے میں

مختلف معیار کیوں ہیں؟ کیا قوم میں پائی جانے والی تقسیم کا ایک بنیادی سبب یہ بھی نہیں کہ ہم اپنی نسل نو کو مختلف اقسام اور معیار کے تعلیمی اداروں میں بانٹ دیتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب بس یہی ہے کہ طبقاتی نظام تعلیم دولت کی بنیاد پر اعلیٰ کہلانے والے طبقے کے مفاد میں ہے۔ اس طرح ان کے بچوں کی راہ میں کسی غریب زادے کی صلاحیت رکاوٹ نہیں ڈال سکتی اور انگریزی میڈیم کے بڑے اسکولوں کا کاروبار بھی اس نظام کے اندھیرے میں چمک سکتا ہے، جو اسی طبقے کے افراد کی ملکیت ہیں۔

# تبدیلی کی کنجی کس کے ہاتھ؟

"میں ووٹ نہیں دیتا، اس ملک میں الیکشن ورکنگ ڈے ضایع کرنے کے علاوہ کچھ نہیں، سب بکواس ہے۔"

نرم سوفے کی راحت میں دھنسے اور دبیز قالین پر پھیلی آسودگی کو تلوؤں سے سہلاتے "صاحب" نے سگار کا معطر دھواں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"ابوئیں میرا دماغ خراب نہ کر، تو ہی جا ووٹ ڈالنے، میرے پاس فالتو ٹیم نہیں ہے۔" تھڑے پر نیم دراز اللہ دتا نے پنڈلی کھجائی اور اپنے دوست کا مشورہ رد کرتے ہوئے مزید "دراز" ہوگیا۔

"ہمارے ہاں الیکشن عوام کو خوش کرنے کے لیے لگایا جانے والا میلہ ہے بسا ور ہیں میلوں میں وقت کھوٹا نہیں کر سکتا۔"، "آپ کس کو ووٹ دیں گے" کے سوال پر "علامہ" نے مسکرانے، سگریٹ سلگانے، سر جھکانے اٹھانے اور پھر چھوٹے سے جملے کی وقفوں میں تکمیل کے ذریعے کوئی دو منٹ صرف کیے اور پھر اپنے سنہرے قول پر داد طلب نظروں سے ارد گرد بیٹھے لوگوں کو دیکھنے لگے۔

طبقاتی فرق اور الگ الگ ذہنی معیار رکھنے والے ان افراد کی سوچ انھیں ایک

طبقہ بنادیتی ہے، جسے نرم سے نرم الفاظ میں مایوس افراد کا طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ ناامیدی کی "دولت" سے مالامال یہ لوگ ہمارے ہاں کثرت سے موجود ہیں اور دونوں ہاتھوں سے مایوسی پھیلاتے رہتے ہیں۔ انتخابات کے نتائج جہاں سیاسی جماعتوں کی کامیابی اور ناکامی کی خبر لاتے ہیں وہیں ٹرن آؤٹ کے اعداد وشمار ان افراد کی تعداد کی نشان دہی بھی کرجاتے ہیں۔ ووٹ نہ دینا اس طبقے کی مایوسی اور ملک کے معاملات سے لاتعلقی کا ایک واضح اظہار ہے۔

ان لوگوں کو ملک، نظام، حکومتوں، اداروں، سیاست دانوں اور عوام سب سے شکوے شکایات ہےں۔ انھیں کسی پر بھروسا نہیں، تنقید ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ بہ ظاہر ملک کے حالات پر ہر وقت فکر مند یہ خواتین وحضرات حالات بدلنے کے لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ یہاں تک کہ یہ پولنگ اسٹیشن پر قطار میں لگ کر ووٹ ڈالنے کی زحمت کو بھی بوجھ سمجھتے ہیں، اور اس طرز عمل کو جواز عطا کرنے کے لیے ان کے پاس بہت سے بہانے ہیں، جن میں سے سرفہرست ملک میں جمہوریت کا عدم استحکام، انتخابات میں دھاندلی کے ذریعے نتائج بدل دینے کی مکروہ روایت اور سیاست دانوں کی بدعنوانی اور ناقص کارکردگی ہے۔

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ باربار مارشل لا کے نفاذ نے پاکستان میں ووٹ کی حرمت کو بری طرح پامال کیا ہے۔ وردیوں کی طرح شیروانیوں نے بھی

جمہوریت اور پاکستانیوں کے حق رائے دہی پر کچھ کم ستم نہیں ڈھائے۔ سیاست دانوں نے بہ طور حکم راں اپنے مخالفین کو کچلنے کی کوششیں کیں، تو حزب اختلاف کی حیثیت میں انہوں نے برسراقتدار جماعت کی حکومت کے خاتمے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا اور اس جنون میں جمہوریت دشمن قوتوں کے آلہ کار بن گئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل سیاست کی ایک بہت بڑی تعداد نے منتخب ہونے اور اقتدار سنبھالنے کے بعد بدعنوانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، دھونس اور دھاندلی کے ذریعے بیلٹ باکسز سے من مانے نتیجے نکالنے کا چلن بھی ہمارے ہاں جاری رہا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود جمہوریت کا متبادل کیا ہے؟ کیا آمریت؟ ہم ان قوموں میں شامل ہیں جنھوں نے موجودہ زمانے میں طویل عرصے تک آمریت جھیلی ہے۔ ان آمریتوں میں سے ایوب خان ہی کی حکومت نے منصوبوں اور ترقی کی صورت میں قوم کو کچھ دیا، مگر اس کی حکمت عملیوں کے نتیجے میں ہمیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ بھی جھیلنا پڑا۔ جہاں تک اس دور میں ہونے والی معاشی ترقی کا تعلق ہے تو ایوب حکومت کی زرعی پالیسیوں کے باعث ہماری زراعت کو بے حد نقصان پہنچا۔ اور رہیں دیگر آمریتیں تو انھوں نے قوم کو انتشار، خلفشار، دہشت گردی، انتہاپسندی اور بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ ایسے میں تبدیلی اور ترقی کے لیے ایک ہی راستہ نظر آتا ہے، بُری جمہوریت کی بہتری کے لیے کوششیں۔

ان کوششوں میں سرفہرست اور بنیادی کوشش ووٹ کا استعمال ہے، لیکن ہمارے ہاں اکثریت یہ کوشش بھی نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ووٹرز کے ٹرن آؤٹ کا تناسب اس خطے کے ممالک میں سب سے کم ہے۔ جنوبی ایشیا میں ووٹنگ کے رجحانات کے حوالے سے سامنے آنے والے اعداد و شمار کے مطابق خطے کے مختلف ممالک میں 2008 سے 2010 تک جو انتخابات ہوئے ان میں ٹرن آؤٹ یہ رہا: بنگلادیش 85 فیصد، مالدیپ 79 فیصد، بھوٹان 79 فیصد، نیپال 63 فیصد، سری لنکا 61 فیصد اور بھارت فیصد۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے 2008 کے الیکشن میں یہ شرح 46 فیصد 58
تھی، جب کہ International Institute for Democracy and
نے تو یہ شرح اور بھی کم یعنی چوالیس فیصد قرار دی۔ Electoral Assistance
آئی ڈی ای اے" کے اعداد وشمار پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ "
سے گذشتہ انتخابات تک ٹرن آؤٹ پچپن فیصد سے زیادہ نہیں رہا ہے۔ دیگر 1977
انتخابات میں یہ شرح 35 فیصد سے 52 فیصد تک رہی ہے۔ یعنی لگ بھگ پاکستانیوں کی نصف تعداد ووٹ کا استعمال نہیں کرتی۔ اگر جعلی ووٹوں کو بھی شمار کیا جائے تو یہ شرح مزید کم ہو جاتی ہے۔

مذکورہ طبقے کے رجحان کے علاوہ ووٹنگ کی شرح کم ہونے کی دیگر وجوہات بھی ہیں، جیسے سیاسی قوتوں کی جانب سے الیکشن کا بائیکاٹ اور بعض علاقوں میں مقامی فرسودہ روایات کے تحت عورتوں کے ووٹ دینے پر پابندی۔ لیکن یہ مایوسی

اور لاتعلقی کا شکار افراد ہی ہیں جن کی عدم شرکت جمہوریت کے لیے نقصان دہ اور تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ اس طبقے کے افراد کی ایک خاصیت ان کی رائے کا آزاد ہونا ہے۔ چناں چہ اگر یہ لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کریں تو ان کے پیش نظر امیدوار اور جماعت کا کردار اور کارکردگی ہوگی، نہ کہ سیاسی وابستگی اور کوئی تعصب۔ مگر ایسے قیمتی ووٹوں کے استعمال نہ ہونے کے باعث وابستگیاں اور تعصبات جیت جاتے ہیں۔

2013 کے انتخابات گذشتہ الیکشنز سے مختلف پس منظر کے ساتھ اور الگ حالات میں ہورہے ہیں۔ پہلی بار ایک جمہوری حکومت نے پانچ سال پورے کیے ہیں، جس سے ملک میں جمہوریت کے استحکام کا امکان پیدا ہوا ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے دوران حزب اختلاف نے حکومت کی ناقص کارکردگی اور کئی نازک مواقع آنے کے باوجود حکومت کو گرانے کی کوئی کوشش کی نہ اس طرح کا کوئی مطالبہ کیا۔ اسی طرح ماضی کے برعکس حکومت نے حزب اختلاف کو کچلنے اور دبانے کا کوئی حربہ استعمال نہیں کیا۔ یہ روش بتاتی ہے کہ سیاست داں نسبتاً بالغ نظر ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے مدت سے قبل حکومت سے محروم ہوجانے والی جماعت مظلوم بن کر ہمدریاں بٹورتی تھی، مگر اس مرتبہ ایسا نہیں۔ مختلف ادوار میں حکومت میں رہنے والی تقریباً تمام جماعتیں ان پانچ سال کے دوران مرکز یا کسی صوبے میں برسراقتدار یا حکومت کا حصہ رہی ہیں اور عوام کے سامنے ان کی کارکردگی ہے۔ تجزیہ کاروں کے

مطابق ان انتخابات میں کھمبا ووٹ ہوں گے نہ کھمبا امیدوار کسی کام آئیں گے، سیاسی جماعتوں کو اپنی کارکردگی اور اپنے نامزد امیدواروں کی اہلیت کی بنیاد ہی پر ووٹ ملیں گے۔ یہ حقائق بہت سے روشن امکانات لیے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف آج ملک بہت نازک صورت حال سے دوچار ہے۔ معیشت سے امن وامان تک تباہی کے مناظر پھیلے ہوئے ہیں۔ ریلوے اور پی آئی اے سمیت متعدد ادارے تقریباً تباہ ہو چکے ہیں۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ، گیس کے بحران اور مہنگائی نے عام پاکستانی کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ ایسے میں ایک اچھی حکومت اور اہل منتخب نمائندے ہی حالات میں سدھار لا سکتے ہیں۔ اور یہ سب باشعور ووٹرز کی پرچیاں ہی ممکن بنا سکتی ہیں۔ اب ڈرائنگ رومز میں اور تھڑوں پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کو بھی پولنگ اسٹیشنوں کی قطاروں میں لگنا ہوگا، ووٹ کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کرنا ہوگا۔ تبدیلی کی کنجی ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس قطار کے علاوہ تبدیلی کا کوئی راستہ نہیں۔

## جمائما سے سیکھیے

"میں نے اسے کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیا، نہ اس نے کبھی مانگا"

یہ بہت عام سا جملہ ہے، مگر اپنے پس منظر کے ساتھ بہت خاص ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کے الفاظ ہیں جو امارت کی الف لیلوی دنیا میں پلی بڑھی، ایک ترقی یافتہ ملک کی شہری کی حیثیت سے اور پُر تعیش زندگی کے سائے میں آسودہ زندگی گزاریا اور پھر بیس سال کی روپ اور سپنوں سے بھری عمر میں ایک وجیہہ مرد، جو اس سے چوبیس سال بڑا تھا، کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنا مذہب چھوڑا اور اس کے تیسری دنیا میں واقع دیس چلی آئی، جہاں کے طور طریقوں کو گلے سے لگایا، زبان سیکھنے کے جتن کیے اور اس اجنبی تہذیب کا آنچل یوں اوڑھا کہ محبت میں سب کچھ تج دینے کی تصویر بن گئی۔ محبت میں گُندھی یہ رفاقت شوہر کی مصروفیات یا نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر در آنے والی تلخیوں کے باعث فاصلے میں بدل گئی اور یہ بندھن 9 سال بعد ٹوٹ گیا۔

اب ہماری "روایت" میں تو ترک تعلق نفرت اور الزام تراشیوں کی بنیاد بنتا ہے، مگر یہ خاتون آج بھی اپنے سابق شوہر کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتی، وہ اس پر لگنے والے الزامات کی تردید پوری سچائی کے ساتھ کرتی

ہے، بلکہ اگر اس کے کسی اقدام کو درست سمجھے تو شانہ بہ شانہ کھڑی ہوتی ہے۔

یہ ہے جمائما خان، کرکٹ کے میدان میں کامرانیاں سمیٹنے کے بعد اب سیاست کے ایوانوں پر کمند ڈالنے کا ارادہ باندھے عمران خان کی سابق اہلیہ۔

اوپر دیے گئے الفاظ جمائما نے اس وقت ادا کیے تھے جب عمران خان کے مخالفین نے ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ اپنی سابق اہلیہ کے امیر کبیر خاندان کے مالی وسائل سے مستفید ہوئے ہیں۔ آج جب عمران خان کی جماعت تحریک انصاف فتح اور حصول اقتدار کے امکانات اور امیدوں کے ساتھ انتخابی اکھاڑے میں اتری ہے تو جمائما سوشل میڈیا پر اپنے سابق شوہر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کر رہی ہیں۔

اسی طرح کی ایک خاصی مختلف مثال ہمیں تہمینہ دُرانی کی صورت میں ملتی ہے۔ تہمینہ درانی نے اپنی مشہور کتاب جس کا ترجمہ "میڈا سائیں" کے نام سے ہوا، اپنے سابق شوہر غلام مصطفیٰ کھر کی پردہ نمائی اور کھر کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کے مبینہ مصائب بیان کرنے کے لیے لکھی تھی، مگر انصاف سے کام لیتے ہوئے کتاب میں غلام مصطفیٰ کھر پر لگنے اس الزام کی تردید کی جو ان کے سیاسی کیریر پر داغ بنا رہا ہے۔ تہمینہ درانی نے پوری وضاحت سے مصطفیٰ کھر

پر بہ طور گورنر پنجاب ایک لڑکی کے اغوا کے الزام کو رد کیا۔

تہمینہ درانی کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کے دیگر مندرجات کو سچ ثابت کرنے کے لیے غلام مصطفٰی کھر کے دامن پر لگا ایک دھبا دھو دیا، تاکہ خود ان کے لگائے گئے داغ نمایاں ہو سکیں، مگر جمائما کا معاملہ مختلف ہے، انھیں عمران خان کی حمایت یا ان کے حق میں گواہی دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جمائما کا رویہ ہمارے معاشرے کے لیے ایک مثال ہے کہ کیسے تعلق میں دراڑ آنے کے باوجود جس سے ناتا ٹوٹا ہے اس کی برائیاں ہی نہ دیکھی جائیں خوبیوں کو بھی یاد رکھا اور ان کا کُھل کے اعتراف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سماجی تعلقات کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ آج باہمی اتفاق کا رشتہ کل گہرے اختلاف کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔

کاروباری تعلق ٹوٹ کر شراکت کاروں کو تجارت کی دنیا میں حریف بنا سکتا ہے۔ نظریہ اور نقطۂ نظر کا بدل جانا تعلق کا چہرہ کچھ کا کچھ کر سکتا ہے۔ گھریلو ناچاقی میاں بیوی کو ایک خاندان کی اکائی سے نکال کر دو الگ الگ گھرانوں کا فرد بنا سکتی ہے۔ تعلق کی نوعیت کا بدل جانا ہمارے ہاں دشمنی اور انتقام کی نفسیات کو جنم دیتا ہے۔ اس کا کم سے کم نتیجہ بھی نفرت اور الزام تراشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اختلاف اور علیحدگی کا

منظر گھر کی چار دیوار میں ابھرے یا سیاست کی راہوں پر گام زن شریکِ سفر راستے الگ کرلیں، الزام اور دشنام کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ یہ کج روی ہمارے سماج میں اس قدر عام ہے کہ کوئی مثال دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی شادی شدہ جوڑے سے اس میں طلاق ہونے کے بعد فریقین سے الگ الگ ملیے، ایک دوسرے کے لیے نفرت کی زبان کے علاوہ آپ کو کچھ سننے کو نہیں ملے گا۔ اسی طرح سیاسی جماعتوں کے دو حصوں میں بٹنے یا کسی راہ نما کے اپنی جماعت سے الگ ہونے کے بعد اس فاصلے کے آرپار کھڑے افراد ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے اور زبانوں سے ایک دوسرے پر انگارے برساتے نظر آئیں گے۔

یہ رویہ ہماری ذہنی پس ماندگی کی عکاسی کرتا ہے جو سماج کے ہر گوشے اور ملک کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ رشتوں کے حوالے سے ہمارے رویے عجیب و غریب ہیں۔ جس پہ فدا ہوں اس کی ہر بُرائی سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں، اس کے گناہ بھی ثواب نظر آتے ہیں، اس پر تنقید کا ایک لفظ سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے، مذہب، اخلاق، اقدار کوئی چیز ہمیں اپنے ممدوح کی خامی تو کیا کسی سیاہ کاری کی حمایت سے بھی نہیں روکتی نہ اسے غلط کہنے کی اخلاقی جُرات دیتی ہے۔ خاص طور پر سیاست کی دنیا میں یہی چلن ہے۔ سیاسی جماعتوں کے بعض نعرے ہی سُن لیجیے اور ان پر غور بھی کیجیے، اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے سیاسی کارکن اور

سیاست دانوں کے حامی کسی بھی نظریے اور قدر سے بے نیاز ہو کر کس طرح اپنے راہ نما سے غیر مشروط تعلق استوار کیے ہوئے ہیں۔ ایسا تعلق عشق کی داستانوں میں تو ملتا ہے مہذب معاشروں کی سیاست میں ناپید ہے۔ دوسری طرف اختلاف کی دراڑ پڑتے ہی جن پر جان فدا کر دینے کی آرزو تھی، ان کی جان لینے کا جذبہ دل میں دہک اٹھتا ہے۔ راہ نما قوم کے لیے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ ان کے رویے عوام کے لیے نذیر بنتے ہیں، مگر ہمارے ہاں راہ نماؤں کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک دوسرے پر ذاتی حملے، مخالفین کے لیے غلیظ الفاظ کا استعمال، پگڑی اچھالنا ہماری سیاست میں "حکمت عملی" کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کسی سیاست داں کے منہ سے اس کے مخالف کی کسی خصوصیت کی تعریف نہیں سنیں گے (البتہ مرحومین کو استثنٰی حاصل ہے کہ ہمارا معاشرہ مرجانے والوں کی فوری بُرائی برداشت نہیں کرتا) سوال یہ ہے کہ کیا سیاست داں اپنے مخالف میں کوئی خوبی نہیں پاتے؟ کیا کوئی حکومت ایک بھی ایسا کام نہیں کرتی کہ حزب مخالف کے لوگ جس کی ستائش کر سکیں؟ ایسا نہیں، بس بات اتنی ہے کہ ہم مخالف یا تعلق کی ایک خاص شکل بدل جانے پر فریق ثانی کی تعریف یا اس کی کسی خوبی کے اعتراف کو اپنی کم زوری اور ذلت تصور کرتے ہیں۔ قربت کے فاصلے میں بدل جانے کے بعد ہمارے نزدیک اس تعلق کی بس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، نفرت اور دشمنی۔ ہم اب تک

نہیں جان پائے کہ باہمی احترام کا رشتہ ہر صورت قائم رہتا ہے، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی یہ رشتہ خود کو منواتا رہا ہے۔

ہمارے سماج اور سیاست دانوں کو جمائما سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب انتخابی مہم جاری ہے، اور بالخصوص عمران خان کو جو اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود صرف الزامات کے سہارے سیاست کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔

## خواب برابری کے، تعبیر صرف 36 امیدوار

ووٹر وہ چیونٹی ہے جس کے انتخابات کے موسم میں پَر نکل آتے ہیں اور پھر یہ چیونٹی کسی ہاتھی کی موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ عوام کو بے وقوف سمجھنے والے کب تک اپنی طاقت کے زعم میں رہیں گے۔

الیکشن کی گہما گہمی عروج پر ہے لیکن ٹھہریے، گہما گہمی صرف ان کے لیے جنھیں کسی حملے کا خطرہ نہیں۔ باقی تو وہ سیاسی جماعتیں ہیں جو پچھلے پانچ سال میں حکومت کا حصہ رہی ہیں یا یوں کہیے کہ حکومت گھسیٹتی رہی ہیں، اب ان کے پاس بڑے بڑے ڈیکس کے ذریعے پارٹی کے نغمات "دور دور تک پہنچانے"، رنگ برنگی بتیاں جگمگانے اور جگہ جگہ اپنے پرچم لہرانے کے سوا الیکشن کی کوئی گہما گہمی نہیں۔ جلسے جلوسوں پر حملوں کا خطرہ ہے، سیکیوریٹی خدشات کے باعث جان پر بنی ہوئی ہے، چناں چہ بلند ترین آہنگ میں انتخابی نغمات کی ریکارڈنگ کے ذریعے انتخابی کیمپوں کے قریب آباد لوگوں کی جان پر بنادی جاتی ہے۔ چاہے اس شور اور دھمک سے کسی دل کے مریض کے دل کا جانا ٹھہر جائے، مگر دل بہلاتی اس گہما گہمی کا نظر آنا ضروری ہے۔

اخبار کے پنّے پلٹیے، ٹی وی کے چینل بدلیے یا سوشل میڈیا میں جھانک آئیں، ہر سو انتخابات کا شور ہے وعدوں کا زور ہے۔ سیاسی جماعتوں کے وعدوں سے بھرے منشور ملک کی نصف آبادی یعنی عورتوں کو بھی اچھے دنوں اور صنفی مساوات کے سپنے دکھا رہے ہیں، مگر ان کی تعبیر ان جماعتوں کے نام زد امیدواروں میں خواتین کی تعداد دیکھ کر سامنے آجاتی ہے۔

یوں تو پاکستان کی ساری ہی سیاسی جماعتیں خواتین کے حقوق کی چیمپیئن بنتی ہیں، لیکن انتخابات میں عام نشستوں پر خواتین کو لڑانے کا مرحلہ آتا ہے تو ان کے دعوؤں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو ہزار دو کے الیکشن کے بعد عام نشستوں کے لیے بہ طور پارٹی امیدوار مقابلہ کرنے والی خواتین کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔

میں ٹی وی چینلز بدلتی گئی اور سیاست دانوں کے بھانت بھانت کے دعوے کانوں میں پڑتے گئے۔ ایک صاحب، جو اردو پر مکمل عبور دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، کچھ یوں پریس کانفرنس میں اظہارِ خیال کر رہے تھے، "ہمارا انتخابی نعرہ اختیارات سب کے لیے ہے۔ پارلیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی پچاس فی صد کی جائے گی۔" دل تو چاہا کہ چیخ کر کہوں کہ اگر ایسا ہی ہے تو آپ نے صرف سات خواتین کو پارٹی ٹکٹ کیوں دیا؟ مگر افسوس میری آواز ان تک

نہیں پہنچ سکتی تھی، ہاں تحریر ضرور پہنچ سکتی ہے۔

دوسرے چینل پر انصاف کے نعرے لگانے والوں کی آواز آئی، "ہمارے منشور کی بنیاد انصاف، امن اور خوش حالی ہے۔" اے انصاف کی بولی بولنے والو! تم نے قومی اسمبلی کے لیے صرف چار خواتین کو ٹکٹ دیا ہے۔ یہ تو انصاف کا چوتھائی حصہ بھی نہ ہوا۔

ایک اور سیاست داں صنعت وتجارت کے شعبے پر خاص توجہ دینے اور ملازمت کے تیس لاکھ سے زاید مواقع فراہم کرنے کی بات کر رہے تھے، مگر انھوں نے خواتین کی نمایندگی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی جماعت نے صرف سات خواتین کو پارٹی ٹکٹ کے لائق سمجھا ہے۔

دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام عورتوں کو سب سے زیادہ حقوق دیتا ہے، لیکن پاکستان کی دو بڑی مذہبی جماعتوں نے ایک بھی خاتون کو ٹکٹ نہیں دیا۔

عام انتخابات میں خواتین پر اعتماد کا عالم یہ ہے کہ 272 نشستوں والی قومی اسمبلی کے لیے تمام سیاسی جماعتوں نے مجموعی طور پر 36 خواتین کو ٹکٹ جاری کیے ہیں۔ 2008 کے الیکشن میں 34 جب کہ 2002 کے انتخابات میں 38 خواتین کو ٹکٹ

دیے گئے تھے۔

خواتین کی پارلیمینٹ میں نمائندگی کے لحاظ سے پاکستان دنیا میں 52ویں نمبر پر ہے۔ ترقی پذیر ملک ہونے کے باوجود یہ نمائندگی دوسرے مسلم ممالک سے زیادہ ہے۔ مگر یہ نمائندگی مخصوص نشستوں کی بنیاد پر ہے، نہ کہ براہ راست انتخاب میں خواتین کی کامیابی کے باعث۔ اور یہ مخصوص نشستیں سیاسی خانوادوں کی خواتین کے لیے مختص سمجھی جاتی ہیں۔

جہاں تک خواتین کو عام نشستوں کے لیے امیدوار بنانے کا تعلق ہے تو سیاسی جماعتوں کی روش یہ نظر آتی ہے: پاکستان پیپلزپارٹی نے 2008 میں پندرہ خواتین کو امیدوار نامزد کیا تھا، اب یہ تعداد کم ہو کر گیارہ رہ گئی ہے۔ مسلم لیگ ن نے 2008 میں چھے خواتین کو ٹکٹ دیے تھے، اس مرتبہ سات خواتین کو میدان میں اتارا ہے۔ متحدہ قومی موومنٹ نے گذشتہ الیکشن میں پانچ خواتین کو امیدوار بنایا، اس بار سات حلقوں میں خواتین امیدوار سامنے لائی ہے۔ مسلم لیگ ق کی جانب سے دیے جانے والے ٹکٹوں کی تعداد آٹھ سے کم ہو کر چار رہ گئی ہے۔پاکستان تحریکِ انصاف نے قومی اسمبلی کے لیے چار جب کہ عوامی نیشنل پارٹی نے صرف دو خواتین کو ٹکٹ جاری کیے ہیں۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام (ف) نے گذشتہ انتخابات کی طرح اس بار بھی کسی خاتون کو

امیدوار نام زد نہیں کیا۔

تجزیہ کاروں کے مطابق خاتون امیدواروں میں عذرا پیچوہو، فریال تالپور، خالدہ گھرکی، ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، ثمینہ دولتانہ، سائرہ افضل تارڑ، سمیرا ملک، ماروی میمن اور خوش بخت شجاعت اپنے اپنے حلقوں میں مضبوط امیدوار ہیں۔

پاکستان کے مخصوص معاشرے میں درپیش مشکلات کے باوجود خواتین جس طرح اپنی ذمے داریاں اور اپنا سماجی کردار احسن طریقے سے ادا کر رہی ہیں، وہ ہمارے جیسے سماج کے حامل دیگر ممالک کی عورتوں کے لیے ایک مثال ہے۔ آج کی پاکستانی عورت گھر سے لے کر تعلیم کے میدان اور سیاست کے ایوانوں تک اپنے فرائض بہ خوبی نبھارہی ہے۔ اس کے باوجود اہل سیاست عملاً خواتین کی صلاحیتوں اور سماجی وسیاسی کردار کے اعتراف سے گریزاں ہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح ہوں یا بے نظیر بھٹو، ان کی سیاسی بصیرت اور جُرات سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ پاکستان کی سیاست میں تو یہ روایت رہی ہے کہ کسی جماعت پر مشکل وقت پڑتا ہے تو خواتین ہی آگے بڑھ کر جدوجہد اور قربانی کی تاریخ رقم کرتی ہیں۔ پارٹی لیڈر کے ایک اشارے پر خاتون کارکنان سڑکوں پر

نکل آتی ہیں۔ مگر سیاسی جماعتوں سے وابستہ خواتین نے کیا کبھی اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ پارٹی ٹکٹ تقسیم صنفی امتیاز کے بغیر برابری کی بنیاد پر کیوں نہیں کی جاتی؟ یا کم از کم معقول تعداد میں خواتین کو امیدوار نام زد کیوں نہیں کیا جاتا؟

ماروی میمن بولنے پر آئیں بڑے بڑوں کو خاموش کرا دیتی ہیں۔ کاش کہ ان کی آواز اپنی جماعت میں خواتین کو ان کا حق دلوانے کے لیے بھی بلند ہو۔ فہمیدہ مرزا کی بارعب شخصیت کا کیا کہنا۔ مجال ہے جو ان کے سامنے کوئی سیاست داں تکرار کرسکے۔ فریال تالپور کی سیاسی بصیرت پر بات کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حنا ربانی کھر ہوں یا کشمالہ طارق اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی ہیں۔ سمیعہ راحیل قاضی کیا منفرد شخصیت کی مالک ہیں۔ کوئی بات سمجھانے پہ آئیں تو دل میں اتر جاتی ہے۔ خوش بخت شجاعت کی اہلیت اور خوش کلامی کا کون معترف نہیں۔ یہ تمام وہ خواتین ہیں جو اپنی اپنی جماعت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ اپنی جماعت میں خواتین کو نظرانداز کرنے پر آواز کیوں نہیں اٹھاتیں؟ ان کی ذرا سی کوشش اور احتجاج ان کی جماعتوں میں خواتین کا مقام تبدیل کرسکتا ہے، لیکن افسوس انھوں نے خود نمایاں مقام حاصل کرکے ملک کی آبادی کا پچاس فی صد سے زاید اپنی ہم صنفوں کو نظرانداز کردیا۔

یہ سارا منظر دل دُکھانے والا ہے، مگر میں مایوس نہیں، کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ اس ملک میں تبدیلی کا وقت آچکا ہے۔ جو کبھی نہ ہوا وہ انشاء اللہ اگلے پانچ سال میں ضرور ہوگا۔ جب صرف باتوں سے خواتین کے حقوق کی چیمپیئن شپ جیتی نہ جاسکے گی، بلکہ نام زد امیدواروں کی فہرست میں "محترمہ، آنسہ اور مِس" کے لاحقے والے ناموں کی نمایاں تعداد ہی بتائے گی کہ کون سی جماعت عورتوں کے حقوق کو تسلیم کرتی ہے۔

## لاش نمبر آٹھ ہزار چوالیس

’’لاش نمبر آٹھ ہزار چوالیس، تصویر بنوالی اس کی؟

’’ہاں یار عبدالغفور! تصویر بنوالی، مگر اس کے ساتھ جو سات لاشیں اور آئی ہیں ان کا ابھی کوئی وارث نہیں، جن پانچ افراد کی مزید لاشیں ملی ہیں وہ کسی سیاسی جماعت کے کارکن تھے۔ انھیں تھوڑی دیر میں ان کے ورثا لے جائیں گے۔ اے میرے مولا! یہ ٹارگیٹڈ کلنگ۔۔۔۔۔ خاندان کے خاندان تباہ ہورہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔۔۔۔

پوچھنے والا کیوں نہیں، باقاعدہ ایف آئی آر کٹی ہوئی ہوتی ہے، پولیس انکوائری ہوتی ہے۔ ٹارگیٹڈ کلنگ میں مرنے والوں کا کم از کم نام تو سامنے آتا ہے، مگر ان بد نصیبوں کو دیکھو، یہ لاوارث ہیں۔ نہ جانے کیا نام ہوگا ان کا۔ اب تو فقط ایک نمبر ان کی شناخت ہے، اور یہ سفید کپڑے میں لپٹی لاش کی تصویر، جسے ان کا کوئی وارث دیکھ بھی لے تو شاید ہی پہچان پائے۔ ان کی جان کے ضیاع پر نہ تو کوئی پولیس کی کارروائی ہوتی ہے اور نہ حکومت ان کی شناخت کا ریکارڈ رکھتی ہے۔ پتا نہیں کون ہیں یہ۔ خیر جانے دے۔ ہمارا تو یہ روز کا کام ہے۔ دوسری لاش کی تصویر بنا۔ لاش نمبر آٹھ ہزار پینتالیس۔۔۔۔‘‘

یہ عبدالغفور اور شاکر ہیں، جو اپنے دن کا ایک بڑا حصہ "گم نام مُردوں" اور "لاوارث لاشوں" کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ایک عام آدمی جہاں جانے کے خیال ہی سے اپنے جسم میں سرد لہر دوڑتی محسوس کرتا ہو اور جہاں خون جماتی خنکی، سفید چادروں میں لپٹے مُردے اور موت کا سناٹا طاری ہو، وہاں فرائض انجام دینے والے عام دل اور اعصاب رکھنے کے باوجود عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

عجیب حال ہے اس جگہ کا جہاں یہ لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ ہے ایدھی سرد خانہ۔ اس عمارت میں داخل ہوں تو دیواروں پر ان گنت پوسٹ اور تصاویر نظر آتی ہیں۔ یہ ان گم شدہ افراد کی تصویریں ہیں جو اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے۔ جب کسی کا پیارا گم ہو جائے تو وہ کیسی اذیت جھیلتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

کراچی کے خراب حالات کی وجہ سے اس دیارِ بے اماں میں زیست کرتا ہر شخص خوف زدہ ہے۔ ایسے میں اگر کسی کا پیارا وقت پر گھر نہیں آتا تو ان گنت خوف ناک خیالات اسے گھیر لیتے ہیں۔ اور جب گزرتا وقت تشویش اور اضطراب کو اس یقین میں بدل دیتا ہے کہ آنے والا کسی ناگہانی کا شکار ہو گیا ہے، تو تلاش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور ناکامی کے بعد بوجھل قدم ایدھی کے سرد خانے کا رخ کرتے ہیں، جہاں شہر بھر سے لاوارث لاشیں لائی جاتی ہیں، جنھیں کم از کم تین

روز رکھ کر مرنے والے کے رشتے داروں کا انتظار کیا جاتا ہے اور اگر پھر بھی کوئی وارث نہیں آتا تو بے جان جسموں کا مقدر بنتا ہے لاوارث لاشوں کا قبرستان۔

تقریباً ڈیڑھ کروڑ آبادی والے اس شہر میں ہر روز کئی افراد ''نامعلوم ملزمان'' کا نشانہ بن کر خبر ہو جاتے ہیں۔ موت ان سے زندگی چھینتی ہے، مگر یہ شناخت سے محروم نہیں ہوتے، سو لاش ملنے کی خبر میں مرنے والے کا نام اور تعلق کی بابت بتایا جاتا ہے۔

لیکن اسی شہر میں ایسی لاشیں بھی ملتی ہیں، جن کی کوئی شناخت نہیں ہوتی اور یہ ''نامعلوم'' کا نام پا کر آخرکار لاوارث قرار دے دی جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی اندھی گولی کا نشانہ بنا ہوتا ہے، تو کوئی حادثے کا شکار ہوتا ہے اور کسی کو طبعی موت سرِ راہ اُچک لیتی ہے۔ اور پھر ان کی لاشیں کئی کئی دن سرد خانوں میں رہ کر گم نامی میں دفن کر دی جاتی ہیں۔

دہشت گردی اور ٹارگیٹڈ کلنگ کے کسی بھی واقعے کا شکار ہونیوالے ''معلوم افراد'' کا پولیس نہ صرف ریکارڈ مرتب کرتی ہے، بلکہ حکومتی سطح پر بھی ان کا ریکارڈ خوبصورت گراف کے ساتھ روزانہ، ماہانہ اور سالانہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بنایا اور امن وامان کے ذمے داروں اداروں کو تنقید و تبصرے کے ساتھ بھیجا جاتا ہے لیکن افسوس سرکاری سطح پر گم شدہ افراد اور لاوارث لاشوں کا

ریکارڈ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں البتہ بعض غیر سرکاری تنظیمیں اس سلسلے میں کچھ ریکارڈ مرتب کرتی ہیں۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی سالانہ رپورٹ کے مطابق 2012 کے دوران کراچی میں 3105 (3 ہزار ایک سو50) افراد قتل کیے گئے، جب کہ صرف اس شہر میں روزانہ دس سے پندرہ لاوارث لاشیں بھی ملتی ہیں، جن کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہوتا۔ کراچی کے علاقے سہراب گوٹھ میں واقع ایدھی کے سرد خانے میں روزانہ 40 سے 50 افراد کی لاشیں لائی جاتی ہیں، ان میں ہیروئنچی، ٹریفک حادثات میں مرنے والے، خودکشی کرنے والے، بم دھماکوں اور ٹارگیٹڈ کلنگ کا شکار اور کچھ طبعی موت مرنے والے افراد شامل ہوتے ہیں۔

کراچی کئی سال سے ٹارگیٹڈ کلنگ کا نام پانے والے بھیانک عفریت کے خونی پنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایسے میں غیر طبعی موت کا شکار افراد کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ چناں چہ شہر کو مزید سرد خانوں کی ضرورت پڑی۔ چند سال پہلے تک کراچی میں صرف ایک سرد خانہ ہوا کرتا تھا، جو سہراب گوٹھ کے علاقے میں ہے۔

یہ سرد خانہ عبدالستار ایدھی ٹرسٹ کے زیر نگرانی قائم ہے۔ جس شہر میں غیر طبعی

موت مرنے والوں کی شرح اس حد تک بڑھ گئی ہو کہ روزانہ دس بارہ لاشیں ملنا معمول سمجھ لیا جائے، ظاہر ہے وہاں قبرستانوں اور سردخانوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس وقت کراچی میں دو اور سردخانے بھی قائم ہیں، جو متحدہ قومی موومنٹ کی خدمتِ خلق فاؤنڈیشن کے زیرِ سرپرستی ہیں، جب کہ کچھ اسپتالوں میں اور کمیونٹیز کی سطح پر بھی مردہ اجسام کو خنک ماحول میں محفوظ رکھنے کی سہولت موجود ہے۔

میر مرتضٰی بھٹو قتل کیس کے بعد ایک انکوائری کمیٹی بنائی گئی جو تین جج صاحبان پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی، جس میں باقاعدہ حکم جاری کیا گیا کہ پوسٹ مارٹم کے وقت اعضا کی پیوندکاری کسی غیر مسلم سے نہیں بلکہ مسلمان سے کروانی چاہیے، جب کہ لاوارث لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیے بغیر ہی رپورٹ لکھ دی جاتی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ کسی بھی ملنے والی لاوارث لاش کو پہلے متعلقہ پولیس پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال لاتی ہے، جہاں وجہِ موت جاننے اور پھر پولیس کلیئرنس کے بعد اسے چند روز ایدھی سردخانے میں رکھا جاتا ہے۔

اور جب کوئی وارث نہیں آتا تو اس لاش کو مواچھ گوٹھ میں واقع ایدھی قبرستان میں دفنادیا جاتا ہے۔ جہاں مرنے والے کی تصویر، اس کے کپڑوں اور اس سے ملنے

والے تمام سامان کی فہرست بنا کر محفوظ کر لینے کے بعد لاوارث لاش کو ایک نمبر الاٹ کر دیا جاتا ہے۔ تصویر سرد خانے میں موجود البم میں لگا دی جاتی ہے، تاکہ اگر ورثا آ جائیں تو اپنے پیارے کی لاش بہ آسانی شناخت کر سکیں۔

لاوارث لاشوں کے ملنے والے نوے فیصد سے زاید لواحقین لاش کو ایدھی قبرستان سے منتقل نہیں کرتے بلکہ قبر پر کُتبہ لگا دیتے ہیں۔ اگر کوئی وارث اپنے عزیز کی لاش منتقل کرانا چاہے تو اسے باقاعدہ متعلقہ سرکاری اداروں کی جانب سے مکمل قانونی کارروائی کے بعد ہی ایسا کرنے کی اجازت ملتی ہے۔

کراچی شاید دنیا کا سب سے لاوارث، بے حس اور خوف ناک شہر ہے، کیوں کہ دنیا کے کسی اور شہر میں لاوارث افراد کا اتنا بڑا قبرستان نہیں، جتنا وسیع گورستان اس شہر میں آباد'' ہے، جہاں ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ لاوارث میتیں سپردِ خاک کی'' جا چکی ہیں۔

عوام کی جان و مال کے تحفظ کی ذمے دار ریاست ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کام اپنی مدد آپ'' پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسے میں کراچی جیسے شہر میں جہاں بڑے بڑے'' نام وروں کی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں، وہاں بے نام اور لاوارث لاشوں کی ذمے داری کون اُٹھائے گا، کسے پڑی ہے کہ ان لاشوں کو شناخت ملے

اور اپنے پیاروں کی راہ تکتے ورثا ان کی میت دیکھ سینے پر صبر کا پتھر رکھ سکیں، کہ اقتدار میں آنے والوں کو ووٹ چاہیے ہوتا ہے اور لاوارث لاشیں ووٹ نہیں دے سکتیں۔
مگر روزِ جزا ہمارے حکم رانوں کو ان لاشوں کے ''ووٹ'' کی ضرورت ہو گی۔

## رانی کی راج دھانی

بچپن کے آنگن سے سسرال کی دہلیز کا سفر عورت کی زندگی میں عجیب نشیب و فراز لیے ہوتا ہے۔ بچپن کا آنگن میکے کا گھر ماں باپ بہن ، بھائی مزے مزے کی نوک جھوک عمر بھر جیسے دماغ میں پیوست ہو جاتی ہے۔ وقت پنکھ لگا کر اُڑ جاتا ہے۔ ماں باپ کی ننھی گڑیا۔ جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتی ہے اور پھر عقد النکاح کے بندھن سے بندھ کر پیّا گھر چلی جاتی ہے۔ آنکھوں میں ہزار خواب سجائے زندگی کی تلخیوں سے ناآشنا ایک خیالی زندگی کا تانہ بانہ دماغ بُنتا چلا جاتا ہے۔ ان خیالات کی خوبصورت چادر اُڑھے سسرال کی دنیا استقبال کرتی ہے۔

اپنے اہم ہونے کا احساس اِس نئی جگہ پر قدم رکھتے ہی اتنا شدید ہوتا ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک رُواں رُواں اک عجب ذوم اور فخر سے سرشار کہہ رہا ہوتا ہے کہ "اب میں اِس گھر کی رانی ہوں یہ میرا گھر ہے" لیکن در حقیقت اِس رانی کو اپنی راج دھانی چلانے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ حقیقی دنیا میں افسانوی کرداروں کیلیے کوئی جگہ نہیں۔ عورت بیوی بننے سے پہلے کسی کی بیٹی ہے۔ اُسکا خاوند کے گھر کو بسانا ایک فطری عمل ہے۔ شوہر کا گھر ہی عورت کا گھر کہلاتا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت جب ماں باپ کا گھر چھوڑ کر شوہر کے گھر

پہنچتی ہے تو اُس کے دل میں غیر محسوس طریقے سے ایک نفسیاتی اور جذباتی خلا پیدا ہوتا ہے۔ اور اِس خلا کو پُر کرنے کے لئے اُس کی زندگی کا محور اُسکے شوہر تک محدود ہو جاتا ہے۔ اِس جذباتی ہیجان کو نہ عورت سمجھ پاتی ہے نہ اُسکا خاوند نہ سسرال والے۔ بیٹی کو یہ سمجھا کر رخصت کیا جاتا ہے کہ گرہستی سنبھالنا، ساس سسر کی خدمت کرنا، تمھارا جنازہ اِس گھر سے رخصت ہونا چاہیے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ پر طریقہ کار۔ وہ نہیں سمجھایا جاتا۔ لیکن اگر سسرال میں روزِ اوّل ہی سے چند باتوں کو اپنے پلو سے باندھ لیا جائے تو یقیناً زندگی روز بروز خوبصورت بنتی چلی جائے گی۔ اور یوں نئی نویلی دُلہن نہ صرف رانی بن کر راج کرے گی بلکہ اپنے خاوند کے دل میں جگہ بھی بنالے گی۔

نئے گھر میں جگہ بنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ نئی نویلی دلہن اکثر اُن رشتوں کی مضبوطی اور اہمیت کو فراموش کر بیٹھتی ہے جو خاوند سے جڑے ہوئے ہیں۔ ساس، سسر، دیور، جیٹھ، نند یہ سب رشتے سسرال کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اگر عورت اِن رشتوں کا خیال نہ رکھے تو گھر میں ناچاکی جنم لیتی ہے۔

بعض مرد اِس معاملے میں لاپروا ہوتے ہیں کہ اُن کے گھر والوں کا خیال رکھا جائے نہ رکھا جائے اُنھیں فرق نہیں پڑتا لیکن بہر حال سارا دن گھر والوں کے

ساتھ تو اُس عورت کو ہی رہنا ہے۔ اُن کے دل جیتنا اور اخلاق سے پیش آنا گھر میں جگہ بنانے کا پہلا قدم ہے۔ عورت اگر اخلاق اور صبر سے کام لے تو رفتہ رفتہ سارا گھر اُسکا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اپنے مزاج سے ہٹ کر حرکات و سکنات برداشت کرنا آسان نہیں۔ اکثر سسرالیوں سے زچ کر غصے میں غلط لفظوں کا استعمال بھی ہو جاتا ہے جو شرمندگی کا باعث بنتے ہیں۔

عورت کے خلوص اور نیت میں اتنی چاشنی اور صبر ہونا چاہیے کہ سسرال والے اُس کے پیار سے مرید بن جائیں۔ رشتوں میں محبت صرف لفظی کھیل نہیں۔ بلکہ عورت کا اعلیٰ قسم کا کردار، خیالات، حرکات اِس کا ثبوت ہوتا ہے۔ گرہستی چلانے کے لئے عقل، تحمل اور بردباری کی ضرورت ہوتی ہے۔

سسرال میں مزاج کے خلاف بہت سی باتیں ہوتیں ہیں اُس وقت یہ دُعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ مجھے صبر دے اور اِسکا اجر دے" صبر در حقیقت کوئی آسان کام نہیں یہ ہر" چھوٹی بات سے بڑی بات تک کرنا پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے میکے کی دنیا میں صبر سے کم ہی واسطہ پڑتا ہے۔ اپنا گھر چلانے کے لئے عورت کو زیادہ قربانیاں صبر و تحمل اور ہر قسم کے سمجھوتے سے کام لینا ضروری ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ دوسروں کی مانی بھی جائے اور اپنی منوائی بھی جائے۔ بس ذرا پیار اور سمجھداری کی ضرورت ہے۔

سسرال والوں سے اچھے تعلقات اُستوار کرنے کے ساتھ ساتھ خاوند کے دل میں پہلے دن کی سی محبت کو برقرار رکھنا بھی کسی محاذ سے کم نہیں۔ بیوی کا دھیمہ لہجہ اور پر سکون اندازِ گفتگو شوہر کی توجہ حاصل کرنے کا پہلا گُر ہے۔ بعض خواتین روزانہ بندوق کی گولیوں کی طرح برستی رہتی ہیں۔ نتیجتاً گھر گھر نہیں رہتا جہنم بن جاتا ہے۔

مرد تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے ابھی سانس بھی نہیں لے پاتا کہ سوالات اور شکوں کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ اتنی دیر کیوں لگادی کہاں چلے گئے تھے۔ گھر میں آٹا دال نہیں تمھاری اماں بہنوں نے آج یہ کارنامہ دکھایا وغیرہ وغیرہ۔ روزانہ کی یلغار سے تنگ آ کر مرد گھر سے باہر رہنے لگتے ہیں اور یوں باہمی رابطے محض خانہ پوری تک رہ جائینگے۔ اگر معاملہ فہمی سے وقت پر کام نہ لیا جائے تو شوہر ایسا ہاتھ سے جائیگا کہ لوٹ کر واپس نہ آئیگا۔ اُس وقت اپنا سر پیٹنا اور بال نوچنا بیکار ہوگا۔ بیوی اگر اپنے بناؤ سنگھار جسمانی دیکھ بھال، دھیمے لہجے، ہنستے چہرے کے ساتھ اپنے شوہر کا استقبال کرے گی تو اِن پر سکون لمحات سے بھرپور زندگی کبھی بھی شوہر کو گھر کے معاملات سے دور نہ رہنے دیگی۔ وہ خود ہی بڑھ چڑھ کر گھریلو مسائل میں دلچسپی لے گا۔ اور اپنی بیوی کے سکون کا خیال رکھے گا۔

بیوی کے لئے یہ نقطہ سب سے زیادہ اہم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنا دوست بنالے ساری پریشانیاں ، مسائل خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے۔ شوہر کے من پسند کھانے کا اہتمام کرنا اُسکے پہناوے میں دلچسپی لینا۔ غیر محسوس انداز میں اِس تعلق کی پہلے دن کی سی محبت کو برقرار رکھتا ہے۔

شوہر اور سسرال کی باتیں میکے میں جاکر کرنا عقلمندی نہیں یہ بلکل ایسا ہی ہے جیسے اپنے گھر کا تماشہ بیچ بازار لگا دیا جائے۔ آپ کے اندر اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ آپ تن تنہا اپنے مسائل کو حل کر سکیں۔ ظالم کو زیر، بد کو اچھا، نرم مزاج کو مرید کرنا آپ کے لئے قطعاً مشکل نہیں فقط ذرا دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ کے جسم کے مرکز دل میں خلوص، صاف نیت اور پیار ہوگا تو دنیا آپ کے گُن گائے گی۔ آپ سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے پر اُس غلطی کا سدھار بھی آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اگر صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑا جائے اور رواداری درگزر سے کام لیا جائے تو جھگڑے پیدا ہی نہیں ہوتے اور باہمی تعلقات خوشگوار ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔

# بے نظیر کی پارٹی

"جمہوریت بہترین انتقام ہے"

اور جمہوریت نے انتقام لے لیا۔ المیہ یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کے اس مقولے کا نشانہ ان کی اپنی جماعت بنی ہے۔ 2013 کے انتخابات نے چاروں صوبوں کی زنجیر بے نظیر کی جماعت کو سندھ تک محدود کردیا ہے۔ اور حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ وہ پارٹی جسے ذوالفقار علی بھٹو کی کرشمہ ساز شخصیت، انقلابی منشور، عوام کا دل تسخیر کرتے نعروں نے حقیقی معنوں میں ملک کی واحد قومی جماعت بنادیا تھا، جو بھٹو کی ولولہ انگیز قیادت میں ملک کی سب سے بڑی جماعت بن گئی تھی اور بے نظیر بھٹو کی جری اور دانش مند قیادت نے جس کی یہ حیثیت برقرار رکھی، آج وہ پاکستان پیپلز پارٹی سمٹ کر ایک صوبے کی نمائندہ جماعت بن گئی ہے۔

ایوب خان کی فولادی آمریت کے خلاف میدان میں آنے والے نوجوان ذوالفقار علی بھٹو نے جب "پاکستان پیپلز پارٹی" کے نام سے نیا سیاسی کارواں تشکیل دیا تو سیاست کی دھوپ چھاؤں میں عمریں گزار دینے والے راہ نما جانتے تھے نہ سمجھے

ہوئے تجزیہ کاروں کو توقع تھی کہ یہ نومولود جماعت نہ صرف ملک کا سیاسی کلچر تبدیل کرکے رکھ دے گی، بل کہ اس شان سے اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوگی کہ یہ کام یابی ہماری انتخابی تاریخ کا امر ہوجانے والا واقعہ بن جائے گا۔ بھٹو کے طرز سیاست اور طرز حکومت سے کوئی لاکھ اختلاف کرے، مگر اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ انھوں نے پاکستانی سیاست اور سماج پر طاری جمود توڑ کر رکھ دیا۔ بہ طور حکم راں اگر ان پر لگنے والے الزامات کی ایک طویل فہرست ہے تو کارناموں کے دمکتے تمغوں سے بھی ان کا سینہ بھرا ہوا ہے۔ بے آئین ملک کو دستور کی ردا دینا، جوہری منصوبے کی داغ بیل ڈال کر بھارتی برتری کے خواب کو شکست، اسلامی سربراہی کانفرنس کے ذریعے پاکستان کو مسلم امہ کی قیادت کا منصب دلانا، زرعی اصطلاحات، مزدوروں کے حقوق کا تحفظ غرض یہ کہ ایسے اقدامات اور فیصلوں کی ایک صفحہ در صفحہ فہرست ہے جس نے تمام تر غلطیوں اور گناہوں کے باوجود پیپلزپارٹی کو عوام میں سرخ رو رکھا۔ پھر بھٹو کی پھانسی نے انھیں اور ان کے ساتھ پی پی پی کو وہ آب حیات پلادیا کہ جنرل ضیاء الحق اور ہم نوا تمام تر کوششوں کے باوجود اس جماعت کے سہ رنگے پرچم کو سفید کفن نہ بناسکے۔ تاریخ گڑھی خدا بخش کی پھولوں سے لدی قبر سے پی پی پی کی حمایت کی مہر لگی پرچیوں سے بھرے بکسوں تک عوام کی بھٹو سے محبت کا نظارہ کرتی رہی۔

جنرل ضیاء کا گیارہ سالہ دور بھٹو کے خاندان اور ان کی جماعت کے جبر کی سیاہ رات تھا۔ پھر اس دُور تک پھیلی رات کی ایک ساعت بھٹو کی تصویر بے نظیر کے اجالے سے روشن ہو گئی اور یہ روشنی پھیلتی ہی چلی گئی۔ لاہور میں بے نظیر کے بے نظیر استقبال نے "زندہ ہے بھٹو زندہ ہے" کے نعرے کی سچائی ثابت کردی۔ گرفتاری اور قیدِ تنہائی سے عورت ہونے کے "جرم" میں غلیظ الزامات کی مہم تک، بھٹو کی دلیر بیٹی نے ہر آمرانہ حربے اور مخالفانہ ہتھکنڈے کا سامنا کیا۔ ان کی جُرات، صبر اور عزم کا نظارہ قوم نے بارہا کیا۔ کبھی وہ جلسوں اور اسمبلی کے فلور پر گرجتی نظر آئیں، تو کبھی آٹھ ماہ کی حاملہ ہونے کے باوجود سڑکوں پر کارکنوں کے ساتھ احتجاجی مارچ کرتی دکھائی دیں، اپنے اسیر شوہر سے ملاقات کے لیے بچوں کا ہاتھ تھامے چلچلاتی دھوم میں اجازت کی منتظر بے نظیر کی تصویر کسے یاد نہ ہوگی، اور پھر قتل کی دھمکیوں اور انتباہ کے باوجود ان کی پاکستان آمد نے انہیں اپنے والد کی طرح سیاست میں بہادری کی مثال بنادیا۔

مسلم دنیا کی پہلی منتخب حکم راں کے طور پر بے نظیر بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو انھیں صدر غلام اسحٰق خان سمیت مخاصمت سے بھرے ماحول کا سامنا تھا۔ سازشیں، نا تجربہ کاری اور غلطیوں نے مل کر غلام اسحٰق خان کے لیے مطلوبہ حالات بنادیے اور انھوں نے پی پی پی حکومت کو چلتا کیا۔ بے نظیر کی اگلی

حکومت بھی مدت پوری نہ کر سکی اور اسٹیبلشمنٹ اور فاروق لغاری کی بے وفائی نے اس حکومت کا خاتمہ کردیا۔ لگ بھگ دو دو سال پر محیط پی پی پی کے یہ حکومتی ادوار کارکردگی کے اعتبار سے ملک کی کسی دوسری جمہوری یا آمرانہ حکومت سے اچھے نہیں تو برے بھی نہیں کہے جاسکتے۔ بل کہ لوگوں کو روزگار دینے میں پی پی پی کی کارکردگی حکومت میں آنے والی دیگر جماعتوں سے بہتر رہی ہے، لیکن روزگار کی فراہمی کو بھی اس جماعت کے لیے الزام بنادیا گیا۔

دورانِ اقتدار الزامات اور بہ طور حزب اختلاف انتقامی کارروائیاں سہتی بے نظیر بھٹو اور ان کی جماعت بہ ہر طور سیاست میں اپنا نمایاں کردار ادا کرتی رہی۔ بے نظیر بھٹو کی دلیر اور زیرک قیادت مشکلات سے راستہ نکالتی رہی اور عوام کے ایک وسیع حلقے میں اپنی پارٹی کا امیج اور بھٹو کا نام زندہ رکھا۔ یہاں تک کہ 1997 کے انتخابات میں پاکستان پیپلزپارٹی مسلم لیگ ن کے بھاری مینڈیٹ کے مقابلے میں صرف اٹھارہ سیٹیں حاصل کرپائی تھی، مگر بے نظیر کی سیاسی تدابیر نے پارٹی کو اس کی کھوئی ہوئی مقبولیت واپس دلادی۔ چناں چہ 2002 کے عام انتخابات میں آمرِ وقت پرویز مشرف کی چھتری تلے کام یابی حاصل کرنے والی مسلم لیگ ق کی 126 نشستوں کے مقابلے میں پی پی پی کو 81 نشستیں حاصل ہوئیں۔ اٹھارہ سے اکیاسی نشستوں تک کا یہ سفر بے نظیر کی بالغ نظر

قیادت کے باعث پیپلز پارٹی کے امیج کی بحالی کے نتیجے ہی میں ممکن ہوا۔ یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ اس الیکشن میں پی پی پی کو ق لیگ کے مقابلے میں ایک فی صد زاید ووٹ ملے تھے۔

2008 کے انتخابات کا انعقاد ہوا تو فضا بے نظیر کے خون سے رنگین تھی۔ اس خون کے صدقے پی پی پی اقتدار میں آئی اور آصف علی زرداری پارٹی کی قیادت سے ملک کی صدارت تک اپنی جماعت کی علامت بن گئے۔ یہ ناقص کارکردگی اور بدعنوانیوں کا ایک سیاہ دور تھا، جس نے پانچ سال مکمل کیے، مگر یہ تکمیل پاکستان پیپلزپارٹی کی حیثیت کا تکملہ بھی نظر آتی ہے۔ پی پی پی کا کوئی بھی دور حکومت ہو، اس میں ہونے والی بدعنوانی اور بدانتظامی میں جہاں پارٹی کے راہ نماؤں کا کردار رہا ہے وہیں "جیالے" بھی پارٹی کی بدنامی کا باعث بنتے رہے ہیں، جو پارٹی کے اقتدار میں آتے ہی مست ہاتھی کی طرح لوٹ کھسوٹ میں لگ جاتے ہیں۔ یہ "اعزاز" پی پی پی ہی کو حاصل ہے کہ اس کے ایک جیالے وزیر نے کرپشن کو علی الاعلان اپنا حق قرار دیا تھا۔

بعض تجزیہ کار پی پی پی کی حالیہ ناکامی کو 2007 کے انتخابات میں اس کی شکست سے تشبیہہ دیتے ہوئے امکان ظاہر کر رہے ہیں کہ پہلے کی طرح پی پی پی دوبارہ انتخابی میدان مار سکتی ہے۔ یہ امکان پیش کرتے ہوئے چند حقائق کو فراموش

کر دیا جاتا ہے۔ پی پی پی بے نظیر کی زیرک قیادت سے محروم ہو چکی ہے، پہلی بار مدت پوری کرنے والی اس جماعت کی حکومت نے ناقص کارکردگی اور بدعنوانیوں کا ریکارڈ قائم کیا اور عوام کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیا ہے، ن لیگ حکومت کی ناکامی کی صورت میں تحریک انصاف ملک میں تیسری اور پنجاب کی حد تک دوسری قوت کے طور پر سامنے آچکی ہے، جس کے پاس خیبر پختونخوا میں حکومت بنا کر کارکردگی دکھانے کا موقع موجود ہے۔ ایسے میں کیا آئندہ انتخابات میں پیپلز پارٹی اپنی پوزیشن بحال کر پائے گی؟ بہ ظاہر اس سوال کا جواب نفی میں نظر آتا ہے۔

بے نظیر بھٹو نے ایک نجی تقریب میں اپنے مخالفین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا یہ بھٹوز کو ختم کرنا چاہتے ہیں" بی بی! مخالفین تو ایسا نہ کر سکے مگر بھٹوز کو آپ کی اپنی" پارٹی نے ختم کر ڈالا۔

# شام دورِ حاضر کا سب سے بڑا مقتل

"اسے چھوڑ دو مارنا ہے تو مجھے مار دو، میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر دو، مگر یہ ظلم مت کرو۔ دیکھو، میرے بچوں کا کیا قصور ہے۔ یہ تو معصوم ہیں ارے سُن رہے ہو۔ کوئی ہے، اے اللہ! تیرے پیارے نبی کی اُمت پر اتنا ظلم۔
دیکھو میرا معصوم بیٹا اور میری دو سالہ بیٹی کس طرح ڈر کے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے دس بچوں کو زندہ جلادیا گیا ہے۔ اب یہ ظالم میرے بچوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کوئی تو روکو انہیں۔ خدا کا غضب نازل ہو گا تم پر۔ وہ کس طرح فریاد کر رہے ہیں، بابا ہمیں بچالو، یہ منظر میرے سامنے سے ہٹتا کیوں نہیں۔ اور میرے سامنے ہی میرے دونوں بچوں کو زندہ جلادیا گیا۔ ان کے جسم ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تو میرے سامنے کھیل رہے تھے۔ میں کیوں بچ گیا۔ میری بیوی کو میرے سامنے ذبح کر دیا گیا۔ اپنے بچوں کو اپنے سامنے جلتا دیکھ کر ویسے بھی وہ زندہ کب رہی تھی۔ کسی کو نہیں چھوڑا ظالموں نے۔"
ترکی کی سرحد پر قائم امدادی کیمپ میں اٹھائیس سالہ نوجوان کی آہ وزاری دل کو چیر کر رکھ دینے والی بپتا وہاں موجود ہر شخص کی آنکھ نم کر رہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک

زخمی ہے، وہ نوجوان بھی، پندرہ دن پہلے گولیاں اس کے بازو اور گردن کے آرپار ہو گئی تھیں، مگر اب اس کے زخم بھرنے لگے ہیں۔ کیمپ میں فرائض انجام دینے والا ڈاکٹر پُرامید ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا، لیکن اس کی دماغی حالت دن بہ دن خراب جا رہی ہے۔ وہ بے ہوش رہتا ہے اور جب جب ہوش میں آتا ہے تو اس کے بین اور چیخیں دل دہلا دیتی ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کا واحد فرد ہے جو اس دن ہونے والی یلغار میں زندہ بچ گیا، باقی سارا گاؤں اس روز قبرستان بن گیا۔ وہ دن اس گاؤں کے لیے روزِ قیامت تھا، ہر طرف پھول سے بچوں کی جلی ہوئی لاشیں بکھری تھیں۔ ایک چند ماہ کی بچی کو آگ میں جھونک دیا گیا تھا۔ ایک بچہ جس کی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں، کو ماں کا پیٹ چیر کر نکالا گیا پھر اس کا روئی سا جسم دہکتے انگاروں پر پھینک دیا گیا۔

آنکھ کو پانی اور دل کو خون کرتے یہ مناظر "شام" کی سرزمین پر جا بہ جا بکھرے ہوئے ہیں۔ بشارالاسد کی آمریت کے خلاف جاری مزاحمت کچلنے کے لیے حکمراں ٹولا ظلم و ستم کا ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ ملک کی اکثریت بشارالاسد کی مخالف ہے، اس لیے شامی فوج کو "دشمن" کی کھوج نہیں لگانی پڑتی۔ وہ عموماً ایک ہی طریقہ استعمال کرتی ہے۔ کسی بستی پر ہلہ بولا جاتا ہے، سب باسیوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے اور پھر موت ان کا مقدر کر دی جاتی ہے۔ اس دن بھی یہی کچھ ہوا۔ پہلے بچوں کو الگ کیا گیا، جن کی تعداد چالیس کے قریب تھی، انہیں ان کے ماں باپ کے سامنے جلا دیا گیا۔ کچھ کو چُھریوں سے ذبح کیا گیا۔ عورتوں میں سے کسی کا گلا کاٹ دیا گیا اور کسی کو بھڑکتے شعلوں میں

پھینک دیا گیا۔ آخر میں اپنے بچوں، بیویوں، ماؤں بہنوں کو بے بسی سے موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر ادھ موئے ہوجانے والے مردوں کو گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔

یہ مناظر لکھتے ہوئے میری روح کانپ رہی ہے، قلم لرز رہا ہے۔ ہاتھوں سے جان نکلی جارہی ہے، تو سوچیے ! جن پر یہ سب گزر رہی ہے ان کا کیا حال ہوگا۔ دل کو دہلاتے یہ مناظر خبروں اور تصاویر کی صورت ہم تک پہنچ رہے ہیں مگر ہم خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں یا یوں نظریں چُرائے بیٹھے ہیں جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہ بے اعتنائی کس لیے ؟ ظلم تو ظلم ہوتا ہے اس کا کوئی مذہب، فرقہ یا مسلک نہیں ہوتا۔

اگست 2011 کو بشارالاسد کی حکومت کے خلاف شروع ہونے والی عوامی بغاوت 16 کو دوسال دو ماہ ہوچکے ہیں۔ ان چھبیس مہینوں میں سوا لاکھ کے قریب شہری قتل کیے جاچکے ہیں۔ شام کی آبادی دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اس لحاظ سے شام میں ہر ماہ اوسطاً چار سے پانچ ہزار افراد کی جان لی گئی ہے۔ یعنی ہر روز 100 شامیوں کو موت کی وادی میں اتارا جارہا ہے۔

شام میں دنیا کی حالیہ تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام جاری ہے، جہاں ظلم کا سلسلہ بوسنیا، فلسطین اور کشمیر سے کہیں آگے نکل گیا ہے، مگر ایک دو ممالک کو چھوڑ کر عالمِ اسلام خاموش ہے۔ شام میں قیامت برپا ہے، ایسی قیامت کہ جس پر اُمت کے ہر فرد کو کم از کم احتجاج کرنا چاہیے، مگر سب لب بستہ ہیں۔

یہ کیسی لڑائی ہے، کیسی جنگ ہے، جس میں عام لوگوں کو پکڑا جاتا ہے اور ایک جگہ جمع کرکے ان پر فائر کھول دیا جاتا ہے۔ لوگوں پر بھیانک تشدد کرتے ہوئے ان کے اعضا الگ کردیے جاتے ہیں۔ آنکھیں نکال دی جاتی ہیں۔ جانوروں کی طرح ذبح کردیا جاتا ہے۔ زندہ جلادیا جاتا ہے۔ ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کو سر میں گولی مار کرہلاک کردیا جاتا ہے۔

بشارالاسدکے سرپرست ملک کی طرف سے اسلحے کی کھیپ کی کھیپ اور "رضاکاروں" کی بڑی تعداد میں شام آمد نے خوں ریزی کے عمل کے حجم اور شدت میں اضافہ کردیا ہے۔ اسلحے کی کھیپ عراق کی فضا سے ہوتی ہوئی اس کے ہم سائے شام پہنچتی ہے۔

دوسری طرف اسد حکومت سے برسرپیکار گروہوں کے پاس شامی فوج سے لوٹا ہوا اسلحہ ہے۔ قتلِ عام کے حالیہ واقعات شام کے ساحلی قصبوں "بائیدہ" اور "راس البنیہ" میں ہوئے، جہاں 322 لاشیں ملی ہیں۔ اس قتلِ عام پر عرب دنیاکے معروف دانش ور و مصنف اور شامی حکومت کے پُرجوش حامی بسام القادی بھی چیخ اٹھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ شام میں بے گناہ افراد کا قتل عام کیا جارہا ہے۔ اس صورت حال پر حکومت کے حامی بھی سکتے میں ہیں اور ان میں سے ایک بڑی تعداد بشارالاسد کی مخالف ہو گئی ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ان شامی مہاجرین کی مدد کر رہے ہیں جنھیں حکومت کے مظالم نے ترکِ وطن پر مجبور کردیا ہے۔

یہ کسی فرقے کی جنگ نہیں، یہ ظالم اور مظلوم کے درمیان معرکہ ہے، غاصب وجابر حکم راں اور عوام کے درمیان لڑائی ہے، جس میں نہتے شہریوں کو بے دردی سے قتل کیا اور سفاکی کی نئی کہانیاں رقم کی جارہی ہیں۔ بشارالاسد کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم میں کوئی اس کا ساتھ دے رہا ہے، کوئی صرف مذمت کی رسم ادا کررہا ہے اور کوئی چُپ چاپ خون بہتے اور جسم جلتے دیکھ رہا ہے۔ یوں اس ظلم میں سب شریک ہیں۔

# سرحد کے دونوں طرف یہ بکھرے رشتے

انسان کہاں تک فرار حاصل کر سکتا ہے۔ سیاسی کٹرپن، مذہبی کٹرپن اور یہ سرحدی کٹرپن، ہم سب ان انتہاؤں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ کیا انسانیت کا گیت، محبت کے کٹرپن کا سریلا راگ نہیں الاپ سکتا۔

یہ 1983 کی بات ہے۔ سیتا رام بازار میں جشن کا سماں تھا، ڈھول زور زور سے پیٹے جارہے تھے۔ اور اس گلی کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا کہ محمد گلفام کی شادی تھی۔ شادیاں تو اور بھی ہوتی ہی ہیں، آس پاس کے محلوں تک میں اس شادی کی دھوم مچی ہوئی تھی، کیوں کہ دلہن پاکستان سے آرہی تھی۔ جب بھی کوئی دلہن سرحد پار سے شادی کرکے بھارت آتی ہے تو شادی کے شادیانوں کی آوازیں اور بڑھ جایا کرتی ہیں۔ ملک تقسیم ہوا پر دل تقسیم نہ ہوسکے، کسی کی چھوٹی پھوپھی یہاں، تو کسی کے منجھلے چچا وہاں، نانی کا خاندان ادھر تو دادی کا خاندان اُدھر۔ ارے ملک تقسیم ہوگیا ہے تو رشتے داریاں کس بے ساکھی کے سہارے چلاتے ہو۔ پر نہیں، دلوں کے رشتوں پر یقین رکھنے والوں کے دل آج بھی سرحد پار ایک دوسرے کے سینوں میں دھڑک رہے ہیں۔

پُرانے دہلی کے سیتا رام محلے میں آنے والی یہ کم عمر دلہن نزہت جہاں بھی محبت پہ قائم ہزاروں داستانوں میں سے ایک ہے۔ نزہت جہاں اور محمد گلفام نے جب زندگی کا سفر شروع کیا تو وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے ہاتھوں میں موجود محبت کی لکیر کو سرحد کی لکیر کاٹ ڈالے گی۔ زندگی کا سفر رواں دواں تھا۔ دو سے تین ہوئے، تین سے چار، اور یوں کنبہ بڑھتا گیا۔ پوتے پوتیاں سبھی تو تھے اور سب کی زندگی نزہت جہاں کے گرد گھومتی تھی، کیوں کہ یہ عورت قربانی کا مجسمہ اور گھر کو بنانے والی سربراہ تھی۔

زندگی اس چھوٹے سے گھر میں مہک رہی تھی کہ تیس سال بعد نزہت کو بھارت میں ویزا نہ ہونے کے باعث گرفتار کرلیا گیا۔ بھارت کی عدالت نے مقدمہ چلایا، جس میں نزہت کو غیر قانونی شہری قرار دیتے ہوئے جرمانے کے ساتھ ساتھ پاکستانی شہری ہونے کی حیثیت سے اسے اس کے ملک واپس بھیجنے کا حکم سنایا گیا۔

اب نزہت بے آسرا لوگوں کی پناہ گاہ "نرمل چھایا" میں کسمپرسی کی زندگی جھیل رہی ہے۔ گھربار، بچوں کے دکھ سکھ، شوہر کی محبت سب کے سائے سے محروم ہو کر وہ چھایا" کے نام پر بے گانگی اور دکھوں کی دھوپ میں لا پھینکی گئی ہے۔ آخر اس کا قصور" کیا ہے؟ رشتے نبھانے اور ناتے سینت کر رکھنے کا وہ چلن جو برصغیر کے گھر گھر کی ریت ہے، اور جسے نبھاتے ہوئے یہ حقیقت بھی نذر انداز کردی جاتی ہے کہ اب رشتوں کے درمیان دشمنی کے خاردار تاروں والی سرحد بچھ

چکی ہے، یہی ریت ہے جس نے نزہت کی الم ناک کہانی کو جنم دیا اور ایسی کتنی ہی کہانیاں بیان ہونے کو بے تاب ہیں۔

بھارت اور پاکستان کے شہر شہر بکھری یہ کتھائیں عام لوگوں کے چہروں پر تحریر ہیں، مگر ان کے لکھنے والے وہ دونوں دیسوں کے خاص لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں اپنے اپنے ملک کی باگ ڈور ہے۔ ان میں سے ہر قصہ نزہت جہاں کے الم جیسا تو نہیں، مگر یہ سارے درد کے لفظوں ہی سے لکھے گئے ہیں۔ سرحد کے آرپار امید اور آس سے بھری نگاہیں اپنے پیاروں سے ملنے کی منتظر رہتی ہیں۔۔برسوں بعد امید کا دامن بھر بھی جائے تو ایک اور طویل جدائی دوبارہ مقدر بن جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک کہانی "نذیر" کی بھی ہے، جو اپنے بیوی بچوں سے دور تنہا زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ نذیر کی شادی بھارتی شہری "سلطانہ بیگم" سے ہوئی تھی۔ جیون بھر کا یہ بندھن بھارتی ریاست گجرات کے شہر سورت میں باندھا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے ہو کر پاکستان آ گئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھارت میں زندگی گزاریں گے، چناں چہ یہ جوڑا بھارت جا بسا، لیکن ان کا خواب خواب ہی رہا۔ بھارتی حکام کو گوارا نہ ہوا کہ ایک پاکستانی ان کے ملک کی شہریت حاصل کرے، سو نذیر اپنی بیوی کی آنکھوں میں بکھرے سپنے کی دھندلاہٹ اور اپنی سینے میں ٹوٹا دل لیے واپس پاکستان آ گیا۔ نذیر اور سلطانہ بیگم کے

درمیان آج فاصلے کے بیس سال بیت چکے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں، جو ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ نذیر کا ہر دن بیوی اور بچوں کی یادوں کی دھوپ اور تنہائی کے اندھیرے میں گزرتا ہے۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک چکا ہے۔ سرحد پار سلطانہ بیگم اور بچے شوہر اور باپ کے ہوتے ہوئے بھی ان رشتوں سے محروم ہیں۔

ہندوستان کے دو حصوں میں تقسیم کے ساتھ زمین ہی نہیں بٹی، کتنے ہی خاندان بھی بٹ گئے اور بکھر گئے۔ پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو الگ ملک نہ ملتا تو متحدہ ہندوستان ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی آگ میں سلگتا رہتا، یوں اس تقسیم سے جڑے المیوں سے بہت بڑے سانحات ہر روز جنم لیتے۔ انگریز راج اور کانگریس کے ذی ہوش راہ نماؤں کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہوگیا تھا، اسی لیے وہ تقسیم پر راضی ہوئے۔ اس تقسیم کا مقصد نفرتیں بڑھانا نہیں گھٹانا تھا، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ چناں چہ پاکستان اور بھارت کے باہمی تعلقات جنگوں، رنجشوں، الزامات اور سردمہری کا دوسرا نام ہیں۔ اس صورت حال کا شکار مختلف صورتوں میں دونوں ملکوں کے عوام ہیں، جن میں سے ایک صورت وہ ہے جو نزہت جہاں اور نذیر کا مقدر بنی ہے۔

دونوں ملکوں میں بٹے خاندان بکھرے اور ٹوٹتے رشتوں کو بچانے کی خواہش لیے اپنے بچوں کی شادیاں سرحد پار کردیتے ہیں۔ یوں کتنی ہی لڑکیاں ماں باپ اور

بہن بھائی ہی نہیں اپنا ملک چھوڑ کر پیا دیس کی ہو جاتی ہیں۔ رشتے جوڑنے کے سپنے یوں آنکھوں میں سماتے ہیں کہ ان کی جھلملاہٹ میں بعض اوقات قانونی تقاضے بھی نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور یہ کڑوا سچ بھی کہ دونوں ملکوں کے شہریوں کا ایک دوسرے کے دیس جانا کتنا کٹھن ہے۔ باہمی ملاقاتوں میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے پاکستان اور بھارت کے حکم راں اور اعلیٰ حکام کشمیر، سیاچن اور ایسے ہی دیگر بڑے مسائل نہیں سلجھا سکتے تو کم از کم ان لوگوں کے لیے ویزے کے حصول میں خصوصی نرمی تو کر ہی سکتے ہیں جن کی زندگیاں ہم سائے ملک کے کسی گھر سے جُڑ چکی ہیں۔ نزہت کی بے چارگی، نذیر کی تنہائی اور سرحد کے دونوں طرف اپنوں کی جدائی کا دکھ جھیلتے کتنے ہی افراد دہلی اور اسلام آباد کے صاحبان اقتدار کی توجہ منتظر ہیں۔ خاص طور پر وہ خواتین جو سرحد کے پار بستے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی شکلیں دیکھنے کو ترس جاتی ہیں۔ آنکھوں سے یادیں برستی ہیں، دل اپنے پیاروں سے ملنے کو تڑپتے ہیں، مگر آنکھوں اور دل کی یہ تحریریں کون پڑھ سکتا ہے، ہاں ویزے کی دستاویز پر لکھے واضح اور سپاٹ لفظ پڑھے جا سکتے ہیں، سو یہی لفظ اپنے سے بچھڑے ان لوگوں کی قسمت ہیں، ضرورت ہے کہ ان لفظوں کو کچھ تو نرم کیا جائے ان میں ذرا سا درد دل تو سمویا جائے۔

## اُف، کیا ہے میرا پاس ورڈ؟؟؟

میل باکس میں محفوظ اہم میلز ہوں یا کسی سماجی ویب سائٹ پر دوستوں کا حلقہ، تحریر اور دوستی کے یہ خزانے آپ کے اپنے ہیں، مگر ان تک رسائی کے لیے ایک کنجی درکار ہوتی ہے، جسے کہتے ہیں ''پاس ورڈ''۔ اب اگر یہ کنجی کھو جائے یا چُرالی جائے تو آپ اپنا خزانہ بھی نہیں پا سکتے۔

اس کنجی سے محرومی کی دو صورتیں ہیں: آپ اپنا پاس ورڈ بھول جائیں یا اسے چُرا لیا، یعنی ہیک کرلیا جائے۔ عموماً محفوظ ترین پاس ورڈ بنانے کی جو شرائط بتائی ہیں وہ اس طرح ہیں:

''طویل پاس ورڈ استعمال کریں جن میں اعداد، رموز واوقاف اور ناقابل شناخت الفاظ شامل ہوں۔ ہر ویب سائٹ کے لیے ایک الگ پاس ورڈ استعمال کریں، اور ان میں سے ہر ایک کو ہر تیس دن بعد تبدیل کردیں۔''

یہ شرائط ناقابل عمل ہیں اور ایسے مشورے دینے والے ماہرین میں سے شاید ہی کوئی خود بھی انھیں اپناتا ہو۔ نیویارک ٹائمز میں ٹیکالوجی پر کالم لکھنے والے صحافی اور کئی کتابوں میں مصنف David Pogueان شرائط کو رد کرتے ہوئے

کہتے ہیں، ”87 مختلف ویب سائٹس پر، جن میں بینکس، ایر لائن، بلاگس، شاپنگ، ای میل کی سائٹس کے علاوہ فیس بک اور ٹوئٹر بھی شامل ہیں، میں نے اکاؤنٹس بنا رکھے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی، چاہے وہ (انٹرنیٹ) سیکیورٹی کا پروفیشنل ہی کیوں نہ ہو، 87 طویل اور پیچیدہ پاس ورڈز اپنی یادداشت میں محفوظ رکھے اور یہ یاد رکھے کہ کون سا پاس ورڈ کس ویب سائٹ کے لیے ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگ مختلف ویب سائٹ پر اور تواتر کے ساتھ ایک ہی پاس ورڈ استعمال کرتے ہیں، مگر ماہرین کی پیش کردہ شرائط یا تجاویز کے باعث وہ ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں ان کا پاس ورڈ چرا نہ لیا جائے۔ پاس ورڈ کا ذہن سے محو ہو جانا یا چوری ہو جانا ایک اہم مسئلہ ہے، جس سے ہر یوزر دوچار رہتا ہے، مگر اس مسئلے کا حل پیچیدہ اور ناقابلِ عمل نہیں بل کہ بہت سادہ اور آسان ہے۔

ونڈوز سمیت زیادہ تر ویب براؤزرز اب تو خود یہ پیشکش کرتے ہیں کہ وہ آپ کے لیے آپ کا پاس ورڈ یاد رکھیں گے۔ تاہم، یہ فیچر تمام ویب سائٹس پر قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ اور جب آپ آن لائن ہونے کے لیے اپنا سیل فون اٹھاتے یا tablet استعمال کرتے ہیں تو یہ عمومی طور پر یہ فیچر کم کم ہی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ لے دے کر صرف ایک شخص رہ جاتا ہے جو آپ کا تمام اکاؤنٹس اور پاس ورڈ کی حفاظت کر سکتا ہے، وہ کوئی اور نہیں آپ خود ہیں۔

طویل اور الجھے ہوئے پاس ورڈ بنا کر انھیں یاد رکھنے کے جھنجھٹ میں پڑنے یا انھیں کہیں لکھنے کا خطرہ مول لینے کے بہ جائے آپ اس مسئلے کو سہل، مناسب اور بہت معقول طریقے سے حل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو کوئی ''پاس ورڈ میموری ائزیشن پروگرام (password memorization program) '' انسٹال کرنا ہوگا۔ ایسی کئی سائٹس ہیں جو پاس ورڈ محفوظ کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہیں، ان Roboform، KeePass،LastPass، 1Passwordاور Dashlane کارکردگی کی بنا پر سب سے بہتر گردانی جاتی ہیں۔ David Pogue اس حوالے سے Dashlane کو بہترین سائٹ قرار دیتے ہیں۔ اس سائٹ نے حال ہی میں خود کو مزید بہتر کیا ہے۔ پاس ورڈ محفوظ کرنے کی سہولت فراہم کرنے والی دیگر سائٹس کے مقابلے یہ سائٹ زیادہ پُر کشش اور مؤثر ہے۔ اس سائٹ پر دست یاب فیچر وقت بچاتے ہیں۔ اس سائٹ سے بلامعاوضہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

Dashlane کو بڑی آسانی سے اور بہت کم وقت میں انسٹال کیا جاسکتا ہے۔ اس سائٹ کے ذریعے سفاری، گوگل کروم، انٹرنیٹ ایکسپلورر اور فائرفلوکس کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس سائٹ کے ذریعے دیگر پروگرامز سے پاس ورڈ "vaults" بھی امپورٹ کیے جاسکتے ہیں۔

یہ پروگرام دو فیچرز کا حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک پاس ورڈ میمورائزر ہے۔ جب آپ یہ پروگرام انسٹال کرلیتے ہیں، پھر کسی ویب سائٹ پر جاتے ہیں، جہاں آپ کا اکاؤنٹ ہو، تو یہ پروگرام ''پوپ اپ ونڈو'' سامنے لاتا ہے، جو پیشکش کرتی ہے کہ کیا آپ کی دی گئی تفصیلات (آئی ڈی اور پاس ورڈ) محفوظ کرلیا جائے اور آئندہ اسے آئی ڈی اور پاس ورڈ کے خانوں میں ثبت کردیا جائے۔

یہ پروگرام آپ کو لاگ آن کرنے کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔ یعنی صرف آپ کا پاس ورڈ ہی انٹر نہیں کرتا بل کہ لاگ آن پر کلک بھی کرتا ہے۔ اس طرح جب آپ فیس بک، ٹوئٹر یا جی میل پر جاتے ہیں، تو بس اپنے بک مارک پر کلک کرتے ہی آپ فوری طور پر مطلوبہ سائٹ پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ پروگرام یا اس جیسے دیگر پروگرام استعمال کرکے آپ اپنے پاس ورڈ محفوظ کرنے اور ان کی ''آٹو انٹرنگ'' کا اہتمام کرلیتے ہیں۔ اب آپ طویل، اور ایسے پاس ورڈ جن کا کوئی اندازہ نہ لگاسکے استعمال کرسکتے ہیں اور ہر ویب سائٹ کے لیے الگ پاس ورڈ استعمال کرسکتے ہیں۔ اور آپ کو ان پاس ورڈز کو یاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ یا اس نوعیت کی دیگر سائٹس آپ کے لیے انجام دیتی ہیں۔ Dashlane فریضہ نہ صرف پاس ورڈ یاد رکھتا ہے بل کہ آپ کے لیے پاس ورڈ بھی بناتا Dashlane ہے۔

Dashlane کا دوسرا فیچر زیادہ وسیع اور حیرت انگیز ہے۔ یہ فیچر دوسری ویب سائٹس کے مختلف نوعیت کے فارمز فِل کرتا ہے۔ یعنی اس پروگرام کے ذریعے آپ کا نام، پتا، فون نمبر، یہاں تک کے آپ کے کریڈٹ کارڈ کی معلومات بھی مطلوبہ فارم پر از خود درج ہو جاتی ہیں، یوں آپ کا قیمتی وقت بھی بچتا ہے اور فارم پُر کرتے ہوئے غلطی کرنے کا جو خدشہ ہوتا ہے وہ بھی نہیں رہتا۔

اگر آپ کو آن لائن خریداری کرنا ہے، اس کے لیے آپ کریڈٹ کارڈ نمبر باکس پر کلک کرتے ہیں، تو Dashlane پروگرام آپ کے مختلف کریڈٹ کارڈ کی تصاویر سامنے لے آتا ہے، ان میں سے جو بھی آپ استعمال کرنا چاہیں اس پر کلک کرتے ہیں تو یہ پروگرام آپ کا طویل کارڈ نمبر، نام، معیاد ختم ہونے کی تاریخ، یہاں تک کہ آپ کا سیکیوریٹی کارڈ بھی خانوں میں درج کر دیتا ہے۔ یوں آپ کا تیس سیکنڈ سے پانچ منٹ تک کا وقت بچتا ہے۔

جب آپ آن لائن کچھ خریدتے ہیں تو یہ پروگرام یہ سہولت پیش کرتا ہے کہ اس حوالے سے تمام تفصیلات ایک ڈیجیٹل رسید میں محفوظ کرلے اور اس کے ساتھ اس ویب سائٹ کا اسکرین شوٹ بھی محفوظ ہو جاتا ہے جہاں سے آپ نے خریداری کی ہے۔

اس نوعیت کے دیگر پروگراموں کی طرح یہ پروگرام ہر پروفائل کے لیے الگ الگ معلومات طلب نہیں کرتا۔ اگر آپ کے تین پروفائل ہیں تو آپ کو ان تینوں کے لیے الگ الگ پرسنلیٹی کے طور پر معلومات نہیں دینی ہوں گی۔

اس پروگرام اور اس جیسے دیگر پروگرامز سے فائدہ اٹھا کر آپ اپنا پاس ورڈ محفوظ کرنے کے ساتھ اپنا بہت سا وقت بھی بچا سکتے ہیں۔

# بہروپ کا دیکھیں اصلی روپ

بہروپ کا دیکھیں اصلی روپ

ثناء غوری

سوشل ویب سائٹس اپنے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں سمیت ہماری زندگیوں میں یوں در آئی ہیں کہ ان سے دور رہنے کی لاکھ کوشش کرلو دور نہیں ہوا جاتا۔

ان ویب سائٹس کا اہم ترین مقصد لوگوں کو ایک دوسرے سے رابطے کی سہولت فراہم کرنا ہے۔ ان سائٹس پر یوزرز جہاں اپنے اہل خاندان، دوستوں اور اپنے پیشے سے وابستہ افراد کو ایڈ کرتے ہیں، وہیں کسی طور انجان لوگ بھی ان کے دوستوں کی فہرست کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان ناآشنا افراد میں سے بعض دراصل جعلی ہوتے ہیں، یعنی وہ اپنی اصل چھپا کر کسی جعلی شناخت کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں ''فیک آئی ڈی۔'' سوشل ویب سائٹس استعمال کرنے والوں کو فیک آئی ڈیز سے بچنا چاہیے، کیوں کہ یہ لوگ کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو ان آئی ڈیز کو پہچاننے کے کچھ گُر بتائیں:

فیک آئی ڈیز کی کچھ نشانیاں

جب کبھی کسی انجان شخص کی طرف سے آپ کو فرینڈ ریکویسٹ آئے تو اس کی پروفائل چیک کیجیے۔ پروفائل میں موجود تصاویر کا بغور جائزہ لیجیے۔ جس شخص کی فرینڈ ریکویسٹ آپ کو موصول ہوئی ہے، اگر اس کی پروفائل میں اس کی فقط ایک تصویر موجود ہے تو اس کا یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ وہ اکاؤنٹ جعلی ہے۔

اب دیکھیے وال پوسٹ، اسٹیٹس اپ ڈیٹ اور کمنٹس۔ اگر اس آئی ڈی سے کافی عرصے سے کوئی اسٹیٹس اپ ڈیٹ نہیں کیا گیا اور کوئی ''ٹیگ'' بھی نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اکاؤنٹ فیک ہے۔

اس پروفائل پر ہونے والی حالیہ ایکٹیویٹی کا بغور جائزہ لیجیے، اگر کوئی خاص پیج لائک نہیں کیا گیا اور کسی گروپ کو جوائن نہیں کیا گیا اور صرف تواتر کے ساتھ لوگوں کو ایڈ کیا گیا ہے، تو سمجھ لیجیے کہ یہ فیک آئی ڈی ہے اور اس آئی ڈی کا مقصد فقط لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے۔

اس آئی ڈی کی فرینڈ لسٹ چیک کریں، اگر فرینڈز میں سے زیادہ تر اس آئی ڈی ہولڈر کی مخالف جنس کے ہیں، تو یہ نشانی بھی آئی ڈی فیک ہونے کی ہے۔

،اب اس آئی ڈی کی پرسنل انفارمیشن کا بغور جائزہ لیجیے، اگر اسکول، کالج

یونیورسٹی یا ورک پلیس کا ذکر نہ کیا گیا ہو تو یہ بھی اس آئی ڈی کے فیک ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

خواتین کے نام سے جو فیک آئی ڈیز بنائی جاتی ہیں، ان میں عموماً رابطے کے لیے نمبرز دیے گئے ہوتے ہیں یا پھر معمولی چیٹنگ کے بعد نمبر دے دیے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ اکاؤنٹ فیک ہے کیوں کہ عموماً خواتین اپنا نمبر نہ تو شو کرتی ہیں اور نہ ہی بہ آسانی کسی کو دیتی ہیں۔

وال پوسٹس پر نظر دوڑائیے، نئے دوستوں کی طرف سے ایڈ کرنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہوگا کہ اور ساتھ ہی پوچھا گیا ہوگا کہ کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟ اور اس کے بعد اس پوسٹ پر کوئی جوابی کمنٹس بھی نہیں دیے گئے ہوں گے۔

فیک آئی ڈیز کے عموماً ''سب لنک'' نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ فیملی ممبرز کو شو نہیں کیا گیا ہوتا۔

اگر آپ کو اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ یہ آئی ڈی فیک ہے، تو ایک بار اور تسلی کرلیجیے۔ گوگل کی ویب سائٹ پر جائیے اور امیج سرچ میں پروفائل پکچرز کو درجہ بہ درجہ دیکھتے جائیے۔ فیک آئی ڈیز کے لیے عموماً گوگل امیجز میں

سے پکچرز لی جاتی ہیں، جسے سرچ کرنے سے بہ آسانی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تصویر کس کی ہے۔

یہ ایک مختصر جائزہ تھا، جس کی مدد سے آپ سوشل میڈیا پر فیک آئی ڈیز کی جانچ کر سکتے ہیں۔ فیک آئی ڈیز سے خبردار رہیے یہ فقط آپ کے لیے مسائل ہی پیدا کر سکتی ہیں۔

جانچ کا ایک تکنیکی طریقہ

تیکنیکی اعتبار سے فیک آئی ڈیز کی شناخت آپ خود بھی کر سکتے ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے؟ یہ آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ اہم سوالات ہیں جو ہر اس فرد کے ذہن میں گردش کرتے ہیں جو سوشل ویب سائٹس استعمال کرتا ہے۔ اگر آپ کو اس بات پر یقین ہوگیا ہے کہ جو فرینڈ آپ کے پاس ایڈ ہے یا جس کی ریکویسٹ آپ کے پاس آئی ہے وہ فیک ہے، لیکن اب آپ خود بھی اس بات کا پتا لگا سکتے ہیں کہ یہ فیک آئی ڈی بنانے والا شخص کون ہے۔

فیس بک کی دنیا میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں فیک آئی ڈیز بنائی جاتی ہیں، ان فیک آئی ڈیز بنانے والوں کا سب سے بڑا مقصد آپ کی ذاتی معلومات،

تصاویر لے کر ان کا غلط استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ساتھ ان آئی ڈیز بنانے والوں میں سے بعض آپ کا سوشل امیج بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

آپ بہ آسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ ایسا کرنے والا شخص کون ہے اور وہ اس وقت دنیا کے کس حصے، شہر اور علاقے میں موجود ہے، جب آپ اس کی معلومات جمع کریں تو کو بھی کر سکتے ہیں۔ جس پر قانونی CPLC ثبوت کے ساتھ آپ اس کی باقاعدہ شکایت کارروائی کی جا سکتی ہے۔

اس کے لیے ایک خاص طریقۂ کار اپنایا جانا ضروری ہے۔ ہم آپ کو درجہ بہ درجہ بتائیں گے کہ یہ کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فیک آئی ڈی بنانے والا کون شخص ہے۔

آئی پی ایڈریس معلوم کرنا ہوگا۔I.P سب سے پہلے آپ کو اس شخص کا

آپ اس آئی پی کو اپنے اکاؤنٹ میں ایڈ کریں اور اس کے ساتھ پرائیویٹ چیٹ بوکس میں چیٹ کریں۔

اس بات کی تسلی کر لیجیے کہ ایسا کرتے ہوئے آپ کے کمپیوٹر کی کوئی اور

کھلی ہوئی نہ ہو۔ تمام پروگرامز بند کردیجیے۔ کوئی ایسا پروگرام استعمال نہ window
کریں جو انٹرنیٹ کے ذریعے چل رہا ہو۔ اپنے براؤزر میں سے ہسٹری کو ڈیلیٹ
کردیجیے۔ صرف سوشل ویب سائٹ، مثلاً فیس بک کا ایک ٹیب کھلا ہوا ہونا چاہیے،
کر رہے ہیں۔ (Chat) جس میں آپ اس آئی ڈی سے چیٹ
بٹن پر کلک Start میں دیے گئے Window جب آپ چیٹ کر رہے ہوں تو اس وقت
لکھ کر انٹر کا بٹن Cmd پر کلک کیجیے اور وہاں Run بار میں سے Menu کرکے مینو
(start->run- ، (Command Prompt) پریس کیجیے ۔جب کمانڈ پرامپٹ
کی کمانڈ لکھ Netstat -an کو دیکھیے۔اب کمانڈ پرامٹ کی ونڈو کھل جائے تو (cmd>
ٹائپ an- کے بعد سنگل اسپیس دے کر netstat کر انٹر کردیجئے۔ خیال رہے کہ
ایڈریس دیکھ سکتے ہیں جس سے وہ IP Connection کیجیے۔ اب آپ بہ آسانی وہ
شخص بات کرتا ہے۔
ایڈریس کو اپنے پاس نوٹ کرلیجیے۔ اب آپ کے پاس آئی پی ایڈریس موجود IP اس
ہے۔ اب اپنے ویب براؤزر سے نئی ونڈو کھولیے اور اس ویب سائٹ کو اوپن کیجیے
http://www.iplocation.net/ یہ ویب سائٹ اس شخص سے متعلق تمام ممکنہ
معلومات آپ کو دے گی۔ اس ویب سائٹ پر آپ حاصل شدہ آئی پی ایڈریس ڈالیے۔
کے Map اور اس کی لوکیشن کا پتہ ISP یقیناً چند ہی لمحوں میں آپ اس شخص کا

کیجیے اور اس شخص کا بالکل درست پتا Zoom-in کو Map ذریعے لگا سکتے ہیں۔ آپ
معلوم کر لیجیے

## نامعلوم

کل دو بندوں کو گرایا تھا، لاش بوری میں ڈالی اور محمود آباد والی کچرا کونڈی میں پھینک دی۔

آج ایک سیٹھ کو پرچی دی ہے، پر اسے میری بات سمجھ نہیں آ رہی ۔

دو دن اور رکوں گا پھر اس کے نام کی بوری بھی تیار کر لوں گا۔

میں اپنے علاقے کا سب سے بڑا گینگ لیڈر ہوں۔

نہ نہ نہ، جو خود کو مجھ سے بڑا سمجھتے ہیں وہ بڑے نہیں ہیں، وہ تو بس خالی خولی مُہرے ہیں اور ان سالوں کا کیا، آج اِدھر تو کل اُدھر۔

میرے علاقے میں میری مرضی کے بغیر پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔ ایس ایچ او بھیگی بلی کی موافق میرے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ جب بھی حکومت نے سختی کی کہ شہر میں امن وامان کی صورت حال بہتر کرو، جھٹ میرے پاس فون پر فون آنے لگتے ہیں ۔ کہ ذاکر لنگڑا سب ٹھیک کر دے گا۔

نہیں نہیں، میرا تعلق کسی جماعت سے نہیں۔ میں تو ان لیڈروں کو خود سے بڑا

لٹیرا مانتا ہوں۔

توبہ! میں تو لوگوں کو مارتے اور لوٹتے ہوئے کبھی کبھی اپنے کانوں کو ہاتھ بھی لگا لیتا ہوں، پر میں نے دس سال بدمعاشی کی زندگی میں ایسے ابلیس نہیں دیکھے۔ کبھی کسی نے مجھے استعمال کیا تو کبھی کوئی اور کسی کے سر کی قیمت دے گیا۔ پر خدا کا خوف کسی کو نہیں۔

یہاں تک کہ کسی اشتہاری کو پکڑنا ہو تو پولیس میرے پاس ان کاؤنٹر کی رقم جمع کروا کے چلی جاتی ہے۔

مجھے خدا کا خوف آتا ہے، جب میں کسی کی جمع پونجی چھین کر اپنی تجوری میں ڈالتا ہوں یا جب خون سے میرے ہاتھ رنگے ہوتے ہیں، تو بہت خوف آتا ہے۔ خدا قسم اس کی ذات سے خوف آتا ہے، پر میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ ذاکر لنگڑا پیچھے ہٹ گیا تو یہ اوپر بیٹھے لوگ سب کچھ ختم کر دیں گے۔ یہ تو مجھے استعمال کرتے ہیں، میں ان کے کام کا نہیں رہوں گا تو یہ مجھ پر زمین تنگ کر دیں گے۔ مجھے اپنی جان کی فکر نہیں، میرے ساتھ میرے گینگ کے سارے لوگ مارے جائیں گے۔

میں اب اس زندگی سے نہیں نکل سکتا۔ ہاں میں اس زندگی میں مر ضرور گیا ہوں۔ مر تو میں اسی وقت گیا تھا جب میرے باپ کو کوئی نوکری نہیں دیتا تھا۔ میں نو سال کا تھا۔

میرا باپ سرکاری اسپتال میں وارڈ بوائے تھا۔ نئی حکومت آئی پرانی گئی، سارے پُرانے بندوں کو فارغ کردیا گیا۔ میرے باپ کو بھی نکال پھینکا۔ سال گزرا، دو سال گزرے، میرا باپ یہاں وہاں کام ڈھونڈتا رہا پر کوئی کام نہ ملا۔ میری ماں گھروں میں کام کرنے لگی۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ باپ نے نشہ شروع کردیا اور ایک روز گھر میں اطلاع آئی کہ ابا کو کسی نے مار دیا ہے۔ میں اس کی لاش لینے اسی اسپتال پہنچا جہاں ملازمت کے لیے ابا نے دو سال تک جوتیاں گھسیں تھیں، لیکن اس کے لیے اسپتال میں کوئی جگہ نہ بنی۔ اس روز ابا کو کم از کم اسپتال میں جگہ تو مل گئی تھی۔ پر وہ مردہ تھا، اور بے یار و مددگار اس اسپتال کی ایک سلیب پر پڑا تھا۔ اس سلیب سے خون بہہ بہہ کر زمین پر گر رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ خون میں لت پت ہوگئے تھے۔

پر رویا میں اس وقت بھی نہیں تھا۔

جیسے تیسے انتظام کرکے ابا کو دفنایا۔ گھر کے بُرے حالات تو تھے ہی، اب مزید خراب ہوگئے۔ میں ایک مکینک کی دکان پر لگ گیا۔ دکان کا مالک مجھے پیٹتا ذلیل کرتا، جتنا میں کام کرتا تھا مجھے اس سے تین گنا کم پیسے ملتے تھے۔

پر رویا میں اس وقت بھی نہیں تھا۔

بڑی بہن ہر وقت کھانستی رہتی۔ جہاں میں رہتا تھا اس علاقے میں زیادہ تر لوگوں کو کھانسی تھی اور وہاں معذور بچے پیدا ہونا عام بات تھی، کیوں کہ اس علاقے کے پاس بڑے بڑے کارخانے تھے، جن سے عجیب سی بساند آتی تھی۔ ان کارخانوں کی ساری گندگی ہماری بستی کے پیچھے بہنے والے نالے میں بہتی رہتی۔ جب کوئی بچہ کھیل ہی کھیل میں نالے میں بہتی اس گندگی کو چھولیتا تو اس کا ہاتھ جل جاتا، مگر بستی کی کم عقل مائیں چیخنے چلانے اور اپنے بچوں کو مارنے پیٹنے اور نالے کے پاس جا کر کھیلنے سے روکنے کی ناکام کوشش کے سوا کر بھی کیا سکتی تھیں۔

میری بہن کو نہ جانے کیا ہوا، ایک دن وہ بہت کھانسنے لگی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ماں کام پر گئی تھی۔ میں کچھ بول نہ سکا۔ اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کے چند قطرے اس کے منہ میں ڈالے۔ وہ میرے ہاتھوں ہی میں بے جان ہو گئی۔

پر رویا میں اس وقت بھی نہیں تھا۔

مجھے اپنے چھوٹے بھائی سے بہت پیار تھا۔ میرے گھنگریالے بالوں والا بھائی اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کئی شرارت کرتا تو مجھے وہ بہت پیارا

لگتا۔ وہ اب سات سال کا ہوگیا تھا۔ میں نے اسے اسکول میں داخل کروادیا اورپُرسکون ہوگیا کہ چلو کہ اب میرا ایک بھائی توپڑھے گا۔ ایک روز اس کی لاش گھر آ گئی۔ اس کا چہرہ خون سے لال تھا۔ اسکول کے ماسٹر نے سبق یاد نہ کرنے پر اسے اتنا مارا تھا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ زخم ایسی جگہ لگا تھا کہ وہ اسی وقت مرگیا۔

پر رویا میں اس وقت بھی نہیں تھا۔

اس کی لاش ہاتھوں پر اٹھائے پولیس اسٹیشن پہنچا تو تھانے دار نے ایف آئی کاٹنے کے پیسے مانگے۔ پیسے تو میرے پاس میت کو دفنانے کے نہ تھے، ایف آئی آر کہاں سے کٹواتا۔ بھائی کی لاش گھر میں چھوڑ کر اپنے سیٹھ سے پیسے مانگنے گیا۔ اس نے پیسے دینے سے انکار کردیا۔

پر رویا میں اس وقت بھی نہیں تھا۔

گیراج میں میز پر چھری رکھی تھی۔ میں اس وقت اپنے حواسوں میں نہ تھا۔ میں نے چھری اٹھائی اور سیٹھ کو ٹھنڈا کردیا۔ اس کے غلک کی رقم ایک تھیلی میں ڈالی اور سیدھا اس ماسٹر کے پاس گیا جس نے میرے بھائی کو مارا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ جس چھری سے میں نے سیٹھ کو مارا تھا اسی سے ماسٹر کا کام تمام کردیا۔ نوٹوں سے بھری تھیلی لیے گھر پہنچا۔ دروازے پر ہی ماں کو

تھیلی پکڑا کر آخری بار پیار کیا اور کہا کہ بھائی کو دفنا دینا۔

پر رویا میں اس وقت بھی نہیں تھا۔

پھر میں نکل پڑا کراچی کی سڑکوں پر۔ مجھے کون پکڑتا، آج تک کون پکڑا گیا ہے، ویسے بھی میں تو گم نام تھا، نامعلوم۔

ایک واردات کی، دوسری کی، لوگ ملتے گئے۔ میں امیر ہوتا گیا، پر مجھے کسی نے نہیں پکڑا۔

کیا ابا کو نوکری سے بلاوجہ نکلوانے والوں کو پکڑا گیا تھا نہیں ناں! مجھے محنت سے کم اُجرت دینے پر استاد کو کسی نے پکڑا نہیں ناں! تو مجھے کون پکڑتا۔ کارخانے کی گندگی بستی کے قریب نالے میں ڈالنے پر کارخانے کے مالک کو کسی نے پکڑا نہیں ناں!

میرے بھائی کی جان لینے والے ماسٹر کو کسی نے پکڑا تو مجھے کون پکڑتا۔

ذاکر اب ذاکر لنگڑا بن گیا ہے۔ جب میرے پاس اپنی شناخت تھی اس وقت کسی ادارے کو میرا خیال نہ آیا، تو آج تو میری شناخت بھی اصلی نہیں۔ اب کون سا ادارہ میرے قریب آئے گا۔

حکومت بدل گئی ہے۔ کہتے ہیں اب ناانصافی نہیں ہو گی۔ نہ ہو، مگر میرے شہر میں کوئی فرق نہیں پڑنے کا۔

آہا تھک گیا۔ میں نے ٹی وی پہ دیکھا تھا سیاست دانوں کو تقریر کرتے ہوئے۔ بڑی دھانسو تقریر کی تھی۔ واہ بھئی مزا آگیا۔ پتا چلا ہے کہ تبدیلی لانے والے نے اس تقریب کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے کی شیروانی سلوائی۔

کتنے ہی ننھے منے ذاکر ڈیڑھ روپے کی ٹافی کھانے کے لیے ترستے ہیں، پھر بڑے ہو کر ڈیڑھ لاکھ روپے کے سپنے دیکھنے لگتے ہیں اور ذاکر لنگڑا بن جاتے ہیں۔

ڈیڑھ لاکھ روپے کی شیروانی اور تبدیلی

ہاہاہا۔ لا بھئی! لسٹ پکڑا، آج کسے کھتّے کی پرچی دینی ہے

## گواہی کی حفاظت

اس نے بھرے بازار میں قتل کیا، کتنی ہی آنکھوں میں یہ منظر خوف بن کر اترا، مگر ان آنکھوں والوں کے ہونٹوں نے کہا، "میں نے کچھ نہیں دیکھا"

انھوں نے جس اجتماع پر گولیاں برسائیں تھیں، اس میں موجود کتنے ہی لوگ انھیں پہچان گئے، لیکن جب ان ملزمان کی شناخت کا مرحلہ آیا، تو ان سب کی زبان پر تھا، "نہیں، یہ نہیں تھے۔"

دہشت گردی کے واقعات ہوں یا ٹارگیٹ کلنگ کے سانحے، کسی زورآور کے ہاتھوں کوئی کم زور جان سے جائے یا کوئی دولت مند کسی غریب کی عزت تار تار کردے ان المیوں کو دیکھنے والی آنکھیں بصارت کھو بیٹھتی ہیں، کہ ان میں خوف اتر آتا ہے۔ ایسے واقعات کے عینی شاہدین جانتے ہیں کہ صرف ایک گولی گواہی کو ان کے سینے میں مارڈالے گی، جرم ہوتے دیکھنے والی آنکھیں بجھادی جائیں گی، نہ انھیں زندگی میں تحفظ ملے گا نہ موت کے بعد کوئی پوچھ ہوگی۔

یہی سبب ہے کہ جرم کی وارداتوں کے شاہد گواہ بننے پر تیار نہیں ہوتے اور

اگر اس کی ہمت کر بھی لیں تو عدالتی کارروائی کے دوران اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں یا بیان بدل لیتے ہیں۔

آج کے پاکستان کو اول سے انتہا تک بدامنی کی ہر صورت کا سامنا ہے۔ فرقہ وارانہ دہشت گردی عبادت گاہوں کو لہو سے رنگین کر رہی اور سڑکیں گلیاں خون سے بھر رہی ہے، خود کش حملہ آور حکومتی اداروں سے شہریوں کے اجتماعات تک موت کا کھیل کھیل رہے ہیں، ٹارگیٹ کلر پورے اطمینان سے اپنے اہداف مکمل کر رہے ہیں۔ ان وارداتوں کے ملزمان پکڑے بھی جاتے ہیں، مگر صرف اس لیے رہا ہو جاتے ہیں کہ "کوئی گواہ نہ شہادت حساب پاک ہوا۔"

ایک ایسے ملک میں جہاں انسانی جان سے زیادہ سستی کوئی چیز نہ ہو، جہاں طاقت اور دولت کے بل پر جو چاہے کیا جا سکتا ہو، جہاں دہشت گرد گروہ مختلف صورتوں میں سرگرم ہوں، وہاں تو کوئی بھی سچ "پل کے پل" میں زندگی سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے، تو عدالت میں گواہی جیسا سچ کوئی بولے تو کیسے بولے۔

اس دیس کے باسیوں کو امن اور چین اس وقت ہی نصیب ہو سکتا ہے جب کم از کم قتل اور دہشت گردی جیسے سنگین جرائم کے مرتکب افراد کو سزا ملے اور انھیں

سزایاب کرنے کے لیے ضروری ہے معتبر اور بے خوف گواہی، اور بھری عدالت میں جرم کا سیاہ چہرہ بے نقاب کرنے والے گواہ تب ہی ایسا کر سکتے ہیں جب انھیں تحفظ فراہم کیا جائے، لیکن اور وعدوں کی طرح ہماری حکومتیں یہ وعدہ بھی وفا نہیں کرتیں۔

حال ہی میں سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سید قائم علی شاہ نے یہ خوش کُن اعلان کیا ہے کہ، "جلد ہی قانونِ شہادت میں ترمیم کرکے گواہوں کے تحفظ کا بل سندھ اسمبلی میں پیش کیا جائے گا، تاکہ گواہوں کا جانی ومالی تحفظ یقینی بنایا جائے۔"

مرحبا، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ مسودہ قانون سندھ اسمبلی میں کب تک پیش ہو کر منظوری کے مرحلے سے گزرنے کے بعد نافذ ہوتا ہے۔ گواہوں کی حفاظت کے لیے وفاقی سطح پر قانون سازی اور موثر اقدامات کی ضرورت ہے، تاکہ جرم کی کسی واردات کا عینی شاہد اپنی اور اپنے خاندان کے جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ پورے اطمینان سے گواہی دے سکے۔

دنیا کے کئی ممالک میں گواہوں کے تحفظ کے نہ صرف قوانین موجود ہیں بل کہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ادارے بھی تشکیل دیے گئے ہیں۔ مثلاً ہانگ کانگ میں سیکیوریٹی بیورو کے تحت ایک ادارہ ایسے گواہوں اور ان کے گھرانوں کی حفاظت

کے لیے قائم ہے، جنھیں دھمکیاں مل رہی ہوں۔ اس کے علاوہ گواہی دینے والے افراد اگر عدم تحفظ کا شکار ہوں تو انھیں نئی شناخت دی جاتی ہے اور اگر اس کے بعد بھی گواہ خود کو غیر محفوظ سمجھے تو اس کے ہانگ کانگ چھوڑ کر کسی اور ملک میں بس جانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ کے علاوہ امریکا، برطانیہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، تائیوان، جمہوریہ آئرلینڈ، سوئٹزرلینڈ، تھائی لینڈ اور یوکرائن میں بھی گواہوں کی حفاظت کے قوانین نافذ ہیں۔ ان ممالک کے مقابلے میں پاکستان کے حالات ایسے قانون کے نفاذ کا کہیں زیادہ تقاضا کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں قوانین بے جان تحریر بن کر رہ جاتے ہیں، جن کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اگر گواہوں سے متعلق قانون سازی میں بھی یہی روش اختیار کی گئی تو ایسا قانون بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ قانون بنا کر اسے موثر انداز میں نافذ کرنا ہی مسئلے کا حل ہے۔ قانون بنانے کے ساتھ ساتھ گواہوں کو جرائم میں ملوث افراد کی کسی کارروائی سے بچائے رکھنے کے لیے ہانگ کانگ کی طرح کے اقدامات کرنا ہوں گے۔ ہمارے مخصوص حالات میں تو یہ اور بھی ضروری ہے کہ گواہوں اور ان کے اہلِ خانہ کو تحفظ دینے کے لیے ایک خصوصی ادارہ قائم کیا جائے۔ کم از کم ایسے افراد اور ان کے گھرانوں کی حفاظت کے لیے تو یہ اقدام کرنا ناگزیر ہے جو دہشت گردی اور ٹارگیٹ کلنگ کے مقدمات میں گواہ

ہوں۔ خطرناک نوعیت کے مقدمات میں گواہی دینے والے کو اگر دھمکیاں ملیں اور وہ خود کو ملک میں غیر محفوظ سمجھے، تو اس معاملے کی مکمل تحقیق کے بعد اُس کی بیرون ملک منتقلی کا انتظام بھی قانون کا جزو بنانا ہوگا۔

خوف کے بعد گواہی دینے والوں کو اس راہ سے روکنے کا دوسرا بڑا سبب عدالتی کارروائی میں تاخیر ہے۔ برسوں بیت جاتے ہیں مگر مقدمات کا فیصلہ نہیں ہوپاتا۔ بعض اوقات تو مقدمات ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوکر بھی فیصلے کے منتظر رہتے ہیں۔ ایسے میں مقدمے کے فریقین کے ساتھ گواہ بھی سال ہا سال عدالتوں کے پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔ عدالتیں دن کے انھی اوقات میں لگتی ہیں جو سرکاری و نجی اداروں اور کاروبار کے اوقاتِ کار ہوتے ہیں۔ چناں چہ گواہ ملازمت پیشہ ہو یا تجارت پیشہ، طویل مقدمات اس کا کتنا ہی قیمتی وقت کھا جاتے ہیں۔ لوگوں کو گواہی پر آمادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عدالتی کارروائیوں میں تیزی لائی جائے اور اس ضمن میں گواہوں کے وقت کا خاص خیال رکھا جائے۔

پاکستان عام نوعیت کے جرائم کا شکار تو ہے ہی، اس کے ساتھ ہمیں بدامنی اور دہشت گردی کی خوف ناک ترین صورت حال کا بھی سامنا ہے۔ ایسے میں سنگین وارداتوں میں ملوث افراد کا محض گواہ نہ ملنے یا گواہوں کے بیان سے مکر

جانے کی بنیاد پر چھوٹ جانا شہریوں خاص کر ایسی وارداتوں کے متاثرین کو مضطرب کر دیتا ہے۔ یہ اضطراب بعض اوقات رد عمل میں بدل کر دہشت گردوں کی تعداد بڑھا جاتا ہے۔ گواہوں کو تحفظ دے کر ہی اس صورت حال کا کسی حد تک سدباب ممکن ہے۔ اور ہماری حکومتیں اور منتخب نمائندے اب تک اس حقیقت کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔

## حال سے بے خبر نصاب

"سر! یہ اتنے سارے لوگ کون ہیں؟ اور زور زور سے کیا کہہ رہے ہیں؟

"اور وہ جو بینر انھوں نے اُٹھایا ہوا ہے اس پر کیا لکھا ہے دہشت گرد"

"نبیل، شارق! کھڑکی بند کرو۔ سب بچے اپنی کتابیں کھولیں۔ آج ہم تحریکِ پاکستان کے بارے میں پڑھیں گے۔"

کھڑکی بند ہو گئی، جس کے اُس طرف دہشت گردی کے خلاف مظاہرہ ہو رہا تھا اور اِس طرف کلاس روم میں حال کی بابت سوال اٹھاتے بچے ماضی کا سبق پڑھنے لگے۔

ہم نے اپنی درس گاہوں کے دریچے اور دروازے حال کے لیے بند کر رکھے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ تاریخ کا جاننا ضروری ہے، ماضی کی آگاہی لازمی ہے، مگر "بنتی تاریخ" اور نظر کے سامنے سے گزرتے حالات سے بچوں کو آگاہ کرنا کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ کچی عمر کے ناپختہ ذہن آنکھوں میں ابھرتے مناظر، سامنے ہوتے واقعات کے بارے میں کیا، کیوں اور کیسے، جیسے سوال اٹھاتے ہیں، گلی محلے، نکڑ اور چوک پر ان سوالات کے مختلف اور متضاد جواب ملتے ہیں۔ ٹی وی چینلز کے ٹاک شوز پر لفظوں کی جنگ پختہ ذہنوں کو بھی خلفشار میں مبتلا

کردیتی ہے تو کچے ذہنوں کے استفسار کا کیا جواب دے گی۔ ایسے میں اگر دہشت اور وحشت کا کوئی ہرکارہ، "پاکستان نہیں بننا چاہیے تھا" کی بیمار سوچ کا حامل کوئی فرد یا اسلام سے بے زار کوئی گروہ معصوم ذہن کے سوال کو "تسلی بخش" جواب دے دے تو یہ ذہن اسی سوچ کا اسیر ہو جاتا ہے۔

درس گاہ ہی وہ جگہ ہے اور نصاب ہی وہ دستاویز، جس کے ذریعے حالاتِ حاضرہ سے واقف کرتے اور حقائق بتاتے ہوئے پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی دہشت گردی جیسے مسئلے پر نسلِ نو کی فکر کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن افسوس ہماری نصابی کتب میں جو چیزیں شامل ہیں، ان میں سے اکثر کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس کی دنیا کو لیا جائے تو ہم گراموفون سے آگے نہیں بڑھ پائے، ہمارا نصاب انٹرنیٹ، ٹیبلٹ پی سی جیسی جدید ایجادات کے تذکرے سے خالی ہے، جب کہ آج بچہ بچہ انٹرنیٹ استعمال کر رہا ہے اور کئی جدید ایجادات ننھے ہاتھوں کا کھلونا بن چکی ہیں۔ ہم روشنی کے خط مستقیم میں سفر کی بات کر رہے ہیں، جب کہ چاند پر بستیاں بسانے کا خواب تعبیر پانے کو ہے۔ سائنس کے کتنے ہی انکشافات اور نئے دریافت شدہ حقائق نصابی کتب کا حصہ نہیں بن سکے ہیں۔

شمسی توانائی سے بجلی پیدا کرنے اور گاڑیاں چلانے کا تجربہ عام ہے، مگر

ہمارے نصاب میں اس توانائی کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔
فزکس اور کیمسٹری کی دنیاؤں میں ہونے والے تجربات نئے فارمولے وجود میں لاچکے ہیں، جن سے ہمارا طالب علم ناواقف ہے۔
میں نے 1999 میں بایولوجی کی جو کتاب پڑھی تھی وہ آج بھی ہمارے نصاب کا حصہ ہے، جب کہ آج بائیولوجی کی دنیا میں کتنی ہی حقیقتیں سامنے آچکی ہیں۔
محمد بن قاسم، ٹیپو سلطان، انگریز راج، تحریک پاکستان سمیت عظیم شخصیات اور اہم ترین تاریخی واقعات کا ذکر اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی قومی تاریخ کا مطالعہ ہمیں اپنی جڑوں سے آشنا کرتا ہے، اپنی غلطیوں سے سیکھنے کا موقع دیتا ہے اور قابل فخر کارناموں پر ناز احساس کمتری سے بچاتا ہے۔ لیکن آنے والی نسل کو ماضی میں گم اور حال سے بے خبر رکھنا کہاں کی دانش مندی ہے؟
مگر افسوس کے ہمارے اسکولوں کا نصاب، عمومی طور پر، اوراق ماضی کے سوا کچھ نہیں۔
غور طلب پہلو یہ ہے کہ دسویں جماعت تک کے نصاب میں سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے ملک میں وقوع پذیر ہونے والے کسی بھی اہم تاریخی

واقعے کا ذکر نہیں ہے۔ چند انگریزی اسکولوں کے نصاب میں پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کے واقعے کا تذکرہ ملتا ہے، مگر دیگر اسکولوں کی نصابی کتب میں ہمارے ملک کا یہ قابل فخر واقعہ بھی شامل نہیں۔ گلگت بلتستان سمیت شمالی علاقہ جات کو آئینی حیثیت اور نیا اسٹیٹس ملے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں، مگر اس کا کوئی ذکر نصاب میں نہیں۔ "شمال مغربی سرحدی صوبے" کے عوام کا دیرینہ مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے اس صوبے کو بے تکے تشخص سے نجات دلا کر "خیبر پختون خوا" کا نام دے دیا گیا ہے، مگر افسوس ناک اور مضحکہ خیز امر ہے کہ مارکیٹ میں آج بھی ایسی کتابیں دست یاب ہیں جن میں خیبر پختون خوا کا نام "صوبہ سرحد" لکھا ہوا ہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ اسکولوں کے نصاب میں اس کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر وضاحت کے ساتھ نہیں بتایا گیا کہ یہ سانحہ کیوں پیش آیا اور وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر قیام پاکستان کی تحریک میں زور شور سے حصہ لینے والے بنگالی صرف پچیس سال میں مغربی پاکستان سے اس قدر بے زار ہو گئے کہ دریاؤں کی سرزمین پر نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور خون پانی ہو کر بہا۔ بات بس اتنی ہے کہ سقوط ڈھاکا کا المیہ ہو، منتخب اور مقبول وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا افسوس ناک واقعہ یا ایٹمی دھماکے کا پاکستانیوں کے سینے فخر سے بھر دینے اور چہرے

دمکا دینے والا لمحہ، گذشتہ کوئی چالیس دہائیوں کی تاریخ کے اہم واقعات حکومت
یں آنے والوں، وہ آمر ہوں یا منتخب حکم راں، کو "سوٹ" نہیں کرتے، چناں چہ نسل
نو کو ان سے بے خبر رکھنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ انھیں نصاب کا حصہ نہ بنایا
جائے۔

افغانستان میں سوویت یونین کی افواج کی آمد ہو یا طالبان حکومت کا قیام اور امریکی
یلغار، یہ سارے واقعات براہ راست ہماری زندگیوں، سماج سیاست پر اثر انداز ہوئے
ہیں، لیکن ہمارے اسکولوں کا نصاب ان واقعات کے بھیانک اثرات تو کجا ان واقعات کے
بارے میں بھی چپ سادھے ہوئے ہے۔

میں جب ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہی تھی تو پاکستان کی تاریخ کے ایسے بہت
سے حقائق میرے سامنے آئے جن سے میں ناواقف تھی، جنھیں جان کر میں حیران رہ
گئی۔ واضح کردوں کہ یہ حقائق مجھے کسی استاد کے لیکچر میں پتا نہیں چلے، بل کہ امتحانی
گائیڈ کے ذریعے مجھ پر منکشف ہوئے، جو اخبارات میں چھپنے والے آرٹیکلز کے ذریعے
مرتب کی گئی تھی۔ حالاں کہ ہماری تاریخ سے متعلق یہ حقائق اسکول اور کالج کے
نصاب کے ذریعے میرے علم میں آنا چاہیے تھے۔

ماضی قریب کی تاریخ اور حالات حاضرہ کی تشکیل کرنے والے واقعات کا پس منظر

اسکولوں کے نصاب میں شامل ہونا ضروری ہے، تاکہ طلبہ اپنے ارد گرد ہوتے معاملات کسی حد تک سمجھ سکیں۔ آج دہشت گردی ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ بقول شخصے، "مجھے یقین ہے کہ جس دن حکومت نے نصاب میں دہشت گردی کا موضوع شامل کر لیا، اس دن ملک میں دہشت گردی ختم ہو جائے گی۔" اس فقرے میں شاید کچھ غلو ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر اسکولوں کے نصاب میں دہشت گردی کے خلاف شعور اجاگر کرتے مضامین شامل ہوں، ہم دہشت گردی کی جن صورتوں کا شکار ہیں ان کا پس منظر موجود ہو اور دہشت گردی کی بنیاد بننے والے افکار کا رد شامل نصاب ہو، تو اسکول کی سطح ہی پر اس حوالے سے آنے والی نسل کی ذہن سازی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح بچوں کے ذہن مسموم کرکے انھیں اپنا آلہ کار بنانے والے عناصر کو ناکام بنایا جا سکتا ہے اور ایک ایسی نسل تیار کی جا سکتی ہے جس کے افراد میں اتنا شعور ہو کہ معصوم جانوں سے کھیلنے اور درس گاہوں کو تباہ کر دینے جیسی وحشیانہ حرکتوں کا کوئی جواز ہے نہ ہو سکتا ہے۔

# خبردار! کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے

سماجی ویب سائٹس نے گذشتہ کچھ عرصے کے دوران پاکستان میں انتہائی مقبولیت حاصل کی اور ہمارے ہاں ان سائٹس کے اثر میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ سماجی رابطے کی ویب سائٹس، جن میں فیس بک اور ٹوئٹر قابل ذکر ہیں، کے ذریعے نوجوانوں کی بڑی تعداد نے سماجی مباحث کو ترتیب دیا اور لوگوں کی سوچ کو جانچنے کی کوشش کی۔

پاکستان میں حالیہ انتخابی مہم چلانے کے لیے مختلف جماعتوں اور ان کے حامیوں نے سماجی ویب سائٹس کا سہارا لیا۔

ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سماجی رابطے کی ویب سائٹس نے تہلکہ مچا دیا ہے، کیوں کہ یہ رائے عامہ ہموار کرنے اور اظہارِ رائے کا بہت بڑا میڈیم بن گئی ہیں۔

کسی مخصوص خیال یا نظریے کی ترویج کرنے کے ساتھ ساتھ مخالفین سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنی رائے اور سوچ کا کُھل کر اظہار کرنے کے لیے بھی لوگ سوشل میڈیا کا سہارا لیتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت فیک آئی ڈیز بنائی جاتی ہیں۔ یہ صورت حال جتنی صاف اور واضح ہے، درحقیقت اتینی ہی گمبھیر ہوتی جارہی ہے۔

فیک آئی ڈیز کے ذریعے انتشار پھیلانا، غیر اخلاقی تصاویر پوسٹ کرنا یا جھوٹی شناخت کا سہارا لے کر کسی کو انفرادی طور پر زچ کرنا آسان سمجھا جاتا ہے، لیکن ایسا کرنے والے اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں کہ ''کوئی'' ہے جو ان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ جی ہاں! برطانوی کمپنی گیما گروپ نے ایک ایسا سافٹ ویئر تیار کیا ہے، جو کسی ریموٹ کنٹرول کے ذریعے کمپیوٹر کا کنٹرول حاصل کرکے دستاویزات کاپی کرسکتا ہے۔ یہ سافٹ ویئر کسی کمپیوٹر سے کتنی آئی ڈیز آپریٹ ہورہی ہیں اس کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ جس گفتگو میں کوئی مخصوص یا مشکوک لفظ شامل ہو یہ سافٹ ویئر اسے فوری طور پر کیپچر کرلیتا ہے۔

پہلے پہل اس بات کا چرچا تھا کہ کسی بھی قسم کی خفیہ گفتگو سیلولر یا لینڈ لائن فون سے کرنا خطرناک ہوسکتا ہے، لہٰذا گفتگو کے لیے بین الاقوامی سطح پر آن لائن مکالمے کے لیے سب سے زیادہ استعمال کیے جانے والے سافٹ ویئر اسکائپ نے بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔ اسکائپ اپنے یوزرز کو سماجی رابطے

کی ویب سائٹس پر موجود حلقہ حباب سے گفتگو کرنے کی بھی سہولت فراہم کرتا ہے۔
لیکن گیما گروپ کی جانب سے تیار کردہ ''فن فشر'' سافٹ ویئر اسکائپ کالز بھی سن سکتا ہے، جو کہ سماجی ویب سائٹس بہ شمول اسکائپ استعمال کرنے والے ہر شخص، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے انتہائی تشویش ناک ہے، جو اپنے ملک کی حکومت سے اختلاف رکھتے اور اسکائپ پر گفتگو کے ذریعے اس کا اظہار کرتے ہیں۔
فن فشر کا نظام متعدد ملکوں میں گذشتہ پانچ سال سے کام کر رہا ہے، جب کہ ایک رپورٹ کے مطابق یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ فن فشر پاکستان میں بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ فن فشر کے ذریعے کسی بھی اسمارٹ فون، بلیک بیری، ونڈو اور ای میلز تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس سافٹ ویئر کے ذریعے کمپیوٹر کے مختلف پاس ورڈز بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ سافٹ ویئر کوئی کمپنی حاصل نہیں کر سکتی۔ فن فشر کو حکومتی سطح پر ایک مخصوص معاہدے کی بنیاد پر خرید جا سکتا ہے۔ اس سافٹ ویئر کو شخصی آزادی پر ایک خطرناک حملہ تصور کیا جا رہا ہے۔
بین الاقوامی سطح پر سرگرم مختلف این جی اوز اس حوالے سے سرتاپا احتجاج ہیں، جب کہ یہ خبر عالمی میڈیا کی شہ سرخیوں میں ایک عرصے سے گردش کر رہی ہے۔ امریکی صدر بارک اوباما کو بھی اس حوالے سے قوم کے سامنے وضاحت کرنے کی

ضرورت پیش آئی اور انھوں نے اسے انسانی حقوق اور آزادی اظہار کی خلاف ورزی کے بجائے ملکی مفاد کے لیے ضروری قرار دیا۔ پاکستان میں اسکائپ سمیت مختلف سماجی ویب سائٹس کے صارفین اب تک اس بات سے ناواقف ہیں کہ ایک باقاعدہ نظام کے تحت انٹرنیٹ سماجی ویب سائٹس اور کالز کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاسکتا ہے یا ممکنہ طور پر رکھا جارہا ہے۔

انٹرنیٹ پر صارفین کی نگرانی میں اس حد تک اضافہ ہوگیا ہے کہ رواں سال کے ابتدائی چھے ماہ میں انٹرنیٹ کے معروف سرچ انجن گوگل کو مختلف ممالک سے اکیس ہزار درخواستیں موصول ہوئی ہیں، جن میں حکومتی اداروں کی ڈیٹا تک رسائی رسائی کو محدود کرنے کے لیے کرنے کے حوالے سے اپنا اپنا موقف بیان کیا گیا ہے۔ گوگل کا کہنا ہے کہ حکومتیں گوگل پر موجود کوئی مواد ہٹوانے کے لیے ملک کی بدنامی، راز ہونے اور سیکیوریٹی جیسے تین اہم عذر پیش کرتی ہیں۔

ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد دنیا بھر میں سوشل ویب سائٹس استعمال کرنے والے اپنی ذاتی زندگی اور نظریات کے بارے میں چیٹنگ یا آن لائن گفتگو کے معاملے میں پریشانی کا شکار ہوگئے ہیں کہ کہیں ان کا ادا کیا ہوا کئی لفظ ان کے اپنے ملک کی حکومت یا دنیا کی بڑی سرکار امریکا کے اداروں کے نظر میں مشکوک قرار پائے اور ان کے لیے مصیبت کھڑی ہوجائے۔

# ڈرون حملے اور لفظی احتجاج

جا بہ جا پیوند لگی چادر پر بچھے دستر خوان پر آج کئی دنوں بعد میسر آنے والے گوشت کا سالن وہاں بیٹھے اہل خانہ کی اشتہا بڑھا رہا ہے۔ ہاتھ رکے ہوئے ہیں کہ گھر کا سربراہ روٹی لینے گیا ہے۔ اچانک اس کچے گھر سے پورے گاؤں تک پھیلا رات کا سکوت ایک خوف ناک آواز نے توڑ دیا۔ ماں کے پہلو میں بیٹھے چارہ سالہ گُل زیب نے سالن کی پتیلی سے نظریں ہٹا کر ماں کی طرف دیکھا، ”ماں! وہی آواز.... کہیں بابا تو نہیں مارا گیا۔“، ”چُپ، اللہ نہ کرے“ ماں کی آواز میں غصے سے زیادہ اپنی اس دعا پر بے یقینی کی لرزش تھی۔ ”ماں! جب یہ آواز آتی ہے تو ہمارے گاؤں میں کسی کا بابا ضرور مارا جاتا ہے۔“

کچھ خبر نہیں گل زیب کا ”بابا“ روٹی لے کر آیا کہ اس معصوم کا خدشہ سچ ثابت ہوا۔ خبر ملتی ہی کب ہے۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ ڈرون حملے میں فلاں فلاں عسکریت پسند سمیت اتنے افراد مارے گئے، اتنے مشکوک عسکریت پسند ہلاک ہوگئے۔ یہ ”سمیت“ مارے جانے والے کون تھے؟ یہ ”مشکوک“ واقعی عسکریت پسند تھے یا بے قصور؟ کچھ پتا نہیں چلتا۔

پاکستان پر امریکی حملوں.... چلیے، یوں نہیں کہتے کہ قومی غیرت اور ''دفاعی وقار'' کا سوال ہے، یوں کہہ لیتے ہیں کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ کے سلسلے میں پاکستان کے شمالی علاقوں میں ہونے والے ڈرون حملوں'' کا آغاز 2004 سے ہوا تھا، جس کے بعد سے یہ یلغار مسلسل جاری ہے۔ آزادی، خودمختاری، قومی عزت ووقار اور ڈرون حملوں کی مخالفت کے نعروں کے ساتھ انتخابات میں کام یابی حاصل کرکے وزارت عظمیٰ سنبھالنے والے میاں محمد نواز شریف کی جماعت کے برسر اقتدار آنے کے بعد اب تک پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دو ڈرون امریکی حملے ہوچکے ہیں۔ نواز شریف ڈرون حملوں کی مذمت اور مخالفت کرتے رہے ہیں۔ وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے سے پہلے قومی اسمبلی سے اپنے خطاب میں بھی وہ کہہ چکے ہیں کہ اب یہ حملے ختم ہوجانا چاہییں۔ اس سلسلے کے فوری خاتمے کا مطالبہ کرتے ہوئے انھوں نے اسے پاکستانی کی خودمختاری پر حملہ قرار دیا تھا۔

نومنتخب وزیراعظم کے اس مطالبے یا ''اپیل'' کا جواب یکے بعد دیگرے دو ڈرون اٹیکس کی صورت میں سامنے آچکا ہے۔ ان میں سے پہلا حملہ 7 جون کو ہوا، جس میں سات جانیں گئیں اور تین افراد زخمی ہوئے۔ دوسرا جواب 3 جون کو آیا اور شمالی وزیرستان ایجنسی کے صدر مقام میراں شاہ میں ہونے والا امریکی ڈرون حملہ مزید سات جانیں نگل گیا۔

بے شک ان حملوں میں عسکری کارروائیوں میں ملوث افراد بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ لیکن اندھے ڈرون طیارے جب بے دردی سے موت بانٹتے ہیں تو قصوروار اور بے قصور میں امتیاز نہیں کرتے۔ چناں چہ ان حملوں میں کتنے ہی پھول سے بچے جھلس کر خاک ہوچکے ہیں، کتنے ہی بے گناہ شہری موت کی آغوش میں جاچکے ہیں اور لاتعداد گھر مٹی ہوچکے ہیں، مگر اس خوں ریزی اور تباہی کا جواب وحساب دینا اور ذمے داری قبول کرنا تو کجا، ان واقعات کی تفصیلات بھی سامنے نہیں آتیں۔ مارا جانے والا دہشت گرد قرار پاتا ہے، مگر اکثر اس کے بارے میں کوئی تفصیل دی جاتی ہے نہ اس کی تصویر۔ ہمارے حکم راں اور دفاعی ادارے اس بات سے انکاری ہیں کہ یہ حملے ان کی اجازت یا اعانت سے ہورہے ہیں، مگر ان کے خلاف زبانی کلامی احتجاج کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قوم کے منتخب نمائندے ان حملوں کے خلاف قرارداد منظور کرتے ہیں، مگر جب پاک فضائیہ کا سربراہ ان سے ڈرون طیارے گرانے کی ''اجازت طلب'' کرتا ہے تو ہر طرف خاموشی چھاجاتی ہے۔ اور رہی قرارداد، تو یہ محض ایک رسمی کارروائی ہی ثابت ہوئی ہے۔ اگر یہ حملے ''قومی مفاد'' کا تقاضا اور ان میں ہونے والی ہلاکتیں اور تباہی ''ملک کے استحکام'' کے لیے ناگزیر ہیں تو ان حملوں کو ''ہماری جنگ'' قرار دے کر واشگاف الفاظ میں ان کی ذمے داری کیوں نہیں قبول کی جاتی؟

ڈرون حملوں کو ہر پاکستانی قومی عزت اور خود مختاری پر حملہ تصور کرتا ہے۔ امریکا کی ان کارروائیوں پر ہر پاکستانی کا دل زخمی اور ملول ہے۔ یہی جذبات تھے جن کا اظہار انتخابی نتائج کی صورت میں سامنے آیا اور عوام نے مسلم لیگ ن اور پاکستان تحریک انصاف کو جو کامیابی دلائی اس کی ایک اہم وجہ ان جماعتوں کی پاکستان کے معاملات میں امریکی مداخلت اور ڈرون حملوں کی مخالفت تھا۔ تحریک انصاف نے ان حملوں کی محض مذمت ہی نہیں کی بلکہ مظاہروں اور دھرنوں کے ذریعے بھی اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔ مگر آج جب تحریک انصاف قومی اسمبلی میں ایک بڑی جماعت بن کر سامنے آئی ہے اور خیبر پختون خوا میں اپنی حکومت قائم کرچکی ہے، اپنے موقف سے کئی قدم پیچھے ہٹتی نظر آتی ہے۔ توقع تھی کہ تازہ حملوں کے خلاف عمران خان اور ان کی جماعت کا بھرپور ردعمل سامنے آئے گا، مگر مایوسی ہوئی۔ شاید ہمارے حکم راں اور سیاست داں اس حوالے سے سخت اور دوٹوک موقف اپنانے سے کتراتے ہیں کہ کہیں دنیا کی بڑی سرکار ان سے ناراض نہ ہوجائے، مگر ان حملوں کو واضح موقف اور عملی اقدامات کے ذریعے ہی روکا جاسکتا ہے۔

ان دو جماعتوں کا ذکر تو اس لیے آیا کہ یہ ڈرون حملوں کی مخالفت کرتی رہی ہیں اور اب برسراقتدار ہیں، ورنہ ملک کی ہر سیاسی جماعت، تنظیم، این جی او اور عوام کو تسلسل سے جاری اس امریکی جارحیت کے خلاف بھرپور احتجاج کرنا

چاہیے، جس میں کتنے ہی بے گناہ پاکستانی مارے جا چکے ہیں اور مارے جا رہے ہیں۔ موثر اور وسیع پیمانے پر ہونے والا احتجاج ہی اس ننگی جارحیت کا خاتمہ کر سکتا ہے، نہ کہ مذمتی بیانات اور قرار دادیں۔

اس معاملے میں ویسے ہی بھرپور احتجاج کی ضرورت ہے جیسا 26 نومبر 2011 کو ناٹو فورسز کی جانب سے پاک افغان سرحدی چوکیوں پر ہونے والے حملے کے خلاف کیا گیا تھا۔ اس حملے میں پاک فوج کے 24 اہل کار اور تیرہ دیگر افراد شہید ہو گئے تھے۔ اس حملے کے خلاف بہ طور احتجاج پاکستان نے ناٹو کی سپلائی لائن بند کر دی تھی اور شمسی ایئر فیلڈ میں قائم امریکی تنصیبات بند کرنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ احتجاج کا یہ مؤثر طریقہ ڈرون حملوں کے خلاف بھی کیوں نہیں اپنایا جاتا؟ ان حملوں میں ہونے والی ہر ہلاکت اور ہر گھر کی تباہی کی ذمے داری پاکستان کی حکومت پر عاید ہے، جسے یہ ذمے داری قبول کرنی چاہیے۔

# مصر میں جمہوریت کا قتل

کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک تصویر دیکھی۔ ایک سماجی ویب سائٹ پر پوسٹ ہونے والی یہ تصویر عام سے طرزِ زندگی کی عکاسی کر رہی تھی، جس میں ایک چالیس پینتالیس برس کا ایک شخص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ بہ ظاہر اس تصویر میں کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی، لیکن ایک چیز حیرت میں ڈالنے والی تھی، وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ زمین پر بچھے دستر خوان پر کھانا کھاتا سادگی کی تصویر بنا یہ شخص مصر کا صدر محمد مُرسی تھا۔

اقتدار کے نشے میں تو بڑے بڑوں کو فرعون بنتے دیکھا، لیکن فرعونوں کے دیس میں اس تصویر کی اشاعت سے کچھ ہی عرصہ پہلے حکومت سنبھالنے والے اس راہ نما کے تیور ہی کچھ اور تھے۔

وہ یہ جانتا تھا کہ ابھی وہ دنیا کے سامنے کم زور ہے، مگر اس کی غیرت اور حمیت میں کوئی ضعف نہ تھا اور وہ مسلم امہ کی طاقت پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے کسی مسلم ملک پر حملے کی صورت میں مغربی دنیا سے عدم تعاون کا اعلان کیا۔

اندرون ملک بھی اس نے زور آوروں کی دھاندلی سے سمجھوتا نہیں کیا، اور بد عنوانی کے ذریعے کھربوں ڈالر مالیت کی جاگیریں بنالینے والے جرنیلوں کو سزا دلوائی۔ امریکا اور دیگر مغربی ممالک کی طرف سے انتہاپسندی اور بنیاد پرستی کا لیبل لگنے کا اندیشہ جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے اس نے شراب خانوں پر پابندی لگادی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق ملک چلانے کا فیصلہ کیا، کہ اس کی جماعت کو اسی طرز حکومت کے لیے مینڈیٹ ملا تھا۔

حسنی مبارک کے طویل آمرانہ اور جابرانہ دور کے انقلاب کی طوفانی موجوں میں تنکے کی طرح بہہ جانے کے بعد ہونے والے انتخابات میں محمد مُرسی ملک کے پہلے جمہوری صدر منتخب ہوئے۔ 30 جون 2012 کو منصب صدارت سنبھالنے والے محمد مُرسی کو لاتعداد چیلینجز کا سامنا تھا۔ وہ اس اخوان المسلمون کے نمائندے تھے جو امریکا اور سیکولر دنیا کی نظر میں ہمیشہ سے قابل گردن زدنی رہی ہے۔ مصر میں عشروں تک مظالم سہہ کر جمہوریت کے مسلمہ راستے سے اقتدار میں آنے والی اس اسلامی جماعت کی حکومت امریکا اور اس کے حواریوں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور اسلامی طرز حیات پر یقین رکھنے والی اس جماعت کی حکومت کو امریکا کے لاڈلے اسرائیل کے لیے خطرہ سمجھا جارہا تھا۔ مُرسی کو اس حقیقت کا پوری طرح ادراک تھا کہ اسرائیل نواز مغربی حکومتیں خاص طور پر وہائٹ ہاؤس ان کی

حکومت کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے، اس کے باوجود انھوں نے اسرائیل کو واشگاف الفاظ میں متنبہ کردیا کہ وہ فلسطینیوں پر ظلم نہ ڈھائے۔ دوسری طرف اپنے لگ بھگ ایک سالہ دورِاقتدار میں انھوں نے اپنے ملک میں اصلاحات کی ہر ممکن کوشش کی، جن میں سرفہرست آئین سازی ہے، جس میں انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کیا گیا اور اسلامی قوانین نافذ کیے گئے۔ انھوں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ مخالفین سے محاذ آرائی نہ ہو، چناں چہ بیوروکریسی میں شامل حسنی مبارک کے وفاداروں کو نکالنے سے گریز کیا گیا۔ آمریت کے پٹھو یہ بیوروکریٹس اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مُرسی کی اصلاحات اور اقدامات کو ناکام بناتے یا ان کا اثر کم کرتے رہے۔

آخرکار بیوروکریسی سے فوج تک ہر جگہ بااثر طاقت ور سیکولر، مغرب نواز اور آمریت پرست حلقوں نے ملک کی سیکولر سیاسی قوتوں کی مدد سے حکومت گرانے کی سازش کا آغاز کردیا، جو 4 جولائی کو رنگ لائی اور فوج نے بغاوت کرتے ہوئے محمد مرسی کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ ساتھ ہی معزول صدر اور ان کے کئی دیگر ساتھیوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ مصری فوج کے سربراہ ابوالفتح السیسی نے اپنے اقدام کا جواز یہ بتایا کہ مرسی حکومت عوام کی توقعات پر پوری اترنے میں ناکام رہی۔

مرسی کے مخالفین نے فوج کے اس اقدام کو سراہا اور اسے انقلاب کا نام دیا ہے۔

یہ کیسا انقلاب ہے، جس میں 52 فی صد ووٹ لے کر منتخب ہونے والی آئینی حکومت کو ایک سال مکمل ہوتے ہی زورزبردستی سے ہٹادیا جاتا ہے۔ جہاں تک توقعات پر پورا اترنے یا مطالبات ماننے کا تعلق ہے تو صرف ایک سال کی مختصر مدت میں "توقعات پوری نہ ہونے پر حکومت چھوڑ دینے کا غیرآئینی اور غیر منطقی مطالبہ کیسے اور کیوں مانا جاسکتا تھا؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تحریر اسکوائر پر بہ طور احتجاج جمع افراد سے حکومت اور فوج مل کر مذاکرات کرتیں اور کوئی موزوں راستہ اختیار کیا جاتا۔ لیکن فوج کا مقصد طے شدہ تھا۔ احتجاجی تحریک سے مرسی حکومت کے خاتمے تک تیزی سے سامنے آنے والی ڈرامائی صورت حال نے یہ واضح کردیا ہے کہ اول سے آخر تک سب کچھ ایک منصوبے کے تحت انجام پایا۔

یہ بالکل سامنے کی حقیقت ہے کہ مصر کی فوج نے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے اور امریکا اور دیگر مغربی ممالک کی آشیرباد سے ان کی بکاؤ فوج بن کر اپنے ملک کے پہلے جمہوری حکم راں محمد مرسی کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا۔

مصری فوج کے ہاتھوں جمہوریت کے قتل کی اس کارروائی پر ترک وزیراعظم طیب اردگان نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے، "ہم مصر میں دو نمبر انقلاب کو

نہیں مانتے۔ مرسی آج بھی مصر کے منتخب صدر ہیں اور ہم آئندہ بھی اپنے تمام معاملات ان ہی کے ساتھ طے کریں گے۔" یہی کھرا موقف اور واضح طرز عمل ہے، جو مصر ہی کے معاملے میں نہیں ہر اس ملک کی بابت حکومتوں کو اختیار کرنا چاہیے جہاں فوج کسی بھی بہانے سے اقتدار پر قابض ہو جاتی ہے۔

افراد ہوں یا حکومتیں کسی ظلم اور زیادتی پر دکھاوے ہی کے لیے سہی اپنے موقف کا اظہار ضرور کرتی ہیں۔ چناں چہ امریکا کے صدر باراک اوباما نے مصر کی فوج کی جانب سے حکومت کا تختہ الٹنے اور آئین معطل کرنے پر شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ہماری حکومت کے ہونٹوں پر تالے پڑے ہیں۔ ایک مسلم اور جمہوری ریاست ہونے کی حیثیت سے کسی بھی ملک، خاص کر کسی اسلامی ریاست میں رونما ہونے والے اتنے اہم واقعے پر اپنا ٹھوس موقف سامنے لانا پاکستانی حکومت کی ذمے داری ہے، لیکن نہیں، غزہ ہو کہ شام یا مصر کی صورت حال ہمارے حکم راں خاموشی ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔

مرسی یا اخوان المسلمون کی حکومت کا خاتمہ ایک جمہوری اور اسلامی اقدار کے نفاذ پر یقین رکھنے والی حکومت پر حملہ ہی نہیں، یہ اسرائیل کے مفادات کے تحفظ کے لیے کیا جانے والا اقدام بھی ہے۔ اس صورت حال میں پوری مسلم دنیا، خاص کر عالم اسلام میں اہم مقام رکھنے والے پاکستان کو اس حوالے سے ٹھوس

اور واضح موقف اور حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے، کیوں کہ یہاں سوال صرف ایک ملک کا نہیں پوری امت مسلمہ کا ہے۔

## ماہ صیام، میانہ روی کا متقاضی ہے

ماہ صیام کی برکتوں اور رحمتوں کے باعث ہر مسلمان ہی اس مہینے کا انتظار کرتا ہے، دوسری طرف اس پُر لطف اور پُر کیف لمحوں کو حالات کی ستم ظریفی اچھی خاصی متاثر کر رہی ہے۔

مہنگائی اور کھٹن معاشی حالات نے ماہ صیام کی خوشیوں میں بھی تشویش شامل کر دی ہے۔ منہگائی ایک اژدھے کے مانند اپنا منہ کھولے سب کچھ نگل لینے کو ہے، دہشت گردی کے متواتر واقعات کے باعث ہر ایک ذہن میں خدشات ابھر رہے ہیں۔ بجلی بحران نیندیں اچاٹ کر رہا ہے، لیکن ان حالات کے باوجود ہمیں ان مبارک ساعتوں کے استقبال کی تیاری کرنی ہے، کیوں کہ دلوں کے سکون کے لیے ان پر نور لمحوں سے بڑھ کر اور کون سا موقع ہوگا۔

رمضان المبارک کے بعد عید بھی ایسا تہوار ہے کہ جس کا سارا سال انتظار کیا جاتا ہے۔ نچلے اور متوسط گھرانے بھی اس سالانہ تہوار کے لیے کچھ اضافی اخراجات کی سوچ بچار میں ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے یہ امر کافی مشکل ہوتا ہے۔ بہت سی گھریلو خواتین عید اور رمضان کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پورے سال بچت کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس ماہ کے اخراجات پورے کرنے میں کسی حد تک

مدد حاصل ہوتی ہے، لیکن منہگائی نے اس سال ایسی کمر توڑ دی ہے کہ بچت کرنے کے باوجود اخراجات قابو میں نہیں آپاتے۔ سحر و افطار کا اہتمام، ملبوسات کی تیاری، عید کے موقع پر گھر کی تزئین و آرائش، دستر خوان، پردے اور دیگر ضروری سامان کی خریداری کے لیے اچھے خاصے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سب سے اہم رمضان میں باورچی خانے کے اخراجات ہیں۔ سحر و افطار میں خصوصی پکوانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں خاص طور پر دکان دار عید اور رمضان کے دنوں کو کمائی کے دن تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے نرخ نامے جاری کیے جاتے ہیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد کروانے کی یقین دہانیاں بھی کرائی جاتی ہیں، لیکن حال یہ ہوتا ہے کہ رمضان کی آمد سے قبل ہی دودھ، دہی، پھل، گوشت، بیسن، چنا، پیاز، ٹماٹر وغیرہ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ یوں نہ چاہتے ہوئے بھی اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اگر ذرا سی سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو اخراجات پر خاطر خواہ حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ سگھڑ خواتین باورچی خانے میں مصروف سحر و افطار کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔ گھر کے ہر فرد کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ فروٹ چاٹ، دہی بڑے، چھولے، پکوڑے، سموسے، رول، آلو کے کباب، کٹلس غرض کہ دستر خوان سجانے کے لیے کیا جتن نہیں کیے جاتے، اس کے بعد کھانے اور صبح سحری کے لیے الگ اہتمام ہوتا ہے۔ اگر پہلے روزے ہی سے خوب

دستر خوان بھر کے مختلف انواع کے پکوان تیار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو ماہ رمضان کے بجٹ اور عید کے خرچ کا کیا ہوگا؟

رمضان کی آمد سے قبل ہی اشیائے خوردونوش کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ ممکن نہیں رہا کہ روزانہ دستر خوان انواع و اقسام کے پکوانوں سے سجایا جائے۔ اس لیے سمجھ داری کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے باورچی خانے کے اخراجات کو مناسب منصوبہ بندی اور میانہ روی کے ساتھ قابو میں کیا جائے۔ مختلف اور لذیذ کھانے ضرور پکائے جائیں، لیکن ان کھانوں کے لیے مختلف دن مختص کرکے اہتمام کیا جائے۔ دستر خوان پر افطاری کے وقت اگر دو ڈشز بھی رکھی جائیں، تو کوئی روزے پر فرق نہیں آ جائے گا۔ ساتھ ہی کھانے کی پیش کش کا پہلو مد نظر رکھنا چاہیے۔ کھانے کا متوازن، لذیذ اور غذائیت سے بھرپور ہونا ضروری ہے، اگر اس کی پیش کش بھی اچھے طریقے سے کی جائے تو اس کی لذت دوچند ہو جاتی ہے۔ سادہ اشیا بھی اگر خوب صورت انداز میں پیش کی جائیں تو وہ بھی مزے دار لگتی ہیں۔

ساتھ ہی اس رمضان کے موقع پر کھانے کی سجاوٹ اور پیش کش کے کچھ انوکھے طریقے اختیار کیجیے۔ سادہ پکوڑوں کے ساتھ مختلف اقسام کی گھر کی بنی چٹنیاں پیش کیجیے اور انھیں پہلے ہی تیار کرکے فریج میں محفوظ کر لیجیے۔ ساتھ ہی

یہ تجربہ بھی کیجیے کہ افطار کا اہتمام کرنے کے بہ جائے رات کا کھانے پر توجہ دیں۔ اس طرح کھانا زیادہ رغبت سے کھایا جائے گا۔ فروٹ چاٹ بنانے کے بہ جائے ایک ہی پھل اچھے طریقے سے کاٹ کر رکھ دیا جائے، تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس رمضان میں موسم گرما کی سوغات آم دستیاب ہے۔ اگر مصنوعی مشروبات کے بجائے کبھی کبھار آم دودھ بنا کر پیش کیا جائے تو اس سے غذائی ضروریات بھی پوری ہوں گی اور منہگے مشروبات کی مد میں ہونے والا خرچ بھی بچے گا۔

کوشش کریں کہ اس بار رمضان ذرا مختلف انداز میں گزاریں۔ ان بابرکت ایام کے لیے منصوبہ بندی کر کے خاتون خانہ اپنے سگھڑاپے کا ثبوت دے سکتی ہیں۔ یہ تہوار یہ بابرکت مہینا ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھا رہے ہیں ورنہ جن معاشی مسائل میں ہم گھِرے ہوئے ہیں وہاں خوشیوں کا بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہر کوئی اس وقت کو یاد کرتا نظر آتا ہے، جب زندگی اس قدر جھمیلوں میں الجھی ہوئی نہیں تھی۔ آج ہمارے مسائل میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ رمضان کے روزے ہمیں مسائل سے نکلنے کے لیے ذہنی اور جسمانی تربیت فراہم کرتے ہیں اس لیے سادگی اپناتے ہوئے ان ایام کی برکتوں سے مستفیض ہوں۔

# سوشل میڈیا: تفریح کا سامان ہی نہیں، مشکل میں مدد کا بھی امکان

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کو عموماً محض لطف اندوزی کا سامان سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ تو ان کے استعمال کو وقت کا زیاں بھی گردانتے ہیں۔ تفریحی پہلو اپنی جگہ مگر یہ سائٹس اپنی افادیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کے ذریعے رابطے کی سہولت کبھی کبھار کسی نقصان سے محفوظ رکھنے کے ساتھ جان بھی بچالیتی ہے۔ یہاں ہم کچھ ایسے ہی واقعات پیش کررہے ہیں:

☆ یہ مارچ 2009 کا واقعہ ہے۔ 29 سالہ روب ولیمز اور جیسن ٹیریوا سوئس لینڈ میں پہاڑی سلسلے الپس میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکیٹنگ کررہے تھے۔ اچانک برفانی طوفان آیا اور وہ اپنے گروپ سے بچھڑ گئے۔ ان کے گروپ کے ایک رُکن نے ٹوئٹر استعمال کرکے اپنے ان بچھڑ جانے والے ساتھیوں کے موبائل نمبر حاصل کیے اور انھیں کال کی۔ گروپ کا ٹیریوا سے رابطہ ہوگیا۔ اس رابطہ کار نے اسے گوگل میپ ایپلیکیشن کی مدد سے راہ نمائی کی۔ بدقسمتی سے ولیمز ایک 66 فٹ بلند چٹان سے گر کر جان کی بازی ہار گیا، لیکن ٹیریوا کی جان بچ گئی۔

☆ جولائی 2010 میں سائیکلنگ کے ایک مقابلے میں Leigh Fazzina نامی خاتون سائیکلسٹ کی سائیکل درخت سے ٹکرا گئی اور وہ اچھل کر دور جا گری۔ وہ دیگر ساتھی سائیکلسٹس سے جدا ہو چکی تھی اور اس قدر زخمی تھی کہ اس کے لیے چلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے رابطے کے لیے موبائل استعمال کرنے کی کوشش کی، مگر سگنل نہ مل سکے۔ پھر اسے ٹوئٹر استعمال کرنے کا خیال آیا۔ اس نے ٹویٹ کیا، ”میں شدید زخمی ہوں، مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“ ٹوئٹر پر چھے لوگ اس کی مدد کے لیے آگے آئے اور چند منٹ کے اندر اسے بچانے کے لیے ایمبولینس پہنچ گئی۔

☆ یہ واقعہ 2009 میں برطانیہ میں پیش آیا۔ برطانیہ کے شہر آکسفورڈ شائر میں رہائش پذیر ایک 16 سالہ لڑکا رات گئے فیس بک پر آن لائن ہوا اور اس نے امریکا میں مقیم اپنی ایک ایف بی فرینڈ کو پرائیویٹ میسج کیا کہ وہ خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ لڑکی نے یہ بات اپنی ماں کو بتائی، جس نے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے فوری طور پر امریکا میں برطانیہ کے سفارت خانے سے رابطہ کیا۔ برطانیہ میں متعلقہ اتھارٹی کے اہل کاروں نے اس لڑکے کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے یہ تلاش آکسفورڈ شائر کے آٹھ گھروں تک محدود ہو گئی۔ آخر کار خودکشی پر مصر لڑکے کو ڈھونڈ نکالا گیا۔ وہ اس وقت منشیات کی بھاری خوراک استعمال کرنے کے باعث نشے میں دُھت تھا۔ بعد ازاں اسپتال میں

اس کا علاج کیا گیا اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

☆ Dave Cormier اور Bonnie Stewart اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ کینیڈا کے New Brunswick علاقے میں ہائیکنگ (تفریح کی غرض سے پیدل طویل سفر) پر تھے۔ سر راہ ان کی بیٹی نے بیر جیسا ایک پھل کھایا، جسے وہ پہچان نہ سکے۔ چھٹی حس کے تحت انھوں نے اس پھل کی تصویر اتاری اور اسے ٹوئٹر پر یہ جاننے کے لیے پوسٹ کر دیا کہ اس پھل کے اثرات کہیں مضر تو نہیں؟ آخر ایک ری ٹوئٹ کے ذریعے انھیں پتا چلا کہ یہ ایک زہریلا پھل ہے۔ انھوں نے قریب ترین اسپتال کو اطلاع دی، جس کے اسٹاف نے آکر ان کی بیٹی کو لے گیا اور اس کی جان بچ گئی۔

☆ Iona Stratton بائیس سالہ اپنی پیدائش ہی سے خون کے سرطان میں مبتلا تھی۔ اپنے چینی اور برطانوی مخلوط پس منظر کے باعث اس کا خاندان اس کے لیے کوئی ایسا ”بون میرو“ عطیہ کرنے والا تلاش نہیں کر پایا تھا، جس کا بون میرو، لونا کے خون سے میچ کر سکے۔ اکتوبر 2008 میں لونا کے والدین نے فیس بک پر اس سلسلے میں اپیل پوسٹ کی، جس کے بعد دنیا بھر سے 5 ہزار500 افراد نے اس اپیل کو آگے بڑھایا۔ بالآخر آسٹریلیا سے لونا کے میچ کا بون میرو مل گیا۔ مگر بدقسمتی سے لونا آپریشن کے دو ہفتے بعد چل بسی لیکن سماجی رابطے کے ذریعے جان بچانے کی کوشش رقم ہو گئی۔

☆اس رات ٹینا کیس فیس بک پر تھی جب اس نے اپنے ایک دوست کی پوسٹ دیکھی، جو اس سے چالیس میل دور مقیم تھا۔ اس کے دوست نے لکھا تھا، "براہِ مہربانی کوئی میرے لیے 911 (ایمرجینسی نمبر) پر کال کردے۔ میرا فون کام نہیں کر رہا اور میرے خیال میں کوئی میرے گھر میں گھس آیا ہے۔" یہ پوسٹ پڑھ کر کیس نے 911 پر کال کی اور اس بارے میں بتایا۔ پولیس نے جب کارروائی شروع کی تو پتا چلا کہ کیس کے دوست کی فون لائن ڈیڈ ہے، جس کے بعد پولیس اس شخص کے گھر پہنچ گئی۔ وہ خیریت سے تھا۔ پولیس نے یہ امکان ظاہر کیا کہ اس کے گھر میں موجود شخص پولیس کو آتا دیکھ کر فرار ہوگیا تھا۔

## کراچی جائے اماں سے بے اماں تک

نیوز چینل آن کرتے ہی جو سب سے پہلی خبر سنائی دی اس کے مطابق کراچی دنیا کے دس خطرناک ترین شہروں میں شامل ہے۔ کراچی کے کسی بھی باسی کے لیے جو اس شہر کے خوف میں لپٹے شب وروز میں جیتا ہو یہ خبر نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ چوں کہ کراچی میں رہنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کن حالات میں جی رہا ہے، مگر اس کے لیے بھی یہ آگاہی کہ اس کا شہر دنیا کے خطرناک ترین شہروں میں شامل ہے، ایک بھیانک سچ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے اس شہر میں نہ جانے کتنے خاندان آباد ہیں جنھیں میری ہی طرح اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر کھائے جاتی ہے اور ان کی آنکھوں میں اپنے بچوں کے لیے ست رنگے سپنے سجے ہیں، لیکن اس شہر کے تلخ سے تلخ ہوتے ایام نے ان کے خوابوں کو ڈر کے تاریک سائے میں ڈھال دیا ہے۔

یہ شہر برسوں سے خوں ریزی اور تباہی و بربادی کے مناظر دیکھ رہا ہے۔ زبان کے نام پر ہونے والے فسادات کتنے ہی گھر اجاڑ چکے ہیں۔ کتنی ہی بار یہ ہوا ہے کہ اس شہر کے مختلف علاقوں میں آباد لوگوں کو اپنے آبائی مکانات اور برسوں پرانی رہائش گاہیں چھوڑ کر کسی اور بستی میں بسنا پڑا۔ کچھ عرصہ قبل اورنگی ٹاؤن سے نقل مکانی کے واقعات ہوئے اور اب لیاری کی سرزمین پر ہجرتوں کی

دردناک کہانیاں لکھی جارہی ہیں۔ میں یہ سوچ کر لرزاٹھتی ہوں کہ کہیں ایسا وقت نہ آجائے کہ مجھے اور میرے اہل خانہ کو بھی اپنا گھربار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑے۔

ہمارے ایک ساتھی صحافی، جو عراق کی جنگ میں صحافتی فرائض انجام دے چکے تھے، کراچی کے موجودہ حالات کے بارے میں ان کا تجزیہ کچھ یوں ہے، ''کراچی کے حالات کسی بھی ایسے ملک کے جیسے ہی ہیں جہاں جنگ ہورہی ہو۔'' قتل وغارت گری کے واقعات کی سنگینی، وحشت اور درندگی کے مظاہرے اور ان میں استعمال ہونے والا اسلحہ اس تجزیے کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ کچھ روز پہلے اخبار میں ایک تصویر شایع ہوئی، جس میں اسپتال میں زیرعلاج کچھ زخمی افراد دکھائے گئے تھے۔ اس تصویر کا کیپشن تھا کہ لیاری میں ''راکٹ لانچر'' سے زخمی ہونے والے افراد اسپتال میں زیرعلاج ہیں۔

یہ ہے میرا شہر، جہاں کلاشنکوف ہی ڈر نہیں بانٹتی۔ راکٹ لانچر اور بم بھی لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کیے ہوئے ہیں، جہاں کے پچانوے فی صد باسی اسٹریٹ کرائم کا شکار ہوچکے ہیں۔ بوری، جو بھوک مٹاتے اناج سے بھری، زندگی کی علامت ہے، اس بدنصیب شہر میں موت کی نشانی بن چکی ہے۔

یہ سب کیوں ہوا اور ہو رہا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ہمیں ان عوامل کا جائزہ لینا ہوگا جنھوں نے کراچی کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ ان عوامل میں سرفہرست آبادی کا دباؤ ہے۔ قیام پاکستان کے وقت چند لاکھ نفوس پر مشتمل اس چھوٹے سے شہر کی آبادی لاکھوں افراد کی ہجرت کے نتیجے میں راتوں رات کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ پاکستان کے اس سب سے بڑے صنعتی و تجارتی شہر کی طرف ملک بھر سے نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہا۔ یہی نہیں، دیگر ممالک کے تارکین وطن کی بہت بڑی تعداد نے بھی اس شہر کو اپنا مسکن بنایا، جن میں افغانی اور بنگلہ دیشی سرفہرست ہیں۔ آبادی میں یہ بے ہنگم اور تیزی سے ہونے والا اضافہ گنجان اور غیر منظم بستیوں کی آبادکاری کے ساتھ دیگر بہت سے مسائل کا سبب بھی بنا ہے۔ آبادی بڑھنے کے باعث وسائل کم ہو رہے ہیں اور مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ملک کے دوسرے شہروں اور دیہات سے کراچی آنے والوں کے روزگار، رہائش اور دیگر متعلقہ مسائل سے کیسے نبرد آزما ہوا جائے؟ یہ ذمے داری کوئی ادارہ قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا اس صورت حال نے رہائش کے مسئلے کو سنگین کر دیا ہے، اور لاکھوں خاندان ڈربے جیسے چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

آبادی بڑھنے اور وسائل گھٹنے کے عمل نے جو سب سے بڑا مسئلہ پیدا کیا وہ ہے بے روزگاری۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کراچی کو آبادی کے لحاظ سے روزگار کے

مواقع فراہم کیے جاتے، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ نجی شعبہ روزگار کی فراہمی کا فریضہ کسی نہ کسی طور ادا کرتا رہا ہے، لیکن بجلی کے بحران کی وجہ سے کتنے ہی کارخانوں پر تالے پڑ چکے ہیں۔ پھر لیاری جیسے علاقے میں حالات خراب ہوں تو اس بستی کے افراد روزگار کے لیے شہر کے مرکزی علاقوں میں کس طرح جائیں؟

چناں چہ ان کا روزگار چھن جاتا ہے۔ یہ وہ وجوہات ہیں جو جرائم کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ بے روزگاری، رہائش کے نامناسب حالات، بدامنی کے باعث ہونے والے مصائب، ان سب نے شہریوں کو مجموعی طور پر اور یہاں بسنے والے مختلف طبقات کو نفسیاتی امراض اور احساس کم تری میں مبتلا کر دیا ہے۔ خاص کر جوش وجذبات سے بھرے نوجوانوں کو احساس کمتری جرائم کی طرف مائل کرتا ہے، یوں جرائم پیشہ گروہوں کو نیا خون ملتا رہتا ہے۔

سندھ اور اربن علاقوں سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعتیں چاہتیں تو ان مسائل پر قابو پا کر کراچی میں امن وامان کی صورت حال بہتر بنا سکتی تھیں، مگر ان کے رہ نماؤں کی سیاسی حکمت عملی'' تو یہ ہوتی ہے کہ درجنوں معصوم جانیں ضایع ہونے کے بعد یہ '' رہنما مذاکرات کے نام پہ شہر کی ایک فوڈ اسٹریٹ پر نہاری کھاتے نظر آتے ہیں۔ پھر ان خاندانوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا جن کو اپنی جماعت سے وفاداری کے باعث مخالفین سے موت کے تحفہ ملتے ہیں۔

گمبھیر ہوتے ان مسائل کا سادہ سا حل یہ تھا کہ صوبائی حکومتیں ملک بھر سے کراچی کی طرف آبادی کے انخلاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے کراچی کی بڑھتی آبادی کے لیے روزگار سمیت وسائل بڑھانے کی منصوبہ بندی کرتیں، لیکن اس معاملے پر کوئی توجہ نہ دی گئی اور اس عدم توجہی کے بھیانک نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔

اہل سیاست کی اس روش کے باعث یوں تو پورا شہر ہی ہر قسم کے جرائم پیشہ افراد کی زد میں ہے اور شہریوں کے لیے کوئی جائے امان نہیں، مگر کراچی کا قدیم علاقہ لیاری تو بدامنی اور خوف ودہشت کی مثال بن چکا ہے۔لیاری کو پچھلے سات سالوں سے دہشت گردی کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اس طرح کے حالات اور اتنی بڑی تعداد میں نقل مکانی کراچی کے شائد ہی کسی علاقے سے ہوئی ہو۔لیاری میں دہشت گردی اور بدامنی سے تنگ آکر بدین پہنچنے والے بچوں کی تعلیم بھی تباہی کے دہانے پہنچ گئی ہے۔ اس حوالے سے کچھی برادری کا کہنا ہے کہ ہمیں ایک سازش کے تحت نشانہ بنایا جارہا ہے بلوچوں سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں بلوچ ہمارے ساتھ کھڑے ہیں۔ہمارے لوگوں کو شہید کیا گیااور سیکڑوں کی تعداد میں ہمارے لوگ نقل مکانی کرچکے ہیں۔

ایسے میں وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کی طرف سے لیاری میں گینگ وار کے

باعث ہونے والی ہجرت کا نوٹس لیے جانا امید افزاء خبر ہے۔ ہفتہ 13 جولائی کو شایع ہونے والی اس خبر کے مطابق وزیر اعظم نے وفاقی سیکریٹری داخلہ اور آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل کو فوری طور پر کراچی پہنچنے کی ہدایت کرتے ہوئے ان سے کہا ہے کہ وہ صوبائی حکام اور دیگر اسٹیک ہولڈرز سے ملاقاتیں کرکے مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ دونوں افسران کو لیاری گینگ وار کے اصل حقائق وفاقی حکومت کے سامنے لانے، نقل مکانی روکنے اور مسئلے کے حل کے لیے سفارشات دینے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

جناب نواز شریف! آپ کے نوٹس لینے سے اتنا تو احساس ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی حکومت قائم ہے۔ اب یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ اپنی ہدایات پر عمل کروائیں اور لیاری سمیت پورے کراچی کو امن کی سوغات دے دیں، یہ اس شہر پر آپ کا احسان ہوگا۔

# ہوشیار! فیس بک ''لائیک'' سارے بھید کھول دیتا ہے

کسی سوشل ویب سائٹ، جیسے فیس بک پر کسی پوسٹ یا اسٹیٹس کو ''لائیک'' کرنا بڑا معصوم سا فعل ہے۔

مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ سادہ اور معصوم سا ''لائیک'' آپ کی شخصیت اور زندگی کی ایسی تفصیلات بھی سامنے لاسکتا ہے جنھیں آپ کسی سے بیان کرنا نہ چاہتے ہوں۔

ہماری زندگی کی ایسی بہت سی حقیقتیں ہوتی ہیں جن پر ہم کم از کم کھلے عام بات نہیں کرتے جیسے ہماری خلوت کے معاملات، مذہبی اور سیاسی خیالات، ہم کتنے ذہین ہیں، ہم اپنے روزوشب سے کتنے خوش ہیں، ہم سماج میں معیوب سمجھی جانے والی کسی لت میں مبتلا ہیں، وغیرہ وغیرہ، مگر آپ کا لائیک پر ایک ہلکا سا کلک یہ سارے راز کھول سکتا ہے۔

حال ہی میں کیے جانے والے ایک تحقیقی مطالعے مطابق صرف کسی شخص کے فیس بک پر کیے جانے والے ''لائیکس'' کا تجزیہ کرکے اس یوزر کی حساس نوعیت کی خصوصیات اور اوصاف کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا ہے۔ کیمبرج یونی ورسٹی اور مائیکروسافٹ کے محققین کی مشترکہ تحقیق بتاتی ہے کہ فیس بک پر کیے جانے والے لائیک'' کا مخصوص رجحان جنسی کارکردگی، زندگی مطمئن ہونے، ذہانت، جذباتی'' ،توازن، مذہب، منشیات کے استعمال، تعلقات کی نوعیت، عمر، جنس

نسل، سیاسی نظریات سمیت لائیک کرنے والے یوزر کی شخصیت کے دیگر بہت سے پہلو سامنے لاسکتا ہے۔ یہ سب جاننے کے لیے لائیکس کی بڑی تعداد ضروری نہیں، بسااوقات صرف ایک لائیک آپ کی شخصیت پر سے پردے ہٹانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اس تحقیق کے مطابق خاص اشیاء اور کسی مخصوص نوعیت کی پوسٹ پر کیا جانے والا لائیک آپ کی شخصیت کوظاہر کرتا ہے۔ اس تحقیق میں شامل شخصی اوصاف اور لائیک کی گئی اشیاء وغیرہ سے انھیں پہچاننے کے لیے دی گئی طویل فہرست میں شام؛ صرف چند خصوصیات اور انھیں آشکار کرتی لائیک کی جانے والی اشیاء پیش ہیں :

اعلیٰ درجے کی ذہانت: کرلی فرائز (فرنچ فرائز کی ایک قسم)، سائنس، طوفان۔

کم درجے کی ذہانت : Harley Davidson (ایک امریکی موٹرسائیکل برانڈ)،

Lady Antebellum(ایک امریکی پوپ میوزک گروپ)، ''مجھے ایک ماں ہونے سے محبت ہے'' جیسی پوسٹس۔

زندگی سے مطمئن ہونا: Pride and Prejudice (فلم) اور انڈیاناجونز (فلم)

زندگی سے غیر مطمئن: آئی پوڈ، فیس بک کا Quote Portal ۔

جذباتی طور پر مستحکم: بزنس ایڈمنسٹریشن، اسکائی ڈائیونگ، ماؤنٹین بائیکنگ۔

اسی طرح آپ کا لائیک آپ کے رویے اور رجحانات کا پتا دیتے ہوئے آپ کے ان رازوں سے پردہ اٹھا دیتا ہے جنھیں آپ سب سے چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔

# مارے کرتا دھرتا ادھورے پاکستانی

جلتا ہے تو جلتا رہے، اس کے باسی مرتے ہوں تو مرتے رہیں، انھیں کیا، ان کی جیبیں بھری ہیں اور آگ کی تپش بھی انھیں چھو نہیں سکتی۔

یہ جلتا شہر میرا ملک پاکستان ہے، وہ لوگ جو آگ بجھا سکتے تھے، مگر انھوں نے جلتے مکانوں کو جلتا چھوڑا اور خود غرضی کی راہ پر گام زن ہو گئے، ہمارے سیاست داں ہیں، خطرے کی بو سونگھتے ہی دیارِ غیر پرواز کر جانا اور غیر ملکی دوروں پر روانہ ہو جانا جن کا چلن ہے۔

مسائل میں گھرے اور مصائب میں بتلا پاکستانی عوام آنکھوں میں امید سجائے سوالیہ نظروں سے حکم رانوں کو تکتے رہتے ہیں کہ ان کے منتخب نمایندے، چاہے وہ حکومت میں شامل ہوں یا نہ ہوں، ان کی دادرسی کے لیے ضرور آئیں گے۔ لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ سیکیوریٹی کی آڑ میں وہ زمین اور خاک نشینوں سے اس قدر دور رہتے ہیں کہ زمین ان کی قدم بوسی کے لیے ترس جاتی ہے۔ یہ کیسا مذاق ہے اس قوم کے ساتھ کہ اس کے لیڈر خود کو ملک سے باہر محفوظ اور ملک کے اندر غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔

ملک کی جگ ہنسائی ہوتی ہو تو ہوا کرے، لیکن ہمارے حکم رانوں کے لیے غیر ملکی سربراہان کی طرف سے ادا کیے جانے والے تسلی کے دو جملے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن میں عالمی میڈیا کے سامنے پاکستان میں امن وامان کی صورت حال پر اظہارِ افسوس کیا جاتا ہے۔

اقوامِ متحدہ میں معصوم بچی اپنی پیاری سی آواز میں خوب صورت انگریزی کے ساتھ تقریر کرتی نظر آتی ہے۔ اپنے ملک کی اس بہادر بیٹی کی تقریر سن کر ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس معصوم بچی نے پاکستان میں سیکیوریٹی کے مسائل، تعلیم کے فقدان، ظلم وزیادتی اور اپنے اوپر ہونے والے حملے کے بھیانک واقعے کا جس خوب صورت انداز میں تذکرہ کیا، وہ قابلِ ستائش ہے، لیکن کاش اس بچی کی تقریر لکھنے والوں نے دو لفظ ڈرون حملوں کے خلاف بھی شامل کردیے ہوتے، تو شاید دنیا بھر کے نمایندگان اقوام متحدہ کے ہال میں گونجتی اس میٹھی آواز کے توسط سے پاکستان کے شمالی علاقوں میں تقریباً ہر روز قیامت ڈھانے والے امریکی ڈرون حملوں پر بھی توجہ دیتے، جن کی وجہ سے کتنے ہی بچے جھلس چکے ہیں اور کتنے ہی گھرانے تباہ ہوگئے ہیں۔

پاکستان کے قبائلی علاقوں کے لوگوں کو امریکی ڈرون حملوں کی وجہ سے سیکیوریٹی کے مسائل کا سامنا ہے، لیکن ان بے چاروں کے پاس تو وسائل بھی

نہیں کہ وہ خود کو بچانے کی خاطر غیر ملکی دورے پر ہی چلے جائیں یا اپنے اور اپنے ڈرون حملوں سے متاثرہ بچوں کے علاج کے لیے غیر ملکی مدد مانگ لیں اور کسی محفوظ ملک میں سیاسی پناہ حاصل کرلیں۔

مگر صاحب، اس مسئلے پر کیوں بولا جاتا، جس ملک کی قیادت بھی ایسے معاملات پر سرگوشیوں میں احتجاج کرے اور چیخ چیخ کر اپنے ملک کو درپیش سیکیوریٹی کے خطرات کا رونا روئے۔

یہ سوچ کر عقل دنگ ہے کہ ہمارے سیاست داں تو وزیرستان میں نہیں رہتے کہ کسی بھی وقت ڈرون حملے کا خوف ہو، پھر وہ ملک سے باہر کیوں؟

غیر ملکی دورے کرنا حکومتی ذمے داریوں میں شامل ہے اور بعض اوقات یہ دورے سیاست کی بھی ضرورت قرار پاتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں تو یہ دورے اہل سیاست کے روزمرہ کا حصہ ہیں۔ علاج کروانا ہے تو بیرون ملک روانہ، اپنے دیس میں گرمی بڑھی تو ٹھنڈے ملکوں کی طرف سدھار گئے، ملک میں ذرا حالات خراب ہوئے اور ہمارے سیاست دانوں نے یورپ اور امریکا کی راہ لی۔ کوئی مستقل کسی اور ملک کو اپنی جائے سکونت بنالیتا ہے، تو کوئی برے وقتوں کے ماہ وسال پردیس میں گزار دیتا ہے۔

یہ سطور لکھے جانے کے وقت بھی کئی سیاسی شخصیات لندن میں ڈیرے جمائے ہوئے ہیں۔

ہمارے سیاست دانوں کے لیے پردیس جائے امان کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی نے وہاں مستقل رہائش گاہیں بنا رکھی ہیں، تو کوئی شہریت حاصل کرکے اپنا مستقبل ''محفوظ'' بنا چکا ہے تو کسی کا کاروبار بیرون ملک وسعت پذیر ہے۔ اور جہاں تک اکاؤنٹس کا تعلق ہے تو پاکستان کے کم ہی سیاست داں ہوں گے جن کا پیسہ سوئس بینکوں سمیت دیگر ممالک کے بینکوں میں محفوظ نہ ہو، ان کے بچے بیرون ملک تعلیم حاصل کرتے اور وہیں مستقبل سنوارتے ہیں۔

یہ ہماری سیاسی جماعتوں کے راہ نما ہیں، جو ہماری پارلیمنٹ میں منتخب ہو کر ہماری قسمت کے فیصلے کرتے ہیں، بہ طور حکم راں ان کے ہاتھ میں ہمارا حال اور مستقبل ہوتا ہے، یہ ہمارے ملک کے کرتا دھرتا ہیں، مگر یہ اپنی سرزمین پر اور اپنے عوام میں خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، حالاں کہ اس ملک کو محفوظ بنانا ان ہی کا کام ہے۔ کیسی دل ہلا دینے والی حقیقت ہے، ہمارے ملک کے کرتا دھرتا وہ لوگ ہیں جن کے مفادات اور وفاداریاں پاکستان اور کسی اور ملک میں بٹی ہوئی ہیں، جو اپنا اور اپنے خاندانوں کا مستقبل اس خدشے کی بنا پر

بیرون ملک محفوظ بنا چکے ہیں کہ نہ جانے اس ملک کا کیا حال ہونا ہے۔ ہم پاکستانیوں کی قسمت کے فیصلے کرنے والے ادھورے پاکستانی ہیں، کتنی خوف ناک حقیقت ہے۔

# فرقہ واریت سے پاک مسجد

پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا سیاسی اتحاد "متحدہ مجلس عمل" ہر اس پاکستانی مسلمان کے لیے امُید افزاء تھا جو امُت مسلمہ میں اتحاد واتفاق دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اسی اُمنگ کے ساتھ میں بھی مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے ایک عام کارکن کی حیثیت سے متحرک تھی۔ بلدیاتی انتخابات میں، میں مجلس عمل کے پولنگ ایجنٹ کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ انتخابی عمل کی شروعات سے پولنگ کے دن تک مختلف مسالک کی جماعتوں کے راہ نماؤں اور کارکنان کو شانے سے شانہ ملائے مہم چلاتے اور مجلس عمل کی کامیابی کے لیے سرگرم دیکھنا میرے لیے ایک خوش کُن نظارہ تھا، مگر مجلس عمل کے قائدین کی بابت ایک خیال بار بار دل کو بے کل کر دیتا تھا، "یہ علماء جو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے پر راضی نہیں ہوتے، اگر برسراقتدار آ گئے تو ہم آہنگی کے ساتھ ملک کا نظام کیسے چلا پائیں گے۔"

سیاست اور مذہب کو الگ خانوں میں رکھنے والوں کے لیے یہ سوال اور خیال اہمیت نہ رکھتا ہو، مگر سیاست کو دین کا جزو سمجھنے والا کوئی شخص اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ نماز محض ایک عبادت نہیں، یہ مسلمانوں کے لیے

زندگی کے میدان کی تربیت بھی ہے۔ مکمل ہم آہنگی، کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا، نظم و ضبط، ایک امام کی اقتدا میں نیت باندھنے سے سلام پھیرنے تک امام کی پیروی.... یہ سب عملی زندگی میں امت کو یک جان رکھنے ہی کی تربیت ہے، مگر ہم نے اس تربیت گاہ کو ہی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کرلیا ہے۔ اس تقسیم کا ایک خوف ناک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ہاں اکثر مساجد امت میں یک جائی پیدا کرنے کے مراکز کے بجائے مسالک اور فرقوں کا مرکز بن چکی ہیں۔

بعض حضرات افسوس کرتے اور شکوہ سُنجاں نظر آتے ہیں کہ آج کے پاکستانی مسلمان دین سے دور ہوگئے ہیں یا ان پر محراب و منبر کے وہ اثرات نہیں رہے جو پہلے تھے۔ ایسا نہیں ہے۔ آج بھی پاکستان کے مسلمان دل و جان سے مذہب کی طرف مائل ہیں۔ مسجد کے میناروں سے ابھرتی آواز اور مسند سے ملنے والا درس انھیں متاثر کرتا ہے۔ اب یہ اس آواز اور درس پر ہے کہ وہ اپنا کیا تاثر قائم کر رہے ہیں۔ اکثر مسجد میں قدم رکھتے ہی نمازیوں کو اختلافی مسائل پر انتہا پسندانہ رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "ایسا کرو"، "ایسا نہ کرو" کا حکمیہ لہجہ خصوصاً نوجوانوں کو مسجد اور نماز سے دور کر دیتا ہے۔ اگر محراب و منبر کو صحیح طرح استعمال کیا جائے تو نہ صرف فرقہ واریت کے مسئلے سے نجات پائی جا سکتی ہے بل کہ اخلاقی تربیت اور تزکیہ کا کام بھی بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم رفع یدین کرنے یا نہ کرنے اور تراویح کی رکعتوں کی تعداد پر اختلاف کو بنیاد بناتے ہوئے ایک دوسرے کو اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ فقہی اختلافات اور ایسے معاملات جن کا اسلام کی عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں، کی بنا پر ایک دوسرے کو کافر قرار دے دیا جاتا اور مختلف مسالک سے وابستہ لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتا ہے۔

مساجد کی ملکیت اور گلی محلوں میں ہونے والی سر پھٹول سے بڑھ کر اب فرقہ واریت امت مسلمہ کے لیے ماضی کے مقابلے میں کہیں خوف ناک ہو چکی ہے۔ فرقہ واریت کو اسلام دشمن قوتیں اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔ اس ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے سیدھی سادی سیاسی اور جمہوری تحریک یا غیر ملکی طاقت کے غلبے کے خلاف جدوجہد کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتا ہے۔ یہی کچھ عراق میں ہوا اور یہی شام میں ہو رہا ہے۔ شام میں بشار حکومت کے ہاتھوں معصوم عوام کا قتل عام ہو یا پاکستان میں انتہاپسندوں کی وحشیانہ کارروائیوں میں ہزارہ کمیونٹی سمیت اہل تشیع افراد کی جانوں کا ضیاع، یہ سب یکساں طور پر قابل مذمت ہے۔ شام کی سرزمین پر صحابی رسولؐ، نبی کریم ﷺ سے سیف اللہ کا لقب پانے والے سیدنا خالد بن ولیدؓ کے مزار پر شیلنگ ہو یا مزاحمت کی علامت بی بی زینبؓ کے مزار پر راکٹوں سے حملہ، یہ مکروہ افعال

پوری امت مسلمہ کے دل کو خون رلا گئے، کہ یہ سب کرنے والے غیر نہیں اپنے ہیں۔ مگر ایسے واقعات پر بھی ہم فرقہ وارانہ لائنوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ چلن برقرار رہا تو یہود و نصاریٰ کو ہمارے خلاف کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، ہم اپنے ہاتھوں خود مٹ جائیں گے۔

فرقہ واریت کس طرح ہمارے قلب و نظر کو متاثر کر چکی ہے، اس کا اندازہ مجھے گذشتہ دنوں اس وقت ہوا جب خانہ جنگی کے شکار ایک ملک میں ہونے والے مظالم کے بارے میں میرا کالم شایع ہوا، جس پر ای میلز اور فیس بک پر کمنٹس کی صورت میں آنے والا بعض لوگوں کا ردعمل یہ ظاہر کر رہا تھا کہ انھوں نے اس تحریر کو فرقہ وارانہ تناظر میں دیکھا اور پرکھا ہے۔

اس سب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فرقہ واریت امت مسلمہ کے لیے خطرناک ترین مسئلہ بنتی جارہی ہے۔ تاہم، صورت حال مایوس کُن نہیں، آج بھی پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت فرقہ پرستی کے خلاف ہے، جو اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے مسالک کے احترام کا رجحان رکھتی ہے۔ بس محراب و منبر سے فرقہ واریت کے خلاف، فقہی اختلافات کی روح کو سمجھنے اور برداشت کا درس دیتی آوازیں ایک آہنگ میں اٹھنے لگیں تو فرقہ پرست مات کھا جائیں گے۔ اور اگر مساجد کے دروازے پر مسلکوں کے نام کندہ ہونے کے بہ جائے ان میں تمام مسالک کے مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہونے لگیں، تو فرقوں کے نام پر جنگ وجدال کرنے والوں کو

ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔

اور آج کے مایوس کن حالات میں بھی دین اور امت مسلمہ کا درد رکھنے والے کچھ لوگ اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اسلام آباد کے ایک تاجر زاہد اقبال بھی ان میں سے ایک ہیں۔ ایک چینل کی خبر کے مطابق زاہد اقبال نے وفاقی دارالحکومت کے علاقے ای الیون میں مقامی لوگوں کی مدد سے ایک مسجد تعمیر کی ہے، جہاں تمام مسالک کے مسلمان ایک ہی امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مسجد کی پیشانی پر نہ کسی مسلک کی چھاپ ہے نہ کسی فرقے کا نشان۔ مسجدِ قرطبہ کے نام سے بنائے جانے والے اللہ کے اس گھر کے امام قاری جہانگیر اور خطیب زاہد اقبال الگ الگ مسالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ خطبۂ جمعہ اور دیگر نمازوں کے خطبوں میں لوگوں کو فرقہ واریت کے خاتمے اور اتحاد کی تلقین کی جاتی ہے۔ مسجد کے تہہ خانے میں ایک لائبریری بھی بنائی گئی ہے، جس میں تین کروڑ روپے مالیت کی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے جب زاہد اقبال صاحب نے کوششیں شروع کیں تو اسلام آباد کی انتظامیہ سے انھیں یہ ہمت شکن جواب ملا کہ "فرقہ واریت سے پاک کوئی مسجد سرکاری کھاتے میں رجسٹر نہیں ہو سکتی۔" چناں چہ زاہد اقبال کو قانونی موشگافیوں کا سہارا لیتے ہوئے پہلے الکتاب ٹرسٹ قائم کرنا پڑا جس کے تحت مسجد قرطبہ قائم ہوئی اور اس کا اندراج ہوا۔

کاش ایسی کوششیں ملک کے ہر شہر ہر محلے میں ہوں۔ جگہ جگہ ایسی مساجد قائم ہوں جن کی بنیاد تقویٰ اور مسلمانوں میں اتحاد کی آرزو پر رکھی گئی ہو، نہ کہ کسی فرقے اور مسلک پر۔ یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

# ہوشیار! فیس بک ''لائیک'' سارے بھید کھول دیتا ہے

کسی سوشل ویب سائٹ، جیسے فیس بک پر کسی پوسٹ یا اسٹیٹس کو ''لائیک'' کرنا بڑا معصوم سا فعل ہے۔

مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ سادہ اور معصوم سا ''لائیک'' آپ کی شخصیت اور زندگی کی ایسی تفصیلات بھی سامنے لاسکتا ہے جنھیں آپ کسی سے بیان کرنا نہ چاہتے ہوں۔ ہماری زندگی کی ایسی بہت سی حقیقتیں ہوتی ہیں جن پر ہم کم از کم کھلے عام بات نہیں کرتے جیسے ہماری خلوت کے معاملات، مذہبی اور سیاسی خیالات، ہم کتنے ذہین ہیں، ہم اپنے روزوشب سے کتنے خوش ہیں، ہم سماج میں معیوب سمجھی جانے والی کسی لت میں مبتلا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ مگر آپ کا لائیک پر ایک ہلکا سا کلک یہ سارے راز کھول سکتا ہے۔

حال ہی میں کیے جانے والے ایک تحقیقی مطالعے مطابق صرف کسی شخص کے فیس بک پر کیے جانے والے ''لائیکس'' کا تجزیہ کرکے اس یوزر کی حساس نوعیت کی خصوصیات اور اوصاف کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا ہے۔ کیمبرج یونی ورسٹی اور مائیکروسافٹ کے محققین کی مشترکہ تحقیق بتاتی ہے کہ فیس بک پر کیے جانے والے ''لائیک'' کا مخصوص رجحان جنسی کارکردگی، زندگی مطمئن ہونے، ذہانت، جذباتی توازن، مذہب، منشیات کے استعمال، تعلقات کی نوعیت، عمر، جنس،

نسل، سیاسی نظریات سمیت لائیک کرنے والے یوزر کی شخصیت کے دیگر بہت سے پہلو سامنے لاسکتا ہے۔ یہ سب جاننے کے لیے لائیکس کی بڑی تعداد ضروری نہیں، بسااوقات صرف ایک لائیک آپ کی شخصیت پر سے پردے ہٹانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اس تحقیق کے مطابق خاص اشیاء اور کسی مخصوص نوعیت کی پوسٹ پر کیا جانے والا لائیک آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس تحقیق میں شامل شخصی اوصاف اور لائیک کی گئی اشیاء وغیرہ سے انھیں پہچاننے کے لیے دی گئی طویل فہرست میں شام؛ صرف چند خصوصیات اور انھیں آشکار کرتی لائیک کی جانے والی اشیاء پیش ہیں:

اعلیٰ درجے کی ذہانت: کرلی فرائز (فرنچ فرائز کی ایک قسم)، سائنس، طوفان۔

کم درجے کی ذہانت: Harley Davidson (ایک امریکی موٹرسائیکل برانڈ)، Lady Antebellum (ایک امریکی پوپ میوزک گروپ)، ''مجھے ایک ماں ہونے سے محبت ہے'' جیسی پوسٹس۔

زندگی سے مطمئن ہونا: پیراکی، Pride and Prejudice (فلم) اور انڈیانا جونز (فلم)

زندگی سے غیر مطمئن: آئی پوڈ، فیس بک کا Quote Portal۔

جذباتی طور پر مستحکم: بزنس ایڈمنسٹریشن، اسکائی ڈائیونگ، ماؤنٹین بائیکنگ۔

اسی طرح آپ کا لائیک آپ کے رویے اور رجحانات کا پتا دیتے ہوئے آپ کے ان رازوں سے پردہ اٹھا دیتا ہے جنھیں آپ سب سے چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔

# ایف بی کے یوزر بہت جلد ''ڈس لائیک'' آپشن استعمال کر سکیں گے

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ فیس بک کے استعمال کرنے والے اب تک ایک اہم آپشن سے محروم رہے ہیں، اور یہ آپشن ہے ''ڈس لائیک'' بٹن (Dislike)۔
اگر آپ فیس بک کے یوزر ہیں تو آپ کی نگاہوں کے سامنے یا آپ کے پیج پر جتنی پوسٹس وغیرہ آتی ہیں، ان میں سے کسی کو آپ لائیک کرتے ہیں تو کسی کو نظر انداز کردیتے ہیں، مگر کچھ پوسٹس ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر کوئی کمنٹ کیے بغیر آپ انھیں ناپسندیدہ قرار دینا چاہتے ہیں، لیکن ایسا نہیں کرپاتے کیوں کہ اس ویب سائٹ پر یہ آپشن ہی موجود نہیں، لیکن بہت جلد فیس بک کے ایک بلین سے زاید ارکان کو اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے ایک آپشن مل جائے گا۔ فیس بک کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ جلد اس ویب سائٹ کا یوزر اپنی اس نوعیت کی رائے کا اظہار کرسکے گا کہ وہ اپنے کسی ہائی اسکول فرینڈ کی جانب سے پوسٹ کی جانے والی بچے کی کسی خاص تصویر کو کیوں پسند نہیں کرتے؟ یا اپنے کسی کالج کے دوست کی طرف سے سامنے لائی جانے والی کسی سیاسی پوسٹ کو کس بنا پر ناپسند کرتا ہے؟

اس سلسلے میں شایع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق فیس بک کے ایک ذمے دار کا کہنا ہے کہ آنے والے چند مہینوں کے اندر آپ ہماری ویب سائٹ پر لوگوں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں اظہار زیادہ واضح طور پر دیکھیں گے۔ مثال کے طور پر آپ کو اگر ایف بی پر پوسٹ یا شیئر کی جانے والی کوئی چیز ناگوار گزرے یا غیر دل چسپ لگے، تو آپ اپنا فیڈ بیک دے سکیں گے۔

تاہم ناپسندیدگی پر مبنی یہ رائے آپ صرف ایف بی تک پہنچا سکتے ہیں، اپنے دوست آپ کے لیے ناپسندیدہ تصویر یا تحریر پوسٹ یا شیئر کرنے والے) کو آپ کی اس رائے) سے آگاہی نہیں ہوسکے گی، یوں آپ کے تعلقات خراب نہیں ہوں گے۔

فیس بک پر ڈس لائیک کا آپشن نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ، ایف بی کے منتظمین کے مطابق، یہ ویب سائٹ صرف مثبت سرگرمیوں کو فروغ دینا چاہتی ہے۔ چناں چہ ناپسندیدگی کے اظہار کے ضمن میں سامنے آنے والی تجاویز رد کی جاتی رہی ہیں۔ تاہم فیس بک کی خواہش ہے کہ وہ یہ جان پائے کہ اس کے یوزرز کیا ناپسند کرتے ہیں اور کیوں؟ مگر اس ناپسندیدگی سے ان کے دوست واقف نہ ہو سکیں۔

یہ آپشن مہیا ہوجانے کے بعد ایف بی کے یوزرز کسی پوسٹ پر اپنی رائے ایف بی تک پہنچا سکیں گے اور انھیں یہ خطرہ بھی درپیش نہیں ہوگا کہ ان کی اس رائے

سے یہ تصویر یا تحریر پوسٹ یا شیئر کرنے والا ان کا دوست ناراض ہو جائے گا۔

## بگ" نے کردیے راز فاش'

فیس بک کی انتظامیہ نے کہا ہے کہ سوشل ویب سائٹ کے سسٹم میں آنے والے ایک بگ کے باعث ساٹھ لاکھ یوزرز کے ایسے کوائف جنھیں وہ ہر ایک کے سامنے نہیں لانا چاہتے، منکشف ہوگئے۔

فیس بک کے مطابق جو انفارمیشن بگ کی وجہ سے سامنے آئی اس میں یوزرز کے ای میل ایڈریسز اور فون نمبر شامل ہیں۔ بگ کی وجہ سے یہ معلومات ایسے یوزرز تک پہنچ گئیں جو بگ کا نشانہ بننے والے ایف بی اکاؤنٹ ہولڈر کی کچھ کنٹیکٹ انفارمیشن رکھتے تھے یا اس سے کسی بھی طرح مربوط تھے۔

ایف بی کا کہنا ہے کہ بگ کی یہ کارروائی خالصتاً تیکنیکی مسئلہ تھا، جس کے نتیجے میں صارفین کی انفارمیشن خود بہ خود ڈاؤن لوڈ ہوگئی۔

اس بگ کا نشانہ "Download Your Information" ٹول بنا، جس کے باعث اگر کسی نے اس ٹول کو استعمال کرتے ہوئے کسی اور یوزر کے آرکائیوز میں سے کچھ ڈاؤن لوڈ کیا تو، اس اکاؤنٹ سے مربوط دوسرے یوزرز کے ٹیلی فون نمبر اور ای میل ایڈریس بھی ساتھ ہی ڈاؤن لوڈ ہوگئے۔ فیس بک کی انتظامیہ نے کہا ہے کہ اب یہ

مسئلہ حل کرلیا گیا ہے

# فائل شیئرنگ: بڑے خطرات ہیں اس میں

کمپیوٹر کی دنیا میں فائل شیئرنگ ایک عام فہم لفظ ہے۔

دنیا بھر میں روزانہ لاکھوں لوگ ایک دوسرے کو بذریعہ انٹرنیٹ فائل بھیجتے اور وصول کرتے ہیں جب کہ ہر سال لاکھوں افراد غیر قانونی طور پر میوزک اور ویڈیو فائل ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں۔۔برطانوی اخبار دی گارجین کے مطابق رواں سال کے ابتدائی چھے ماہ میں صرف.برطانیہ میں ہی چار کروڑ تیس لاکھ سے زاید افراد نے غیر قانونی طور پر گانے ڈاؤن لوڈ کیے۔

لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ بنا کسی قیمت گانے، ویڈیو یا کسی بھی فائل کو ڈاؤن لوڈ کرنا بہت آسان اور بے ضرر کام ہے، لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہ ایک خطرناک عمل ہے اور آپ کی یہ خطرناک عادت آپ کے کمپیوٹر، فون اور نجی معلومات کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے اس کا اندازہ آپ کی سوچ سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہ خطرہ قانونی طور پر فائل ڈاؤن لوڈ کرنے کی نسبت غیر قانونی طریقے سے فائل ڈاؤن لوڈ کرنے والوں کے لیے زیادہ ہے۔

چند سال قبل ہونے والے ایک مطالعے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ ہونے والی بیس فی صد فائلز (قانونی اور غیر قانونی) میں کچھ اقسام کے مال ویئر (ایک قسم کا مُضر سوفٹ ویئر جو آپ کے کمپیوٹر کے نظام کو مفلوج کر دیتا ہے) شامل ہوتے ہیں۔ یہ مال ویئر آپ کے براؤزر کو ری ڈائریکٹ کرنے والے کوڈ پر بھی مشتمل ہو سکتے ہیں، جس سے آپ کسی ویب سائٹ کا ایڈریس لکھتے ہیں اور یہ مال ویئر آپ کو کسی اور ویب سائٹ پر لے جاتے ہیں۔

بعض اوقات یہ مال ویئر آپ کی ویب سائٹ پر اشتہارات اور وائرس کی بھرمار کر دیتے ہیں، جس کا نتیجہ آپ کے کمپیوٹر کو پہنچنے والے شدید نقصان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ تمام مال ویئر آپ کے کمپیوٹر سے تمام نجی معلومات (سوشل سیکیوریٹی نمبر، کریڈٹ کارڈ نمبرز، پاس ورڈز) چرا لیتے ہیں۔ یہ آپ کے آپریٹنگ سسٹم میں داخل ہو جاتے ہیں اور زیادہ تر لوگ اس بات سے لاعلم رہتے ہیں۔

اگر آپ غیر قانونی طور پر ڈاؤن لوڈ کے لیے بِٹ ٹورینٹ (BitTorrent) استعمال کر رہے ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اپنے کمپیوٹر کے دروازے ہیکرز اور وائرس کے لیے کھول دیے ہیں، جہاں سے وہ اپنی مطلوبہ معلومات چوری کر سکتے ہیں۔ ٹورینٹ ایپلی کیشن کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ وہ آپ کے علم میں

لائے بنا سیکیوریٹی فائر وال کھول دیتی ہیں۔

فائل شیئرنگ کے حوالے دو اہم پوائنٹ پر توجہ دینا ضروری ہے۔ پہلا یہ کہ جب آپ ٹورینٹ سے فائل رن کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے کمپیوٹر کی کارکردگی پر منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں، جس سے آپ کے کمپیوٹر کی بینڈ وتھ کم ہونے سے بیک اپ یور سسٹم" جیسی دوسری ایپلی کیشنز متاثر ہوتی ہیں۔ اگر آپ کسی کے ساتھ" انٹرنیٹ کنیکشن شئیر کر رہے ہیں تو صورت حال مزید بدتر ہو سکتی ہے۔ اور بہت سی ان دیکھی چیزیں آپ کے کمپیوٹر سے چوری ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی کمپنیوں نے نو فائل شیئرنگ" پالیسی اپنالی ہے اور فائل شئیر کرنے کی صورت میں صرف ڈانٹ" ڈپٹ ہی نہیں کی جاتی بل کہ نوکری سے بھی فارغ کر دیا جاتا ہے۔

اگر آپ غیر قانونی طور پر فائل شئیرنگ کر رہے ہیں تو آپ کا حال بھی بوسٹن یونیورسٹی کے سابق طالب علم جوئیل کی طرح ہو سکتا ہے جسے امریکی عدالت نے غیر قانونی طور پر تیس گانے ڈاؤن لوڈ کرنے اور شئیر کرنے کے الزام میں چھے لاکھ پچھتّر ہزار ڈالر جرمانہ ادا کرنے کی سزا سنائی تھی۔ اور یہ نہ بھی ہو تو مال ویئر کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اگر آپ فائل شئیرنگ کے گہرے سمندر میں غوطہ لگانے جا ہی رہے ہیں تو آپ کو اینٹی

وائرس کی لائف جیکٹس لازمی پہننا ہوں گی۔

# ٹوئٹر اور عالمی لیڈر

سوشل میڈیا رابطوں اور معلومات کے ایک ایسے جہان کے طور پر سامنے آیا ہے جسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

خاص طور پر سیاست داں اور حکم راں سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کو اہمیت دینے پر مجبور ہیں، کیوں کہ یہ سائٹس رائے عامہ بنانے اور تبدیلیاں لانے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ اس سلسلے میں تعلقات عامہ کی ایک بین الاقوامی فرم نے حال ہی میں ٹوئٹر پر موجود عالمی لیڈروں کے حوالے سے ایک مطالعے کا اہتمام کیا، جس کے اعداد و شمار کے مطابق امریکی صدر باراک اوباما ٹوئٹر پر سب سے زیادہ فالو کیے جانے والے عالمی لیڈر ہیں، تاہم وہ صرف 2 عالمی لیڈروں کو فالو کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اوباما کا اکاؤنٹ سب سے کم کنکٹ رہنے والے راہ نماؤں کے اکاؤنٹس میں شامل ہے۔

یہ مطالعہ بتاتا ہے کہ ٹوئٹر پر اکاؤنٹ رکھنے والے عالمی راہ نماؤں یا حکم رانوں میں سے 68 فی صد ٹوئٹر پر دیگر حکم رانوں سے رابطے میں رہتے ہیں۔ سویڈن کے وزیرِ خارجہ Carl Bildt اس معاملے میں سرفہرست ہیں، وہ اور ان کے

ہم منصب ایک دوسرے فالو کر رہے ہیں۔44

ٹوئٹر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی شخصیت کیتھولک مسیحیوں کے پیشوا پوپ فرانسس ہیں، جن کے اسپینش زبان کے اکاؤنٹ سے کیے جانے والے ہر ٹوئٹ کے جواب میں اوسطاً 11 ہزار 116 ری ٹوئٹ کیے جاتے ہیں، جب کہ ان کا انگریزی زبان میں قائم اکاؤنٹ اوسطاً 8 ہزار 219 ری ٹوئٹس فی ٹوئٹ وصول کرتا ہے۔ اس حوالے سر فہرست ہیں، جو فی ٹوئٹ Nicolás Maduro سے حکم رانوں میں وینزویلا کے صدر اوسطاً 4 ہزار 767 ری ٹوئٹ وصول کرتے ہیں۔

دنیا کے چھے راہ نما ایسے ہیں جن کا ایک ٹوئٹ دس ہزار مرتبہ ری ٹوئٹ کیا گیا، ان میں انڈونیشیا کے صدر سسیلو بمبانگ،، برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ، امریکی وزیرِخارجہ جان Nicolás Maduro وینزویلا کے صدر ،Shinzo Abe کیری، جاپان کے وزیراعظم اور فوج کے ہاتھوں برطرف ہونے والے مصر کے پہلے جمہوری صدر محمد مُرسی شامل ہیں۔

جہاں تک ٹوئٹر پر سب سے زیادہ متحرک ہونے کا تعلق ہے، تو اس معاملے میں بھی وینزویلین صدر بازی لے گئے ہیں۔ مذکورہ مطالعہ ہونے تک ٹوئٹر پر موجود تمام عالمی لیڈروں نے مجموعی طور پر 10 لاکھ 81 ہزار 728 ٹوئٹ کیے، وہیں وینزویلا

کے صدر نے تنِ تنہا 34 ہزار ٹوئٹ کرڈالے ہیں، یعنی اوسطاً یومیہ چالیس ٹوئٹس۔
ٹوئٹر پر متحرک ہونے میں امریکی محکمۂ خارجہ 29 ہزار 259 ٹوئٹس کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے۔

## سینٹرل جیل ڈیرہ اسمٰعیل خان پر حملہ، ریاست کہاں ہے؟

رات ابھی اپنی ابتدا میں ہے۔ گھڑی کی سوئی کو گیارہ کا ہندسہ پار کیے بیس منٹ سے اوپر ہو چکے ہیں۔ اچانک کوچوں اور درجنوں موٹر سائیکلوں کی آواز سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ اور پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دھماکوں کی گرج میں خوف کا ایک ایسا منظر تشکیل پاتا ہے جس کے سائے دراز ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پیر 29 جولائی اور منگل 30 جولائی کی درمیانی شب ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سینٹرل جیل پر ہونے والا حملہ پاکستان کے باسیوں کے بے اماں روز و شب کی ایک اور کہانی سنا گیا۔

بھاری ہتھیاروں، دستی بموں اور راکٹوں سے لیس ڈیڑھ سو افراد کا کوچوں اور درجنوں موٹر سائیکلوں پر مشتمل جلوس کی صورت سینٹرل جیل ڈی آئی خان پر ہلہ بولنا اور 248 قیدیوں کو چُھڑا کر لے جانا، ہر پاکستانی کے لیے ایک دہشت انگیز اور خوفناک واقعہ ہے۔ بھاری اسلحے اور گولا بارود سے لیس افراد کی اتنی بڑی تعداد گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر آنا اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرکے پوری شادکامی سے واپس چلے جانا ہمارے سیکیورٹی اداروں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگا گیا اور ان کی ساکھ مجروح کر گیا ہے۔

مگر جناب! کیسا سوالیہ نشان اور اور کیسی ساکھ، ایسا کوئی پہلی بار، تھوڑی

ہوا ہے، ایسے واقعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہمارا ملک برسوں سے دہشت گردی کا شکار ہے، سیکیوریٹی ہمارا اولین مسئلہ ہے، بدامنی ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بیماری ہے، لیکن ہم اس مسئلے کا حل نکالنا تو درکنار اس حوالے سے کوئی موثر منصوبہ بندی کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ اس سے پہلے گذشتہ سال پندرہ اپریل کو خیبر پختون خوا ہی کے شہر بنوں پر اسی نوعیت کا حملہ کیا گیا تھا اور حملہ آوروں نے اپنے ساتھیوں سے دیگر بہت سے قیدیوں کو فرار کرایا تھا۔ ایسے حملوں کا امکان پہلے بھی تھا اور ایسے واقعات آئندہ بھی متوقع ہیں، مگر بنوں کی جیل پر ہونے والے حملے سے ہمارے حکم رانوں اور امن وامان کی فراہمی پر مامور

اداروں نے کیا سبق سیکھا؟

اپنی کم زوریوں پر کتنی توجہ دی؟

جیلوں کی سیکیوریٹی کے لیے کیا اقدامات کیے گئے؟

اس طرح کی یلغار رکوانے کے لیے کیا منصوبہ بندی کی گئی؟

ان سب سوالات کا واضح اور مایوس کُن جواب ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سینٹرل جیل پر ہونے والے حملے کی صورت میں عوام کے سامنے آگیا ہے۔

ایک ایسی جیل جہاں ریاست اور ریاستی اداروں سے برسرپیکار اور خودکش حملوں

اور دہشت گردی میں ملوث گروہ سے وابستہ ملزمان قید ہوں، اس کی نگرانی اور حفاظت تو کسی اور مقام کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہتمام اور انتظام کی متقاضی ہے، لیکن اس جیل کی حساسیت کے تقاضے نہیں نبھائے گئے۔

اس واقعے سے متعلق یہ خبریں دل و دماغ کو اضطراب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں کہ متعلقہ اداروں کو اس حملے کی باقاعدہ اطلاع نہیں تو سُن گُن ضرور مل چکی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق خفیہ ایجنسیوں کی جانب سے ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سینٹرل جیل پر ہونے والے حملے کی جو رپورٹ وزیراعظم نواز شریف کو ارسال کی گئی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ وزارت داخلہ نے دہشت گردوں کے اس حملے سے متعلق بروقت وارننگ دی تھی۔ وارننگ کال ملنے پر خیبر پختون خوا کی صوبائی حکومت کے متعلقہ حکام نے جیل کا دورہ بھی کیا اور سیکیوریٹی انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد اس سلسلے میں اجلاس بھی ہوئے۔ اس سب کے باوجود دہشت گرد اپنے مقاصد میں کام یاب رہے اور انھیں بروقت وارننگ روک پائی، نہ دورے اور انتظامات ان کی راہ کا پتھر بن سکے۔

عسکریت پسند اور دہشت گرد اپنے گرفتار ساتھیوں کی رہائی، عوام کے دلوں پر اپنی دھاک بٹھانے اور حکومتی اداروں کی سبکی کے لیے ان جیلوں پر حملے کر سکتے ہیں جن میں ان کے ساتھی قید ہیں، اس حقیقت سے آشنائی اور آگاہی کے

لیے نہ افلاطونی عقل کی ضرورت ہے نہ کوئی "انٹیلیجنس" درکار ہے۔ دہشت گردی کے کسی ہونے والے واقعے کی اطلاع پا کر بھی اسے روک نہ پانا تو بہت بڑی ناکامی ہے، مگر ایسے واقعات کے سدباب کے لیے پیش بندی نہ کرنا خود ایک ناکامی ہے۔ اور یہ خبریں اور اطلاعات خوف اور اندیشوں کو مزید مہیب بنارہی ہیں کہ باقی حراستی مراکز کو تو چھوڑیے، جن جیلوں میں انتہائی مطلوب قرار پا کر گرفتار ہونے والے قیدی رکھے گئے ہیں، ان کے سیکیوریٹی انتظامات بھی ناقابل اعتماد ہیں۔ اس ضمن میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ کے مطابق ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سینٹرل جیل پر دہشت گردوں کی یلغار کے بعد حساس اداروں نے وزارت داخلہ کو جو رپورٹ بھیجی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اپریل2000 میں وفاقی حکومت نے چاروں صوبوں میں جیلوں کے حفاظتی انتظامات بہتر بنانے کا حکم دیا تھا، اس کے باوجود ملک کی کسی بھی جیل کے باہر کلوز سرکٹ کیمرے اور موبائل جیمرز نصب نہیں کیے گئے، جب کہ صرف چار جیلوں میں بم پروف بنکرز بنائے جاسکے ہیں۔ یہ رپورٹ کہتی ہے کہ جیلوں کے مرکزی دروازوں پر نصب کیمرے قیدیوں اور ان سے ملنے آنے والوں کو تو مانیٹر کر سکتے ہیں، مگر سو میٹر سے آگے کی مانیٹرنگ کے لیے یہ کیمرے ناکارہ ہیں۔

ایک ایسا ملک جو دہشت گردی کا عذاب تواتر سے جھیل رہا ہو، وہاں سیکیوریٹی کے انتظامات کے معاملے میں ایسی بے توجہی حیرت انگیز بھی ہے اور خوف ناک

بھی۔ یہ بے توجہی کس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے؟ کیا حکم رانوں اور متعلقہ اداروں میں صورت حال کا ادراک کرنے کی بھی صلاحیت نہیں، کیا جان بوجھ کر یہ بے اعتنائی برتی گئی اور برتی جارہی ہے؟ جواب جو بھی ہو، عام پاکستانی کے لیے یہ سب کچھ بہت دہشت ناک ہے۔ عدالت سے قیدیوں کے فرار سے جیل پر حملے تک ریاستی
اداروں کی ہر ناکامی عام پاکستانی کے دل میں اپنی جان، مال اور عزت وآبروسے متعلق خوف اور اندیشوں کو دوچند کرجاتی ہے۔ تحقیقات کا اعلان کرکے عوام کو دلاسہ دیا جاتا ہے، مگر پھر کوئی اگلا خوف ناک واقعہ پچھلے واقعے یاد اور
اس کی تحقیقات کو ذہنوں سے محو کردیتا ہے۔ کاش ہمارے حکم راں اور ادارے سینٹرل جیل ڈیرہ اسمٰعیل خان پر حملے جیسے واقعات کی روک تھام کے لیے پیش بندی کر سکیں اور ایسا کوئی واقعہ دوبارہ پیش نہ آئے، کہ ایسے واقعات اداروں کی ناکامی کے ساتھ یہ سوال بھی سامنے لے آتے ہیں کہ ریاست کہاں ہے؟؟؟

# نشے میں ڈوبے وہ کم سن بچے

رات کے تین بجے میری گاڑی کراچی کے علاقے ایف بی ایریا کے ایک چوک سے ٹرن ہوئی، وہاں ایک ایسا منظر دیکھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئی۔ اس چوراہے پر اچھی خاصی روشنی ہوتی ہے، جس میں یہ منظر اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ میں نے گاڑی ایک طرف کی اور انھیں دیکھنے لگی جو میری حیرت کی وجہ بنے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ بچے، جن کی عمریں چھے سے پندرہ سال کے درمیان تھیں، عجیب مدہوش حالت میں گرتے پھر کھڑے ہو جاتے۔ کوئی بچہ لڑپڑتا، کوئی دوسرے پر چیخنے لگتا، کوئی اپنے ساتھی کو مارنے کے لیے دوڑتا، لیکن ہاتھوں میں جان ہی نہ ہوتی کہ وار نشانے پر لگتا۔ میں نے بہ غور ان کے چہروں کو دیکھنا چاہا۔ ان میں سے کچھ بچے تو وہی جانے پہچانے چہرے تھے، جو روز میری گاڑی کے سامنے شیشہ صاف کرنے کے لیے دوڑ کر سگنل پر آ جاتے ہیں۔ اپنے بھائی سے معاملہ دریافت کرنے پر حقیقت یہ سامنے آئی کہ یہ سب بچے نشئی ہیں۔ یہ ان کے روز کا معمول ہے۔ گاڑیوں کے شیشے صاف کرنا اور بھیک مانگنے کے بعد جو رقم ان کو ملتی ہے وہ اس سے ہیروئن خریدتے ہیں۔

یہ کیسی دل دہلا دینے والی حقیقت ہے کہ یہ معصوم بچے نشے جیسی لت کا شکار

ہو کر سڑکوں پر بے یارومددگار بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک بات جو مجھے حیرت میں مبتلا کیے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ جہاں یہ بچے بیٹھے کھلے عام نشہ کر رہے تھے، وہاں بالکل سامنے پولیس کی ایک چوکی قائم ہے اور یہاں رینجرز کی گاڑیاں چوبیس گھنٹے موجود ہوتی ہیں، لیکن قانون کے رکھوالوں کی توجہ سے یہ بچے محروم تھے۔

یہ منظر میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا، بہت سے سوالات اور خیالات کے ساتھ۔

نشہ انسانی زندگی میں سرور یا حقائق سے فرار بن کر داخل ہوتا ہے اور پھر انسان کو اپنا محتاج بنا کر کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ اپنی ہی دنیا میں مگن ان لوگوں کو نہ حال کی فکر ہوتی ہے نہ مستقبل کی۔ ان کی خواہش، ضرورت اور مجبوری سب کا ایک ہی نام ہے، نشہ۔

اور نشہ اگر ہیروئن کا ہو تو نشئی کہیں کا نہیں رہتا۔ کسی کو ایک بار یہ لت لگ جائے تو اسے چھوڑنا مشکل ترین جنگ سے کم نہیں۔ یہ لت جسم کے ساتھ ساتھ عزت نفس اور غیرت سمیت ہر مثبت انسانی وصف کھا جاتی ہے۔ نشے کی طلب میں ٹوٹتا چٹختا جسم کسی بھی قیمت پر نشہ طلب کرتا ہے، اور یہ طلب کبھی باپ کی جمع پونجی پر ہاتھ صاف کرکے پوری کی جاتی ہے تو کبھی ماں کے کنگن چُرا کر، اور کبھی بہن کے جہیز کے لیے رکھا زیور بھی دھوئیں کی نذر کردیا جاتا ہے۔

ہر حس کو مفلوج کرتا اور ہر قدر کی جان لیتا نشے کا رجحان پاکستان میں کس قدر تیزی سے فروغ پذیر ہے اس کا اندازہ گلی کوچوں اور سڑکوں سے سے قبرستانوں اور ویرانوں تک پھیلے ایسے مناظر سے بہ آسانہ لگایا جاسکتا ہے جیسا میرے ذہن پر نقش ہے۔ حال ہی میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت پاکستانیوں کا تقریباً 5.8 فی صد مختلف منشیات استعمال کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں لگ بھگ 6.4 ملین افراد اس

ات کا شکار ہیں، گویا ہر 27 پاکستانیوں میں سے ایک منشیات کا عادی ہے۔ ان اعداد وشمار میں ایک خوف ناک حقیقت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں سے پچیس فی صد کے قریب کسی نہ کسی نشے کے عادی ہیں۔

منشیات کی لعنت اپنے استعمال کرنے والوں ہی کو متاثر نہیں کر رہی بل کہ اس کے اثرات اور طرح بھی معاشرے پر مرتب ہو رہے ہیں۔ نشہ کرنے والوں میں استعمال شدہ سرنجز کے ذریعے نشہ کرنے اور دیگر وجوہات کی بنا پر ایڈز جیسا لاعلاج مرض بھی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ نشے سے جنم لینے والی دیوانگی بھی مختلف افسوس ناک واقعات کی صورت میں اپنے جلوے دکھاتی رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل کراچی کے ایک پوش علاقے میں ہونے والی قتل کی واردات کی بابت سامنے آنے والے حقائق بتاتے ہیں کہ اس گھر میں رہائش پذیر لوگ اور مہمان آنے والا ایک جوڑا ہیروئن سے بنیں ٹیبلٹس کھائے ہوئے تھے اور نشے کی حالت ہی اس قتل کا

سبب بنی۔ اس واقعے سے مزید تلخ حقیقتیں بھی سامنے آئیں، جیسے ہیروئن سے بنی یہ ٹیبلٹس، جنھیں آرڈر ملنے پر تیار کنندہ کمپنی کے اہل کار آرڈر دینے والے کے گھر پر ڈیلیور کرنے جاتے ہیں اور جس کی مالیت پندرہ سو روپے فی ٹیبلٹ ہے۔ یعنی یہ اتنا ہی آسان ہے جیسے پیزا کا آرڈر دینا۔ کیا یہ کیپسول کوئی رجسٹرڈ فارماسیوٹیکل کمپنی بنا رہی ہے؟ اگر نہیں تو یہ کہاں تیار ہو رہے ہیں؟ یہ اور اس جیسے کتنے ہی سوالات اس معاملے سے جُڑے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے میڈیا پر ملک میں پھیلتی منشیات کے بڑے چرچے تھے۔ خبروں سے لے کر آرٹیکلز، فیچرز اور کالموں تک یہ مسئلہ تواتر سے جگہ پاتا اور زیر بحث رہتا تھا، مگر دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ، بجلی کے بحران، گیس کی قلت اور سیاسی اتار چڑھاؤ نے ہمارے رگ و ریشے میں زہر اتارتے اس مسئلے کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔

اس معاملے میں پولیس کی کارکردگی نشہ کرنے والے بے یار و مددگار افراد کو پکڑ کر تھانے میں بند کرنے سے آگے شاید ہی بڑھ پاتی ہے۔ ہیروئن سمیت تمام منشیات اپنے راستوں سے ہوتی ہوئی منزلِ مراد پاتی ہیں اور ہمارے قانون نافذ کرنے والوں کی رکاوٹیں اور چوکیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ ہزاروں افراد خاص کر نوجوانوں کی زندگیاں نگل جانے والی ہیروئن اور دیگر منشیات گذشتہ

عشرے کے دوران ہمارے تعلیمی اداروں کا بھی رخ کر چکی ہیں، جہاں طلبہ ہی نہیں طالبات بھی اس لت کا شکار ہو رہی ہیں، مگر کوئی اس خوف ناک مسئلے کی طرف توجہ دینے کو تیار نہیں۔

نشہ کرنے والے کی زندگی تو جہنم بن ہی جاتی ہے اس کے ساتھ اس کے اہل خانہ کی زندگیاں بھی جلتی سلگتی رہتی ہیں۔ اپنے پیارے کو اس عذاب سے نکالنے کے لیے انھیں بحالی کے مراکز کا سہارا ہوتا ہے، مگر پورے ملک میں ان مراکز کی تعداد 100 سے بھی کم ہے۔ حکومت اگر خود منشیات استعمال کرنے والوں کو اس لت سے نجات دلانے کے مراکز قائم کرنے سے قاصر ہے تو اسے ایسے اداروں کی مالی مدد کرنی چاہیے۔

منشیات کا پھیلاؤ روکنے اور اس لت میں مبتلا افراد کی بحالی کے لیے حکومت کو جامع حکمت عملی وضع کرنی ہوگی اور ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے۔ ورنہ روشن چورنگی پر پولیس چوکی کے سامنے نشے میں ڈوبے کم سن بچے ہماری آنکھوں کا منظر بنے رہے ہیں گے۔

## موت ! بر حق ہے، لیکن، یہ قتل ہے معصوم جانوں کا

عید آئی اور گزر گئی مسلمانوں کا مذہبی تہوار، وہ دن جب روزہ دار کو اللہ رب العزت کی طرف سے انعام سے نوازا جاتا ہے۔ خوشیوں بھرا دن۔ لیکن دل تو رو رہا ہے نہ جانے کیا غم ہے کہ خوشیوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

چاند رات کو اپنی بیٹیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہناتے ہوئے مجھے کراچی میں ہونے والی بارشوں میں اپنی جان سے ہاتھ دھونے والے مظفر کی بیوی یاسمین کی صورت نظر آئی۔ کتنا معصوم چہرہ تھا اس پیاری سی لڑکی کا۔ وہ بھی تو اپنے ہاتھوں کو سجانے کے لیے چوڑیاں لینے نکلی تھی۔ اس نے بھی ویسے ہی اپنے ڈیڑھ سال کے بچے کے لیے نماز کی چھوٹی سی ٹوپی خریدی ہوگی، جیسی میں نے اپنے بیٹے کے لیے خریدنا چاہی۔ وہ بھی اپنے شوہر سے کپڑوں کی پسند نہ پسند پر ایسے ہی ناراض ہوتی ہوگی جیسے میں اپنے شریک حیات سے ہوتی ہوں۔ لیکن آج نہ یاسمین ہے نہ اس کا جیون ساتھی مظفر نہ ان کا پیارا سا بیٹا۔ سب اس دھوکے سے بھری دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔

عید ہے لیکن یہ چہرہ یاسیت کی داستانیں سُنا رہا ہے۔ خوشی مر گئی۔

موت بر حق ہے، مگر ایسی موت جو قتل ہے معصوم جانوں کا!

میرے بچوں نے عید کے دن غبارے خریدے۔ رنگ.برنگے.بڑے.بڑے غبارے۔ وہ اچھلتے کودتے ''ماما ماما'' کہتے میرے سینے سے آ لگے، مجھے عید کی مبارک کہنے۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان ماؤں کا کیا حال ہوگا جن کی نگاہیں اپنے بچوں کو تلاش کرتی ہوں گی، جو بارش میں آنے والے سیلابی ریلے کی نذر ہوگئے، اور ہم بے حسی سے تماشا دیکھتے رہ گئے۔

میرے بیٹے نے اپنے ننھے ننھے پیروں میں نئی چپل پہنی تو مجھے لیاری میں ہونے والے بم دھماکے کے بعد اِدھر اُدھر بکھری معصوم بچوں کی چھوٹی چھوٹی جوتیاں نظر آئیں۔ ان معصوموں کے خون کے نشان دل کو خون رُلا گئے۔ یہ بچے اپنی ماؤں سے ضد کرکے رات کو ہونے والا فٹبال میچ دیکھنے گئے تھے، اور پھر گھر کو واپس نہ آسکے۔ کیا قیامت ہوگی اس عید پر ان کے گھروں میں۔ کوئی بچہ اپنے باپ سے محروم ہوگیا اور کوئی باپ اپنے پیارے بیٹے سے، وہی بیٹا جو کچھ دیر پہلے لیاری کے لوگوں کا من پسند کھیل فٹبال دیکھنے گیا تھا۔ کیسا زندگی سے بھرپور منظر تھا۔ بچے بگل بجارہے تھے،تالیاں پیٹ رہے تھے کہ ایک دھماکا ہوا اور سب ختم۔

موت ! .برحق ہے، لیکن، یہ قتل ہے معصوم جانوں کا۔

ایک لمحے کے لیے سوچیئے! ہم اپنے خاندان کے ساتھ عید کی تیاری کرنے نکلیں اور پھر کبھی گھر کو لوٹ کر نہ آئیں۔

ایک لمحے کے لیے سوچیے، وہ بچے جو بارش کی ٹھنڈی بوندوں کو اپنے اندر جذب کرتے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ باہر نکلے تھے اور پھر ابدی نیند سوگئے، وہ ہمارے ہی گھر کے بچے ہوتے۔

ایک لمحے کے لیے سوچیے، کہ وہ 43 لوگ جو سیلابی ریلے کی نذر ہوئے، ان میں سے کسی کی میت ہمارے گھروں سے اٹھتی۔

ایک لمحے کے لیے سوچیے، ہم اس وقت لیاری کے اسٹیڈیم میں زندگی کی رونقوں سے محضوظ ہو رہے تھے کہ پَل بھر میں ہمارے جسم کے اعضاء بکھر گئے۔

میرا قلم لرز اُٹھا ہے، ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہے، خداوندِ کریم ہم سب کو ناگہانی آفات سے بچائے۔

لیکن یہ جتنے لوگ لقمہِ اجل بنے، خواہ بارش کا کا نشانہ بنے ہوں یا دھماکے نے ان کی موت لکھی ہو، ان سب کو قتل کیا گیا، میں اسے قتل کہتی ہوں۔

جن کا کام عوام کو تحفظ فراہم کرنا ہے، چاہے وہ قدرتی آفات سے ہو یا دست قاتل سے، وہ سب ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے لیے تُلے بیٹھے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کراچی کا ڈیم توڑا گیا، کسی کا الزام ہے کہ کراچی کو جان بوجھ کر ڈبویا گیا۔ کسی نے لیاری کے دھماکے کو گینگ وار کی کڑی کہا، اور کسی نے نیا رنگ دینے کی کوشش کی۔

میں نہیں سمجھنا چاہتی کہ کس نے کیا کیا اور کیوں کیا، میرے لبوں سے ایک آہ نکلتی ہے کہ اے خدا! جس کسی نے بھی معصوم جانوں کے زیاں کی فکر کیے بغیر اپنی سیاست چمکائی ہے، تو اسے نیست و نابود کر دے۔ ان لوگوں کو غارت کر دے جو ہماری بستیوں میں ہونے والی تباہ کاریوں کے ذمے دار ہیں۔ وہ لوگ جو گذشتہ سات سال سے لیاری کے عوام کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔

یہاں تو حال یہ ہے کہ ثواب کمانے کے لیے سرکاری خرچ پر عمرے کیے جاتے ہیں۔ ملک سیلاب میں ڈوب رہا ہے، لیکن غیر ملکی دوروں اور سیر سپاٹے کی مدت مزید بڑھادی جاتی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فوری وطن واپس آ کر عوام کے دکھوں کا کچھ مداوا کیا

جاتا، مگر عوام کے مصائب کی پرواہ کسے ہے۔

کاش یوں ہوتا کہ قومی اسمبلی میں بیٹھے اراکین اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کا جو جم غفیر پاکستان کے مخصوص نظامِ حکومت کی وجہ سے یہاں کے عوام کو ورثے میں ملا ہے، ان اراکین کی فوج ہر علاقے، ہر شہر، ہر گلی ہر محلے جاتی اور بارش سے نمٹنے کے لیے کیے جانے والے انتظامات کا خود جائزہ لیتی۔ جو غلطیاں ہو چکی ہیں ان پر رونے کے بجائے نئے سرے سے مؤثر اقدامات کیے جاتے۔ لیکن یہ منتخب ارکان تو لوگوں کے کسی مصیبت کا شکار ہونے کے بعد بھی انہیں نہیں پوچھتے تو ان کے بچاؤ کے لیے پیش بندی کیا کرتے۔

قومی اسمبلی کے اراکین کو قومی نمائندوں کے طور پر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، اسی طرح صوبائی اسمبلیوں کے رکن بھی قوم کی نمائندگی کرتے ہیں، مگر ہمارے ہاں تو حال یہ ہے کہ ایک صوبہ دوسرے صوبے میں جھانکے گا بھی نہیں۔ خیبر پختون خوا میں لوگ ڈرون حملوں اور دہشت گردی سے مارے جائیں، بلوچستان کے باسیوں پر قیامت ٹوٹتی رہے، پنجاب کے رہنے والے سیلاب کی نذر ہوتے رہیں یا سندھ کے عوام قدرتی آفات اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنیں، ایک صوبے کے رہنے والوں کے مصائب دوسرے صوبے کے منتخب نمایندوں کا دل نہیں دکھاتے، ورنہ ایسا کیوں ہے کہ ایک صوبے کے نمائندے کسی دوسرے صوبے کے متاثرین سے ہم دردی

اور ان کی مدد کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ لگتا تو یوں ہے کہ سب ملی بھگت سے چُپ سادھے بیٹھے ہیں، کیوں کہ دوسرے صوبے کے مسئلے سے کسی کو کیا لینا دینا!

اور تو اور یہاں تو حکومتِ سندھ بھی اپنے ہی شہر کراچی کے مسائل پر توجہ دیتے ہوئے ہزار بار سوچتی ہے اور آخر کے ہر معاملے کو کراچی کی اندرونی سیاست کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

کیا کسی کو نہیں پتا تھا کہ مون سون کی بارشیں ہونی ہیں؟ ٹوٹ کر کتنی ہی زندگیاں تباہ کردینے والے بند کی حالت پر مون سون کی بارشوں سے پہلے ایک نظر ڈالنا کسی ادارے نے کیوں گوارا نہ کیا۔

اسی طرح کیسے ممکن ہے کہ لیاری میں خوں ریزی اور تباہ کاری کے خدشات سے ایجنسیاں آگاہ نہ ہوں، جب کہ لیاری کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ عید پر اس علاقے میں خون کی ہولی کھیلی جائے گی۔ تو کہاں تھے ادارے؟ کیوں نہ روکا گیا کسی کو؟ اور مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعات کا ذمے دار آخر کون ہوگا؟

بات سچ ہے، موت برحق ہے، لیکن بے رحمی سے قتل کیے جانے والے معصوم لوگوں کا

خون ہمارے نام نہاد راہ نماؤں کی گردن پر ہے۔

# سوشل میڈیا کی دین۔۔۔۔۔۔سٹیزن فوٹو جرنلزم

تصور کریں! آپ اپنے شہر کی کسی سڑک یا گلی سے گزر رہے ہیں۔

وہاں آپ کوئی اچھوتا واقعہ رونما ہوتے دیکھتے ہیں، جیسے جرم کی کوئی واردات، تو آپ کو فوری رد عمل کیا ہوگا؟ اگر آپ کا جواب ہے کہ ''میں فوری طور پر اس منظر کی تصویر لیتا/ لیتی'' تو اس کا سیدھا سا مطلب ہے کہ آپ سوشل میڈیا کے برپا کیے ہوئے انقلاب کا حصہ ہیں۔ ان لمحات میں موبائل فون سے منسلک اور سوشل میڈیا سے جڑا کوئی بھی شخص اس جگہ موجود ہو وہ فوری طور پر نیوز فوٹو گرافر ہو سکتا ہے۔

کسی خوف ناک حادثے سے لے کر بم باری کے منظر، جرم کی وارداتوں اور مضحکہ خیز واقعات تک روزانہ کتنے ہی مناظر سوشل میڈیا کے یوزرز کے ہاتھوں تصویر کی صورت میں مختلف ویب سائٹس پر آجاتے ہیں۔ دنیا میں ہونے والا شاید ہی کوئی اہم واقعہ ہو جس کے پہلی تصاویر سوشل ویب سائٹس پر آتی ہیں۔ اکثر یہی تصاویر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا حصہ بنتی ہیں۔

کینیڈا کی یونی ورسٹی آف ٹورنٹو کے ڈائریکٹر جرنلزم پروگرام Jeffrey

اس حوالے سے کہتے ہیں، یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ آخری دفعہ کسی عالم گیر Dvorkin شہرت کے حامل واقعے کی تصویر کب نہیں لی گئی تھی۔ تاہم یہ بارہ سال پہلے کی بات ہے جب نائن الیون کے سانحے کے موقع پر نیویارک ٹائمز، رائٹرز اور ایسوسی ایٹڈ پریس کے تجربہ کار اور فوٹوگرافرز ہی نے کسی بڑے واقعے کو کور کیا تھا۔ چناں چہ ہمارے پاس اس واقعے کی حیرت انگیز تصاویر موجود ہیں۔ ''اس کے بعد سے پروفیشنل ''فوٹوجرنلزم زوال کا شکار ہے اور سٹیزن فوٹوجرنلزم فروغ پارہا ہے۔

سوشل میڈیا کے ذریعے مجموعی طور پر میڈیا میں بدلاؤ آرہا ہے۔ اس سال مئی کے مہینے میں ایک امریکی اخبار ''شکاگو سن ٹائمز'' نے اپنے تمام فوٹوگرافرز کو ملازمت سے فارغ کردیا اور رپورٹرز پر ذمے داری ڈال دی کہ وہ اپنے آرٹیکلز کے لیے اپنے اسمارٹ فونز کے ذریعے تصاویر اور وڈیوز بنائیں۔ ذرائع ابلاغ کی دنیا میں سوشل میڈیا کے طفیل وجود میں آنے اور فروغ پانے والی فوٹوگرافی نے ''کراؤڈ میڈیا'' کا نام پایا ہے، جس نے اب تجارت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

یہ رجحان میڈیا آرگنائزیشنز کا اس طرح مددگار ثابت ہوا ہے کہ وہ اپنے فوٹوگرافرز پر انحصار کرنے کے بہ جائے سوشل میڈیا فوٹوجرنلسٹس کی بروقت

کھینچی گئی اور بہتر سے بہتر تصاویر کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ویب سائٹ "کراؤڈ میڈیا" پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی معاون ثابت ہو رہی ہے۔ یہ ویب سائٹ اپنے خودکار سرچنگ سسٹم کے ذریعے روزانہ کھینچی جانے والی 150 ملین تصاویر میں سے سرچ کر کے مطلوبہ تصاویر فراہم کر سکتی ہے۔ اس طرح درکار وقت میں تصاویر کے خزانے سے کسی نیوز اسٹوری سے متعلق تصاویر بہ آسانی دست یاب ہو جاتی ہیں۔

کراؤڈ میڈیا یہ تصاویر عام صارفین سے حاصل کرتی ہے، جو عموماً فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ جیسی سوشل ویب سائٹس پر پوسٹ کی جاتی ہیں۔ کراؤڈ میڈیا نیوز ایجنسیز کے لیے صارفین کی ان تصاویر یا مطلوبہ تصویروں تک رسائی کا سہل ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس ویب سائٹ کے سی ای او Martin Roldan کا کہنا ہے کہ وہ کوشاں ہیں کہ جو ہی کوئی واقعہ رونما ہو ان کی ویب سائٹ فوری طور پر اس واقعے کی کھینچی گئی تصاویر تلاش کر کے اور تصاویر کھینچنے والے صارف کو خودکار طریقے سے تصاویر کے حصول کے لیے میل سینڈ کر دے۔

کراؤڈ میڈیا کو آن لائن ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اس ویب سائٹ نے ٹوئٹر پر آنے والی امریکی صدر باراک اوباما کی ایک فنڈ ریزنگ تقریب میں شرکت کی اولین تصاویر کر لیں اور ان کی اشاعت کے لیے گاہک بھی تلاش کر لیا۔

Martin Roldan کا کہنا ہے کہ جو شخص کسی واقعے کے رونما ہوتے ہوئے عین وقت پر وہاں موجود ہے، اسے (عکس بندی کا) موقع میسر آتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تصویر اچھی ہے یا نہیں۔ یہ رائے اپنی جگہ تاہم معیار کی اپنی اہمیت ہے۔

Jeffrey Dvorkin کہتے ہیں کہ اگرچہ سٹیزن میڈیا مین اسٹریم میڈیا کے لیے اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے، اور اسے بڑا صحت مند رجحان گردانا جاتا ہے، مگر سوشل میڈیا کے یوزرز کی بنائی ہوئی تصاویر کے معاملے سے بہت سے خطرات وابستہ ہیں۔

اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ سٹیزن فوٹو جرنل ازم میں فریب کاری کا خطرہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سٹیزن فوٹو ( digitally-created) اور جعل سازی جرنلسٹس کے لیے کچھ معیارات کا تعین ضروری ہے، جو ان کی تصاویر کو مین اسٹریم میڈیا نے کیا ہے۔ سوشل Jeffrey Dvorkin قابل اعتماد بنادیں گی۔ جن خطرات کا تذکرہ کہتے Jeffrey Dvorkinمیڈیا کی حد تک تو یہ خطرات حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔ ہیں کہ خاص طور پر جنگ زدہ علاقوں میں تصویریں کھینچنے والے سٹیزن فوٹو گرافر اپنی تصاویر کو قابل قدر بنانے کے لیے ان میں ردوبدل کر دیتے ہیں۔

سینیر صحافی سٹیزن فوٹو جرنلزم کو معیار کا انحطاط مگر مواد کی توسیع قرار دیتے ہیں۔

معیار کا معاملہ اپنی جگہ مگر سٹیزن فوٹو جرنلزم ان مجبوریوں اور قیود سے آزاد ہے جن کا سامنا مین اسٹریم جیزل ازم کے فوٹو گرافرز کو ہوتا ہے، تاہم ان قیود کے ساتھ سٹیزن فوٹو جرنل ازم اخلاقیات اور ذمے داریوں سے بھی آزاد ہے۔

## جب غوطہ دمشق میں قیامت مچی

وہ شخص تین یا شاید چار سال کے ایک مرتے ہوئے بچے کو بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ کبھی اس کے پھول سے چہرے پر پانی چھڑک کر اس مرجھاتے شگوفے کو دوبارہ کھلانے کے جتن کرتا ہے تو کبھی اس ننھے سے زرد پڑ جانے والے اور بے جان جسم کو ہاتھوں سے مسل کر اس میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لیے کوشاں ہے۔ مگر یہ کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں، پھول مرُجھا جاتا ہے۔ اس کے ارد گرد اسی حالت سے دوچار اور بھی جسم ہیں، کوئی زندگی سے محروم ہو چکا ہے اور کوئی حالتِ نزع میں ہے۔

دل کو تڑپاتی یہ وڈیو شام کے علاقے ''غوطہ دمشق'' کی ہے۔

شامی دارالحکومت دمشق کے جنوب اور مشرق میں واقع یہ علاقہ شام کی سرزمین پر آمریت سے برسرپیکار گروہوں کے قبضے میں ہے، جہاں شامی فوج نے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے نہتے شہریوں پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں 1300 سے زاید افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

یہ فجر سے پہلے کا وقت تھا کہ اچانک سرسبز زرعی علاقے غوطہ دمشق کی پُرسکوت

فضا راکٹوں کی مکروہ آوازوں سے بھر گئی۔ نہ جانے کیا ہوا۔۔۔ معصوم بچے بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگے۔ ان کے جسم نیلے پڑ گئے اور منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ بچوں کو مرتے دیکھ کر بے حال مائیں بھی آناً فاناً اسی کیفیت کا شکار ہونے لگیں جس میں ان کے بچے جان سے گئے تھے، ان کی روحیں بھی اپنی آنکھ کے تاروں کے تعاقب میں روح جسم سے پرواز کر گئیں۔

حملے کے بعد پہلے پہل درجنوں لوگوں کے مرنے کی اطلاعات ملیں، پھر رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھتی گئی۔

مرنے والوں کی حالت اور کیفیت سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں کیمیائی ہتھیاروں سے نشانہ بنایا گیا ہے۔

امدادی کارکن متاثرین کی مدد کے لیے پہنچنا شروع ہو گئے، لیکن ان میں سے بھی اکثر مارے گئے۔ قلیل تعداد میں دست یاب آکسیجن ماسک لوگوں کو کیمیائی حملے سے بچانے کے لیے ناکافی تھے۔ صبح طلوع ہوئی تو اس علاقے میں عجیب منظر تھا۔ لوگ خود کو سڑکوں پر گھسیٹ رہے تھے۔ انھیں ہوا کی تلاش تھی۔ کیمیائی گیس سے بھرے اس علاقے سے نکلنا چاہتے تھے، مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اپاہج جسم طویل سفر طے کر سکیں۔ لوگ خود کو بیمار محسوس کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں زخم پڑ گئے تھے۔ ان کے لیے سانس لینا دشوار تھا۔ متاثرین میں سے کئی کی ٹانگیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسی کیفیت میں رہتے پھر ایڑیاں رگڑ

رگڑ کر مر جاتے۔

بدھ اکیس اگست شام کی سرزمین پر طلوع ہونے والا وہ دن تھا جس کی ابتدا سیکڑوں نہتے شہریوں کو کیمیائی حملے کے ذریعے بھیانک اور دردناک موت سے دوچار کر کے عالمی قوانین کی پامالی سے ہوئی۔

بشارالاسد کی حکومت سے برسرپیکار گروہوں، جنھیں میڈیا باغی کے نام سے یاد کرتا ہے، کی جانب سے غوطہ دمشق میں برپا ہونے والی قیامت کی کچھ جھلکیوں کی وڈیو جاری کی گئی ہے، جس میں یقینی طور پر کیمیائی حملے سے ہونے والی ہلاکتوں کے ثبوت ملتے ہیں۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون نے کیمیائی حملوں کا نشانہ بننے والے علاقے میں فوری طور پر تحقیقاتی ٹیم کی رسائی کا مطالبہ کیا ہے۔ بان کی مون نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ کیمیائی ہتھیاروں کا کسی بھی قسم کا استعمال چاہے وہ کسی کی بھی طرف سے ہو، قانون کی خلاف ورزی ہے۔ جو کوئی بھی انسانیت کے خلاف اس قسم کے سنگین جرم کا مرتکب ہو گا اسے نتائج بھگتنا ہوں گے۔

شام میں ماضی میں بھی کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کی اطلاعات سامنے آتی رہی ہیں۔ شامی حکومت اس حوالے سے تردید کرتی رہی ہے، لیکن غوطہ دمشق میں ان ہتھیاروں کے اندھا دھند استعمال نے بشارالاسد کے جھوٹ کا پردہ چاک کر دیا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک اور خلیجی ریاستوں کے ساتھ بشار الاسد کا سب سے بڑا حامی روس بھی اس معاملے کی تحقیقات کا خواہاں ہے۔

معصوم بچوں کی لاشیں دیکھنے کے باوجود ہمارے ہاں بعض لوگ مُصر ہیں کہ جتنے لوگ مارے گئے وہ باغی تھے، ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ سوشل میڈیا پر اس طرح کے کمنٹس دینے والوں سے عرض ہے کہ اے ہوش مند انسانو! جو 311 بچے اس کیمیائی یلغار میں تڑپ تڑپ کر مر گئے، کیا وہ بھی باغی تھے؟ انھیں آخر کس جرم کی پاداش میں کچل دیا گیا؟

شام میں ہونے والی بدامنی کو فرقہ واریت قرار دے کر فریقین کو ایک ہی نظر سے دیکھنا ظلم ہے۔ یہ فرقوں کی لڑائی نہیں، بہ خدا یہ فرقوں کی جنگ نہیں۔ یہ ظالم اور مظلوم کے درمیان معرکا ہے۔ یہ آمریت اور عوام کے مابین ٹکراؤ ہے، جسے خاص مقاصد کے لیے فرقہ وارانہ جھگڑا قرار دینے کے جتن کیے جا رہے ہیں۔ ایسا کرنے والے درحقیقت پوری مسلم دنیا میں فرقہ واریت پھیلانے کا سبب بن رہے ہیں۔

بان کی مون کی دھمکی ہو یا امریکا اور مغربی ممالک کا اس کیمیائی حملے پر ردعمل، یہ سب دکھاوا ہے۔ شامی فوج ایک عرصے سے عوام کا قتل عام کر رہی ہے۔

انتیس ماہ سے جاری جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد مارے جا چکے ہیں اور شامیوں کی بہت بڑی تعداد ترک وطن پر مجبور ہو چکی ہے۔ سرکاری کارندے بستیوں کی بستیاں اُجاڑ چکے ہیں، مگر اس سب کے باوجود امریکا، یورپی ممالک اور اقوام متحدہ کی تمام کارروائی صرف انتباہ، دھمکیوں اور اعلانات تک محدود ہے۔ یہ دنیا کی خاموشی اور بے عملی ہی ہے کہ بشارالاسد نے مظلوم نہتے شہریوں پر کیمیائی حملے جیسا ظالمانہ اقدام کیا۔

شام میں ڈھائے جانے والے مظالم پر آنکھیں بند رکھنے والے مسلم ممالک بھی بشارالاسد کے اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلم ریاستیں اور ان کی تنظیم او آئی سی اپنے طور پر شام کے مسئلے کا حل نکالتی، مگر کچھ کرنا تو کجا مسلم حکمرانوں کی غالب اکثریت اس معاملے پر لب کشائی کے لیے بھی تیار نہیں اور خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ شام کے عوام جس طرح ظلم سہہ کر بھی اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں وہ یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ شام میں سحر نمودار ہو کر رہے گی اور بشارالاسد اپنے لاؤلشکر سمیت رسوائی کے اندھیروں میں ڈوب جائے گا، مگر تاریخ دنیا اور مسلمان حکمرانوں کا کردار یاد رکھے گی۔

"برزخ" افسانہ

یہ پیشنٹ پچھلے ایک سال سے ہمارے پاس ہے۔ ہم نے اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کر لی مگر......۔ ڈاکٹر... نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کو کیس سمجھاتے ہوئے بتایا

اس طرح کومے میں جانے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟

گُڈ کوئسچن ڈاکٹر زریاب۔ کومے میں جانے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کوئی میجر ایکسیڈنٹ، جس میں ذہن کے کسی ایسے حصے میں چوٹ لگ جائے، جس کے ناکارہ ہونے سے انسانی جسم مفلوج ہوجاتا ہے یا پھر کوئی شدید ذہنی صدمہ کہ جس کو برداشت کرنے کی انسانی دماغ صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس کیس میں پیشنٹ کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ گھر والوں کے مطابق یہ ایک عام گھریلو زندگی گزار رہی تھی۔ کسی قسم کا صدمہ بھی نہیں کہ ایک صبح اسے بے ہوش پایا گیا اور فوری طور پر ہوسپٹل پہنچا دیا گیا، جہاں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ پیشنٹ نیند کی حالت ہی میں کومے میں جا چکی ہے۔

اینی کوئسچن ڈاکٹر زریاب؟

اسٹرینج.... تو ڈاکٹر ضیغم اب پیشنٹ کے حوالے سے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اسے کب تک ہوش آ سکتا ہے۔

ویل ینگ ڈاکٹرہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ سالوں اسی حالت میں بھی رہ سکتی ہے اور چند لمحوں میں بھی ہوش آ سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے کل رات سے ہم اس کی پلز کو بہتر نوٹ کر رہے ہیں۔ بی پی کافی اسٹیبل ہے۔ امید کی کرن تو نظر آ رہی ہے۔

اس کا مطلب ڈاکٹر ضیغم یہ ہماری آواز سُن سکتی ہے؟ ڈاکٹر زریاب کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

شاید ہاں... شاید نہیں۔ میڈیکل سائنس اس حوالے سے کوئی حتمی بات نہیں بتاتی۔ اس پیشنٹ میں پلس پوائنٹ یہ ہے کہ فزیکلی اسے کوئی اور مرض نہیں، الہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بہت جلد ری کور کر سکتی ہے۔ اگر یہ چاہے تو۔ کومے کے ایسے پیشنٹ میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اپنی وِل پاور کتنی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس صورت حال سے نکال سکے۔

so let hope for better ok young doctors move to another patient

---------------------------------------------------

خیال در خیال دائرے بنتے چلے گئے۔ اندھیروں کے اندر سیاہ اور نیلے سیاہی مائل دائروں اپنا حصار بناتے گئے۔ وہ اپنے ارد گرد کھڑے ڈاکٹرز کی آوازیں سن نہیں سکتی تھی۔ وہ اس وقت کہاں تھی؟ یہ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ یہاں بہت

سارے لوگ سفید چادر میں لپٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے۔ کوئی کسی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاحدِ نظر انسانوں کا سفید جنگل پھیلا ہوا تھا، لیکن مکمل سُکوت۔ سُکوت ایسا تھا کہ جیسے اس زمین پر وہ اکیلی بیٹھی ہو۔ سب ہی تو چپ تھے۔ شاید ہر کوئی اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں خوف نہ تھا۔ وہاں نہ نفرت تھی نہ محبت، نہ آگ اور نہ پانی۔ پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کون زاہد ہے اور کون بدکار۔ وہ بہت پُرسکون تھی وہاں۔

ہلچل تھی تو فقط اتنی کہ اتنے عرصے بعد اسے وہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جنھیں وہ بہت پہلے سُننے کی عادی تھی۔ کچھ گھنٹوں سے وہ آوازیں بڑھتی چلی جارہی تھیں اور اس کا سکون گھٹتا جارہا تھا۔ وہ یہ آوازیں سُننا نہیں چاہتی تھی۔ ان آوازوں سے اسے بہت محبت تھی۔ لیکن اس کی محبتیں اُس وقت، اس سکون کی کیفیت میں اسے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ وہاں موجود ہر شخص اسی سکون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید یہ آوازیں صرف اُسے ہی سُنائی دے رہی تھیں۔ شاید وہاں بیٹھا ہر شخص صرف اپنی اپنی آوازوں کی اذیت میں تھا۔ شاید اسی لیے سب خاموش تھے۔ رفتہ رفتہ آوازیں بڑھتی گئیں، بڑھتی گئیں، چیخ بنتی گئیں، گڈمڈ ہوتی چلی گئیں۔

..... میری بیٹی میری شہزادی

.... تمھارا باپ مرگیا

.... یہ کیا پڑھائی کرے گی

....بولو قبول ہے، قبول ہے... بولو

...تم میری زندگی ہو

....یہ دیکھیے! آپ کی بیٹی پیدا ہوئی ہے

.... کتنی بیٹیاں پیدا کرے گی

....کیا کرو گی پڑھ لکھ کر

....کچھ بھی ہو وہ تمھارا گھر ہے

....تم سے کہا نا، تمھیں یہ کام نہیں کرنا

.... تم اس دنیا کی مخلوق ہو بھی کہ نہیں

....ناکارہ عورت

....ماما ماما

....تم ہماری عزت ہو، ہمارا مان ہو

.....بد چلن آوارہ

....آپ بہت قابل اور ذہین خاتون ہیں... دیکھیے گا، آپ کتنی جلدی آگے بڑھیں گی

شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اتنی تکلیف میں تھی کہ جیسے اس کے سارے جسم سے خون رس رہا ہو۔ لیکن گھاؤ کہیں نظر نہ آتا ہو۔ اس کی نبض اچانک تیز ہو جاتی۔ سرہانے بیٹھی نرس بار بار گھبرا کر میٹر ریڈنگ نوٹ کرتی اور واپس بیٹھ جاتی۔ لیکن اسے ہوش نہ تھا کہ

اس کے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے اندر کی آوازیں چیخے جا رہی تھیں۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرنا چاہا۔ وہ تکلیف کی شدت سے گھٹنوں کے بَل زمین پر گر پڑی۔ اچانک آواز آئی:

شازمین

شازمین

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ یہ تو وہی چہرہ تھا۔ اسے چھونے کے لیے وہ آگے بڑھی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چہرہ آئینے میں تبدیل ہو گیا۔ ایک شفاف خوب صورت آئینہ۔ اس نے اپنے آپ کو اس آئینے میں دیکھنا چاہا۔ وہ اپنی گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر اس آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ شاید آج پہلی بار اس نے اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ کمر تک لہراتے سیاہ گھنگریالے بال، شفاف جلد اور سبز آنکھیں۔ خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے جیسے یقین نہ آیا ہو۔ اپنی انگلیاں آئینے پر پھیرتی اور پھر اپنا چہرے چھوتی۔ اپنے آپ میں مگن۔ اس نے خود سے کہا:

شازمین یہ تم ہو۔ سچ میں یہ تم ہی ہو؟ اتنے وار کھانے کے بعد تو تمھارا چہرہ مسخ ہو گیا" ہے۔ تم تو خود اپنے آپ کو دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ہاں یہ میں ہی ہوں۔ ہاں یہ تو میرا ہی چہرہ ہے۔ وہ اس حیرت کدے میں کھوئی ہوئی تھی کہ پھر آواز آئی:

شازمین

شازمین

اس نے بجلی کی سی تیزی سے یہاں وہاں دیکھا۔ پر وہ نہیں تھا۔ آواز تو اسی کی تھی لیکن وہ کہیں بھی تو نہ تھا۔ ایک بار پھر وہ خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ ایک بار پھر وہ خود سے مخاطب تھی :

وہ مجھے اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ میرے ہاتھ پر " ہاتھ رکھ دے۔ میں مکمل سکوت کی حالت میں زمین پر لیٹی آنکھیں بند کیے اسے اپنے وجود میں جذب ہوتا محسوس کرتی ہوں۔ وہ ایسا حصہ ہے میرے جسم کا۔ جہاں دھڑکنوں کا کارخانہ رواں دواں ہے۔ میری پہلی سہمی ہوئی خواہش...--

یہ کائنات پہلی محبت کے لفظ کی چھاؤں میں وجود میں آئی۔ میرا مسئلہ تو میری آخری محبت ٹھیرا۔ مجھے نفرت ہے اپنے آپ سے، کہ مجھے تم سے عشق ہے۔ لیکن مجھے اس دبے ہوئے جذبے سے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں عورت ماں بنتی ہے تو اپنے اندر ایک نئے وجود کی پیدائش اسے سرشار کر دیتی ہے، سرمایۂ حیات.... مکمل عورت بننے کی نوید۔ عشق بھی تو ایک وجود کو جنم دے رہا ہے میرے اندر۔ انسانوں نے جسم کو نوچا، بہ ظاہر مکمل عورت بن گئی، مگر روح... روح کو فرشتے تک نہ چھو سکے۔ میری روح میں تمھارا عشق پل رہا ہے۔ چھو گیا ہے مجھے۔ تم مکمل انسان صحیح لیکن لمحہ لمحہ ہر گزرتے دن تم پھر سے صورت پا رہے ہو میرے اندر۔ ایک تمھاری ماں نے تمھارے جسم کو جنم دیا، ایک

میں کیسی پاگل جوگن کہ تمھاری روح کو اپنے بدن میں پلتا دیکھتی ہوں۔ تم سانس لینے لگے ہو میرے اندر۔ لیکن تمھارا وجود نو ماہ کے عرصے میں مکمل ہو کر مجھ سے الگ نہیں ہوگا۔ میں کانپ جاتی ہوں یہ سوچ کر کہ نو ماہ، نو سال، نو صدیاں ... جب تک دنیا قائم ہے......۔ روحیں فنا نہیں ہوتیں، جسم مرتے ہیں۔ اور تم تو پل رہے ہو میرے اندر۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں تمھاری آنکھیں ہو جائیں گی.... میرے لب تمھاری زبان بولیں گے.... میری روح کے کونے کونے پر تم قابض ہو جاؤ گے۔ اے میری سہی ہوئی خواہش! بخش دے مجھے.... یہ روگ مجھے بدروح بنا کر چھوڑے گا۔

غم سے نڈھال ہو کر وہ گھٹنوں میں سر دیے سسکیاں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی اس کی آواز نہ سُن لے۔ اسے ایسے ہی گھٹ گھٹ کر رونے کی عادت تھی۔ اچانک اسے زیورات کی چھنکار سنائی دی۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کا وجود آئینے میں سے باہر آگیا تھا۔ وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتی اپنے سامنے کھڑی دوسری شازمین کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ کیا۔ وہ تو سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی، مگر اس کے سامنے کھڑی شازمین نے سُرخ لباس پہنا ہوا تھا۔ سرُخ لباس میں ملبوس شازمین مسکرائی اور بہت پیار سے ہاتھ آگے بڑھا کر کہنے لگی۔

گھبراؤمت، میں تمھاری زندگی ہوں، تمھیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ آؤ"
میرا ہاتھ تھام لو"۔

---

۔آئی سی یو میں نصب میٹر کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ شازمین نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ نگرانی پر مامور نرس کو لگا کہ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن نہیں، نبض تیز ہورہی تھی۔ سانس تیز ہوتی جارہی تھی۔ آنکھیں کھلیں اور بند ہوگئیں۔ نرس یک دم ،چلائی

او مائی گاڈ،پیشنٹ کو ہوش آرہا ہے،ڈاکٹر...ڈاکٹر! ڈاکٹر بھاگتا ہوا آیا اور شازمین کے سرہانے آکھڑا ہوا۔

Call the other doctors imedediately

اگلے دس منٹ اس لڑکی کی زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔پیشنٹ کے ساتھ کون کون ....ہے؟ باہر اس لڑکی کا شوہر موجود ہے۔ بلاؤ اسے فوراً

ڈاکٹر یہاں، آئی سی یو میں؟

ہاں، یہ ضروری ہے۔

---

سفید کپڑوں میں لپٹی شازمین لال کپڑوں میں ملبوس شازمین کو دیکھتی رہی۔ لال کپڑے پہنے شازمین کے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

آؤ میرا ہاتھ تھام لو، میں تمھیں دنیا کی ہر خوشی دوں گی۔ تم جس راستے کو اختیار کرنا چاہو یہ تم پر ہے۔ اپنے حصے کی خوشیاں لے لو اس دنیا سے۔ تم کر سکتی ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ میں تمھیں لینے آئی ہوں۔

نہیں میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ تمھارے سُرخ لباس سے مجھے خون کی بو آتی ہے۔ تم دھوکا ہو، فریب ہو۔ خوشیوں کی نوید دے کر تم مجھے زندگی کی دوزخ میں جھونک دو گی۔ مجھے بھروسا نہیں تم پر۔

لال کپڑوں میں ملبوس شازمین نے محبت سے ایک قدم آگے.بڑھایا۔

چلو، دیکھو زندگی تمھیں پکار رہی ہے۔ تمھارے بچے تمھیں پکار رہے ہیں۔ اور وہ جو تمھارا ہم سفر تھا، دیکھو، سنو اس کی آواز، وہ تمھیں پکار رہا ہے۔

میرا وقت ہوگیا مجھے جانا ہے۔ مجھے چند روز کی خوشیاں نہیں چاہییں۔ اپنے حصے کی مسرتیں میں دنیا سے چھیننا چاہتی تو بہت پہلے چھین لیتی، لیکن مجھے چھیننا نہیں آتا ہے۔ میں جانتی ہوں، میرے لیے راستہ بنانا مشکل نہیں۔ اپنی خوشیوں کو پانا ناممکن نہیں، لیکن میں چند روز کی خوشیوں کے لیے اپنی ابدی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ اپنے محبوب سے دوری مجھے گوارہ ہے، مگر اپنے رب سے دوری برداشت نہیں۔ روزِ آخرت اگر خدا نے مجھ سے نگاہیں پھیر لیں تو کہاں جاؤں گی۔ اُس زندگی میں تو میں مر بھی نہیں سکوں گی۔

لال کپڑوں والی شازمین اب بھی ہاتھ آگے کیے کھڑی تھی۔ سفید کپڑے میں لپٹی شازمین کو اب باہر کی دنیا کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہ اس کے ہم سفر کی آواز تھی۔

،شازمین آنکھیں کھولو

خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ میں تم سے اپنے ہر سلوک پر معافی مانگتا ہوں۔ آنکھیں کھولو شازمین۔ ڈاکٹر کچھ کیجیے۔

ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس وقت اس کی اپنی وِل پاور پر ہے کہ یہ خود کو کومے سے باہر لا سکے۔ آپ بات کیجیے اس سے، یہ آپ کو سُن سکتی ہے۔

شازمین واپس آجاؤ۔ اٹھو شازمین۔

شازمین نے ایک دفعہ آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنے ہم سفر کا چہرہ نظر آیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

سفید کپڑوں میں لپٹی شازمین نے قدم پیچھے ہٹانا شروع کردیے۔

وہ لال لباس پہنے شازمین سے دور ہوتی جارہی تھی،

اور دور ہوتی گئی۔ اچانک سرخ کپڑوں میں ملبوس شازمین غائب ہو گئی۔

باہر کی دنیا کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ آئی سی یو میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ای سی جی مونیٹرنگ مشین کی بیپ بند ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر کی آواز نے سکوت توڑ دیا۔

I am sorry she is no more"

## یہ بھی مقتول ہیں

عمر اٹھارہ سال...

عمر کا یہ حصہ کیسا حسین ہوتا ہے اور زندگی کا یہ دور کتنا دل کش ہوتا ہے۔ ہاتھ خالی ہوں، مگر دل میں دل میں امید کھلی رہتی ہے کہ ہتھیلی پر بس تتلی کے رنگ اترنے کو ہیں، چار سو اندھیرا پھیلا ہو، لیکن آنکھوں میں آرزوؤں کے دیے روشن رہتے ہیں، خواب پلکوں پر ڈیرے ڈالے رہتے ہیں۔ اٹھارہ سال کی وہ لڑکی بھی سپنوں، امیدوں، رنگوں اور خوشبوؤں کے اس دور سے گزر رہی تھی، اور پھر ایک رات سارے خواب اور امیدیں بس ایک روتی بلکتی آرزو میں ڈھل گئے "میں زندہ رہوں۔" آرزو مر گئی، آنکھیں ہمیشہ کے لے بند ہوئی اور سپنے اندھیروں میں گم ہوگئے۔

وہ سندھ میں ڈینگی بخار کے حالیہ حملے کی اب تک کم عمر ترین شکار ٹھیری۔ کراچی کے علاقے منگھوپیر سے تعلق رکھنے والی اس لڑکی سمیت اس سال صوبہ سندھ میں 10 افراد ڈینگی بخار کے ہاتھوں موت کے منہ میں جا چکے ہیں، جراثیم کش اسپرے وقت پر نہ ہونے کے باعث صوبے بھر میں ڈینگی وبائی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جبکہ صوبے میں 985 افراد اس وبا سے متاثر ہیں۔ ڈینگی کے خونی پنجوں کی گرفت میں جان دینے والے اور متاثرین میں سے زیادہ تر کا تعلق کراچی سے ہے۔

یومیہ 24 افراد تیز بخار اور ڈینگی بخار کے شبہ میں شہر کے مختلف نجی و سرکاری اسپتالوں میں لائے جارہے ہیں۔ ستمبر میں ڈینگی بخار کا شکار ہونے والے افراد کی تعداد 79 ہو چکی ہے ۔روزانہ کی بنیادوں پر ڈینگی بخار کے بڑھتے ہوئے کیسز پر محکمہ صحت نے کراچی کے تمام ٹاؤنز کے ہیلتھ افسران کو ہدایات جاری کردی ہیں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جمع پانی کو نکالنے کے لئے اقدامات کریں جبکہ اسپرے مہم کو بھی تیز کرنیکا حکم بھی دیا گیا۔اب نجانے یہ تیزی کب دیکھائی دے گی۔ جی ہاں، صوبے کے سب سے بڑے اور ترقی یافتہ شہر کراچی کے شہری ڈینگی کی وبا سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

کراچی کو ڈنگی سے پاک شہر بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا، مگر ہماری حکومتوں اور اداروں کے دعوے ریت پہ لکھی تحریر اور پانی پہ بنائی لکیر کی طرح ہوتے ہیں۔ چناں چہ اس دعوے کے مطابق کراچی کو ڈینگی سے پاک تو کیا کیا جاتا، اب یہ مرض پہلے کے مقابلے میں زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ گذشتہ سال ڈینگی بخار کے 700 کیسز سامنے آئے تھے۔ متاثرین میں سے ایک خاتون سمیت چار افراد زندگی کی بازی ہار گئے تھے، لیکن اس سال اگست تک، جب سال کے ختم ہونے میں چار ماہ باقی ہیں، آٹھ سو سے زیادہ افراد ڈینگی بخار میں مبتلا ہوچکے ہیں اور دس زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ وہ تھا دعویٰ، اور یہ ہے حقیقت۔

سندھ خاص طور پر کراچی میں صرف ڈینگی ہی کی وبا نے سر نہیں ابھارا ہے صوبے کے باسیوں کی جان کا دشمن ایک اور مرض ڈائریا بھی پھوٹ پڑا ہے۔ صوبے میں ڈائریا کا مرض ڈینگی سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ پھیلا ہے، خبروں کے مطابق یکم سے اکتیس اگست تک سندھ میں ڈائریا کے 54 ہزار 662 کیسز رپورٹ ہوئے ہیں، جن میں سے 9 ہزار 273 مریض مختلف اسپتالوں میں زیر علاج ہیں یا رہے ہیں، جب کہ دو بدقسمت مریض جاں بر نہ ہوسکے، جن میں سے ایک کا تعلق عمرکوٹ سے تھا اور دوسرا شکارپور کا رہائشی تھا۔

اس ضمن میں طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ سندھ میں مون سون بارشیں ہونے کے باعث ڈینگی وائرس اور ملیریا کے مرض کا سیزن شروع ہوچکا ہے، جو اگست سے دسمبر تک جاری رہتا ہے۔ کیا صوبائی محکمۂ صحت کے حکام اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ ان امراض اور دیگر وباؤں کی روک تھام کے لیے قبل از وقت اقدامات کر لیے جاتے؟ مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ صوبائی دارالحکومت کراچی سمیت سندھ بھر کے ٹیچنگ اسپتالوں میں "آئسولیشن وارڈ" بھی نہیں قائم کیے جاسکے تھے، جہاں ان وبائی بیماریوں کے متاثرین کو دیگر مریضوں سے الگ رکھ کر ان کا علاج کیا جاتا۔

ہمارے ہاں ویسے ہی موت کے تمام اسباب مہیا ہیں، دہشت گرد معصوم لوگوں کو

نشانہ بنا رہے ہیں، ٹارگیٹڈ کلنگ کی وارداتوں میں روزانہ کراچی کے کتنے ہی شہری اپنے خون میں نہا جاتے ہیں، فرقہ وارانہ قتل وغارت گری لاتعداد گھر اجاڑ چکی ہے، ڈاکو اور راہ زن روز شہریوں کی جان سے کھیلتے ہیں، بھتا خور گروہ اپنا مطالبہ پورا نہ ہونے پر جان لے لیتے ہیں۔ اس سب کے ساتھ تباہی مچاتا سیلاب اور قیامت ڈھاتی بارشیں بھی ہماری زندگیوں کو بے وقعت سمجھتے ہوئے اپنا نشانہ بنالیتی ہیں۔ شہری اس سب پر یہ سوچ کر صبر کرچکے ہیں کہ ہماری بے چاری معصوم حکومت اور پولیس کیا کرے کہ دہشت اور جرم کے ہاتھ حکومت کے فولادی اور قانون کے لمبے ہاتھوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں، اور پھر حکومت تو بارہا کہہ چکی ہے کہ کسی کو قانون شکنی کی اجازت نہیں دیں گے، اب دہشت گرد، ٹارگٹ کلر اور دیگر جرائم پیشہ عناصر اجازت لیے بغیر قانون کی دھجیاں اور جسموں کے چیتھڑے اڑادے تو حکومت غریب کیا کرے، اسے علم ہی نہیں ہوتا کہ کب کوئی دہشت گردی یا قتل کی واردات ہونے والی ہے، مگر سیلاب اور بارشیں دہشت پھیلاتے اور انسانی خون سے ہاتھ رنگتے انسانوں کی طرح بے رحم نہیں، ان کی آمد کی خبر نہیں تو واضح امکان ضرور ہوتا ہے، لیکن ہمارے متعلقہ اداروں پر ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

اسے نرم سے نرم الفاظ میں صوبائی حکومت بالخصوص محکمۂ صحت کی مجرمانہ غفلت ہی کا نام دیا جاسکتا ہے کہ بارش سے پہلے کراچی سمیت سندھ میں شہریوں کی جان ومال کی حفاظت کے مناسب انتظامات نہیں کیے گئے۔

جہاں تک کراچی کا تعلق ہے تو سندھ کی دو سب سے بڑی اور برسر اقتدار رہنے والی جماعتوں کے درمیان بلدیاتی نظام سے متعلق تنازعے نے پورے صوبے کی طرح اس شہر کو بھی منتخب بلدیاتی قیادت سے محروم کر رکھا ہے، جس کے باعث شہر بھر میں کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں اور سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہیں۔ حال ہی میں ہونے والی بارشوں نے شہر کا جو حال کیا اس نے متعلقہ اداروں کی کارکردگی کا پول کھول دیا ہے۔ ڈینگی وائرس پھیلنے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کراچی سمیت صوبے میں جراثیم کش اسپرے نہیں کیا گیا، جس کے باعث یہ وبا پھوٹ پڑی۔

ڈینگی وائرس سے بیسیوں افراد کے متاثر اور دس قیمتی جانیں ضایع ہونے کے بعد صوبائی محکمۂ صحت کو اس مرض سے متعلق آگاہی پھیلانے کا خیال آیا، تاہم یہ سلسلہ اب تک کام شروع نہیں کیا گیا ہے۔ محکمہ صحت کو اگر ہماری بات سے اختلاف ہے تو زیادہ دور نہیں اپنے آس پاس کے قریبی دوا خانوں کا ہی رخ کر کے دیکھ لیں۔ چھوٹے کلینک ہوں یا بڑے ہسپتال مریضوں سے بھرے پڑے ہیں۔

یہ بلدیاتی اداروں کی عدم کارکردگی اور صوبائی محکمۂ صحت کی فرائض سے بے اعتنائی ہے کہ سندھ کے باسی ڈینگی اور ڈائریا کا شکار ہو رہے ہیں۔ وائرل

انفکشنز پہ قابو پانے کے لئے عوام کو کسی قسم کی ویکسینشنز سے متعارف تک نہیں کروایا گیا۔ وفاقی حکومت ہو یا صوبائی حکومتیں، صحت کے متعلق ان کا رویہ بجٹ اور حکمت عملیوں سے ظاہر ہے۔ یہ یکم ستمبر کو محکمہ صحت کی جانب سے ایک بیان جاری کیا گیا جس کے مطابق محکمہ کے افسران کو ہنگامی بنیادوں پہ کام کرنے کی تنبیہ کی گئ۔

فل وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔حکومت کو چاہیے کہ تمام اقدامات کے ساتھ ساتھ اشتہاری مہم کے ذریعے بھی عوام میں اس مرض سے آگاہی اور بچاؤ کے لیے شعور دیں اور فوری طور پر سرکاری اسپتالوں میں پلیٹلیٹ لیٹس کی مفت فراہمی کو ممکن بنائے

۔

بلدیاتی اداروں اور محکمۂ صحت ناقص کارکردگی اور غفلت کے باعث ہونے والی ہلاکتیں شاید دہشت گردوں اور قاتلوں کے ہاتھوں جان سے جانے والوں کی اموات سے زیادہ مظلومانہ ہیں، کہ یہ وہ ''قتل'' ہیں جن کا مقدمہ کہیں درج نہیں ہوگا، جنھیں مقتول کہا اور سمجھا جائے گا اور نہ ہی کسی کے ہاتھوں اور دامن پر ان کے خون کے چھینٹے ہوں گے۔

## ہنّا اسمتھ کی خودکشی کا سبب ''آسک. ایف ایم''؟

ترقی یافتہ ممالک، خاص کر مغربی ریاستیں غریب اقوام اور مشرقی ممالک کے میں بسنے والوں کی زندگی کو کتنا ہی بے وقعت سمجھیں، مگر اپنے شہریوں کی زندگی انھیں بہت عزیز ہے۔

ان ممالک میں انسانی جانوں کو بے حد قیمتی سمجھا جاتا ہے، ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ لوگ لاتعداد افراد ٹارگٹ کلنگ، دہشت گردی اور فرقہ واریت کی نذر ہوتے رہیں اور کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو، چناں چہ قتل تو دور کی بات، وہاں کوئی خودکشی بھی کرلے تو ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ یہی کچھ ان دنوں برطانیہ میں ہورہا ہے۔

cyber bullying کا نشانہ بن کر خودکشی کرنے والی چودہ سالہ لڑکی ہنا اسمتھ کہ افسوس ناک موت نے پورے برطانیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ واضح رہے کہ cyber bullying اصطلاحاً ایسے عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی کی بے حد تضحیک و توہین کی جائے، بدنام کیا جائے یا اس کا اس طرح مذاق اُڑایا جائے کہ وہ عاجز آجائے۔ سوشل ویب سائٹس پر یہ رجحان عام ہے، جس کا شکار دنیا بھر میں کتنے ہی افراد خصوصاً نوجوان ہوچکے ہیں۔ کم سن ہنا اسمتھ بھی اسی ظالمانہ سلوک کا نشانہ بنی تھی، جس کے بعد اس نے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی

زندگی موت کے حوالے کردی۔

ہنا ایک سوشل ویب سائٹ Ask.fm کی یوزر تھی۔ 16 جون 2010 کو لاؤنچ ہونے والی یہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر یوزر دوسرے یوزرز سے ہر قسم کے سوال پوچھ سکتا ہے، تاہم اس ویب سائٹ کے استعمال کنندہ کو اپنی پہچان خفیہ رکھنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس سائٹ کے یوزرز کی تعداد 70 ملین سے تجاوز کرچکی ہے۔ ہنا اسمتھ اس سائٹ سے متعلق پانچویں ٹین ایجر یوزر تھی جس نے طنز اور تضحیک برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ اس سے پہلے جن یوزرز نے خودکشی کی تھی ان کا معاملہ دب گیا تھا، مگر ہنا کی موت نے ''آسک. ایف ایم'' ہی نہیں پورے سوشل میڈیا کی بابت سوالات کھڑے کردیے ہیں اور اس حوالے سے بحث کا آغاز ہوگیا ہے۔ ہنا اسمتھ کے دوستوں کا کہنا ہے کہ اسے ''آسک .ایف ایم'' پر اس کے وزن سے لے کر اس کے انکل کی موت تک، ہر معاملے میں طنز اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ اسے یہ پیغامات تک دیے گئے کہ ''زہر پی لو'' اور ''مرجاؤ''۔

اس ویب سائٹ پر ظالمانہ رویوں کا ہدف بننے کے باعث جان دینے والی ہنا اسمتھ اور دیگر چار نوجوان، جن کا تعلق برطانیہ، آئرلینڈ اور امریکا سے ہے، کی

موت کا ذمے دار ناقدین آسک. ایف ایم کی یوزرز کے کمنٹس اور میسیجز کے بارے میں ناقص یا کھلی ڈلی پالیسی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ویب سائٹ نے ایک ایسا ماحول بنادیا ہے جس میں دونوں طرح کے، یعنی رجسٹرڈ اور اپنی شناخت چھپائے رکھنے والے، یوزرز ایسے جواب پوسٹ کر سکتے ہیں، جو صورت حال کو بہ آسانی بیہودگی اور گالی گلوچ کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہنااسمتھ کی موت نے عوام سے اعلیٰ سطح تک پورے.برطانوی سماج کو ہلاک کر رکھ دیا ہے۔.برطانیہ کے وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے ہنا کی خود کشی کو المیہ قرار دیا ہے۔

.برطانوی وزیر اعظم نے انٹرنیٹ کے یوزرز سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسی سوشل ویب سائٹس کا بائیکاٹ کریں جن پر لوگوں کو تضحیک اور توہین کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ڈیوڈ کیمرون نے کہا ہے کہ ہم سب بہ حیثیت والدین اور انٹرنیٹ یوزر کے طور پر اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہم اس طرح کی ویب سائٹس کا استعمال ترک کردیں۔ ڈیوڈ کیمرون لوگوں پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں، ’’ان کا بائیکاٹ کرو، وہاں مت جاؤ، انھیں جوائن مت کرو۔

‘‘

ہنا سمیت یکے بعد دیگرے پانچ نوجوانوں کی خود کشی کے بعد اپنے خلاف بننے والے ماحول اور نکتہ چینی نے ’’آسک .ایف ایم‘‘ کے منتظمین کو پریشان کردیا ہے۔ اس ویب سائٹ نے ہنا کی موت کو ’’حقیقی سانحہ‘‘ قرار دیا ہے۔ ویب سائٹ کے

.برادرز نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے، حال ہی میں ہونے والے Terebin مالکان واقعات کی روشنی میں سائبربا ئلنگ اور ہراساں کرنے رجحانات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم پروفیشنل ایڈوائزرز سے مشاورت میں مصروف ہیں تاکہ ہماری ''ویب سائٹ اور اس پر موجود سیفٹی فیچرز کی آزادانہ اور مکمل جانچ پڑتال کی جاسکے۔ اگرچہ سوشل ویب سائٹس کی ذمے داری ہے کہ وہ اشتعال انگیزی، توہین اور تحقیر کے رجحانات کا سدباب کریں، مگر ہر یوزر کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے الفاظ کسی کی زندگی تباہ یا اسے مرجانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

## ایک ظالم کی مخالفت دوسرے کی حمایت نہ بنے

ہم لوگ نفرت کرنے پر آتے ہیں تو تعصب کی آخری حد بھی پار کر جاتے ہیں۔ یہاں تک کے ہمارے لیے ظلم اور ظالم کی تعریف بھی نفرت کے دائرے میں محدود ہو جاتی ہے۔

باراک اوباما اور بشارالاسد کے معاملے میں بھی ہم میں سے بہت سے لوگوں کا یہی چلن ہے۔ جاپان سے ویتنام اور افغانستان سے عراق تک وحشت اور دہشت کی تاریخ رقم کرنے والے امریکا کی دہشت گردیاں قابل مذمت بھی ہیں اور قابل نفرت بھی، مگر صدام حسین سے حسنی مبارک تک امریکی مفادات کے لیے کام کرتے کرتے ایک روز ان ہی مفادات کا نشانہ بن جانے والے حکم رانوں کے اپنے ہم وطنوں سے وحشیانہ سلوک کی طرح شامی صدر بشارالاسد شام کے عوام پر مظالم سے نظریں کیسے چرائی جا سکتی ہیں۔ امریکا شام پر حملہ کرتا ہے یا نہیں اور اس حملے کے اہداف اور مقاصد کیا ہیں، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا، لیکن اس حملے کے اعلان کے بعد بعض حلقوں کے ردعمل نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہمارے یہاں ظالم اور مظلوم سے بھی امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام اور اہل سیاست ہی نہیں، دنیا کی بڑی طاقتیں اور حکومتیں بھی اس روش پر گام زن ہیں۔

بشارالاسد کی مطلق العنان کے خلاف شام کے عوام 29 ماہ سے برسرپیکار ہیں اور ہر ظلم برداشت کر رہے ہیں۔ جب حکومت مخالف تحریک نے زور پکڑا اور اس پر مظالم میں شدت آ گئی تو اس لڑائی میں مظلوم شامی عوام کی مدد کے لیے مختلف جہادی تنظیموں اور گروہوں کے ارکان بھی شریک ہو چکے ہوگئے، جس کے ساتھ ہی بشارالاسد کی حکومت نے ظلم کی نئی داستانیں رقم کرنا شروع کردیں۔ جلے ہوئے جسم، کٹی پھٹی لاشیں، تصویروں اور وڈیوز کی صورت دنیا کے سامنے آتی اور انسانیت کے حامل ہر شخص کے دماغ میں چبھتی رہیں۔ مخالفین سے اتنا بھیانک سلوک، بے خطا شہریوں پر اتنے ہولناک مظالم، آخر دنیا کب تک بے حس بنتی اور نظریں چراتی رہتی۔ عالمی رائے عامہ اس ظلم کو روکنے کے لیے یک زبان ہوتی گئی۔ مگر دنیا کے چوہدریوں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ بشارالاسد کے خلاف صف آراء گروہوں میں انھیں غلبہ حاصل ہے جنھیں "جہادی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اب عالمی سطح پر اثرورسوخ رکھنے والے ممالک سے عام لوگوں تک ایک گروہ بشار الاسد کا حامی ہوگیا اور دوسرا اس کے مخالفین کا۔ تاہم دنیا شام کے عوام پر ظلم ہوتے دیکھتی رہی۔ عالمی طاقتوں نے اس مسئلے پر عملاً تشویش کا اظہار اس وقت کیا جب انھیں اس حقیقت کا بہ خوبی علم ہوگیا کہ جہادی گروہ بھرپور

عسکری قوت استعمال کرتے ہوئے شام کے ستر فی صد علاقے پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں، اب مسئلہ صرف اس ساحلی پٹی کے حصول کا ہے جس کے ذریعے بشارالاسد کو روس سے رسد حاصل ہوتی ہے۔ اگر جہادی گروہ اس ساحلی پٹی پر قبضہ جمالیتے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بشار حکومت مزید کم زور ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے امریکا سمیت مغربی قوتیں کسی صورت جہادی قوتوں کو شام میں برسراقتدار آنے دینا نہیں چاہتیں۔

اگست 2013 کو غوطۂ دمشق میں کیمیائی حملے کے ذریعے پندرہ سو سے زاید افراد21 شہید کیے گئے۔ امریکی حکومت کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا کہ وہ اپنی چال چل دے۔ نہ مسلم اُمہ نے اس مسئلے پر لب کشائی کی اور نہ ہی انتیس ماہ سے ہر روز شامی عوام پر ڈھائی جانے والی قیامت پر او آئی سی نے کوئی اجلاس طلب کیا۔ ہاں، مغربی قوتیں اپنا کام پوری سرعت کے ساتھ کرتے رہے اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کیمیائی حملے سے بہت پہلے بشارالاسد پر دباؤ ڈال کر اس خون کی ہولی کو روکا جاتا جس سے ارضِ شام رنگین ہو چکی ہے اور فریقین میں جنگ بندی کروائی جاتی، لیکن ظلم بڑھتا گیا اور عالمی قوتیں زبانی جمع خرچ ہی کرتی رہیں، ایسے میں مظلوم شامی عوام اپنے بچاؤ کے لیے تمام تر

کوششیں کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مخالفین کے دارالحکومت دمشق کی طرف بڑھتے قدموں سے خوف زدہ ہو کر بشار حکومت نے کیمیائی ہتھیار آزمائے، جسے جواز بنا کر امریکا نے شام کے خلاف اعلان کر دیا۔

بشار حکومت پہلے تو اس حملے کی تردید کرتی رہی، مگر پھر کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کے اعتراف کے ساتھ انھیں عالمی تحویل میں دینے پر رضامند ہو گئی۔ ادھر ہمارے یہاں امریکا کی مخالفت میں شام کے مظلوم عوام کو نظر انداز کر دینے والے حلقوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ جہادی تنظیموں نے خود ہی یہ کیمیائی حملہ کیا ہے۔ کیسی ناقص سوچ ہے۔ جن پر الزام لگایا جا رہا ہے وہ تو پہلے ہی فتح کے قریب پہنچ چکے ہیں، انھیں کیا ضرورت ہے امریکا کا ساتھ دے کر اپنی کام یابی کو ناکامی میں بدلنے اور ایک تیسری قوت کو بیچ میں لانے کی؟ اگر انھیں یہی کچھ کرنا ہوتا تو وہ بہت پہلے کر سکتے تھے۔

درحقیقت شامی حکومت کی بوکھلاہٹ نے راز افشا کر دیا کہ کیمیائی حملے کا ذمے دار کون تھا۔ بشار الاسد تمام کیمیائی ہتھیار اور مواد عالمی تحویل میں دینے کے لیے تیار ہو گئے، جس کے ساتھ یہ حقائق بھی سامنے آ گئے کہ یہ مواد کب اور کہاں سے خریدا گیا۔ اب یہ شام میں اپنے حق کے لیے لڑنے والوں کو کیمیائی حملے کا ذمے دار قرار دینے والوں پر فرض ہے کہ انھوں نے کس بنا پر یہ

الزام لگایا۔

بات صرف زبانی کلامی الزام تک نہیں رہی، سوشل میڈیا پر باقاعدہ ایک وڈیو سامنے لائی گئی، جس میں کچھ لوگوں کو شام میں برسرپیکار مجاہدین قرار دیتے ہوئے انھیں میزائل کے ذریعے کیمیائی حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ یہ وڈیو آٹھ ماہ پہلے بشار حکومت کے مخالفین کا امیج خراب کرنے کے لیے بنائی گئی، جب کہ کیمیائی حملہ گذشتہ ماہ ہوا۔ غوطۂ دمشق پر کیمیائی حملہ ڈھلتی رات میں کیا گیا تھا، جب دن کی روشنی بھی نہ پھوٹی تھی اور معصوم بچوں سمیت سیکڑوں افراد نیند ہی میں موت کی نیند سو گئے تھے، متاثرین کی آنکھوں سے خون بہنے لگا تھا اور ان کے جسم ناکارہ ہو گئے تھے، اور وہ تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی تلاش میں خود کو گھسیٹ رہے تھے، مگر اس وڈیو میں دن کا اجالا پھیلا ہوا ہے۔ اس وڈیو کو پھیلانے والوں سے التماس ہے کہ اسے غور سے دیکھیں اور اپنے ضمیر کی عدالت میں سچ جھوٹ اور صحیح غلط کا فیصلہ کریں۔

امریکا کی طرف سے بشار حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان اگر روبہ عمل آتا ہے تو یہ اقدام شام سمیت پورے خطے کو بھڑکتی آگ میں جھونک دے گا، لہٰذا اس کی کسی طور حمایت نہیں کی جاسکتی۔ شامی حکومت کو مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال کر ظلم

سے روکا جاسکتا ہے، مگر واشنگٹن کا مقصد شامی عوام کو ظلم سے بچانا کب ہے، اس کے تو اپنے ہی مفادات، عزائم اور ارادے ہیں۔ شام پر حملے کا امریکی اعلان قابل مذمت ہے۔ اس حملے کی صورت میں شام کے دونوں متحارب فریقوں کا نقصان ہوگا۔ اگر بشار حکومت کا خاتمہ کرکے امریکا شام میں اپنے کسی پٹھو کو اقتدار میں لے آتا ہے اور اس کی فوجیں وہاں ڈیرے ڈال دیتی ہیں، تو عراق اور افغانستان کی طرح شام کی جہادی قوتیں اس صورت حال کو برداشت نہیں کریں گی، جس سے تشدد کی آگ مزید بھڑکے گی۔

چناں چہ جنگ کی مخالفت کرنی چاہیے، لیکن امریکا کی مخالفت میں حد سے گزر کر یہ کہنا کہ شامی حکومت کے مخالف گروہ امریکا کے اشارے پر جنگ لڑ رہے ہیں، ان ہی کی نہیں حریت اور جمہوریت کے لیے ہونے والی ہر جدوجہد کی توہین ہے۔ ایسا کہنے والے دانستہ طور پر یا نادانستگی میں ایک ظالم امریکا کے مقابلے میں دوسرے ظالم بشارالاسد کے ہم نوا ہوجاتے ہیں۔

## اس معاشرتی بگاڑ کا سبب کیا ہے؟

بے راہ روی کی جس روش پر پاکستانی معاشرہ گام زن ہے، وہاں خیر کی امید کرنا عبث ہے۔ ایک درندہ بھی کسی جانور کے بچے کو کھاتے ہوئے ہزار بار اس کی معصومیت اور بچپن دیکھ کر پیچھے ہٹ جائے، مگر انسانی کھال منڈھے جو درندے ہمارے درمیان موجود ہیں وہ بچوں پر بھی رحم نہیں کھاتے۔

میں نے ایک وڈیو دیکھی تھی، جس میں جنگل کی تاریکی میں خرگوش کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دکھایا گیا تھا، لیکن اس جگہ ان بچوں کی ماں نہیں تھی، کہاں گئی تھی چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر، یہ تو خدا جانے۔ اب وہ بچے بھوک سے بلک رہے تھے، کہ اس نیم اندھیرے میں ایک بھیڑیا آیا اور بچوں کو بھوک سے یہاں وہاں ہوتے دیکھ کر ان کے لیے چھوٹے چھوٹے پتے لا کر ان کے سامنے رکھتا گیا۔ وہ پتے لاتا، انھیں اپنے پیر سے مسلتا اور خرگوش کے سامنے کر دیتا، تاکہ انھیں خوراک نگلنے میں مسئلہ نہ ہو۔ یہ تھا بھیڑیا، اور اس کے سامنے موجود تھے، مجبور اور بے یارومددگار خرگوش کے بچے۔

بھیڑیا چاہتا تو ایک ہی وار میں ان پانچوں کو کھا جاتا، لیکن نہیں، شاید اسے ان معصوموں پر رحم آگیا۔ کیمرے کی آنکھ نے اس منظر کو محفوظ کرلیا۔ شاید خدا نے خرگوش کی ماں کو اسی لیے کسی

کام میں الجھا دیا ہو گا تاکہ بھیڑیے کی نیکی انسانوں تک پہنچ جائے، لیکن بھیڑیا تو ہم انسانوں کے قبیل میں نفرت، خود غرضی اور شیطانیت کی علامت ہے، گالی ہے۔ پھر یہ کون ہیں جو بھیڑیوں سے بھی ستر گنا زیادہ درندگی رکھتے ہیں، نہیں یہ انسان نہیں ہو سکتے، بھیڑیے نے تو معصوم بچے پر رحم کر لیا، لیکن یہ موذی جانور بچوں کی چیر پھاڑ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں کپکپائے۔

پانچ سالہ سنبل بھی ایک ایسے ہی جانور کا شکار بنی۔ اس کا بچپن، اس کی معصومیت بلکہ اس کی پوری زندگی نگل گئے یہ جانور۔ بے دردی سے توڑ ڈالا گیا اس گڑیا کو۔ دل خون کر دینے والے ایسے واقعات اب ہر روز کا قصہ بن چکے ہیں۔ ملک کا کون سا شہر کون سا علاقہ ہے جہاں ہوس، وحشت اور درندگی کی ڈائنوں نے یکجا ہو کر انسانی روپ دھارا اور کسی بچے کو کچا چبا گئیں۔ میں ان جانوروں کو کیا نام دوں، کیا تشبیہہ دوں، زبان نے وہ لفظ ایجاد ہی نہیں کیا جو ان کی غلیظ فطرت اور مکروہ سیرت کا احاطہ کر سکے۔

خرگوش کے بچوں کی پیار سے بھوک سے بلکتے بچوں کو دیکھ کر بھیڑیے کو بھی پیار آ جاتا ہے، جنگل میں درندے بھی کسی قانون اور اخلاقیات کی پیروی ضرور کرتے ہیں، ڈائنیں کلیجہ چبا جاتی ہیں، مگر غلاظت سے بھرے یہ ''انسان'' ننھے فرشتوں کو اپنی ہوس کی آگ میں جلا ڈالتے ہیں، پوری کی پوری زندگی کھا جاتے ہیں یہ انسان نما جانور۔ ان کی

حقیقت تک رسائی کے لیے، ان کی پہچان کے لیے ہمیں کوئی نیا لفظ نیا نام تلاش کرنا ہوگا، جو اپنے اندر ان کی پوری شیطانیت، غلاظت اور سنگ دلی کو سمو سکے۔

بچوں سے زیادتی کے واقعات ہوں یا عورتوں کی عزت پامال کرنے کے سانحے، یہ جاننے کے لیے کسی اعداد و شمار کے مطالعے اور تجزیے کی بھی ضرورت نہیں کہ ایسے واقعات ہمارے یہاں بڑھتے جا رہے ہیں۔ درندگی کے ایسے مظاہرے بھی ہوئے ہیں کہ ڈھائی تین سال کی بچی کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔

ہر انسان کو خون کے آنسو رلا دینے اور ہر صاحب اولاد کا دل خوف سے بھر دینے والے ان واقعات کا ایک سبب تو وہی ہے جو ہمارے ملک میں ہر جرم کی کفالت کر رہا ہے، یعنی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بے عملی، مگر یہ سبب تو صرف مجرم کو بے خوف ہو کر جرم کرنے پر اُکساتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا قبیح جرم کوئی انسان کر کیسے سکتا ہے؟ اور جواب یہ ہے کہ اپنوں کے گلے کاٹنے سے آدم خوری تک انسانوں نے بے رحمی کی تاریخ انسان ہی نے رقم کی ہے۔ ہر معاشرے میں انسان کا روپ لیے شیطان بستے ہیں۔ ان کی شیطانیت قانون کے خوف باعث متحرک نہیں ہوتی یا معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کا پاس و لحاظ انھیں حد سے گزرنے نہیں دیتا، مگر ان کی درندگی جو جگانے والے عوامل موجود ہوں تو کسی بھی لمحے وہ انسان سے درندے بن جاتے ہیں۔

اس درندگی کو بڑھاوا دینے والے

عوامل میں برقی ذرائع ابلاغ کا کردار سب سے اہم ہے۔

نوے کے عشرے میں پاکستان میں پرائیوٹ چینلز نے جنم لیا اور ساتھ ہی انٹرنیٹ کو فروغ ملا۔ ایک سرسری سا مشاہدہ بھی بتا سکتا ہے کہ بچوں اور خواتین سے زیادتی کے واقعات میں کئی گنا اضافہ بھی اسی دور سے ہوا ہے۔ ٹی وی کی اسکرین جتنے گہرے اثرات کی حامل ہے، شاید ہی کوئی دوسرا ذریعۂ ابلاغ اتنی قوت رکھتا ہو۔ ناظرین کی تعداد بڑھانے کی دوڑ میں ٹی وی چینلز اتنے آگے بڑھ گئے کہ اقدار پیچھے رہ گئیں۔ بے باکی کا سلسلہ لباس سے دراز ہوتے ہوتے ہیجان خیز مناظر، مکالموں اور ہماری قدروں کی دھجیاں اُڑاتی کہانیوں تک جا پہنچا۔ میڈیا نے معاشرے پر کس حد تک اثرات مرتب کیے اس کا اندازہ زبان کے بگاڑ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اخبارات میں چھپنے والی زبان ہو یا ٹی وی سے نشر ہونے والے الفاظ، لوگ انھیں معیار سمجھتے اور قبول کرتے ہیں، چناں چہ ٹی وی چینلز پر خصوصاً ڈراموں میں استعمال ہونے والے تہذیب سے عاری مکالمے اور الفاظ اب ہماری بول چال کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ کوئی مہذب معاشرہ اس بیہودہ زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا، مگر ہمارے یہاں اس بگاڑ کی کسی کو پرواہ نہیں۔

اس کے ساتھ انٹرنیٹ نے اتنی تیزی سے فروغ پایا کہ ہمارے شہروں میں آناً فاناً انٹرنیٹ کیبل کا گلی گلی پھیلا کاروبار وجود میں آگیا۔ ہونا تو یہ

چاہیے تھا کہ ٹی وی چینلز ہوں یا انٹرنیٹ، متعلقہ ادارے معاشرے کو ان میڈیم کے منفی اثرات سے بچانے اور ہمارے ثقافت اور اقدار کے تحفظ کے لیے ٹھوس اور مؤثر اقدامات کرتے، مگر اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اطلاعات کے مطابق فحش مواد پر مبنی ویب سائٹس کراچی میں کام کرنے والی کمپنیاں ڈیزائن کر رہی ہیں اور پاکستانی سنجیدہ اور معتبر ویب سائٹس پر بھی ''ڈیٹنگ سائٹس'' کے اشتہارات نوجوانوں کو ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ فحاشی اور بے راہ روی پھیلانے والی ان ویب سائٹس پر پابندی کیوں نہیں لگائی جاتی؟ اس صورت حال کا ذمے دار کون ہے؟ حکم راں اور متعلقہ ادارے آخر کب اس معاملے کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھیں گے۔

کوئی کچھ کہے مگر آئین کی رو سے پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ ہم ایک مسلم معاشرے میں رہتے ہیں۔ ہماری اقدار حیا کی پاسدار ہیں۔

ہماری ثقافت لباس سے زبان تک شرم اور لحاظ کی حامل ہے۔ پاکستان کے ادارے آئین کے تحت پابند ہیں کہ وہ ہماری اسلامی اقدار کے پامال نہ ہونے دیں، مگر نہ انھیں اپنی ذمے دار کا احساس ہے اور نہ کوئی ان کے فرائض یاد دلا رہا ہے۔ اس میں دورائے نہیں ہوسکتیں کہ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے۔ ٹیکنالوجی کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے، ٹی وی ہو یا انٹرنیٹ، یہ

ذرائع ابلاغ ہمیں دنیا سے جوڑے رکھتے اور ہم پر علم اور آگاہی کے نئے در وا کرتے ہیں۔ تاہم زمانے کے ساتھ چلنے کا مطلب بے حیائی اپنالینا نہیں، بے حیائی جنگل کی ثقافت اور جانوروں کی صفت ہے۔ ہمیں دنیا کے ساتھ اس طرح چلنا چاہیے کہ ہماری ثقافت اور اقدار کا سایہ ہمارے سروں پر رہے۔

## سوشل میڈیا پھیلا رہا ہے ہسٹریا

سماجی ویب سائٹس دنیا کو معاشرتی اور معاشی طور پر نقصان پہنچا سکتی ہیں
نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے ماہرِ سماجیات کا خدشہ کیا حقیقت میں تبدیل ہوجائے گا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ سوشل ویب سائٹس لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں، جن سے منسلک رہتے ہوئے یوزرز ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے اور خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہ سائٹ اپنے استعمال کرنے والوں میں منفی رجحانات جنم دینے اور ایسے رجحانات کے فروغ کا باعث بن رہی ہیں۔

حال ہی میں ایک ماہرِ سماجیات نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ سماجی ویب سائٹس کے ذریعے ایسے ہی رجحانات کے فروغ کے باعث عام لوگوں کی سطح پر عالم گیر ہسٹریا جنم لینے کا خدشہ پیدا ہوگیا ہے۔

Robertنیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ سے تعلق رکھنے والے ماہرِ سماجیات Bartholomewنے اس حوالے سے اپنے تحقیقی مقالے میں یہ کہا ہے کہ سوشل میڈیا دنیا کو ایک ہسٹریا کی طرف لے جارہا ہے۔ یہ ویسے ہی صورت حال ہے جیسی امریکا کی ریاست میساچیوسٹس کے شہر سیلم میں سولہویں صدی میں پیدا ہوئی تھی، جب بیس افراد کو جادوٹونا کرنے کے الزام میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

رابرٹ برتھولومیو نے متنبہ کیا ہے کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس عالمی سطح پر اپنے اثرات بڑھاتے ہوئے دنیا کو سماجی اور معاشی حوالے سے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سماجی ویب سائٹس کے اثرات کی وجہ سے ہونے والی ہلچل کے باعث گذشتہ چند سال کے اندر مختلف قسم کے مسائل پھوٹ پڑے ہیں، جیسے ذہنی دباؤ سے دوچار کرنے والے نفسیاتی عوامل، ذہنی صدمہ اور ہیجان وغیرہ۔ یہ سب لوگوں میں conversion disorder سے شروع ہوا ہے، جسے عام فہم زبان میں ہسٹریا کہا جاتا ہے۔ گویا یہ ویب سائٹس لوگوں میں جنون پھیلا رہی ہیں۔

رابرٹ برتھولومیو کا کہنا ہے کہ سوشل میڈیا کے اثرات سے پیدا ہونے والی یہ علامات چھوت کی بیماری کی شکل اختیار کر گئی اور اسی طرح پھیل رہی ہیں۔ یہ دراصل mass psychogenic illness یا عوام الناس کو ایک ساتھ متاثر کرتی

نفسیاتی بیماری ہے، جسے تاریخی طور پر ہسٹریا کا نام دیا گیا ہے۔

نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے اس ماہر سماجیات کا کہنا ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے کے سوشل میڈیا کے منفی اثرات ماس ہسٹیریا میں تبدیل ہو جائیں، ہمیں سمجھنا ہو گا کہ سوشل میڈیا کس طرح ہسٹریا کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔

# سوشل میڈیا کا جادو

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ میں ایک ویب سائٹ پر امریکا کی تاریخ میں ہونے والے ناقابلِ فراموش واقعات کا مطالعہ کر رہی تھی، جہاں کتنے ہی عجیب وغریب واقعات پڑھتے ہوئے میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ خاص طور پر ایک واقعہ میرے لیے بڑا پُراسرار تھا۔ یہ واقعہ سولہویں صدی کے وسط میں رونما ہوا، جب امریکی ریاست میسا چیوسیٹس کے شہر سیلم میں بیس افراد کو ایک ساتھ پھانسی پر چڑھادیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ جادو ٹونے کے زبردست ماہر مانے جاتے تھے۔ لیکن یہ تو ان کا ذاتی فعل تھا، اس پر سزائے موت جیسا انتہائی اقدام اٹھانا۔ سوال یہ ہے کہ ریاست نے ایسا کیوں کیا؟ دراصل اس شہر میں پہلے ایک شخص جادو ٹونے کا ماہر بنا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، یوں جادوگر کے پاس لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ کچھ جادو سیکھنے کے خواہش مند تھے تو کچھ جادو کروانے آتے تھے۔ اب بات اس شہر تک محدود نہ رہی۔ دور دراز علاقوں سے بھی لوگ جادوگر بننے کے لیے آنے لگے۔

ایک طرف جادوگروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، تو دوسری طرف لوگوں کی زبانوں پر سحر کے تذکرے تھے اور ہر ایک ذہن اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ

وہ جادو کے گُر سیکھ لے۔ لوگ غیر ارادی طور پر اس جادوئی دنیا کے اسیر بن کر اپنی حقیقی ذمے داریوں سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ابتدا میں حکومتی حلقے لوگوں کی اس کیفیت کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ معاملے کی تہہ تک اس وقت رسائی حاصل ہوئی جب دوسرے شہروں، قصبوں اور دیہات سے لوگ بہت بڑی تعداد میں میساچوسیٹس کا رُخ کرنے لگے۔ تب حکومت کو اس معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا اور ریاست اپنی ذمے داری نبھانے کے لیے آگے آئی۔

حکومت اس فتنے کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی تھی، سو جادو ٹونا کرنے کے الزام میں بہت سے افراد کو حراست میں لے لیا گیا، ان پر مقدمہ چلایا گیا اور جرم ثابت ہونے پر بیس جادوگروں کے گلے میں پھندے ڈال دیے گئے۔

اگر جادو سیکھنے سکھانے کا یہ سلسلہ محدود پیمانے پر جاری رہتا اور اس سے سماجی اور معاشی زندگی متاثر نہ ہوتی تو حکومت کو اتنے سخت اقدام کی ضرورت محسوس نہ ہوتی، لیکن بات ذاتی افعال کے دائرے سے نکل کر معاشرتی بگاڑ تک جا پہنچی تھی، چناں چہ حکومت کو نہایت سختی کے ساتھ اس معاملے سے نمٹنا پڑا۔

آج اکیسویں صدی میں بھی ہم ایک جادو کے اسیر ہیں۔ ہم سوشل ویب سائٹس کے شہر طلسم میں جی رہے ہیں۔ سماجی ویب سائٹس ایک جادو ہیں اور ہم روز بہ روز ان کے سحر میں جکڑے چلے جا رہے ہیں اور غیر محسوس طور پر ان کی ذہنی غلامی

میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

سوشل ویب سائٹس جہاں لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لائی ہیں، وہیں یہ ایسی زمینیوں کی صورت اختیار کر گئی ہیں جن پر نفرتوں کے بیج بوئے اور تعصب کی فصلیں اگائی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے اس بوائی اور کاشت سے زہر کی فصل ہی حاصل ہونی ہے۔

آنکھوں کو خیرہ کردینے والی روشنی میں پہلے پہل اپنا آپ اپنا نمایاں نظر آنا کسی سحر سے کم نہیں ہوتا۔ اسی طرح جیسے پہلی بار کسی نوجوان کے ہاتھ میں شناختی کارڈ آتا ہے اور اپنی پہچان کا احساس پورے جسم میں خوشی اور فخر کی لہر دوڑادیتا ہے۔ یہ ویب سائٹس تو اس کیفیت سے کہیں زیادہ سحر انگیز ہیں۔ اپنا نام، اپنا تعارف، اپنی تصویر، رتبہ اور ہر وہ قابل ذکر فعل جو ہم نے سرانجام دیا ہو یا نہ دیا ہو اپنے نام کے ساتھ ان ویب سائٹس کی دیواروں پر آویزاں کرکے ہم خوشی سے نہال ہو جاتے ہیں۔ یہ محاورہ اب پُرانا ہوگیا کہ ''نیکی کر دریا میں ڈال'' اب تو یوں ہے کہ کچھ بھی کر فیس بُک پر ضرور ڈال۔

ان ویب سائٹس کو وجود میں آئے ہوئے تقریباً دس بارہ سال کا عرصہ گزرا ہے اور پاکستان میں گذشتہ تین سال کے دوران لوگ ان کے سحر میں نہایت تیزی سے

مبتلا ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں ان سائٹس کی مقبولیت اور ان کے صارفین کی تعداد میں نہایت تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور ہوتا ہی جارہا ہے۔

اتنے کم وقت کے دوران پاکستان میں سوشل ویب سائٹس کا بخار پھیلنے کی وجہ انتخابات تھے۔ انتخابات کے دوران جہاں گلیاں، سڑکیں اور میدان انتخابی سرگرمیوں کا مرکز بنے، وہیں سیاسی جماعتوں اور ان کے حامیوں نے اپنی اپنی جماعت کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے سوشل میڈیا کا خوب استعمال کیا۔ ایسے میں سوشل ویب سائٹس پر اپنے حق میں دلائل سے زیادہ مخالفین کے خلاف پروپیگنڈے اور الزامات کا وہ طوفانِ بدتمیزی مچا کہ دیکھنے اور پڑھنے والی زبان توبہ توبہ کرنے لگی اور ہاتھ کانوں کو چھونے لگے۔ پگڑیاں اچھالنے اور گریبانوں پر ہاتھ ڈالنے کا وہ سلسلہ تھا کہ کوئی گناہ گار بچا نہ کسی زاہد کی عزت محفوظ رہی۔ کسی کی داڑھی اور دستار کو نشانہ بنایا گیا تو کسی کی لبرل سوچ پر تیر برسائے گئے۔ کمپیوٹر ایڈیٹنگ کے ذریعے مخالف سیاست دانوں کی ایسی ایسی بیہودہ اور مضحکہ خیز تصاویر بنا کر پوسٹ کی گئیں کہ اللہ کی پناہ۔ جاننے والے سچ اور جھوٹ کا فرق جانتے ہیں، لیکن بعض تصاویر بناتے ہوئے ایسی صفائی دکھائی گئی کہ بالغ اور باشعور ذہن بھی دھوکا کھا گئے۔

الیکشن ہوگئے، نتائج آگئے، جیتنے والے خوشیاں اور ہارنے والے غم مناکر اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہوگئے، قصہ ختم ہوا مگر سوشل ویب سائٹس پر اٹھنے والے اس طوفانِ بد تمیزی کی تلخ یادیں اب بھی محفوظ ہیں، حساس دلوں میں بھی اور ان سائٹس کے پیجز پر بھی۔

انٹرنیٹ ایک ایسی ٹیکنالوجی ہے جو ہمیں ترقی کی راہوں پر دنیا کے ساتھ چلنے کا ہُنر سکھاتی اور ہمارے دلوں میں اس سفر کی اُمنگ جگاتی ہے، لیکن ہم نے اس ٹیکنالوجی کو اخلاقی پستی کے مظاہروں کا سامان بنادیا ہے۔ طنز، طعنے، الزام تراشی، ہتک آمیز رویہ، یہاں تک کہ گالیاں بھی سوشل ویب سائٹس پر ہمارے اخلاقی بحران کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اختلاف رائے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے، کسی نظریے، رائے اور شخصیت پر تنقید کرنا بھی کسی طور غلط نہیں، تاہم یہ سب تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے ہونا چاہیے، لیکن میں نے بہ ظاہر بڑے معقول اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے آپے سے باہر ہوتے دیکھا ہے، جو کسی سیاسی یا نظری بحث کے دوران مقابل پر ذاتی حملے کرنے لگتے اور اس کی کردار کشی پر اتر آتے ہیں۔ یہ سب سوشل ویب سائٹس پر روز ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

سماجی رابطوں کی ویب سائٹس کے سحر میں گرفتار ہم لوگ ان کے اثرات بڑی تیزی

سے قبول کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا میڈیا ہے جس کے ذریعے مختلف الخیال لوگوں کو ایک دوسرے سے براہ راست مکالمے کا موقع ملتا ہے اور ہم دوسروں کی رائے، سوچ اور نظریات جان پاتے ہیں۔ ایسا ہو بھی رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ نفرت سے بھری، اشتعال انگیز پوسٹس، شیئرنگ اور دوسروں کی تحقیر اور تذلیل پر مبنی کمنٹس نفرتوں میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ یوں رابطوں کا یہ ذریعہ ہمارے کسی بھی قسم کا نظری، فکری، مذہبی اور سیاسی اختلاف رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوشل ویب سائٹس کا نام پانے والی ان جادوگرنیوں کو ہم پھانسی دے دیں۔ ایسا کرنا آگاہی کے ان دریچوں کو بند کر دینے کے مترادف ہوگا جن سے ہمارے سماج کو آگاہی کی روشنی میسر آ رہی ہے۔ درحقیقت یہ سائٹس دوسروں کی بات سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے کا ایک نہایت موثر ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے وہ خبریں اور اطلاعات بھی عام آدمی تک پہنچتی ہیں جو بہ وجوہ مین اسٹریم میڈیا پر نہیں آپاتیں۔ ان کی بہ دولت ان سے وابستہ ہر شخص اپنی رائے، خیالات اور صلاحیتوں کا اظہار کر سکتا ہے۔ ایسے موثر اور مفید ذریعے کو نفرت واشتعال پھیلانے اور اخلاق سوز زبان اور تصاویر کے ذریعے دل کی بھڑاس نکالنے کا وسیلہ بنانا بھیانک جرم ہے۔ یوں تو یہ ان سائٹس کے منتظمین کا بھی فرض ہے کہ وہ اشتعال اور نفرت پر مبنی مواد اپنی سائٹس پر نہ رہنے دیں، اور بعض معاملات میں ایسا ہوا بھی ہے، لیکن اس میڈیا سے وابستہ ہر شخص کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ خود ایسا مواد پوسٹ اور

شیئر کرے، نہ اس قسم کے دل آزاری پر مبنی کمنٹس کرے۔ اس طرح کا مواد ویب سائٹس سے ہٹوانے کے لیے ان کا اپنا اپنا طریقۂ کار بھی موجود ہے، جس پر عمل کرکے یہ فریضہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے اپنی یہ ذمے داری نہ نبھائی تو رابطوں کی یہ سائٹس رابطے توڑنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

## سوشل میڈیا ہماری زندگیوں میں تیزی سے سرایت کرتا جارہا ہے

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کا اثرونفوذ سال بہ سال بڑھتا جارہا ہے۔ یہ ایک نئی اور رنگارنگ دنیا ہے، جس کے جنم لینے کے ساتھ ہی سرگرمیوں، تعلقات اور اصطلاحات کے نئے سلسلے وجود میں آ گئے۔

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس ایک طرف مشترکہ دل چسپیاں رکھنے والے افراد کو قریب لائی ہیں، وہیں سیاست سے تجارت تک ہر شعبے میں سرگرم لوگوں کے لیے بھی یہ سائٹس ناگزیر ہوتی جارہی ہیں۔ یہاں ہم قارئین کی دل چسپی اور معلومات کے لیے سوشل میڈیا کی بابت بعض اہم حقائق اور اعدادوشمار دے رہے ہیں:

فیس بک

☆فیس بک کے 751 ملین یوزر اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ تک موبائل فون کے ذریعے رسائی حاصل کرتے ہیں، جس کے لیے سات ہزار مختلف ڈیوائسز استعمال کی جاتی ہیں۔

☆یوزرز کے لیے فیس بک کی دس 10 ملین سے زاید اپلی کیشنز دست یاب ہیں۔

☆فیس بک کے 23 فی صد استعمال کنندہ اپنا اکاؤنٹ دن میں پانچ دفعہ سے زیادہ مرتبہ چیک کرتے ہیں۔

☆ایف بی پر ہر روز 350 ملین سے زاید تصاویر اپ لوڈ کی جاتی ہیں۔

☆ایف بی پر کی جانے والی کوئی بھی پوسٹ 75 فی صد توجہ اور شراکت اپنے سامنے آنے کے 5 گھنٹے کے اندر حاصل کرتی ہے۔

ٹوئٹر

☆ٹوئٹر پر ہر ماہ متحرک رہنے والے استعمال کنندگان کی تعداد 288 ملین ہے۔

☆28 فی صد ری ٹوئٹس متعلقہ ٹوئیٹ کی عبارت میں ''براہ مہربانی ری ٹوئیٹ کریں'' لکھے جانے کی وجہ سے کیے جاتے ہیں۔

☆عمر کے حساب سے ٹوئٹر استعمال کرنے والوں میں سب سے زیادہ تیزی سے پچپن سے چونسٹھ سال تک کی عمر کے افراد کا اضافہ ہوا ہے، جن کا تناسب 79 فی صد ہے۔

☆ٹوئٹر کے 60 فی صد استعمال کنندہ اس ویب سائٹ تک موبائل فون کے ذریعے رسائی حاصل کرتے ہیں۔

☆ٹوئٹر پر بنائے جانے والے اکاؤنٹس میں سے تقریباً 20 ملین جعلی (فیک) ہیں۔

☆روزانہ اوسطاً 400 ملین ٹوئٹس کیے جاتے ہیں۔

☆ٹوئٹر کے ہر اکاؤنٹ سے اوسطاً 208 ٹوئیٹ کیے جاتے ہیں۔

گوگل پلس

☆گوگل پلس پر 343 ملین سے زاید متحرک یوزرز موجود ہیں۔

☆اس پلیٹ فارم کے یوزرز میں 69 فی صد سے زیادہ مرد ہیں۔

☆ گوگل پلس کے اسّی فی صد یوزر ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ لاگ آن ہوتے ہیں، جب کہ ساٹھ فی صد روزانہ لاگ آن ہوتے ہیں۔

☆اس ویب سائٹ کا ''پلس ون بٹن'' ہر روز پانچ بلین مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے۔

☆اینی میٹڈ GIF گوگل پلس پر سب سے زیادہ توجہ حاصل کرنے والی پوسٹ ہوتی ہے۔

لنکڈان

☆لنکڈان پر کُل ایک اعشاریہ پانچ ملین گروپ موجود ہیں۔

☆27 فی صد یوزر موبائل کے ذریعے لنکڈان سے رابطہ جوڑتے ہیں۔

☆اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کے 50 فی صد استعمال کنندہ گریجویٹ ہیں۔

☆لنکڈان کے 42 فی صد یوزر اپنا پروفائل باقاعدگی سے اپ ڈیٹ کرتے ہیں۔

انسٹاگرام

☆اس فوٹو شیئرنگ ویب سائٹ پر اب تک 16 بلین تصاویر اپ لوڈ کی جاچکی ہیں۔

☆انسٹاگرام کا ہر یوزر اوسطاً 40 تصاویر رکھتا ہے۔

☆ ''ایم ٹی وی'' انسٹاگرام کا سب سے زیادہ فالو کیا جانے والا برانڈ ہے، جس کے ایک اعشاریہ دو فی صد فالوورز ہیں۔

☆انسٹاگرام پر ہر ایک سیکنڈ کے دوران 8ہزار یوزر کسی تصویر کو لائیک کرتے ہیں۔

☆اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر ہر ایک سیکنڈ کے دوران ایک ہزار کمنٹس کیے جاتے ہیں۔

☆انسٹاگرام پر لاؤنچ ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر 5 ملین وڈیوز شیئر کی جاتی ہیں۔

☆اس سائٹ پر ہر روز 5 ملین سے زیادہ تصاویر اپ لوڈ کی جاتی ہیں۔

پن ٹریسٹ

☆اس سماجی ویب سائٹ کے یوزرز میں اکثریت خواتین کی ہے، جن کا تناسب 69 فی صد سے زیادہ ہے۔

☆ پن ٹریسٹ کے مواد میں سب سے بڑا حصہ غذا کے حوالے سے کنٹینٹ پر مبنی ہے، جس کا تناسب 57 فی صد ہے۔

☆اس ویب سائٹ کی 80 فی صد ''پنز'' کو ''ری پنز'' کیا جاتا ہے۔

☆ Nordstorm پن ٹریسٹ کا مقبول ترین برانڈ ہے، جسے 44 ملین فالوورز حاصل ہیں۔

ملے جُلے حقائق :

☆ہر ماہ ایک بلین یوزر یوٹیوب کا وزٹ کرتے ہیں۔

☆مجموعی طور پر چار اعشاریہ دو بلین سوشل ویب سائٹس سے مربوط ہونے کے لیے موبائل فون کو وسیلہ بناتے ہیں۔

☆مصنوعات کے پیجز میں مردوں سے زیادہ خواتین دلچسپی رکھتی ہیں۔

☆دنیا کے مارکیٹرز میں سے 23 فی صد بلاگنگ اور سوشل میڈیا پر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔

☆ویب یوزرز کی مجموعی تعداد کا 46 فی صد صرف خریداری کی غرض سے سوشل ویب سائٹس سے ناتا جوڑتا ہے۔

## یہ گھروں کے محاذ

گولی چلی اور وہ عورت خون میں نہا کر جان سے گزر گئی۔ یہ قتل کی واردات تھی۔ ایسی وارداتیں ہمارے ملک میں روز ہی درجنوں کی تعداد میں ہوتی ہیں، مگر اس واقعے میں سا نحے سے بڑا سا نحے یہ ہے کہ گولی چلانے والے کی عمر ہے صرف 10 سال، اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ گزرا کہ قاتل نے مقتولہ کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ انگریزی اخبار ''ایکسپریس ٹریبیون'' میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق یہ واقعہ لاہور میں پیش آیا۔ یہ خبر بتاتی ہے کہ قانون سے متعلق ایک اہم عہدے پر فائز شخص کے اپنی بیوی سے اختلافات تھے۔ میاں بیوی باہمی چپقلش کے باعث ہونے والے جھگڑوں کے دوران ایک دوسرے کے خلاف سخت زبان استعمال کرتے تھے۔ ماں کمسن بیٹے پر الزام لگاتی تھی کہ اس ''جنگ'' میں وہ اپنے باپ کا حمایتی ہے۔ وقوعے کے روز ماں نے بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹا۔ بیٹے نے گھر میں رکھی 12 بور کی گن نکالی اور ماں پر گولیاں برسا دیں۔

میں نے یہ خبر پڑھی تو دل لرز کے رہ گیا، ذہن یاسیت میں ڈوب گیا۔ میں سوچنے

گی خون کے رشتے خونی کیوں ہو جاتے ہیں؟ اور پھر ماں جیسا رشتہ۔ یہ خبر پڑھنے والے لوگ بیٹے کو ظالم قرار دیں گے اور ماں کے لیے دکھی ہوں گے، مگر کیا یہی سچ ہے؟
ایک ہی خاندان کے افراد کے ایک دوسرے کے ہاتھوں نقصان اٹھانے اور قتل ہو جانے کے واقعات نئے نہیں، ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں باپ اولاد کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے تو کہیں اولاد باپ کو خون میں نہلا دیتی ہے۔ کوئی بھائی اپنے ماں جائے کے ہاتھوں ابدی نیند سو جاتا ہے تو کبھی کوئی بہن اپنی بہن کے خون سے ہاتھ رنگ لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ماؤں کے اولاد کو مار ڈالنے کے واقعات بھی دل پر خنجر چلاتے رہے ہیں۔ جس روز یہ خبر میری نظر سے گزری، اس کے اگلے ہی دن کے اخبارات میں راولپنڈی میں ایک ریٹائرڈ بریگیڈیر، ان کی اہلیہ اور دو بیٹیوں کے قتل میں اسی خاندان کے ایک فرد کے ملوث ہونے کی خبر تھی۔ قاتل مقتولین کا بیٹا اور بھائی تھا، جس نے پسند کی شادی نہ ہونے اور جائیداد کے تنازعے پر اپنے ہی گھر خون کی ہولی کھیلی۔
اس نوعیت کے سارے ہی واقعات دل دکھانے والے ہوتے ہیں، مگر لاہور میں جنم لینے والا یہ المیہ ان سے کہیں مختلف اور زیادہ الم ناک ہے کہ اس میں ماں کے قتل کا ارتکاب جس بیٹے سے سرزد ہوا ہے اس کی عمر صرف دس سال ہے۔ کھلونوں

سے کھیلنے کی اس عمر میں اس نے بندوق کو کھلونا بنالیا۔ ظاہر ہے یہ بچہ نہ زمین و جائیداد کے معاملے پر اپنی ماں سے برہم تھا نہ ہی پسند کی شادی جیسا کوئی ایشو اس قتل کی بنیاد بنا۔ خبر کے مطابق یہ میاں بیوی کی باہمی تلخی تھی، جو اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سخت ترین زبان استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ ماں اپنے صرف دس سال کے بیٹے کو "باپ کی حمایت" کا طعنہ دیتی تھی۔ ایسے ماحول میں پلنے والا بچہ جو طعنے بھی سنتا ہو، اسے تلخی، زہر اور نفرت سے بھرا ہونا ہی تھا۔

یہ ایک گھر کی کہانی نہیں۔ ہمارے یہاں کتنے ہی خاندان باہمی نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہونا یا ان کے بیچ کسی بھی نوعیت کے اختلافات باہمی رشتے کو کمزور کردیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے دلوں میں موجود ناپسندیدگی رویوں میں در آتی ہے۔ بڑھتی ہوئی بے گانگی حیات کے شراکت داروں کو کبھی کبھی ایک دوسرے سے اس قدر دور لے جاتی ہے کہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے الگ الگ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ شادی کے بندھن میں بندھنے والے مرد اور عورت کے درمیان صرف میاں بیوی کا رشتہ نہیں ہوتا، گزرتا وقت انھیں بچوں کے ماں باپ کی صورت ایک نئے تعلق اور ناتے میں بھی باندھ دیتا ہے۔ اس ناتے میں بندھے افراد اپنے پہلے اور اصل رشتے کی بنیادیں ہل جانے کے باوجود میاں بیوی کی حیثیت سے پوری زندگی گزار

دیتے ہیں، دریا کے دو کناروں کی طرح۔ ایسے جوڑوں میں سے کم ہی ایسے بالغ نظر اور باشعور ہوتے ہیں جو اپنے اختلافات کے شعلوں سے اپنی اولاد کے جذبات اور احساسات کی دنیا کو بچائے رکھیں۔ ورنہ ہوتا یوں ہے کہ ماں باپ کی آپس کی رنجش اولاد کی زندگی جہنم بنا دیتی ہے۔

آپ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں۔ آپ کو اچھے برے ہر قسم کے لوگ نظر آئیں گے۔ اگر فرداً فرداً صحت مند رویے رکھنے والے اور دوسروں کے لیے آزار بننے والے رجحانات کے حامل لوگوں کے پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو مستثنیات کو چھوڑ کر یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مثبت رویوں کے مالک افراد کی تربیت ایسے ماں باپ نے کی جن کے مابین محبت اور اعتماد کا رشتہ تھا اور منفی رویے رکھنے والے افراد کے والدین ایک دوسرے سے عداوت کی آگ میں جلتے رہے تھے۔

دنیا کا شاید ہی کوئی گھر ہو جہاں میاں بیوی میں کبھی اختلافات نہ ہوئے ہوں۔ ایسے گھرانوں کی بھی کمی نہیں جہاں شوہر اور بیوی کے درمیان اتنے فاصلے ہو جاتے ہیں کہ وہ کبھی قریب نہیں آپاتے۔ ذہنوں اور دلوں کا فاصلہ اپنی جگہ، لیکن کیا ضروری ہے کہ اختلاف اور عدم مطابقت کو نفرت میں ڈھال لیا جائے، ایسی نفرت کہ زبان ایک دوسرے پر شعلے برسائے۔ اس روش پر گامزن جوڑوں کے آپس کے جھگڑے چیخ و پکار تک ہی محدود نہیں رہتے، بلکہ اپنے اپنے

حق میں حمایت کے حصول کے لیے بچوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا بھی جاتا ہے اور باپ کی طرف داری یا ماں کی حمایت کے طعنے بھی دیے جاتے ہیں۔ ایسے آتشیں ماحول میں پرورش پانے والے بچے کی شخصیت سیاہیوں میں ڈوب اور آگ میں جل کر اپنا مسخ شدہ چہرہ بناتی ہے۔ عدم برداشت کی جو فضا ہم اپنے سماج اور سیاست میں دیکھتے ہیں، اس کی بنیاد گھروں ہی میں توپڑی ہے۔

دس سالہ بچے کے ہاتھوں ماں کے قتل کا سانحہ بھی ایک ایسے ہی گھرانے میں پیش آیا جہاں بچے کے لیے اس کے والدین ایک دوسرے کے دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ واقعہ کشیدگی کی فضا سے آلودہ اور بے گانگی کی گھٹن کے شکار ہر گھر کے دروازے پر دستک دے کر کہہ رہا ہے کہ ماں باپ اپنے اختلافات میں بچوں کو نہ گھسیٹیں، بلکہ دو کناروں پر کھڑے میاں بیوی جب ماں باپ کی حیثیت سے اولاد کے سامنے آئیں تو اسے ان کی قربت تحفظ کا احساس دے، نہ کہ وہ اس اندیشے میں مبتلا رہیں کہ وہ ایک ایسے گھر کے مکیں ہیں جو ٹوٹنے کو ہے۔

# یوٹیوب کی بندش: پروکسی ویب سائٹس نے پابندی کو مذاق بنا کر رکھ دیا ہے

دنیا بھر کی سماجی ویب سائٹس کا ذکر کیا جائے تو یوٹیوب سر فہرست قرار پائے گی۔
دنیا کے نمبر ون سرچ انجن گوگل کی ملکیتی ویب سائٹ ''یوٹیوب'' انتہائی مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ سے متنازع بھی ہے۔ یوٹیوب کو 14 فروری 2005 کو متعارف کرایا گیا جس کا مرکزی دفتر ''سین بورونو'' کیلی فورنیا امریکا میں ہے۔ یوٹیوب ویب سائٹ کو اسٹیو چن، چاڈ ہرلی اور جاوید کریم نے ''براڈکاسٹ یورسیلف'' کے سلوگن کے ساتھ لاؤنچ کیا۔ یہ ایک ویڈیو ہوسٹنگ ویب سائٹ ہے، جس کے ذریعے صارفین اپنی ویڈیوز، انٹرنیٹ کی دنیا میں بہ آسانی لا سکتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر یہ پہلی ویب سائٹ ہے جو 54 مختلف زبانوں میں ویڈیوز سرچ کرنے کی سہولت دیتی ہے۔
گوگل میلنگ اکاؤنٹ سے رجسٹرڈ صارفین یوٹیوب پر اپنا مواد بہ آسانی دے سکتے ہیں، جب کہ غیر رجسٹرڈ صارفین یہاں موجود ویڈیوز سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ سی بی ایس، بی بی سی اویولو، ویوو سمیت دیگر کمپنیاں یوٹیوب کی شراکتی تنظیم کا حصہ ہیں، یوٹیوب کے قانون کے تحت 16 سال سے بڑے افراد ہی

اس کے رجسٹرڈ صارفین بن سکتے ہیں۔

یو ٹیوب ایک ایسی ویب سائٹ ہے جس نے سماجی طور پر اپنے بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کے ذریعے عام فرد کو سوسائٹی اور دنیا تک رسائی کا موقع ملا۔ یو ٹیوب سے لاتعداد گم نام لوگ سیلیبریٹی بن کر سامنے آچکے ہیں۔ جہاں کسی بھی سوشل نیٹ ورکنگ کی ویب سائٹ کے فوائد ہیں وہاں اس کے نقصانات بھی ہیں اور یہ نقصانات انسان ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ یو ٹیوب پر ایسی ویڈیوز کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جن میں مخالفین کی طرف سے کسی فردِ واحد، تنظیم یا مذہب کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہو، جب کہ مختلف تعلیمی شعبوں سے متعلق معیاری ویڈیوز، زبانوں کو سیکھنے کے لیے باقاعدہ درجہ بہ درجہ کلاسز کا اہتمام، ہنر، آرٹ، ڈرائنگ، اسکیچ پینٹنگ سے متعلق ویڈیوز غرض یہ کہ ہر قسم کا معلوماتی اور مفید مواد اس ویب سائٹ پر موجود ہے، جس کے ذریعے دنیا کے کسی بھی کونے میں گھر میں بیٹھے فرد کے لیے بھی تعلیم اور ہنر اور معلومات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

دنیا بھر میں مختلف اوقات میں یو ٹیوب کی سروسز کو بلاک کیا جاتا رہا ہے۔ فی الوقت پاکستان میں یوٹیوب بند کردی گئی ہے، جس کی وجہ گذشتہ سال امریکا میں تیار کی گئی ایک اسلام مخالف فلم کی ریلیز تھی، اس فلم کی وجہ سے

مسلمانوں کے جذبات کو شدید دھچکا پہنچا۔ چناں چہ پاکستان نے گوگل کمپنی کی انتظامیہ سے اس فلم کے تمام مواد کو ہٹانے کا مطالبہ کیا، لیکن گوگل نے اس مواد کو حذف کرنے سے صاف انکار کردیا، جس کے باعث پاکستان میں یوٹیوب کی سروس بند کردی گئی۔

یوٹیوب کہنے کو تو پاکستان میں بند ہے لیکن جو لوگ جانتے ہیں وہ اس ویب سائٹ تک ایک سافٹ ویئریا پروکسی ویب سائٹس کے ذریعے بہ آسانی رسائی حاصل کرلیتے ہیں۔ پاکستان میں اس وقت یوٹیوب کی طرز پر چلنے والی ایک اور ویب سائٹ بھی کام کررہی ہے جس پر وہ تمام قابل اعتراض مواد موجود ہے جس کی وجہ سے یوٹیوب کو بند کیا گیا، لیکن حکومت شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستانی حکومت کی طرف سے یوٹیوب کی مالک کمپنی گوگل کی انتظامیہ، تیکنیکی ماہرین اور ان ممالک کے حکام سے بھی، جہاں یوٹیوب پر متنازع ویڈیوز بلاک کی گئی ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے لیے مخصوص قابل اعتراض مواد کو خود بلاک کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یوٹیوب کا پاکستان کے لیے ڈومین حاصل نہ کیا جائے۔

اس ڈومین کے حصول کے لیے حکومت کو کمپنی کو تحفظ کی ضمانت دینا لازم ہے، جس کے لیے قانون سازی یعنی الیکٹرانک کرائم بل میں ترمیم کی ضرورت ہے، حکومت

کو چاہیے کہ جلدازجلد قانونی باریکیوں اور وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اس مسئلے پر توجہ دے، کیوں کہ دوسری صورت میں تو اب بھی لوگ اس مواد تک رسائی حاصل کر رہے ہیں، جب کہ یوزرز کی بڑی تعداد کے لیے یوٹیوب پر موجود معلوماتی اور مثبت تفریح کے خزانے تک رسائی کا راستہ بند ہے۔

# ننھے منّوں کی پہلی غذا

ماں قدرت کا اَن مول تحفہ ہے۔ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے نشیب وفراز میں آنے والے مصائب اور سختیاں سہل ہو جاتی ہیں۔

قدرت نے انسان کے پہلی غذا کا بندوبست ماں کے ذریعے کیا ہے، جو بچے کی بہترین نشوونما کا ضامن بھی ہے۔ یہ بچے کی ذہنی نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

دودھ پلانا ماں کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ماں کا دودھ بچے کی غذائی ضرورت کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ یہ سوال تقریباً تمام ماؤں کے لیے پریشانی اور فکر کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کی رائے کے مطابق بچے کا وزن عمر کے لحاظ سے ٹھیک ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماں کا دودھ بچے کے لیے کافی ہے۔ اگر ماں محسوس کرتی ہے کہ وہ بچے کی غذائی ضرورت پوری نہیں کرپارہی تو اس مسئلے کا پہلا حل یہ ہے کہ وہ دودھ پلانے کے وقفے کا دورانیہ کم کردے، کیوں کہ یہ امر بچے کی غذائی ضرورت پوری کرنے میں خاصا معاون ثابت ہوتا ہے، جب کہ ماؤں کی عمومی سوچ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ دورانیہ کم کرنے کے بہ جائے بڑھاتی چلی جاتی ہیں، جو کہ درست نہیں۔ اس کے علاوہ شیر خوار بچوں کی مائیں مقررہ وقت پر کھانا کھانے کا معمول بنانے کے ساتھ

ضروری صحت بخش اجزا سے بھرپور غذا کا استعمال شروع کر دیں تو بہ آسانی اپنے بچے کی غذائی ضروریات پوری کر سکتی ہیں۔

اکثر ملازمت پیشہ مائیں اپنے شیر خوار بچوں کی یہ ضرورت پوری نہیں کر پاتیں۔ ایسی صورت میں بچے کو ڈبے کا دودھ پلانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ اوسطاً ساڑھے پانچ سو سے ساڑھے سات سو روپے کا دودھ کا ایک ڈبا بچے کی پانچ دن کی غذائی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اس طرح ہر مہینے ایک خاص رقم دودھ کے لیے رکھنی پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں دفاتر یا فیکٹریوں میں بچوں کے لیے ڈے کیئر یا بے بی کیئر کا رواج نہیں۔ بہت سے اداروں میں ملازمت کرنے والی خواتین میٹرنٹی لیو کی سہولت سے محروم ہیں۔ ان خواتین کو مجبوراً بچے کو اوپر کا دودھ دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ عوامی مقامات پر بھی ماؤں کے لیے کوئی ایسی جگہ مختص کرنے کا رواج نہیں جہاں وہ بچے کو دودھ پلا سکیں، چناں چہ گھر سے باہر نکلنے والی خواتین کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کوشش ہونی چاہیے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی بچے کا پیٹ بھر دیا جائے۔

ماؤں کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ شیر خواری کی عمر میں اپنے بچے کو اپنا دودھ لازمی پلائیں، لیکن اگر کسی طبّی یا معاشی عذر کے باعث یہ ممکن نہ ہو تو متبادل غذا کا اہتمام کرنا چاہیے۔ بچے کو اوپر کا دودھ دینا یقیناً ایک

محنت طلب کام ہے، کیوں کہ اس میں بوتل کی صفائی کا خیال رکھنا اور صاف اور ابلے ہوئے پانی کا استعمال بہت ضروری ہے۔ دوسری صورت میں بچے کو دست اور اسہال کی شکایت ہو سکتی ہے۔ دودھ کی تیاری کے دوران صفائی کا خیال نہ رکھنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بچہ جب ایک مرتبہ اوپر کا دودھ پی لیتا ہے تو پینے میں آسانی کی وجہ سے زیادہ دودھ مانگتا ہے۔ ڈبے کے دودھ میں لیکوڈ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اس لیے بچے کو اس کا ذایقہ زیادہ خوش گوار لگتا ہے، لیکن یاد رہے کہ بچے کو زیادہ دودھ دینا اس کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض مائیں دودھ بناتے ہوئے ڈبے پر تحریر ہدایات نہیں پڑھتیں، دودھ پتلا نظر آنے کی صورت میں خشک دودھ کی مقدار میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہ طرزِ عمل بچے کی صحت کو متاثر کر سکتا ہے۔ اس طرح بچہ بیمار بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس دودھ کی مقدار کم رکھنا بھی خطرناک ہے۔ اس کا براہ راست اثر بچے کی صحت پر پڑتا ہے۔ اس لیے دودھ تیار کرتے ہوئے تناسب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے کہ بچے کے لیے کون سا دودھ زیادہ بہتر ہے۔

ماں کا دودھ ایک خاص درجۂ حرارت رکھتا ہے، یہ بھی ننھے مُنوں کے لیے قدرت

کے خصوصی انتظام کا حصہ ہے۔ بچے کو بوتل کا دودھ دیتے ہوئے بھی معتدل درجۂ حرارت کا خیال رکھنا چاہیے۔ ماہرین کی رائے میں بڑھتی عمر کے ساتھ بچے کو دودھ کے ساتھ نرم اور بہ آسانی ہضم ہونے والی غذا بھی دینی چاہیے۔ بہت سی ماؤں کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کا بچہ روتا بہت ہے۔ اس بے وجہ رونے کا سبب اس کا پیٹ نہ بھرنا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے چھے ماہ کی عمر کے بعد جس طرح بچے کی عمر بڑھتی جائے اسے ٹھوس غذا دینا شروع کر دیں۔ ابتداً اس میں مشکل پیش آئے گی، بچہ ابکائیاں لے گا، قے کرے گا، لیکن مستقل مزاجی سے یہ مشق جاری رکھیں، آخرکار بچہ ٹھوس غذا کا عادی ہو جائے گا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بچے ٹھوس غذا کھانے کی ''مشقت'' سے بچنے کے لیے دودھ پینے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ماں کو چاہیے کہ وہ بچے کی بھوک کا اندازہ لگاتے ہوئے دودھ اور غذا کا ایسا تناسب رکھے کہ بچہ دودھ بھی پی لے اور نشوونما میں مددگار غذائی اجزا بھی خوراک کی صورت میں اسے مہیا ہوتے رہیں۔ جسمانی اور ذہنی نشوونما کے اس اہم ترین دور میں بچے کی غذائی عادت کو متوازن بنانے کی کوشش شروع کر دینی چاہیے۔

ماں کے دودھ کا کوئی نعم البدل نہیں، اس لیے ہر ممکن کوشش یہی ہونی چاہیے کہ قدرت کا یہ اَن مول تحفہ اپنے بچے تک لازمی پہنچائیں۔ یہ فقط اس کی غذائی ضرورت کی تکمیل نہیں، بلکہ اس عمل کے کچھ نفسیاتی پہلو بھی ہیں۔ یہ

عمل ان کے درمیان تحفظ اور تعلق کا ایک اٹوٹ سا بندھن مضبوط کیے جاتا ہے۔ مستقبل میں یہ بچے اعصابی، جسمانی اور ذہنی طور پر بھی بہت بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ یہ عمل بچے کے مدافعتی نظام کو اس قدر مضبوط بنا دیتا ہے کہ ساری زندگی اس کے لیے بیماریوں سے بچاؤ آسان ہو جاتا ہے۔ بچے کو دی جانے والی غذا ہی اس کے مستقبل کا تعین کرتی ہے کہ وہ ایک صحت مند زندگی گزارے گا یا جسمانی اور نفسیاتی مسائل سے پُر عرصۂ حیات اس کا مقدر ٹھہرے گا۔ اس لیے زندگی کرنے کی تگ ودو میں اس بات کا خیال رکھیے کہ آپ کے جیون آنگن کا ننھا سا پودا کہیں آپ کی توجہ سے کہیں محروم نہ رہ جائے۔

## نوجوان اب cyberbullying سے محفوظ

سوشل ویب سائٹس پر cyberbullying کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ طنز اور تضحیک پر مبنی سلوک کا یہ چلن ان ویب سائٹس کے یوزرز کے لیے کرب ناک اور ان سائٹس کے لیے بدنامی کا باعث بنا ہوا ہے۔

خاص کر نوجوانوں کے لیے یہ مسئلہ نہایت خطرناک صورت حال اختیار کرگیا ہے، جو حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔ cyberbullying کا شکار ہونے والے کئی نوجوان خودکشی کرچکے ہیں۔

اس مسئلے کے پیش نظر ایک نئی ویب سائٹ بنائی گئی ہے۔

Safecircles.me کے نام سے بنائی جانے والی یہ ویب سائٹ نواجوانوں کو اذیت سے تحفظ دینے کے دعوے کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ ٹریشا نارمن اس نئی ویب سائٹ کو کام یاب بنانے کے لیے مہم چلارہی ہیں۔ ٹریشا cyberbullying کا نشانہ بننے والی اپنی بارہ سالہ بیٹی کو کھودینے کا دکھ جھیل رہی ہیں، جس نے ایک سوشل ویب سائٹ پر اپنے ساتھ ہونے والے تضحیک آمیز سلوک کے باعث خودکشی کرلی تھی۔ ٹریشا نارمن کا کہنا ہے، ”یہاں اب بھی ایک خلاء ہے۔ وہ واحد چیز جس نے

مجھے آگے آنے پر اکسایا دوسرے بچوں کو محفوظ رکھنا اور والدین میں یہ شعور اجاگر کرنا ہے کہ (سوشل ویب سائٹس پر) کیا ہو رہا ہے۔"

ایک Safecircles.me فیس بک اور دیگر مقبول سماجی ویب سائٹس کے مقابلے میں محفوظ سائٹ ہے۔ اس سائٹ سے منسلک ہونے کے لیے یوزرز کو ماہانہ 1.40 ڈالر ادا کرنا ہوتے ہیں اور یوں یوزر کے بچوں کو سائن اپ ہونے کی سہولت مفت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ویب سائٹ اپنے یوزر والدین کو یہ سہولت فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے اس سائٹ کے یوزر بچوں کو موصول ہونے والی تمام میلز چیک کر سکتے ہیں۔ اگر والدین یہ دیکھیں کہ ان کے بچے کو سائبر بالنگ کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، تو وہ سائٹ کے منتظمین کو اس کی رپورٹ کر سکتے ہیں۔

# فلکر کا نیا فیچر: فیس بک سمیت دیگر سائٹس سے تصاویر براہ راست اپ لوڈ کی جا سکیں گی

فوٹو شیئرنگ کی مقبول سائٹ فلکر کے یوزر کے لیے خوش خبری ہے کہ فلکر نے اب اپنے یوزر کو ایک نئی سہولت فراہم کردی ہے۔

اب فلکر کی ایپلیکیشن Flickr for iOS کی مدد سے اس ویب سائٹ کے یوزر فیس بک، ٹوئٹر اور دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے براہ راست تصاویر فلکر پر اپ لوڈ کرسکیں گے۔ یہ تصاویر خودکار طریقے سے اپ لوڈ کی جا سکیں گی۔

اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے یوزرز کو فلکر کا ''آٹو اپ لوڈ فیچر'' انسٹال کرنا ہوگا۔ یہ فیچر ایک بار ایکٹیو ہوجانے کے بعد تصاویر اپ لوڈ کو ہوکر فلکر کے اسٹوریج لاکر میں منتقل ہوجائیں گی، جہاں یہ تصاویر اس وقت تک دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہیں گی جب تک انھیں اپ لوڈ کرنے والا یوزان کو پرائیویٹ نہیں کردیتا۔

امکان ہے کہ فلکر کی جانب سے یوزرز کو یہ سہولت فراہم کیے جانے کے بعد اس ویب سائٹ پر اپ لوڈ ہونے والی تصاویر میں کئی گنا اضافہ ہوجائے گا۔ واضح رہے کہ فوٹو اور وڈیو کی شیئرنگ کی ویب سائٹ فلکر کے رجسٹرڈ یوزرز کی تعداد

اس سال مارچ تک 87 ملین ہو چکی ہے، جب کہ اس سائٹ پر اوسطاً ہر روز فی یوزر کے حساب سے 3.5 تصاویر اپ لوڈ کی جاتی ہیں۔

# خواتین کی ڈرائیونگ

ہماری ایک بہت قریبی عزیزہ بھارت کے شہر سورت میں مقیم ہیں۔ پاکستان میں جب تک رہیں ان سے تعلق بہنوں سے بڑھ کر تھا اور اب بھی دل کے نہایت قریب ہیں۔ کچھ دنوں پہلے انھوں نے ہمیں اپنی ایک تصویر بھیجی، جس میں وہ ویسپا اسکوٹر چلاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم ان کے تہلکہ خیز مزاج سے آشنا ہیں، اس لیے تصویر دیکھ کر یہی سمجھے کہ ویسپا چلانا بھی ان کے کسی ''ایڈونچر'' کا حصہ ہوگا۔ لہٰذا جب ان سے بات ہوئی تو ہم نے ان کا ''ایڈونچرازم'' برقرار رہنے پر انھیں داد اور مبارک باد دی۔ تاہم ان کا جواب ہمارے لیے غیر متوقع تھا۔

ان کا کہنا تھا یہ ہمارے لیے تفریح نہیں ہماری ضرورت ہے۔ ''میں ویسپا اسکوٹر چلانا نہیں چاہتی تھی، لیکن یہ میری ذمے داریوں کا تقاضا ہے کہ میں یہ سواری خود چلاؤں، کیوں کہ نوکری، گھر گرہستی اور بچوں کو سنبھالنا، سب میرے فرائض میں شامل ہے اور میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے گھر کے دیگر افراد کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ میرے شوہر نہایت محنتی انسان ہیں۔ وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ ہم دونوں کو اپنی اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ عورتوں کا اسکوٹر چلانا ہمارے یہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں، کراچی

آکر میں یہ سب نہیں کرسکوں گی، کیوں کہ پاکستان کا کلچر اور وہاں کی سماجی اقدار مختلف ہیں۔ اسکوٹر چلانا میری ضرورت ہے اور اس سے مجھے بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔۔۔''

یہ تھی ہماری عزیزہ کی گفتگو، جس نے بہت سے سوال ذہن میں پیوست کردیے۔

ابھی ہم ان سوالات کے تانے بانے میں الجھے ہوئے ہی تھے کہ ایک خبر اخبارات سے الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا تک جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ خبر کچھ یوں تھی کہ سعودی عرب کی عورتوں کے حقوق کے لیے سرگرم تین خواتین نے اپنی ہم وطن بہنوں کو ڈرائیونگ کا حق دلانے کی مہم کے سلسلے میں بہ طور احتجاج کار ڈرائیو کی اور اس عمل کی وڈیوز اور تصاویر یوٹیوب سمیت مختلف سوشل ویب سائٹس پر اپ لوڈ کردیں۔ یوٹیوب کی اسکرین نے ان وڈیوز اور تصاویر کو خوب پروموٹ کیا اور اب تک کروڑوں لوگ انھیں دیکھ چکے ہیں۔

ان خواتین کا یہ اقدام اپنے ملک میں خواتین کو ڈرائیونگ کی اجازت نہ ہونے کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تھا۔ سعودی عرب کے قانون کے مطابق کوئی عورت ڈرائیونگ لائسنس لینے کی اہل ہے نہ گاڑی ڈرائیو کرسکتی ہے، ایسا کرنے کی صورت میں بھاری رقم پر مبنی جُرمانہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ سوشل میڈیا پر برق

رفتاری سے سفر کرتی اور مقبول ہوتی ان وڈیوز اور تصاویر نے سعودی حکومت کے ایوانوں میں بھی ہلچل مچادی، چناں چہ اس سلسلے میں غور کرنے کے لیے شوریٰ کا اجلاس بلالیا گیا۔

مغربی میڈیا اور این جی اوز کو کسی مسلم ملک کو ہدف بنانے کا موقع ملنا چاہیے، سو حسب توقع انھوں نے اس معاملے پر وہ صف ماتم بچھائی ہے کہ گریہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

ساتھ ہی حسب دستور اسلام کو نشانہ بنانے کا کھیل بھی شروع ہوگیا۔

ادھر سعودی عرب میں ''چاند'' نکلا اُدھر ہمارے یہاں بعض لوگوں کی ''عید'' ہو گئی۔

مغربی میڈیا تو رہا ایک طرف ہمارے لوگوں نے بھی اس معاملے کو مذہبی رنگ دینا شروع کردیا ہے۔ حالاں کہ اس ایشو کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، یہ سماجی اقدار کا مسئلہ ہے۔

بھارت میں مسلمان عورتیں اسکوٹر چلائیں یا سعودی عرب میں نسوانی ہاتھوں کو گاڑی کا اسٹیئرنگ تھامنے کی اجازت نہ ہو، یہ کسی بھی مخصوص خطے یا ملک کے حالات، سماجی اقدار اور وہاں کے طرز زندگی کی بنا پر ہے۔ اگر کوئی قانون، اجازت یا قدر اسلام سے متصادم نہیں تو اس معاملے میں اسلام کو جواز یا

تنقید کا نشانہ بنانا کہاں کا انصاف اور دانش مندی ہے، جس سرزمین پر سعودی مملکت قائم ہے، وہاں آج سے 14 سو سال پہلے صحابیات گھڑسواری کرتی تھیں اور اونٹ پر بیٹھ کر تجارت کے لیے سفر کیا کرتی تھیں۔ خواتین کو ڈرائیونگ کی اجازت نہ ہونے کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ اسلام میں عورتوں کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں، اس لیے بہتر ہے کہ وہ ڈرائیونگ نہ کرے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی احکامات کی رو سے سفر ہے کیا؟ شہر کی حدود میں رہتے ہوئے آمدورفت کرنا سفر کے زمرے میں نہیں آتا، چناں چہ نماز کی قصر کا حکم بھی اندرون شہر کے سفر پر لاگو نہیں کیا جاتا۔ لہذا یہ پابندی سفر کے حوالے سے اسلامی ضوابط کے دائرے میں تو نہیں آتی۔

بعض حلقوں کی جانب سے خواتین کی ڈرائیونگ کو ''حرام'' قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا جارہا، جس عمل کے اسلام سے متصادم ہونے کی کوئی دلیل نہیں اسے کوئی حرام کیسے کہہ سکتا ہے؟ ایسی کوئی پابندی یا اجازت کسی ملک کی داخلی صورت حال اور اقدار کی بناپر ہونا اور بات ہے، مگر اس پر حرام کا فتویٰ لگادینا افسوس ناک ہے۔

اس ضمن میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ چونکہ مرد حاکم ہے اور عورت کی ذمے داریاں گھر کی چار دیواری تک محدود ہیں، اس لیے خواتین کی ڈرائیونگ

اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

کیا بات ہے۔ اسلام نے مرد کو عورت کا سرپرست بنایا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت صلاحیتوں میں مرد سے کم ہے۔ دراصل مرد کو درجے میں بلند رکھنا بھی عورت کے لیے ایک تحفہ ہے ہمارے رب کا۔ چونکہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کے مقابلے میں نزاکت عطا کی ہے اور اسے ماں بننے کی صلاحیت سے نوازا ہے اور اسے یہ اہلیت دی کہ مرد کی طرح بچے کی بھوک مٹانے کے لیے اسے خارجی ذرائع پر انحصار نہیں کرنا پڑتا، بلکہ وہ اپنے سینے سے اپنی اولاد کو غذا فراہم کرتی ہے۔ عورت کو یہ نازک اور اہم ترین ذمے داریاں عطا کرکے اللہ تعالیٰ نے مرد کو اس کا محافظ بنا دیا تاکہ وہ پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض نبھا سکے۔

یہ ہے اسلام کا مزاج۔

اسلام کے اس مزاج کے پیش نظر ڈرائیونگ کو عورتوں کے لیے سرے سے حرام قرار دینا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے مخصوص صورت حال میں عورتوں کو بعض افعال سے گریز کرنا چاہیے، جیسے دورانِ حمل ڈرائیونگ کرنا بچے کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے، مگر ایسی شرائط عورتوں

ہی کے لیے نہیں، کچھ خاص حالات میں اور بعض امراض میں مبتلا مرد بھی ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔ رسول اکرم ﷺ کے دور میں ہونے والے معرکوں میں مسلم خواتین کا کردار ہمارے لیے روشن مثال ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کے تحت عورت کا میدان میں آنا اسلام کے مزاج کے ہرگز خلاف نہیں۔

ایک طرف مغربی حلقے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہیں اور دوسری طرف ہم لوگ، جو اپنے روشن مذہب کے دمکتے پہلوؤں کو سامنے لانے کے بجائے اپنی رائے کو حلال اور حرام کا درجہ دے کر اسے اسلام پر چسپاں کر دیتے ہیں۔

## امیر ترین حکمرانوں کا غریب ملک

اماں پانی سے ڈر لگتا ہے، میں نہ جاؤں گی اس میں۔ دیکھ اماں! نہ کر ایسا، مجھے روٹی نہیں چاہیے۔ 8 سالہ ایمن رو رہی تھی۔ رو تو رضیہ بھی رہی تھی جو اس کی ماں تھی، لیکن اس ماں کے دل میں نہ جانے کس بات کا خوف تھا، جس نے اس کی سننے سمجھنے کی حس ختم کر دی تھی۔ شاید وہ اپنی اولاد کو موت کے منہ میں تو ڈال سکتی تھی، لیکن انھیں روز روز بھوک سے بلکتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔پَل بھر کے لیے اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، پانچ سالہ غلام حسین کے ماتھے کو چوما، چار سالہ بصیرت کو گلے سے لگایا اور اگلے ہی لمحے اپنے تینوں بچوں کو بی آر بی نہر میں پھینک دیا۔

آس پاس موجود لوگ پہلے تو سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ عورت آخر کر کیا رہی ہے۔ جب اس نے خود نہر میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی تو اس وقت تک لوگ معاملہ سمجھ چکے تھے۔ رضیہ کا ارادہ بھانپ کر وہ اس کی طرف دوڑ پڑے اور اسے روک لیا۔ اپنا سب کچھ پانی میں بہا دینے والی یہ ماں اپنے حواسوں میں نہ تھی۔

فوری طور پر 112 پر اطلاع دی گئی۔ اس سانحے کی خبر ملتے ہی ریسکیو ٹیم کے غوطہ خور موقعے پر پہنچ گئے اور مقامی رہائشی افراد کے ساتھ مل کر کوئی دو

گھنٹے تک سرچ آپریشن کرتے رہے۔ بچوں کے بچانے کی تگ ودو تو ناکام ہوئی، مگر ان کی لاشیں مل گئیں۔

یہ کہانی نہیں، حقیقت ہے۔ کیسی دل دہلادینے والی حقیقت ہے کہ ایک عورت اپنے ہی بچوں کا ہاتھ پکڑ کرانھیں موت کو سونپ دے۔

کتنی تڑپتی ہوگی وہ، کہ جس اولاد نے اسے مکمل عورت بنایا، اسی کو اپنے ہاتھوں سے موت کی وادی میں اتار دیا، جنھیں زندگی دی تھی، ان کی زندگی چھین لی، کیوں کہ اس دکھیاری کو اپنے بچوں کا بھوک سے بلبلانا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ بچوں کو خوراک کا نوالہ نہ دے سکی، تو انھیں لُقمۂ اجل بنادیا۔

ہائے ری غربت، روٹی اور غریب، اور غریب کی موت۔ کتنی ہی حکومتیں آئیں اور چلی گئیں، سوئس اکاؤنٹس بھرتے گئے، پالتو گھوڑوں اور کُتوں کی خوراک پر ماہانہ لاکھوں روپے خرچ ہوتے رہے، حکومتی ایوانوں کی سجاوٹ اور دیکھ بھال پر کروڑوں روپے اُٹھائے جاتے رہے۔ قومی اسمبلی کا کینٹین ملک کا سستا ترین فائیو اسٹار ہوٹل ہے، جہاں کھانا اتنا سستا ملتا ہے، جیسے من وسلویٰ بکتا ہو کوڑیوں کے مول، اور یہاں کھانے والے ہیں اس ملک کے حکمراں۔

کبھی آٹا سستا ہوا نہ دوا، اور مکان کی امید تو غریب کے لیے بس ایک ٹوٹا ہوا سپنا ہے۔ غربت بڑھتی گئی، غریب مرتا رہا۔ سگنل پر گاڑی روکتے ہی کبھی کسی معصوم ننھے بچے کو سرد موسم میں ننگے پاؤں اور لباس کے نام پر چیتھڑے اٹکائے دیکھا تو دل خون کے آنسو رو دیا۔ کب تک، آخر کب تک ہم یوں ہی لوگوں کے افلاس کی وجہ سے مرتا اور بھیک مانگتا دیکھتے رہیں گے۔ کیا حکمرانوں کی کوئی ذمے داری نہیں؟ کیا حکمراں صرف اس لیے ہیں کہ قوم کے پیسے سے بیش قیمت گاڑیاں خریدیں پھر اپنی ''قیمتی'' جان کے تحفظ کی خاطر لاکھوں روپے مزید خرچ کرکے ان گاڑیوں کو بُلٹ پروف بنائیں۔ یقیناً جان تو انھی کی قیمتی ہے، بلکہ انھی کی جان کی قیمت ہے۔ عام لوگ راہ چلتے ان جانی سمت سے آنے والی گولی کا نشانہ بن جائیں یا بھوک کے سفاک پنجوں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے، کس کو فکر۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی خوف نہیں کہ پاکستان امیر ترین حکمرانوں کا غریب ترین ملک ہے۔

پاکستان کی آبادی 180 ملین سے تجاوز کر چکی ہے، جب کہ 33 فی صد سے زائد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ رواں سال ہمارے ملک نے انسانی معیار زندگی، یعنی ''ہیومن ڈیولپمنٹ'' کے اعتبار سے اپنا چھیالیسواں درجہ برقرار رکھا۔ یہ اعداد و شمار پاکستان میں افلاس کی خوف ناک صورت حال کی نشان دہی کر رہے ہیں۔

انسانی معیارِ زندگی کے گھٹتے ہوئے درجات اور بڑھتا ہوا افلاس انفرادی سوچ کو بری طرح متاثر کر رہے ہیں، جس کے باعث رفتہ رفتہ صورت حال سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجوہات ہمارے معاشرے کی تنزلی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ غصہ، وحشت، بے گانگی، رشتوں کے احترام میں کمی، یہ رویے ہمارا چلن بنتے جا رہے ہیں۔ یہ حالات اور رویے فرد کو تنہا اور غیر محفوظ کرکے اسی راستے پر لے جاتے ہیں جس پر چل کر رضیہ نے اپنے پھولوں کو پانی میں بہادیا۔ وہ حواس باختہ ہو کر جنونی کیفیت میں مبتلا ہو گئی اور اپنے ہی بچوں کی قاتل قرار پائی۔

زندگی تو اس کی برباد ہو ہی چکی تھی، مزید قیامت یہ ٹوٹی کہ خبروں کے مطابق تھانے میں تفتیش کے دوران پولیس نے روایتی انداز اپناتے ہوئے اس پر بھیانک تشدد کیا۔ مر تو وہ پہلے ہی گئی ہے، اب بس سانسوں کی ڈور ٹوٹنا باقی ہے، سو شاید اسے زندگی کی اذیت سے نجات دینے کی خاطر ہی اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پولیس ہی نہیں، میڈیا، معاشرہ، ہم سب اس ''ظالم ماں'' کا سر کچل دینے کے آرزومند ہیں۔ اپنے بچوں کی جان لینے والی رضیہ کو سزا دینے کے خواہش مند انسانو! ہوش کرو، مجرم کے بجائے جرم اور اس کے اسباب مٹانے پر غور کرو۔

بہ حیثیت معاشرہ ہم سب کو جرائم کے سدباب کی فکر کرنا ہوگی جو غربت کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ حکومت تو نہ جانے کب جاگے، لیکن ہم اور آپ میں سے جو صاحبِ حیثیت ہیں، کیا اپنے آس پاس زندگی بھوگتے افلاس زدہ افراد اور کنبوں اور راستوں پر بھیک مانگتے بچوں پر نظر نہیں ڈال سکتے؟ ہم کچھ تو ایسا کر سکتے ہیں جس کے بعد کوئی رضیہ اپنا ذہنی توازن نہ کھوئے، کسی بچے کو بھوک سے بلکنے پر موت کا زہر نہ پینا پڑے، ایسا نہ ہو کہ ننھے مُنے ایمن، غلام حسین اور بصیرت آنکھوں میں خوف اور حیرت لیے دنیا دیکھے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہوجائیں۔

رضیہ کے المیہ کا سبب یہ ہے کہ وہ تنہا رہ گئی تھی، اس کے ہر طرف اندھیرے تھے، جہاں امید کی ایک کرن بھی نہیں تھی۔

رضیہ کے مقابلے میں جیسیکا خوش قسمت تھی، سو اس کی تنہائی کو رفاقتوں کا کارواں مل گیا اور اس کے ارد گرد پھیلے اندھیروں میں ہزاروں دیپ جل اٹھے۔

یہ اس سال تیئیس اکتوبر کا واقعہ ہے۔ امریکا کے شہر میامی کے ایک اسٹور میں جیسیکا روبلین نامی ایک عورت چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی۔ خاتون پولیس آفیسر وکی تھامس اسے ہتھکڑی پہناتی تو ہے، لیکن صرف پندرہ منٹ بعد وہ ملزمہ کی

ہتھکڑی کھول کر اس کے ہاتھ میں سو ڈالر تھما دیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ جس اسٹور سے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا، وہیں سے کھانے پینے کی اشیا خریدے۔

مقامی ٹی وی چینل اس پورے واقعے کی خبر براہ راست دے رہا تھا، لہٰذا پولیس آفیسر وکی تھامس کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ اس نے اپنے پیشے سے غداری کرتے ہوئے ایک مجرم کو چھوڑ دیا۔

وکی تھامس سے صفائی طلب کی گئی۔ اس کے جواب نے صرف امریکا ہی نہیں ساری دنیا کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وکی تھامس کا کہنا تھا، ''یہ عورت چور نہیں، وہ چوریاں کرتی رہی ہے، لیکن اس نے ہمیشہ اسٹورز سے کھانے پینے کی اشیاء ہی چُرائی ہیں۔ وہ بہت غریب ہے۔ جب وہ اسٹور میں چوری کے ارادے سے داخل ہوئی، اس وقت اس کی بارہ سالہ بیٹی گھر پر بھوکی بیٹھی کھانے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اگر اسے گرفتار کر لیتی تو جرم ختم نہیں ہوتا، بل کہ گھر پر بیٹھے اس کے بچے بھی ماں کے نہ آنے پر شاید بھوک مٹانے کے لیے چور بن جاتے۔ ہمیں مثبت سوچ اپنانی ہوگی۔'' وکی تھامس کے اس جواب کے بعد فضا یکسر بدل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی لوگوں نے جیسیکا کو عطیات دینے کا اعلان کر دیا اور اس کے لیے مہینے کے راشن کی رقم جمع کی جانے لگی۔ یہی نہیں، مختلف اسٹور مالکان نے اعلان کیا کہ جیسیکا ان کے اسٹور سے ہر ماہ سات سو ڈالر تک کی اشیاء مفت حاصل کر سکتی ہے۔

یوں بھوک سے نڈھال بچوں کی ماں کی چوری جرم نہیں، اس کا فرض قرار پائی۔ میں سوچ رہی ہوں کاش رضیہ کے بچوں کی بھوک مٹا دی جاتی تو اس کے بچے بھی زندہ ہوتے اور وہ بھی زندہ لاش بننے سے بچ جاتی۔

## آئی ٹی منسٹری سو رہی ہے؟

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ پاکستان میں جنگل کا قانون رائج ہے۔ مجھے اس جملے سے ہمیشہ شدید اختلاف رہا ہے، کیوں کہ جنگل کا بھی کوئی قانون ہوتا ہے، قدرت کے عطا کردہ ضابطے ہوتے ہیں، جن پر چرند پرند عمل کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں، مگر ہمارے یہاں تو اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔

مہذب اور باعزت معاشرے کے قیام کے لیے انسانی حقوق کی پاس داری بہت ضروری ہے۔ دوسروں کے حقوق کے احترام کے بغیر فرد انسانیت کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔ چناں چہ حق تلفی کے سدباب کے لیے قوانین اور ادارے بنائے جاتے ہیں، جو کسی فرد یا جماعت کے حقوق چھینے جانے پر حرکت میں آ جاتے ہیں۔ لیکن ایسے قوانین کی تشکیل اور اداروں کا قیام اور ان کی کارکردگی اس بات پر منحصر ہے کہ معاشرہ اپنے حقوق سے کس حد تک آشنا اور ان کی پاس داری کے لیے تیار ہے۔

ہم پاکستانیوں کا المیہ تو یہ ہے کہ ہماری حق تلفی ہوتی رہی اور ہم اس کے عادی ہوتے گئے۔

ریاست کا فرض ہے کہ وہ کم از کم غریب شہریوں کو گرانی کی آفت سے بچائے رکھے، مگر منہگائی بڑھتی رہی، بڑھتی جارہی ہے، لیکن اسے روکنے کے لیے کو قدم نہیں اٹھایا گیا۔

ہماری جان کے تحفظ کا حق پامال ہوتا رہا، ہم سڑکوں پر ان جانی گولیوں کا نشانہ بن کر مرتے رہے، لیکن ہماری جان کے تحفظ کا حکومتی فرض چپ چاپ تماشا دیکھتا رہا۔

ٹریفک کے مسائل گھنٹوں کے ٹریفک جام اور خوف ناک حادثات کی صورت میں ہماری جان کا روگ بنے ہوئے ہیں، لیکن کسی کو سڑکوں پر ٹائروں تلے کچلے جانے والے ہمارے حقوق کا خیال نہ آیا۔

مثالی معاشرہ تو دور کی بات ہے، ایک معاشرے کے قیام کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے افراد کے حقوق وفرائض کا تعین کیا جائے، اور ان کے نفاذ کے لیے حکومت اور اس کے ادارے کوشاں رہیں، اگر ایسا نہ ہو وہ معاشرہ نہیں محض افراد کی بھیڑ ہوگی۔

میں یہ نہیں کہتی کہ قیام امن سے لے کر اخلاقی روایات کی پامالی تک ہر معاملے میں حکومت ہی کو ذمے دار سمجھا جائے، ذمے داری عوام کی بھی

ہے، لیکن جب کسی حق اور فرض کے حوالے سے قانون بنایا ہی نہیں جائے گا یا اس سے آگاہی فراہم نہیں کی جائے گی تو عوام میں اس حوالے سے شعور کیسے اجاگر ہوگا؟ رہے اخلاقی ضابطے، تو کسی قانون کی عدم موجودگی میں صرف اخلاق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

سیاست دانوں، آمروں اور افسر شاہی کی عنایت سے ہمارا ملک آج جس نہج پر جا پہنچا ہے اس کے نتائج ہم دیکھ بھی رہے ہیں اور بھگت بھی رہے ہیں۔ ہر پاکستانی واقف ہے کہ اس کا ملک کن گمبھیر مسائل سے دوچار ہے۔ اسے پتا ہے کہ دہشت گردی ریاست کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے اور فرقہ واریت کا جنون معاشرے کو بھڑکتے جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ ایسے میں حکومت ہو یا میڈیا، کسی واقعے کی بابت حقائق چھپا کر عوام سے ان کے جاننے کا حق ہی نہیں چھینتے، بل کہ افواہوں اور الزامات کا راستہ بھی کھول دیتے ہیں۔

سانحہ راولپنڈی نے بھی یہ حقیقت اجاگر کردی ہے کہ حقائق چھپانا مسئلے کا حل نہیں۔ جب یہ سانحہ رونما ہوا تو دو دن تک میڈیا خاموش رہا۔ اس خاموشی کی بنیاد مصلحت پر مبنی یہ پالیسی تھی کہ اس سانحے کی خبر کو پوری تفصیل کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک نشر کرنے سے حالات خراب ہو جائیں گے، لہذا خبر کو فی الوقت دبا دیا جائے یا اس کی سنگینی کم کردی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد

میں الیکٹرانک میڈیا نیند سے بیدار ہوگیا اور اس سانحے کے حوالے سے ٹاک شوز میں ریٹنگ بڑھانے کا عمل شروع ہوگیا۔

دو دن کی یہ خاموشی خطرناک ثابت ہوئی۔ اس پُراسرار خاموشی میں سوشل میڈیا پر جو شور برپا ہوا اس نے الیکٹرانک میڈیا کی چُپ کے ساتھ مل کر شکوک وشبہات اور الزامات کی فضا تیار کردی۔ سوشل میڈیا پر فریقین یا فرقہ وارانہ سوچ رکھنے والوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی، تصاویر پوسٹ کرنے اور نازیبا زبان کے استعمال کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بڑھتا چلا گیا۔ یہ سب ایک عرصے سے ہو رہا ہے، لیکن شکر ہے کہ حکومت نے اس مرتبہ سماجی ویب سائٹس پر پھیلائی جانے والی منافرت کا نوٹس لیا ہے۔

میں اپنے گذشتہ کالموں میں بھی سوشل میڈیا کے حوالے سے قانون سازی کی بات کرتی رہی ہوں۔ شکر ہے کہ حکومت نے اس پر غور شروع کردیا ہے۔ تاہم ہماری حکومتوں کی ترجیحات اور مسائل کی آتش کو دعوؤں اور بھڑکوں کے پانی سے سرد کرنے کی روش دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی یہ معاملہ التوا کا شکار ہوجائے گا۔

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ٹی وی چینلز پر پورے کروفر کے ساتھ انتباہ کیا جاتا

ہے کہ "جو شخص عوامی رابطے کی ویب سائٹس اشتعال انگیز مواد پھیلاتا پایا گیا، اسے سخت سزا دی جائے گی۔" حد ہے صاحب! آپ کے پاس تو وہ قانون ہی نہیں جو کسی کو اس اشتعال انگیزی سے روک سکے۔ میں اپنے کالموں میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وزیر انوشہ رحمٰن کو مشورہ دے چکی ہوں کہ وہ سوشل ویب سائٹس کے حوالے سے قوانین اور ضابطے بنا کر اپنی ذمے داری کا حق ادا کریں، لیکن اس جانب کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

سوشل میڈیا کے دائرۂ کار اور نوعیت کے باعث اس کے اثرات دنیا بھر میں مرتب ہو رہے ہیں۔ سوشل ویب سائٹس پر ہر شخص کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ یہ آزادی ذمے داری کے ساتھ پوری نہیں کی جارہی۔ افراد اور گروہ، چاہے وہ کسی سیاسی نظریہ کے حامل ہوں یا مذہبی عقیدے کے، افواہوں، الزامات اور دل آزار پوسٹس کے ذریعے معاشرے کے انتشار اور اختلافات کو مزید بڑھا رہے ہیں۔ یہ حقیقت اس معاملے کو مزید سنگین بنادیتی ہے کہ سوشل ویب سائٹس کے استعمال کرنے والوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے، جو اپنے جذبات میں شدت رکھتے ہیں۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے سماج کو اس میڈیا کے منفی اثرات سے بچانے کے لیے اقدامات کریں۔ اس کے لیے قانون سازی ضروری ہے، لیکن یہ ایک خالصتاً تیکنیکی مسئلہ ہے، جو صرف قانون بنادینے سے حل نہیں ہوسکتا۔ سوشل ویب سائٹس سے قابل اعتراض اور نفرت انگیز مواد کے خاتمے اور اس کی روک تھام کے لیے حکومت کو ان ویب سائٹس کی مالک کمپنیوں سے بات

چیت کرکے موثر اقدامات کرنے ہوں گے۔ مثال کے طور پر یوٹیوب پر موجود اشتعال انگیز مواد ہٹوانے اور آئندہ ایسے مواد کی آمد روکنے کے لیے، یوٹیوب کی مالک کمپنی گوگل کے قواعد کی رو سے، ہماری حکومت کو یوٹیوب کا پاکستان کے لیے ڈومین حاصل کرنا ہوگا، جس کے لیے اس کمپنی کو تحفظ کی ضمانت دینا لازمی ہے۔ اس ضمانت کی فراہمی کے لیے الیکٹرانک کرائم بل میں ترمیم ناگزیر ہے۔

حکمرانوں کو سوشل ویب سائٹس سے متعلق حقائق کا ادراک کرنا ہوگا، تب ہی اس حوالے سے موثر پالیسی اور قوانین کا نفاذ ممکن ہے۔

## دوا کا کاروبار یا استحصال کا جال

ڈاکٹر کا نسخہ ہاتھ میں لیے میڈیکل اسٹور پر کھڑے دکان دار نے ایک گہری نظر ادویات کی فہرست پر ڈالی، اور اگلے ہی لمحے اپنے قلم سے دوا موجود ہونے یا ہونے کے نشان لگانے لگا۔ فہرست میں شامل پہلی چار ادویات، جو اس کے پاس نہیں تھی، کی بابت پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دوائیں کل ہی متعلقہ کمپنیوں نے مارکیٹ سے اٹھالیں، جب کہ پانچویں دوا کی جگہ وہ ہمیں ایک اور دوا تھمانے لگا۔ اس کا کہنا تھا ''صرف نام مختلف ہے، فارمولا ایک ہی ہے'' ہم نے کہا، بھئی اگر فارمولا ایک ہی ہے تو دونوں کی قیمت میں یہ فرق کیوں؟ جس پر جواب دیا گیا، ''دیکھیے بی بی ! جس نام کی دوا آپ لینا چاہتی ہیں، اس کی مالیت 14 روپے ہے، جب کہ میں جو دوا آپ کو دے رہا ہوں وہ 60 روپے کی ہے، یعنی مجھ سے آپ زیادہ اچھی دوا لے کر جائیں۔'' ذہن اس کے جواز کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اسی وقت اس حوالے سے تحقیق شروع کردی۔

مارکیٹ سروے کیا گیا اور اپنی ایک لیڈی ڈاکٹر دوست سے ملاقات کی۔ میرے سامنے حیران کن حقائق آئے، جنھیں پاکستانی عوام سے مجرمانہ طور پر مخفی

رکھا جا رہا ہے۔

اور 60 روپے کی دوا کے فارمولے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ 14 سستی دوا مقامی ادویہ ساز ادارے کی تیار کردہ ہے اور مہنگی دوا ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے تیار کی ہے۔ دونوں دوائیں بنانے میں جو خام مال استعمال ہوا ہے وہ بھی یکساں معیار کا ہے۔ قیمتوں میں یہ نمایاں اور بلاجواز فرق اس وجہ سے ہے کہ حکومت کی طرف سے قوانین کے اطلاق کے لیے قوت نافذہ کہیں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی دوسرا مسئلہ ادویات کی عدم دستیابی کا ہے، جو کہ دواؤں کی قیمتوں میں فرق سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس تحقیق کے دوران انکشاف ہوا کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے کئی ادویات مارکیٹ سے غائب کردی ہیں۔ ساتھ ہی خبروں کے ذریعے دھمکایا جا رہا ہے کہ غیر ملکی فارماسیوٹیکل کمپنیاں پاکستان میں اپنا کاروبار بند کر رہی ہیں، ''جس کی وجہ حکومت کی طرف سے ادویات کی قیمتیں نہ بڑھانے کے ضمن میں مجرمانہ غفلت ہے۔'' اپنی مظلومیت کا رونا رونے والی یہ فارموسیوٹیکل کمپنیاں پاکستان میں اربوں کھربوں کا کاروبار کرچکی ہیں۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ چھے ماہ پہلے لی جانے والی کسی دوا کی قیمت چھے مہینے کے بعد وہی رہی ہو، جب کہ مختلف اخبارات میں اس بابت جو خبریں شائع ہو رہی ہیں ان کے مطابق 2001 سے ادویات کی قیمتوں

میں اضافے کی منظوری نہیں دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اگر حکومت نے منظوری نہیں دی تو پھر قیمتوں میں اضافہ کیسے ہوتا ہے، کون کرتا ہے؟ اور مارکیٹ میں جو نئی دوائیں آتی ہیں ان کے نرخ کون طے کرتا ہے؟ مثال کے طور پر کینسر کی بعض ادویہ جو کچھ عرصہ قبل ہی مارکیٹ میں آئی ہیں، ان کی قیمت ہزاروں میں ہے، ان کی یہ قیمتیں اگر حکومت نے مقرر نہیں کی تو کس نے مقرر کی؟ اور اس قیمت کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا؟

یہ ہے ان ادویات ساز کمپنیوں کی چال بازی اور استحصال، جو وہ بڑے دھڑلے سے کر رہی ہیں۔ اس پر وہ گھاٹے کا واویلا کرتے ہوئے فریاد بھی کر رہی ہیں کہ حکومت ان کے مسئلے پر توجہ نہیں دے رہی۔ چلیے مان لیا کہ آپ کا کاروبار خسارے کا شکار ہے، حکومت نے بھی ان کے ''درد'' کا مداوا کرنے کی ٹھان لی ہے، لیکن مارکیٹ سے جان بچانے والی اور دیگر ادویات غائب کرکے مریضوں کا جو قتل عمد کیا اور انھیں اذیت سے دوچار رکھا جارہا ہے، اس پر حکومت ان سے جواب طلب کیوں نہیں کرتی؟ جس حکومت تک ان کمپنیوں کے بین پہنچ گئے اس تک مرتے اور کرب جھیلتے مریضوں کی آہیں اور کراہیں کیوں نہیں پہنچ پارہیں؟

دواؤں کی قیمت بڑھانے کے لیے ایک جواز یہ بنایا جارہا ہے کہ لاگت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ بین الاقوامی دواساز ادارے اپنی دواؤں

کی مارکیٹ بنانے اور ان کی زیادہ سے زیادہ فروخت کے لیے ڈاکٹروں کو رجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کی ''مارکیٹ ویلیو'' دیکھتے ہوئے اسے نوازا جاتا ہے۔ کمپنیاں اس مقصد کے لیے بھاری تن خواہوں پر بیسیوں کی تعداد میں میڈیکل ریپریزینٹیٹیوز بھرتی کرتی ہیں۔ خوش نما ڈائریوں اور کیلینڈروں کے تحفے، بین الاقوامی دورے اور فائیو اسٹارز ہوٹلوں میں قیام وطعام جیسی نعمتوں کے عوض ڈاکٹر کو صرف یہ عنایتیں کرنے والی کمپنی کا نسخہ مریضوں کو تجویز کرنا ہوتا ہے، چاہے چالیس روپے لاگت والی اس دوا کی قیمت چار ہزار روپے ہی کیوں نہ ہو، چاہے اس کے سائیڈ افیکٹس مریض کو کسی اور مرض میں مبتلا کردیں، یہاں تک کہ وہ دوا مریض کے لیے غیر ضروری ہو تب بھی اس کے سر تھوپ دی جاتی ہے، اس عیش وعشرت کے بدلے میں جو کمپنیاں ان ڈاکٹروں کو فراہم کرتی ہیں۔ یہ استحصال کا پورا جال ہے، جس میں غریب پاکستانی عوام جکڑے ہوئے ہیں۔ دواؤں کی مارکیٹنگ کی مد میں ڈاکٹروں کو نوازنے کے اخراجات دواؤں کی لاگت سے کہیں زیادہ قیمت کی صورت میں عوام سے وصول کیے جاتے ہیں۔ اگر یہ اخراجات نہ ہوں تو عوام کو کہیں سستی ادویات میسر آسکتی ہیں، البتہ کمپنیوں کی منافع خور گھٹ کر صرف جائز منافع میں تبدیل ہوجائے گی۔

ادویہ ساز کمپنیاں حکومت کی ایسی ہر کوشش میں روڑے اٹکاتی ہیں جو عوام کو دوائیں سستے نرخوں میں فراہم کرنے کے لیے کی جائیں۔ مثلاً خطے کے ممالک

بھارت اور بنگلا دیش، پاکستان کو ادویات سستے داموں میں فروخت کرنے کے خواہش مند ہیں، جس سے ان کمپنیوں کی اجارہ داری ختم ہو سکتی ہے۔ چناں چہ شور مچایا جا رہا ہے کہ ان ممالک سے دوائیں درآمد نہ کی جائیں۔

یعنی ایک طرف خود دوائیں غائب کرکے عوام کو اذیت دی جارہی اور حکومت کو بلیک میل کیا جارہا ہے، دوسری طرف سستی ادویہ کی فراہمی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں۔ پاکستان فارماسیوٹیکل مینوفیکچررز ایسوسی ایشن (PPMA) نے حکومت پر زور دیا ہے کہ ادویہ سازی کی صنعت کے تحفظ کے لیے اس صنعت کو درپیش خدشات اور تحفظات مدنظر رکھتے ہوئے بھارت سے ادویات درآمد نہ کی جائیں۔ گویا عوام کو سستی دوائیں نہ ملیں، کیوں کہ یہ کمپنیوں کے مفاد میں نہیں، واہ صاحب واہ۔

ایک طرف دواؤں کی قیمتوں نے عوام کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے، دوسری طرف مارکیٹ میں تیس سے چالیس فی صد جعلی دوائیں فروخت ہورہی ہیں اور ڈرگ انسپکٹر اپنی جیبیں بھر کر موت کے اس کاروبار سے چشم پوشی کیے ہوئے ہیں۔ جعلی دوائیں نسبتاً سستی ہوتی ہیں، ان کے مقابلے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دوائیں غریب کی دسترس سے باہر ہیں، چناں چہ لوگ سستی دوا سمجھ کر زہر خرید لیتے ہیں۔ معیاری اور سستی دوائیں درآمد کرنے کی صورت میں عوام تک سستی

ادویہ کی رسائی ممکن ہو گی اور جعلی ادویات خود بہ خود بِکنا بند ہو جائیں گی، لیکن لگ یہ رہا ہے کہ اس کے برعکس حکومت عوام نہیں کمپنیوں کے مفاد کو مقدم جانے گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی، قومی ڈرگ پالیسی بنانے کے قابل ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ادویات کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے، لیکن ترقی یافتہ دنیا کے بیشتر ممالک بیماری کی صورت میں اپنے شہریوں کے انشورنس کی سہولت دیتے ہیں، جس سے عوام کو ریلیف ملتا ہے اور دواؤں کے نرخوں میں اضافہ ان پر اثرانداز نہیں ہوتا، لیکن پاکستان میں دواؤں کی قیمتیں مزید بڑھانا مہنگائی کا بوجھ ڈھوتے پاکستانی عوام پر ظلم ہوگا۔ خبروں کے مطابق حکومت ادویہ کی قیمتیں اٹھارہ فی صد تک بڑھانے پر آمادہ ہو گئی ہے مگر کمپنیاں پچاس فی صد اضافے پر بضد ہیں۔ ادویہ ساز اداروں کا پروپیگنڈا اور مارکیٹ سے دوائیں غائب ہونا بتا رہے ہیں کہ کمپنیوں نے اپنا مقصد پورا ہونے کے لیے حالات سازگار بنالیے ہیں، اب یہ حکمرانوں پر ہے کہ ثابت کریں کہ وہ عوام کے منتخب نمایندے ہیں یا ان کا راج ''کمپنیوں کی حکومت'' ہے۔

پاکستانی عوام کسی صورت دواؤں کی قیمتوں میں اضافہ برداشت نہیں کر سکتے۔

تاہم اگر حکومت تمام حقائق نظرانداز کرکے ادویہ ساز غیر ملکی کمپنیوں کو خوش کرنے پر تُل ہی گئی ہے تو قیمتیں بڑھانے کے بہ جائے انھیں سبسڈی دی جائے۔ مگر سبسڈی دینے سے پہلے حکومت ان سوالوں کا جواب تلاش کرکے عوام کو آگاہ کرے کہ دواؤں کی لاگت بڑھنے کے پروپیگنڈے میں کتنی حقیقت ہے؟ مارکیٹنگ کی مد میں بھاری اخراجات کا کیا جواز ہے اور اس مد میں خرچ ہونے والی رقم عوام سے کیوں وصول کی جاتی ہے؟ اور اگر دواؤں کی قیمتیں گُذشتہ دس بارہ سال سے نہیں بڑھیں تو آخر ہر کچھ عرصے بعد ہر دوا مارکیٹ میں مہنگی کیوں ہوجاتی ہے؟

# انھیں تنہائی سے نکالیے

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے انٹرنیٹ پر معلومات اور خبریں تلاش کرتی میری نظریں ایک دل ہلادینے والی خبر پر جاکر رک گئیں۔ یہ ایک پورے خاندان کی خودکشی کی خبر تھی، جی ہاں پورا کنبہ، باپ اور اس کی چار بیٹیاں۔ افلاس کی انتہا کو چھوتے علاقے جنوبی پنجاب کے قصبے میلسی سے تعلق رکھنے والے بشیر احمد راجپوت کی پانچ بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک کی بھی وہ شادی نہ کرسکا تھا۔ سب سے چھوٹی اکتیس سال کی تھی اور سب سے بڑی بہن کی عمر کا پینتالیسواں سال تھا۔ بشیر کے پاس اپنی بیٹیوں کو دینے کے لیے جہیز نہیں تھا، سو کسی رشتے نے اس گھر کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ غریب باپ لاکھ جتن کرکے بھی اپنی بیٹیوں کو رخصت کرنے کے لیے ایک رتی سونا چاندی بھی نہ لاسکا۔ ان کی عمریں ڈھلتی رہیں، بالوں میں وقت کی چاندی اور آنکھوں میں مایوسی کا سُونا پن اترتا رہا۔ جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب مجبور، مایوس اور دکھی باپ بیٹیوں نے ایک ساتھ مرجانے کا فیصلہ کیا اور بشیر اپنی بیٹیوں سمیت نہر میں کود گیا۔ سب ڈوب گئے، صرف سب سے چھوٹی بہن فاطمہ کی جان بچائی جاسکی۔

ہماری ساری جدوجہد کا محور زندگی ہی تو ہے۔ اسے خوش گوار بنانے کے لیے ہم

خوشیاں سمیٹنے کی ہر کاوش کرتے ہیں۔ اسے آسان بنانے کے لیے ہم دن رات ایک کردیتے ہیں، اسے سہولتوں سے آراستہ کرنے کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوجاتے ہیں، اسی کے لیے دوستیاں ہوتی ہیں اسی کی محبت میں دشمنیاں پالی جاتی ہیں۔ معاشرت، ثقافت، سیاست اور معیشت کی ساری چہل پہل ساری ترقی محض اس بنیاد پر ہے کہ فرد زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اب یہ کتنی خوف ناک حقیقت ہے کہ اسی زندگی کو اپنے ہاتھوں ختم کردیتا ہے! آخر کرب، اذیت اور درد کی وہ کون سی منزل ہوتی ہے جہاں پہنچ کر زندگی بے معنی لگنے لگتی ہے اور سکون پانے کی واحد امید موت بن جاتی ہے۔ یہ منزل مایوسی کی ہے، ایسی مایوسی جہاں فرد اندھیروں میں تنہا رہ جاتا ہے۔

اگر کسی ملک اور معاشرے کی ترقی کا پیمانہ امید اور مایوسی کو بنایا جائے تو پاکستانی سماج ناامید معاشروں میں سرفہرست جگہ پائے گا۔ لاقانونیت، دہشت گردی، بدعنوانی انصاف تک نارسائی، ضروری سہولتوں کا فقدان اچھی اور دیانت دار قیادت کی عدم دست یابی جیسے عوامل نے ہمیں فرد اور خاندان سے مجموعی طور پر قوم تک مایوس افراد کے گروہ میں تبدیل کردیا ہے اور ''یہاں کچھ نہیں بدلے گا'' جیسے الفاظ اور پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے خدشات پر مبنی جملے ہمارا قومی نعرے بن چکے ہیں۔ خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات بھی اسی کیفیت کا شاخسانہ ہیں۔

ایک رپورٹ میں دیے گئے اعداد شمار کے مطابق گذشتہ صرف بارہ سال کے دوران پاکستان میں 23 ہزار762 افراد نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کیا اور رہیتے سال کے صرف چھے ماہ کے دوران 312 مرد، 303 خواتین اور136 بچے خود کشی کر چکے ہیں۔ ان اموات کا ذمے دار کون ہے؟ اگرچہ ایسی کسی موت کے رونما ہونے پر قانوناً حکم رانوں کو کٹہرے میں نہیں لایا جاسکتا نہ ہی ایسی کوشش کبھی کی گئی ہے، لیکن اگر ہم ان عوامل کا جائزہ لیں جو خود کشی کی بنیاد بنتے ہیں تو کسی طور حکومت کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قطرہ قطرہ زہر پلاتا افلاس ہو یا جان کا روگ بن جانے والی بے روزگاری، گھریلو تشدد کے واقعات ہوں یا جنسی زیادتی کے سانحات، چاہے امن وامان کی صورت حال، جس کے باعث پیدا ہونے والے نفسیاتی مسائل بڑھتے جارہے ہیں، ایسے سب مسائل کا سدباب حکومت کی ذمے داری ہے۔ معیشت بہتر بناکر افلاس زدہ طبقے کو غربت کے گڑھے سے نکالنا، اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دے کر بے روزگاری کا انسداد، تشدد اور زیادتی کے شکار افراد کو انصاف کی فراہمی، یہ سب حکومت اور حکومتی اداروں کے بنیادی فرائض ہیں، لیکن ہمارے حکمرانوں کو اپنے فرائض سے دلچسپی ہے ہی کب۔ المیہ تو یہ ہے کہ حکومت ملک میں خود کشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کا نوٹس لینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ چناں چہ ایک خبر کے مطابق ہمارے یہاں خود کشی کے واقعات کی بابت سرکاری اعداد وشمار دستیاب ہی نہیں اور اپنی زندگی کا خاتمہ

کرنے والوں کی صحیح شرح کیا ہے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم پولیس کے تعاون سے خودکشی کو قدرتی موت بنادینے کا چلن اور دیگر عوامل کی بنا پر اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ سامنے آنے والی تعداد کے مقابلے میں ہر سال کہیں زیادہ افراد خودکشی کرتے ہیں۔

جس ملک میں ہر سال دو ہزار کے قریب افراد خودکشی کر لیتے ہوں اس کی حکومت کے لیے یہ ایشو اہم نہ ہونا خود ایک المیہ ہے۔ کیا حکومت اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ ماہرین نفسیات اور ماہرین سماجیات پر مبنی ایک ہیلپ لائن بنادے، جو خودکشی کی طرف بڑھتے افراد کے لیے آخری امید ہو، جس سے رجوع کرکے وہ اپنا مسئلہ اپنا درد بیان کر سکیں۔ اس ہیلپ لائن کا کام صرف تسلی اور دلاسے تک محدود نہ ہو، بلکہ اسے پولیس سمیت مختلف حکومتی اداروں اور صوبائی حکومتوں سے مربوط کیا جائے، تاکہ خودکشی پر کمربستہ شخص کا مسئلہ حل یا اس کی دادرسی کی جاسکے۔ میرے کالموں کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہے، اور یہ فریضہ میں اپنی ذمے داری سمجھ کر ادا کرتی ہوں، ورنہ ہیلپ لائن کی تجویز دیتے ہوئے مجھے کوئی توقع نہیں کہ حکم راں اس پر توجہ دیں گے، جن کا یہ حال ہے کہ 10 ستمبر کو دنیا بھر میں منایا جانے والا ''خودکشی کے تدارک'' کا دن ہمارے یہاں خاموشی سے گزر گیا۔

کسی شخص میں خودکشی کا رجحان ہونے کی بابت ماہرین نفسیات بہ آسانی جان لیتے ہیں، اور اگر کسی نے اپنی جان لینے کی کوشش کی ہو تو اسے اس رجحان سے دلانا ضروری ہوجاتا ہے، ورنہ اگلی کوشش کام یاب بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 325 کے تحت خودکشی کی کوشش کی سزا ایک سال قید اور جرمانہ یا دونوں ہیں، جس کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرکے بچ جانے والا اور اس کے اہل خانہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس حوالے سے کسی کو علم نہ ہوسکے۔ چناں چہ اکثر ماہرین نفسیات سے بھی رجوع نہیں کیا جاتا۔ اگر یہ سزا ختم کردی جائے تو یہ خدشہ دور ہوجائے گا اور یہ رجحان رکھنے والے افراد کی ماہرین نفسیات تک رسائی بلاخوف وخطر ممکن بنائی جاسکے گی۔

ہم اس معاملے میں تمام ذمے داری حکومت پر نہیں ڈال سکتے۔ جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ کسی خاندان کا فرد ہوتا ہے، جو خاندان اجتماعی خودکشی کرتے ہیں وہ میرے اور آپ کے کہیں قریب ہی مسائل اور مصائب کی کھائی میں گر رہے ہوتے ہیں۔ بشیر احمد ہی کے کنبے کو لیجیے، کیا اس کے خاندان والے، محلے کے لوگ اور واقف کار اس گھر میں ڈھلتی عمر کی بن بیاہی بیٹیوں اور ان کے باپ کے دکھ سے آشنا نہیں ہوں گے، مگر کوئی ان کا ہاتھ تھامنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ یہی خودغرضی اور چشم پوشی کا رویہ ہے جو افراد اور گھرانوں کو تنہا کردیتا اور انھیں مایوسی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے، جس کا نتیجہ خودکشی کی

صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔

جہاں تک غربت اور بے روزگاری کی وجہ سے خودکشی کرنے کا تعلق ہے تو ہمارے یہاں ایسے خوش حال افراد کی کمی نہیں جو افلاس کی انتہا تک پہنچ جانے والے گھرانوں کی کفالت کرسکیں۔ یہ فریضہ کمیونٹی کی سطح پر بھی انجام دیا جاسکتا ہے۔

اپنی جان لینے کے خوف ناک عمل کے اسباب میں معیشت کے علاوہ بھی دیگر کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ نفسیاتی مسائل، تحقیر آمیز رویے، کسی ظلم وزیادتی کا نشانہ بن کر بے بسی اور تذلیل کی تصویر ہوجانا، ایسے عوامل ہیں جو فرد کو تنہا کرکے اسے خودکشی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ میرے اور آپ کے ارد گرد ایسے کتنے ہی لوگ ہوں گے جن کے چہروں پر چھائی اداسی اور آنکھوں کی ویرانی ہم سے دو حرف تسلی کے اور ذرا سی امید کی طلب گار ہوتی ہیں، لیکن ہمیں فرصت کہاں کہ ہم کسی کا دکھ بانٹ سکیں۔ ہم تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں، تو آس پڑوس اور گلی محلے میں بسنے والوں کی فکر کیسے ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت جاننا چاہیے کہ جس تنہائی میں دوسرا جی رہا ہے وہ کل ہمارا مقدر بھی ہوسکتی ہے۔ تو آیئے، اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں، اپنے الفاظ اور عمل سے بس ایک زندگی بچالیں، امید کا صرف ایک دیا

روشن کردیں، یوں ہمارا سماج اور ہمارے خاندان ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچ جائیں گے۔
ورنہ ہم سب تنہا تنہا جیتے اور مرتے رہیں گے۔

# ہول ناک جنگ میں شامل نوجوان سوشل میڈیا پر متحرک

سوشل میڈیا

شام کے محاذ سے

ہول ناک جنگ میں شامل نوجوان سوشل میڈیا پر متحرک

مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والے یہ نوجوان اپنے تجربات شیئر کر رہے ہیں

سلگتے مسائل کے شکار خطے مشرق وسطیٰ کا ملک شام گذشتہ کئی سال سے خانہ جنگی کا سامنا کر رہا ہے۔ جہاں شامی عوام بشارالااسد کی حکومت سے برسرپیکار ہیں اور سرکاری فوج انھیں کچلنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہی ہے، وہیں بعض دوسرے ممالک کے جنگ جو بھی فریقین کے ساتھ اس معرکہ آرائی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ حکومت کا ساتھ دینے کے لیے لبنان سے حزب اللہ کے رضاکار اور خبروں کے مطابق ایرانی کمانڈوز شام میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، تو حزب اختلاف کی اعانت کے لیے مختلف مسلم ممالک کے علاوہ مغرب کی کچھ ریاستوں کے مسلمان نوجوان بھی شام میں مصروفِ جنگ ہیں۔ واضح رہے کہ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ میں سے ہر ملک کا کہنا ہے کہ ان کی شہریت رکھنے والے سیکڑوں نوجوان شام میں جنگ لڑ رہے ہیں۔

شامی عوام کی حمایت اور بشارالاسد حکومت کے خلاف صف آراء جنگ جو سوشل میڈیا پر بھی سرگرم ہو گئے ہیں اور اپنی مصروفیات اور کارروائیوں کی بابت اطلاعات اور معلومات شیئر کرتے رہتے ہیں۔ مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس، جیسے ٹوئٹر، بلاگنگ پلیٹ فارم ٹمبلر اور سوال وجواب کی سائٹ "آسک ڈاٹ ایف ایم" پر یہ نوجوان شام میں جاری ہولناک جنگ کے بارے میں نادر معلومات فراہم کررہے ہیں اوراس صورت حال کے مختلف گوشے سامنے لارہے ہیں۔

ساتھ ہی وہ ان سائٹس پر اپنے جذبات واحساسات اور روزوشب کی بابت بھی اظہار کرتے رہتے ہیں، مثلاً یہ کہ اپنے گھر کے حوالے سے انھیں کیا یاد آتا ہے اور حالت جنگ میں رہتے ہوئے وہ کیا کھاتے پیتے ہیں۔ وہ ان گروپس کے شانہ بہ شانہ لڑنے پر فخر اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں، جنھیں مغربی ممالک دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔

ان نوجوانوں میں برطانیہ سے تعلق رکھنے والا تئیس سالہ افتخار بھی شامل ہے، جو برطانیہ کے شہر Portsmouth کا رہائشی ہے۔ برطانیہ چھوڑ کر شام روانہ ہونے سے قبل وہ سوشل میڈیا کا ایک سرگرم یوزر تھا اور سوشل ویب سائٹس پر اپنی سرگرمیاں باقاعدگی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کے کئی ٹوئٹر اکاؤنٹ تھے۔

پر مختصر دورانیے کی وڈیوز اپ لوڈ کرتا اور آسک ڈاٹ ایف ایم پر Keek.com وہ سوالوں کے جواب دیتا تھا۔ اس نے برطانیہ سے ترک وطن کرکے شام جانے کی اپنی خواہش کا اظہار برسرعام کیا تھا۔ اس سال 14 مئی کو اس نے ترکی کی سرحد پار کرتے ہوئے اس حوالے سے ٹویٹ کیا۔

وہ اب بھی سوشل میڈیا خصوصاً ٹوئٹر پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ اپنے ہر روز کے معمولات کے بارے میں ٹویٹ کرتا ہے۔ گذشتہ ماہ ٹوئٹر پر کتے کے بچوں کی ایک تصویر پوسٹ کرتے ہوئے اس نے لکھا، "کتے کے بچے بہت خوب صورت ہیں۔ ان میں سے تین میرے پاس سے گزر رہے تھے۔" ایک اور ٹویٹ میں افتخار کہتا ہے، "(روزوشب کو) کم از کم کچھ بہتر بنانے کے لیے ہم نے دو بلیاں پال رکھی ہیں۔" اس طرح کے ٹویٹس بتاتے ہیں کہ مغرب کے پروپیگنڈے کے برعکس مجاہد کہلانے والے ان نوجوانوں کے سینے میں بھی دل ہے اور وہ زندگی کی خوب صورتیوں سے محبت کرنا اور ان سے لطف اندوز ہونا جانتے ہیں۔

افتخار آسک ڈاٹ ایف ایم پر اپنا اکاؤنٹ فالو کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان سے کہتا ہے کہ وہ اس کے روزوشب کے بارے میں اس سے زیادہ سے زیادہ سوال پوچھیں۔

وہ بتاتا ہے کہ شام میں اس کی فرانس، امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور فن لینڈ سے تعلق رکھنے والے جنگ جوؤں سے ملاقات ہو چکی ہے۔

افتخار کی طرح شام میں برسرپیکار بہت سے دیگر نوجوان میں سوشل میڈیا پر اپنی حالیہ زندگی کی بابت معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں، جن میں عبداللہ ابواللیث بھی شامل ہے۔ اس نے ٹوئٹر پر ایک تصویر پوسٹ کی، جس میں جنک فوڈ سے بھرے دو تھیلے دکھائے گئے تھے۔ یہ گویا اس حقیقت کا اظہار تھا کہ یہ نوجوان کس نوعیت کی خوراک سے پیٹ بھرتے ہیں۔

ایک اور جنگ جو نوجوان، جس نے Chechclear کے نام سے اکاؤنٹ بنا رکھا ہے، آسک ڈاٹ ایف ایم پر سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے سوشل میڈیا پر اپنی پوسٹس لوگوں کے سامنے لانے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ وہ کہتا ہے، "میں یہاں (ویب سائٹ پر) اس ارادے کے ساتھ نہیں آتا کہ مجھے واپس جانا ہے۔"

شام میں مصروفِ جنگ ان نوجوانوں میں سے بہت سے محض اس لیے سوشل میڈیا سے وابستہ ہیں اور یہاں اپنے تجربات سامنے لا رہے ہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے شام پہنچیں اور بشارالاسد کی حکومت کے خلاف جنگ میں شامل

ہوں۔ مثال کے طور پر ڈنمارک سے تعلق رکھنے والے ابوفلان المہاجر نے شام جانے سے پہلے وہاں جانے کی خواہش شیئر کی اور وہاں جانے کے بعد اعلان کیا کہ وہ پہنچ چکا ہے۔ اس نے ٹوئٹ کیا، "اپنے دورے کے بارے میں میری ٹوئٹنگ کرنے کی واحد وجہ ہے کہ ان کی ہمت بڑھائی جائے کہ جو میں نے کیا ہے وہ بھی وہی کریں۔" ابوفلان نے محاذ جنگ کی مختلف تصاویر بھی ٹوئٹر پر پوسٹ کی ہیں۔ ساتھ ہی اس نے شام کے شہر الیپو میں قید ایک جنگ جو کے محاذ جنگ سے دور ہونے پر اظہار افسوس پر مبنی الفاظ بھی پوسٹ کیے ہیں۔

شام میں جنگ لڑنے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے یہ نوجوان جنگ کے حوالے سے اور وہاں گزرتی اپنی زندگی کے بارے میں تجربات شیئر کرکے سوشل میڈیا کو ایک نئی جہت دے رہے ہیں، امکان ہے کہ رجحان تیزی سے فروغ پائے گا۔

# خون پیتی سڑکیں

ہماری مادری زبان گجراتی میں ایک کہاوت مشہور ہے، ''جے ناں ماس ما گھاؤ لاگے اے پنچ دو کھے۔'' یعنی جس کا جسم زخمی ہوتا ہے، زخم کا اندازہ بھی وہی کر سکتا ہے۔

کراچی میں ٹریفک کی صورت حال پر شہر کے گھروں سے سڑکوں تک ہر روز بحث ہوتی ہے۔ شاید ہی اس شہر کا کوئی باسی ہو جسے کسی بھی طور ٹریفک کے حوالے سے پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میرے ساتھ بھی کئی حادثات پیش آچکے ہیں، لیکن گذشتہ ہفتے، یعنی سات دسمبر، کی شام جو حادثہ پیش آیا وہ اتنا خطرناک تھا کہ میں اسے کبھی نہ بھول پاؤں گی۔

ویک اینڈز میں کراچی کی سڑکوں پر گاڑی چلانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ گھنٹوں کی تاخیر اور شدید ذہنی کوفت کے بعد ہی اپنی منزل تک پہنچ پائیں گے، لہذا ہفتے کو کہیں جانا ضروری ہو تو میرے شریک حیات کار پر بائیک کو ترجیح دیتے ہیں، کہ اپنے مختصر جسم کے باعث بائیک ٹریفک کے رش میں راستہ بنا ہی لیتی ہے۔ اس روز بھی ہم بائیک پر تھے۔ شام سات اور آٹھ کے درمیان کراچی میں ٹریفک کی

جو خوف ناک صورت حال ہوتی ہے، اس سے شہر کا ہر رہنے والا واقف ہے۔ یہی دورانیہ تھا جب ہم ناظم آباد میں واقع میٹرک بورڈ آفس سے کچھ فاصلے پر ٹریفک سگنل پر کھڑے سرخ بتی کا رنگ بدلنے کے منتظر تھے۔ سرخ رنگ جوں ہی سبز میں تبدیل ہوا سگنل پر کھڑی گاڑیاں بے ہنگم انداز میں دوڑ پڑیں۔ اس افراتفری میں ایک بائیک سوزوکی سے ٹکرا کر اچھلی، اس کے ساتھ ہی ہماری موٹر سائیکل سمیت چار بائیکس آپس میں ٹکرا گئیں۔ پیچھے سے آتی ایک کار نے ہمارے موٹر سائیکل کو ٹکر ماری اور میں سڑک پر آ رہی۔ عجیب لمحہ تھا، میرے بیٹے اور دو سالہ بیٹی کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اب میں انھیں اور وہ مجھے شاید ہی دیکھ پائیں، یہ خیال یقین کی طرح میرے دل میں تیر کی طرح اتر گیا۔ میں نے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

آنکھیں کھلیں تو میں عباسی شہید اسپتال کے ایمرجینسی وارڈ میں تھی، جہاں کے وحشت طاری کرتے ماحول میں مجھے اپنے زندہ ہونے کی نوید ملی۔ میں کافی زخمی ہو گئی تھی۔ ان زخموں کی تکلیف اب تک جھیل رہی ہوں، لیکن اللہ کا احسان ہے کہ ہاتھ پاؤں سلامت رہے۔ یہ خوف میں ڈوبے وہ لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے۔ سرکاری اسپتالوں کی حالت زار پر تو پھر کبھی لکھوں گی، فی الوقت تو میرا موضوع ٹریفک حادثات ہیں، وہی بات کہ خود کو ضرب لگی تو اس اہم موضوع پر قلم اٹھانے کا خیال آیا، ورنہ اب تک شہر کے اور لوگوں کی طرح میں ان حادثات پر

زبانی تبصرے ہی کرتی رہی ہوں۔

اعتدال سے ہٹ کر اختیار کیا جانے والا ہر عمل مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ عدم اعتدال ہی کا رویہ ہے جو ٹریفک حادثات میں کارفرما نظر آتا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس صورت حال کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں۔

کراچی کی سڑکیں روزانہ کتنی ہی جانیں نگل جاتی ہیں۔ ایک طرف شہر کی اپنی بڑھتی آبادی کا بوجھ، دوسری طرف دیگر شہروں اور دیہات سے آنے والے اور شہریوں کی سفری ضروریات، گاڑیاں امڈی پڑ رہی ہیں۔ کوئی اصول اور کوئی ضابطہ کہیں نظر نہیں آتا، البتہ شہر کے وہ علاقے جہاں شہر کا صرف پانچ فی صد امیر ترین طبقہ رہائش پذیر ہے، وہاں سڑکیں اور گلیاں بھی دیگر علاقوں کی نسبت کہیں کشادہ ہیں، وہاں ٹریفک پولیس کے اہل کار بھی نظر آتے ہیں اور صحیح کام کرتے سگنل بھی۔ دیگر علاقوں بھی ٹریفک پولیس کے اہل کار تو ہوتے ہیں، مگر ان میں سے دو چار کے علاوہ سب ہی سو پچاس کی دہاڑی'' لگانے میں مصروف رہتے ہیں۔''

جس شہر میں ٹریفک کے قوانین اور ضابطے سو اور پچاس روپے میں بکتے ہوں، وہاں بے ہنگم ٹریفک کے وحشت ناک نظارے اور سڑکیں خون میں نہلاتے حادثات

نہیں ہوں گے تو کیا ہوگا۔

اگر مجھے علم ہو کہ گاڑی چلاتے ہوئے موبائل فون استعمال کرنے کی صورت میں پکڑے جانے پر مجھے دس ہزار روپے جرمانہ دینا پڑے گا، تو میں کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گی، لیکن جب پکڑے جانے کا خطرہ ہی نہ ہو اور ایسا ہونے پر معمولی سی رقم دے کر جان چھوٹ جائے، تو خوف کیسا۔ اگر کوئی دیانت دار سفید وردی والا اہل کار قانون کی خلاف ورزی پر کارروائی کرنے کی ٹھان لے اور رشوت ٹھکرا دے تو کالی قمیص والی پولیس تھانے میں چند گھنٹے بند اور ملزم کی جیب خالی کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا جائے گا یا پھر کورٹ میں حاضری ہو گی اور ہزار بارہ سو روپے میں معاملہ طے ہو جانے کے بعد گاڑی کے کاغذات ہاتھ میں تھما دیے جائیں گے۔ بس اتنی سی بات ہے، پھر کیسا ڈر اور کیسی فکر، اڑاتے رہیں گاڑی، توڑتے رہیں قوانین، جان لیتے رہیں لوگوں کی۔

آج انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ وقت ہے، لیکن وقت بہرحال اپنی اور دوسروں کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں۔ ہمارے ہاں تھوڑا سا وقت بچانے اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی خواہش کے باعث ایسے بھیانک ٹریفک حادثات رونما ہوتے ہیں جو نہ صرف فردِ واحد بلکہ اس کے پورے خاندان کے لیے اذیت کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ موت کا وہ کھیل ہے کہ اگر سانسیں واپس مل بھی جائیں تو جسمانی معذوری کبھی

کبھی زندگی کو موت سے بدتر کردیتی ہے۔
ٹریفک کی خراب صورت حال اور حادثات میں جہاں دیگر عوامل کا ہاتھ ہے، وہیں ہمارے رویے اس کے سب سے زیادہ ذمے دار ہیں۔ ہماری سڑکیں ہمارے اخلاقی بحران کا سب سے بڑا اور واضح ترین مظہر ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم نے خود کو غیر مہذب قوم ثابت کرنے کا تہیہ کرلیا ہو۔ جہاں سڑک پر ذرا سا ٹریفک جام ملا گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھادی، یعنی پیدل چلنے والا جو پہلے ہی پریشان ہے ٹوٹی پھوٹی سڑک سے بھی محروم ہوجائے۔
ٹریفک قوانین کے تحت موٹر سائیکل چلانے والے اور اس کے پیچھے بیٹھے شخص، دونوں پر ہیلمٹ پہننے کی پابندی ہے، مگر پیچھے بیٹھنے والے تو سرے سے ہیلمٹ پہنتے ہی نہیں، بائیک رائڈرز میں سے بھی بہت بڑی تعداد اس قانون کو خاطر میں نہیں لاتی۔ نتیجتاً موٹر سائیکل کے حادثات عموماً جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔
ایک رپورٹ بتاتی ہے کہ اس سال صرف اپریل تک کراچی میں 100 مہلک حادثات رونما ہوئے، جن میں 113 افراد جان کی بازی ہار گئے اور 75 شدید زخمی ہوئے، جب کہ بعض اعداد و شمار کے مطابق روزانہ شہر کی سڑکوں پر حادثات کا شکار ہونے والے

پندرہ سے بیس افراد خطرناک حالت میں اسپتال لائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر حادثات منی بس، کوچز اور بائیکس کے ہوتے ہیں۔ رہی سہی کسر چنگچی رکشاؤں نے پوری کر دی ہے، جس کے ڈرائیور کی معمولی سی غلطی کے باعث تیز ٹریفک میں الٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

حادثوں کی ایک بڑی وجہ غیر لائسنس یافتہ ڈرائیور بھی ہیں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ٹرک اور ڈمپر چلانے والوں کا پاس بھی لائسنس نہیں ہوتے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ پبلک ٹرانسپورٹ کے ڈرائیور اور ان کی تنظیمیں اپنا مکمل ریکارڈ ٹریفک پولیس کے حوالے کریں، مگر نہ وہ خود ایسا کرتے ہیں نہ ان سے ریکارڈ وصول کیا جاتا ہے۔

حادثات کا ایک سبب بعض روڈ کٹس کی ساخت بھی ہے، جس کی وجہ سے حادثے کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی پُل بناتے ہوئے بھی غلط پلاننگ کی گئی ہے۔ متعلقہ اداروں کو چاہیے کہ اس طرف توجہ دیتے ہوئے یہ سقم دور کریں۔

کراچی میں ٹریفک کی صورت حال جتنا اہم مسئلہ ہے اسے اس طرح قابل توجہ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ سڑکوں پر ہونے والے طوفان بد تمیزی کے باعث نہ صرف خوف ناک اور جان لیوا حادثات ہوتے ہیں بلکہ ٹریفک جام اور ٹریفک کی روانی میں خلل

کی وجہ سے شہریوں کا قیمتی وقت اور پیٹرول کی مد میں روزانہ کروڑوں روپے کی خطیر رقم بھی ضائع ہوتی ہے۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے اسے سنجیدگی سے لینا ہوگا۔ اس ضمن میں سب سے اہم اقدام یہ ہے کہ لوگوں کو اس بارے میں شعور دیا جائے۔ جب تک ایک عام فرد ٹریفک کے حوالے سے اپنی ذمے داری محسوس نہیں کرے گا، صورت حال کو بہتر نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو اسکولوں میں بچوں کو روڈ سائنز اور ٹریفک کے اصولوں کی بابت بتانے کے لیے ٹریفک پولیس کی جانب سے باقاعدہ ٹیمیں آتی تھیں، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا، حالاں کہ گراس روٹ لیول سے ٹریفک قوانین کے بارے میں شعور بیدار کرنا بہت ضروری ہے، اس کے ساتھ قوانین پر سختی سے عمل درآمد کی بھی ضرورت ہے۔

کراچی میں ٹریفک کا مسئلہ دن بہ دن گمبھیر اور سنگین ہوتا جارہا ہے۔ اگر اس مسئلے پر فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ اپنے خطرناک نتائج اور ضمنی مسائل کے ساتھ سنگین تر ہوتا جائے گا۔

## انسانیت کہاں ہے؟

کہتے ہیں انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ حقیقتاً اس بات میں ذرا بھی صداقت نہیں۔ انسانیت مسلمان بھی ہوتی ہے، عیسائی بھی، یہودی بھی اور ہندو بھی۔ اور ہمارے ہاں تو انسانیت کئی اور طبقوں میں بھی بٹی ہوئی ہے، سنی انسانیت، شیعہ انسانیت، دیوبندی انسانیت، بریلوی انسانیت، اس جذبے کی لسانی اور علاقائی تقسیم اس کے علاوہ ہے۔ جی ہاں، انسانیت کا مذہب بھی ہوتا ہے، فرقہ بھی اور زبان بھی۔ میرا قلم انسانیت جگانے کے لیے چلتا ہے۔ مجھے ملنے والی ای میلز سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرے کالم پڑھنے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ کالم چھپتے ہی پاکستان اور مختلف ممالک سے ای میلز کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ان میں میرے خیالات کی مخالفت پر مبنی میلز بھی شامل ہوتی ہیں، مگر میلز کی غالب اکثریت میری کالموں کی ستائش اور تحریر میں اٹھائے گئے نکات کی حمایت پر مبنی پیغامات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ میں اپنی تحریروں میں عام آدمی کے دکھوں اور مصائب کو موضوع بناتی ہوں، اس لیے یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ لوگ دراصل میری ستائش نہیں کر رہے بل کہ میری آواز میں آواز ملا رہے ہیں۔ یوں

میرے اندر موجود جذبہ انسانیت سرشار ہو جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میری زندگی کا مقصد کسی حد تک تو پورا ہو رہا ہے کہ میرے لفظ کچھ لوگوں میں انسانیت بیدار کرنے میں کامیاب رہے۔

لیکن میرا یہ زعم ٹوٹ گیا۔ میں جس فقرے کو پلو سے باندھے اپنے قلم کو مستقل مزدوری پر لگائے ہوئے تھی کہ ''انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا'' وہ غلط ثابت ہوا، تو اب میرا قلم کیا لکھے گا؟

لوگ دیکھتے ہیں، پڑھتے ہیں اور پھر سرسری جان کر گزر جاتے ہیں۔ عقائد انسانیت پر بھاری ہیں، اگر دوسرے عقیدے کا کوئی شخص تڑپ رہا ہو تو وہ شخص جو اس کے بہت قریب ہے اور مدد کر سکتا ہے، وہ بھی یہ سوچ کر منہ موڑ لے گا کہ میں کیوں ایک دوسرے عقیدے والے کی مدد کروں، مرتا ہے تو مرتا رہے، خس کم جہاں پاک۔ اُس کا یہ عمل اس سوچ کا آئینہ دار ہے جس کے تحت وہ اپنے سامنے تڑپتے ہوئے شخص کو نہ صرف کافر گردانتا ہے، بل کہ کافر کو انسان سمجھنے اور اس کی جان بچانے کو بھی گناہ سے تعبیر کرتا ہے۔

لوگ مر رہے ہیں اور میں فقط صفحے کالے کیے جا رہی ہوں۔ انسانیت باقی نہیں رہی فقط مختلف رنگوں میں رنگے گروہ باقی رہ گئے ہیں۔ کیسے سمجھاؤں اپنے

پیاروں کو کہ انسان ہی نہ رہے تو عقیدے، زبانیں، رنگ اور نسل یہ سب کہاں رہیں گے۔

انسانیت کے خانوں میں بٹنے کی کرب ناک حقیقت مجھ پر اس وقت آشکار ہوئی جب جنگ کے شکار شام کی ناکافی کپڑوں میں ملبوس ایک چھے سات سالہ بچی کو ایک مکان کے ملبے پر جمی برف میں یوں دفن دیکھا کہ اس کا گلاب سا چہرہ اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں نمایاں تھے اور باقی پر برف جمی ہوئی تھی۔ شاید اسے ابھی ابھی برف سے نکالا گیا تھا۔ وہ شام اور خطے کے دیگر ممالک میں آنے والے شدید برفانی طوفان کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ خون جماتی سردی میں نازک سا جسم یوں ہوگیا تھا جیسے سوکھی لکڑی۔ لیکن ہمیں اس بچی کی حالت سے کیا۔ یہ ہمارا مسئلہ تو نہیں۔ وہ جانیں جن کی یہ بیٹی ہے۔ آخر کیوں ان سے اس کا خیال نہ رکھا گیا۔ خیال تو اس وقت رکھا جاتا جب وہ زندہ ہوتے۔ یہ بدقسمت بچی تو ماں باپ سے محروم ہوچکی ہے۔ شام میں تو بھیڑیے خون اور ماس سے اپنی بھوک پیاس مٹا رہے ہیں اور ملک کی مخصوص آبادی پہلے ہی قتل وغارت گری کا شکار ہے کہ ایسے میں برفانی طوفان نے بھی قیامت ڈھادی۔ اس بچی کی ماں ہوتی تو شاید سخت سردی بھی اپنے تن کو لبادہ بنا کر اپنی بچی کو اڑھا دیتی۔ اسے اپنی ممتا کی حرارت سے زندگی دیتی۔ لیکن اسے تو پہلے ہی مار دیا گیا ہے، اب وہ کہاں سے آئے اپنی بچی کی مدد کرنے۔

شام عہد حاضر کا سب سے بڑا مقتل بنا ہوا ہے۔ وہاں جس بے دردی سے انسانوں کا خون بہایا جارہا ہے اس کی مثال حالیہ تاریخ میں کم کم ہی ملتی ہے۔ ملک کا ہر گلی محلہ محاذجنگ یا قبرستان بنا ہوا ہے۔ شامی سرزمین برسوں سے لہو میں نہا رہی ہے، اہل شام کی آزمائش ختم ہی نہیں ہونے ہی میں نہیں آتی۔ خانہ جنگی کے باعث تباہ ہوتے صدمے جھیلتے شامیوں پر ایک اور مصیبت برفانی طوفان کی صورت میں نازل ہوئی ہے۔ مشرق وسطیٰ کو کوئی ایک صدی بعد اس طوفان کا سامنا ہے۔ اس طوفان کے باعث سرزمین شام پر بچے مر رہے ہیں، بے یارو مددگار مائیں جو تن ڈھانپنے کے لیے کپڑوں کو ترس رہی ہیں، زمین اور فضا کو سرد خانہ بناتی سردی میں خود کو اور اپنے بچوں کو کیسے بچا پائیں گی۔ ایسے میں جب خانہ جنگی کا شکار ہونے والے لوگ دوا اور مسیحا کے انتظار میں تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں، برفانی طوفان نے ان کی زندگی مزید اجیرن کر دی ہے۔ یہ لوگ سسک سسک کر مرتے رہیں گے۔ ان کی چیخیں، کراہیں اور بین سماعتوں سے ٹکرا کر واپس آتے رہیں گے۔ کچھ دنوں بعد دنیا بھر میں کرسمس اور پھر سال نو کی خوشیاں مناتے لوگوں کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ شام کے باسی کس طرح تڑپ تڑپ کر جانیں دے رہے ہیں۔ شام میں انسانیت قتل ہوتی رہے گی اور باقی دنیا کی انسانیت جشن میں مشغول ہوگی۔ اوروں کو تو چھوڑیے، مسلم ممالک کی خود غرضی

اور شام کے المیے سے بے اعتنائی ہی انسانیت کا نوحہ لکھنے کے لیے کافی ہے۔ حکومت کے مظالم کا شکار شامی عوام کی حمایت نہیں کی جا سکتی، ان کے حق میں جلسے جلوس نہیں نکالے جا سکتے اور قرار دادیں منظور نہیں ہو سکتیں، تو چلیے اسے مسلم ممالک کی حکومتوں اور ان کی سیاسی جماعتوں کی سیاسی مجبوری مان لیتے ہیں، لیکن ایک قدرتی آفت کا شکار ہونے والوں کی مدد سے گریز کیوں، انھیں مصیبت سے نکالنے کے لیے آواز اٹھانے یا کوئی اقدام کرنے سے بے اعتنائی کس لیے؟ یہ سوال یوں تو ہر مسلم ملک کی حکومت سے ہے، مگر پہلے پاکستان کے حکم رانوں اور یہاں سیاست میں سرگرم جماعتوں خاص طور پر مذہبی جماعتوں سے پوچھنا چاہتی ہوں، اتنی خاموشی کیوں ہے بھائی۔

## شکریہ اے ہمارے محسنو!

ایدھی فاؤنڈیشن کی چار ایمبولینسیں جل گئیں۔ سبزی منڈی پر واقع ایدھی سینٹر کے سامنے کھڑی ان گاڑیوں کا جلنا کسی کے لیے شاید بڑی خبر نہ ہو مگر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرا ذاتی نقصان ہوا ہو۔ میں سوچ رہی ہوں کہ موت کے پنجوں سے جانوں کے چھین کر انھیں زندگی کی آغوش تک پہنچاتی ان چار گاڑیوں کے جل جانے کی وجہ سے کتنے ہی مریض اور زخمی علاج گاہوں تک رسائی سے محروم ہو جائیں گے اور ان میں سے کتنے ہی تڑپ تڑپ کر جان ہار جائیں گے۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایدھی فاؤنڈیشن، چھیپا ویلفیئر ایسوسی ایشن اور ان جیسے دیگر فلاحی ادارے اگر کام کرنا بند کر دیں تو ہمارا کیا حال ہو۔ یہاں ''ہمارا'' سے میری مُراد غریب اور متوسط طبقے کے وہ لوگ ہیں جنھیں عوام اور عام کہا جاتا ہے، جن کے ووٹ سے حکومتیں بنتی اور پھر اپنی پوری مدت کے دوران انھیں ''بناتی'' رہتی ہیں، یہ مملکت کے وہ باسی ہیں کہ بجلی کا بحران، گیس کی بندش، دہشت گردی اور بدامنی سمیت ہر مسئلہ ان کی زندگی اجیرن بنا دیتا ہے، رہی بااثر اور وسائل سے مالا مال مختصر اقلیت، تو اس کے پاس اثر ورسوخ اور پیسے کی وہ جادوئی چھڑائی ہے جسے گھما کر آن کی آن میں کوئی

مسئلہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ جناب ! اگر فلاحی سرگرمیوں خاص طور پر زندگی بچانے میں مصروف یہ ادارے اپنا کار رحمت سمیٹ لیں تو ہر روز کتنے ہی لوگ سرکاری ایمبولینسوں کا انتظار کرتے کرتے انتظار میں کھلی آنکھیں لیے دنیا سے رخصت ہو جائیں، جائے حادثات اور دہشت گردی کے شکار مقامات پر زخمی پڑے کراہتے رہیں اور پھر ان کی کراہیں مستقل سکوت میں بدل جائیں، لاوارث لاشیں اپنے ورثاء کی تلاش میں مٹی میں ملتی رہیں اور وہ ننھی جانیں جنھیں بدنامی کے خوف سے یا افلاس کے باعث کچرا کنڈیوں میں پھینک دیا جاتا ہے، وہیں پڑے پڑے کتوں، بلیوں اور چوہوں کی غذا بنتی رہیں اور گھر سے محروم ہو کر بے آسرا ہو جانے والے افراد فٹ پاتھوں پر رہ کر موسموں کی شدتیں ایک روز جھیلتے جھیلتے وہیں جان سے گزر جائیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں حکمراں صرف شان سے حکومت کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، حکومتیں اپنے ذمے داریاں ادا کرنے کو تیار نہیں اور اداروں کی نجکاری حکومتوں کا محبوب مشغلہ ہے، وہاں یہ فلاحی ادارے کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں اس حقیقت کو لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہیں۔ زخمیوں اور جان بہ لب مریضوں کی جان بچانے سے بے آسرا لوگوں کو چھت دینے اور لاوارث لاشوں کی تدفین یا انھیں ورثا تک پہنچانے سے غربت کی دلدل میں گلے تک پھنسے لوگوں کو مفت کھانا کھلانے تک یہ ادارے ان ذمے داریوں کو نبھانے میں مصروف ہیں جو دراصل ریاست کے فرائض ہیں۔

ٹھیک ہے کہ ان اداروں کی بانی اور انھیں چلانے والی شخصیات کو حکومتیں اور معاشرہ بجا طور پر عزت واحترام دیتے ہیں اور انھیں اعزازات سے نوازا جاتا ہے، مگر ان سے وابستہ سیکڑوں رضاکار ہر صلے سے محروم ہیں۔ الٹا انھیں ہتک آمیز سلوک اور تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے کئی رضاکار اپنے کام کے دوران جان سے ہاتھ بھی دھو بیٹھے ہیں۔ یہ رضاکار کس قدر عظیم ہیں، کن مشکلات میں اور کس جذبے سے کام کرتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے ایک ادارے کے رضاکار سے گفتگو کرکے ہوا، جو اس ادارے کی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔

بہ طور کالم نویس زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں جاننا اور ہر پیشے سے وابستہ افراد سے مکالمہ کرنا میرے کام کا حصہ ہے۔ اس طرح میں لوگوں کے مسائل سے آگاہ ہو کر انھیں اپنے کالموں کے ذریعے سامنے لانے کے قابل ہو پاتی ہوں۔ اس روز ہم ایک عزیز کی عیادت کے لیے آغا خان اسپتال گئے تھے۔ عیادت کرکے واپسی ہوئی تو پتا چلا کہ ہماری گاڑی چلنے سے انکار کر چکی ہے۔ میرے شوہر کو گاڑی کی خرابی سے الجھے دیکھ کر پاس ہی کھڑی ایک فلاحی ادارے کی ایمبولینس کا ڈرائیور ان کے پاس آگیا اور اس کھوج میں ان کی مدد کرنے لگا۔ آخر طے پایا کہ کسی میکینک کی مدد لی جائے۔ اس ڈرائیور نے قریب ہی موجود ایک میکینک کا نمبر دیا، جسے میرے شوہر نے فون کرکے بلا لیا۔ جب تک وہ آتا

مجھے اس ایمبولینس ڈرائیور سے مکالمے کا موقع مل گیا۔ پھر کیا تھا۔ جانے کب کا سینے میں بھرا دکھ اس کے ہونٹوں پر تھا۔

باجی! ہم لوگ یہ کام نوکری سمجھ کر نہیں کرتے، لوگوں کی خدمت کے لیے کرتے ہیں، بڑا سکون ملتا ہے دوسروں کے کام آ کر، مگر کبھی کبھی بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے لفظوں میں کوئی کھوٹ نہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی ڈرائیور بعض اوقات اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر لوگوں کی جانیں بچاتے ہیں، اور ایسا وہ چند ہزار روپے کی تن خواہ کے لیے نہیں بل کہ انسانیت کے جذبے کے تحت کرتے ہیں۔

جب کسی مقام پر گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور بم دھماکے کی ہول ناک آواز اپنے پیچھے لاشیں، چیختے کراہتے زخمی، خون، آگ، دھواں اور خوف چھوڑ جاتے ہیں، تو وہاں موجود ہر شخص جانے بچانے کی فکر میں بھاگ کھڑا ہوتا ہے، مگر یہ رضاکار اپنے محفوظ ٹھکانوں سے نکل کر ان مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ وہ برستی گولیوں اور آگ اور دھوئیں کے درمیان راستہ بنا کر زخمیوں تک پہنچتے اور انھیں اسپتال پہنچاتے ہیں، وہ ایسی لاشوں کو اٹھاتے ہیں جن کی حالت دیکھ کر ہم آپ جیسے لوگ انھیں دوبارہ دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے، لیکن ان خدمات کے صلے میں عزت افزائی تو کجا بعض اوقات انھیں انتہائی ناروا سلوک کا سامنا

کرنا پڑتا ہے۔ ''ہم سائرن بجاتے جائے حادثہ کی طرف جا رہے ہوں تو لوگ ہمیں راستہ نہیں دیتے، بلکہ ایسا بھی ہوا کہ ایسے میں لوگوں نے ڈرائیور کو گالیاں دیں اور تھپڑ تک مار دیا۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کے چہرے پر دکھ کے سائے تھے۔ اس کے ایک ساتھی ڈرائیور کو ایک زخمی کے لواحقین نے اس بنا پر تشدد کا نشانہ بنایا کہ اسے زخمی تک پہنچنے میں ٹریفک میں پھنسے کے سبب تاخیر ہو گئی تھی۔ یہ اور ایسے کتنے ہی واقعات جو اس نے مجھے سنائے یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ہم اپنے محسنوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

خود غرضی اور بے حسی کی اس فضا میں یہ رضاکار انسانیت کی علامت ہیں۔ ہمیں انھیں کچھ نہیں دے سکتے تو کم از کم ان کی عزت تو کر سکتے ہیں، ان کی ستائش کر کے ان کا حوصلہ تو بڑھا سکتے ہیں۔ حکومت اور عوام کو ان اداروں اور ان کے رضاکاروں کا ممنون احسان ہونا چاہیے جو معاشرے کی اتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ کم از کم ہر بجٹ میں ان فلاحی اداروں کے نقصان کے ازالے کے لیے رقم مختص کرے، جو نقصان کی صورت میں فوری ادا کی جائے۔ اسی طرح ان اداروں سے وابستہ رضاکار زخمی یا جاں بہ حق ہو جائیں تو ان کے اہل خانہ کی کفالت ریاست کی ذمے داری قرار پائے اور خدمات دیتے ہوئے زخمی ہونے یا جان سے جانے والے رضاکاروں کو اعزازات دیے جائیں۔

یہ فلاحی ادارے اور ان کے رضاکار ہمارے محسن ہیں، ہم ان کے احسان کا بدلہ

نہیں دے سکتے، لیکن ان کی خدمات کا اعتراف تو کر ہی سکتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو آپ کو ''سرراہ جو رضاکار نظر آئے اس سے اتنا تو کہہ ہی سکتے ہیں، ''شکریہ اے ہمارے محسن۔

# کاش ارم کی چیخیں ایوانوں تک پہنچیں

’’یہ بس ایک حادثہ تھا۔ اس نے تین مرتبہ میرے پیسے چُرائے تھے۔‘‘ وہ بڑے آرام سے چائے کی چسکیاں لیتے اور بسکٹ کھاتے ہوئے بہت سکون سے اپنے فعل کا جواز پیش کر رہی تھی۔ کسی بے ضرر یا عام سے فعل کا نہیں، ایک قتل کا، وہ بھی ایک دس سالہ معصوم بچی کے قتل کا۔ ٹھیک ہی تو ہے، کیسی شرمندگی، کہاں کی ندامت، کیسا خوف اور کیوں ہو دکھ، تشدد کے باعث جان سے جانے والی ایک غریب گھر کی لڑکی تھی، وہ بھی ملازمہ، کمی کمین، انسان تھوڑی تھی، غصہ آیا، لوہے کا پائپ اٹھایا اور پیٹنا شروع کردیا، قصور تو اس کا ہے نا، وہ کیوں تھی اتنی نازک تھی کہ مار نہ سہہ سکی اور مر گئی۔

لاہور میں مالکن کے تشدد کے باعث ہلاک ہوجانے والی دس سالہ گھریلو ملازمہ کی ہلاکت سے متعلق تفصیلی خبر میں خاتون رپورٹر نے اس لڑکی کی جان لینے والی مالکن کی بے اعتنائی اور پُرسکون کیفیت کو بڑی حیرت سے بیان کیا ہے۔ ایک بچی کی جان لے کر بھی پوری طرح مطمئن یہ عورت جو ماں کے درجے پر بھی فائز ہے ہمارے اس طبقے کی عکاسی کر رہی ہے جس کے دل ودماغ میں آقا اور غلام کا سیاہ تصور اب تک اپنی پوری کالک کے ساتھ مسلط ہے اور یہ طبقہ ہم پر اپنا

تسلط جمائے ہوئے ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک انسان نامی کوئی مخلوق دنیا میں موجود نہیں، بس اشراف ہیں یا اجلاف۔ وہ افراد جو ان کے غلیظ معیار کے مطابق کم ذات ہیں ان پر ہر ظلم ڈھانا، تشدد کرنا یہاں تک کہ جان بھی لے لینا یہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کسی غریب بچے پر باغ سے سے پھل توڑنے پر کتے چھوڑ دینے، کسی کسان کی بیٹی کو بے آبرو کر دینے اور ہاریوں کو نجی جیلوں میں بند رکھنے سے متعلق خبریں میڈیا پر نشر اور شایع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سب اسی آقا اور غلام کی سوچ کا شاخسانہ ہے۔ خود کو آقا سمجھنے والے جانتے ہیں کہ اثرورسوخ اور دولت کے انبار قانون کے سامنے ان کی ڈھال بنے رہیں گے، سو ان کی جاگیردارانہ اور شاہانہ سوچ کو کوئی خوف نہیں ہوتا۔

گڑیوں سے کھیلنے کی عمر میں ننھے منے ہاتھوں سے برتن اور کپڑے دھونے اور جھاڑو دینے پر مجبور کر دی جانے والی گڑیا ارم رمضان جس گاؤں سے تعلق رکھتی تھی اس کا نام ہے ''جندر کھا'' اس پنجابی نام کا مطلب ہوا، وہ جگہ جہاں زندگی محفوظ ہے۔ افلاس کے عذاب نے اس سے اپنا گاؤں چھڑوادیا۔ اسے گھریلو ملازمہ کے طور پر لاہور بھیج دیا گیا، جہاں وہ متوسط طبقے کے ایک خاندان میں کھانا پکا کر روزی کمانے لگی۔ یوں شرارتوں اور معصوم فرمائشوں کی عمر غربت کی بھینٹ چڑھ کر روزگار کی مشقتوں کی نذر ہونے لگی۔

مالکن کے مطابق ارم کا ''سنگین جرم'' یہ تھا کہ اس نے پیسے چرائے تھے، چلیے مان لیا، یہی کام اپنا بچہ کرتا تو اسے غلطی جان کر اور مان کر ڈانٹ دیا جاتا، سمجھا دیا جاتا یا زیادہ سے زیادہ ایک تھپڑ لگا دیا جاتا، مگر وہ بچی تھوڑی تھی، وہ تو ملازمہ تھی، اسے اس جرم کی پوری سزا دی گئی۔ غصے سے بھری مالکن نے لوہے کے پائپ سے اسے مارنا شروع کیا اور مارتی ہی چلی گئی۔ اس کا سولہ سالہ بیٹا وہیں کھڑا ماں کی ''تادیبی کارروائی'' دیکھتا رہا۔ بچے کی تربیت کے لیے یہ ضروری تھا، اسی طرح تو معاشرے کو بے رحم اور ذرا سی طاقت پا کر فرعون بن جانے والے افراد ملیں گے۔

ارم کی تصویر میں اس کی دمکتی آنکھیں بتاتی ہیں کہ اسے زندگی سے کتنی محبت تھی۔ اب یہ آنکھیں اپنی دمک اور جینے کی لگن سمیت ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہیں۔

ارم کے ساتھ ہونے والا سفاکانہ سلوک ہمارے ملک میں گھریلو ملازمین خاص طور پر کم سن گھریلو ملازمین کی زندگیوں کی کہانی سامنے لاتا ہے۔ گھروں میں کام کرنے کے لیے بچوں کو اس لیے ترجیح دی جاتی ہے کہ انھیں بڑوں کے مقابلے میں بہت کم تن خواہ دینا پڑتی ہے۔ میرے ایک واقف نے مجھے بڑے دکھ کے ساتھ بتایا تھا کہ اندرون سندھ کے سفر کے دوران وہ جس گھر میں مہمان ہوئے تھے

وہاں کام کرنے والا آٹھ دس سال کا بچہ پورا دن اس گھر میں خدمات انجام دیتا تھا اور اس کی تن خواہ تھی فقط تین سو روپے ماہانہ۔ کوئی ہے جو اس ظلم پر توجہ ہی دے؟

انسانی اقدار اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ بچوں کو روزگار پر لگایا جائے، مگر ہماری معاشی حقیقتیں بہت ظالم ہیں۔ غربت کی دلدل میں پھنسے گھرانوں کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کسی ہوٹل یا گیراج میں بہ طور چھوٹا لگادیں یا انھیں حصول روزگار کے لیے کھردری زندگی کے حوالے کردیں۔ صنعتوں سے دکانوں اور گھروں تک اس مجبوری کا خوب فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ہماری معاشی صورت حال اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بچوں کے کام کرنے پر پابندی لگادی جائے، لیکن ان کے تحفظ اور ان کی زندگی سنوارنے کا اہتمام تو کیا جاسکتا ہے اور یہ فریضہ حکومت اور معاشرہ دونوں انجام دے سکتے ہیں اور انھیں دینا چاہیے۔

کاش لوہے کے پائپ کی ضربیں کھاتی ارم کی چیخیں منتخب ایوانوں اور صاحب ثروت افراد کے کانوں تک پہنچیں۔

ریاست معاشرے کے ہر طبقے کے حقوق کی ذمے دار ہوتی ہے، تو گھریلو ملازمین کے

حقوق سے بے اعتنائی کیوں؟ ضرورت ہے کہ گھریلو ملازمین کے حقوق کے لیے قوانین بنائے جائیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد کروایا جائے۔ خاص طور پر گھروں میں ملازمت کرنے والے بچوں کے حوالے سے قانون سازی کی جائے۔ ان کے لیے اوقاتِ کار کا تعین کیا جائے۔ مالکان کو پابند کیا جائے کہ وہ کم سن ملازمین سے کوئی بھاری کام نہیں لیں گے اور ان پر ان کی عمر کے حساب سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ ان بچوں کے لیے تعلیم کا خصوصی اہتمام کرنا بھی حکومت کا فرض ہے۔ ان کے لیے سرکاری اسکولوں میں شام کی کلاسیں شروع کی جاسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ نجی اسکولوں کو پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ شام کے اوقات
میں ان بچوں کے لیے خصوصی تعلیم کا اہتمام کریں۔ سرکاری اور نجی اسکولوں کی ان خصوصی کلاسوں میں تیکنیکی تعلیم بھی دی جائے۔ یہی راستہ ان بچوں کی زندگی سنوار سکتا ہے۔

ارم کی مالکن جیسے افراد کو گھریلو ملازمین کے بارے میں اپنی سوچ بدلنا چاہیے، یہ غلام نہیں آپ کے کاموں میں آپ کے مددگار ہیں۔ یہ ان بچوں اور ان کے والدین کا ہم پر احسان ہے کہ بھوک سے مجبور ہو کر انھوں نے جرم کو سہارا نہیں بنایا، محنت کو پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھیں مجبور نہ کیجیے کہ وہ محنت میں عظمت کے بہ جائے ذلت کا سامنا کرکے جرم اور دہشت کی تاریک

راہوں کے مسافر بن جائیں۔

# خطرات میں گھری زندگی

جنوری کی وہ سرد رات اپنے آخری حصے میں داخل ہو چکی تھی۔ اندھیرا سمٹنے اور صبح کا اجالا اترنے کو تھا کہ اُس گھر میں روشنی پھیلنے لگی۔ مگر یہ سورج کی حیات بخش روشنی نہیں، موت کے اندھیروں کی طرف بلاتے شعلوں کی روشنی تھی۔ شارٹ سرکٹ نے بجلی کو آگ میں بدل دیا تھا۔

اس ماہ کی سترہ اور اٹھارہ کی درمیانی شب کراچی کے علاقے فیڈرل بی ایریا کے بلاک 15 میں واقع اس مکان کے مکین آنے والی قیامت سے بے خبر سو رہے تھے۔ اس دو منزلہ مکان کی اوپر والی منزل پر عاصم اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا اور نیچے کی منزل پر اس کا بھائی ماں اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم تھا۔ اوپر کی منزل کا سکوت اس وقت ٹوٹ گیا جب پانچ سالہ شارق نے ''دادی دادی'' کہہ کر چِلانا شروع کر دیا۔ گھر کے تمام افراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ نیند بھری آنکھوں سے دیکھا تو ہر طرف شعلے بھڑک رہے تھے۔ ان کے شور مچانے سے اہل محلّہ بھی جاگ اٹھے اور آگ سے متاثرہ گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ مکان میں لگی آگ بجھانے کے لیے کوششوں میں مصروف ہو گئے، مگر ہر ممکن کوشش کے باوجود آگ پر قابو نہ پایا جا سکا اور شعلے مکان کو چاٹتے رہے۔

شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں مصروف اہل محلّہ کی آنکھوں میں اس گھر کے مکینوں کے چہرے تھے۔ زندگی کی اڑتیس بہاریں دیکھ لینے والا ہنس مکھ عاصم، جس کی شادی اسی محلے میں ہوئی تھی، اس کی بیوی پینتیس سالہ ارم، یہ سوچ کر دل اور بھی تڑپ اٹھا کہ پھول جیسی تین سالہ قرۃ العین اور ننھا مُنا شارق بھی انگاروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ آخر کار فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ فائر فائٹرز بھی اہل محلّہ کے ساتھ جانوں کو جلنے سے بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار ساڑھے تین بجے کے قریب لگنے والی آگ پر صبح ساڑھے چھے بجے قابو پایا جا سکا۔ اس دوران مکان کی بالائی منزل مکمل طور پر جل چکی تھی۔ اندر جا کر دیکھا گیا تو میاں بیوی اور دو بچوں سمیت پورا کنبہ دم گھٹنے کے باعث بے ہوش ہو چکا تھا۔ انھیں طبّی امداد کے لیے اسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ منزل سے پہلے موت نے آ کر انھیں ابدی نیند سلا دیا۔

یہ سوچ کر ہی ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے کہ آج میں جس خاندان کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار رہی ہوں، رات سوتی ہوں اور صبح تک میرا وجود اور میرا خاندان مٹ چکے ہوتے ہیں۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے، مگر یوں اچانک پورے خاندان کا جان سے گزر جانا، روح کانپ جاتی ہے، دل ہول کے رہ جاتا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا.... ہم جن سانحات کا

اتفاقیہ اور ''اچانک'' کے الفاظ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، ان کی پرورش ایک مدت سے ہورہی ہوتی ہے، اور اس کا سامان اکثر ہم خود کرتے ہیں۔ دل کو خون کرتا یہ المیہ اسی پہلو کی طرف ہماری توجہ دلاتا ہے۔

اہل محلّہ کے مطابق فائر بریگیڈ کا عملہ واقعے کی اطلاع دینے کے آدھا گھنٹے بعد پہنچا۔ جان بچانے کے لیے آنے والے ان سرکاری اہل کاروں پر نیند کا غلبہ تھا۔ ان کی اہلیت کا یہ عالم ہے کہ وہ صحیح طریقے سے پائپ لگانے سے بھی قاصر تھے، چناں چہ پائپ اہل محلّہ کی مدد سے لگایا گیا۔ پھر کہیں جاکر آگ پر قابو پانے کی کارروائی شروع ہوئی۔ جس کمرے میں متاثرہ خاندان موجود تھا، وہاں ہنگامی حالات میں نکلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایسے میں کمرے کی کھڑکی کھلی ہوتی تو شاید زندگی راستہ پالیتی، مگر اس کھڑکی کے سامنے ڈیوائڈر رکھ کر اسے بند کیا جاچکا تھا۔ لوگوں نے اسے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔

یوں حکومتی اداروں کی کارکردگی اور طرز زندگی سے متعلق ہمارا رویہ ایک الم ناک حادثے کا سبب بن گیا۔

وہ فائر فائٹرز جنھیں ہر دم چوکس رہنا چاہیے اس وقت ان پر نیند کیوں طاری

تھی؟ اس کی وجہ عملے کی کمی اور کام کا دباؤ تھا یا ان اہل کاروں کی اپنے فرض سے غفلت؟ پھر یہ امر حیرت انگیز ہے کہ فائر بریگیڈ کے یہ اہل کار پائپ لگانے جیسا آگ بجھانے کا بنیادی عمل بھی ٹھیک طرح انجام نہیں دے پائے، جو ان کی تربیت اور اہلیت پر سوالیہ نشان ہے۔ ہنگامی حالت میں جب ہر ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے نیند میں ڈوبے سست رو اور اپنے کام کے حوالے سے پوری اہلیت نہ رکھنے والے مددگار واقعے کے آناً فاناً سانحہ بننے کا سبب ہی ثابت ہو سکتے ہیں۔ تربیت اور اہلیت کا یہ فقدان وہ ''برسوں'' کی '' پرورش'' ہے جس کی وجہ سے زلزلہ آئے یا سیلاب، آگ بھڑک اٹھے یا کوئی عمارت زمین بوس ہو جائے.... متاثرین کو بچانے کی کارروائی بدنظمی اور نااہلیت کی مثال بن کر سامنے آتی ہے۔

افراد سے ریاست تک ہمارا زندگی گزارنے کی سوچ ''بس آج'' تک محدود ہے، ہم کل کے بارے میں نہیں سوچتے۔ اگر کوئی ہنگامی صورت حال پیش آئے تو کیا ہوگا؟ بار بار آنے والی مصیبتوں کے باوجود گھروں سے حکومتی ایوانوں تک اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں پائی جاتی۔ اس رویے کی عکاس کراچی کی بلند و بالا عمارتیں بھی ہیں۔ اس شہر کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ فلیٹس میں آباد ہے۔ ان فلیٹس میں سے نوے فی صد میں آگ لگنے یا کسی اور ہنگامی صورت حال کے دوران باہر نکلنے کا راستہ موجود نہیں۔ کراچی کی آبادی روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال میں بلڈرز کی چاندی ہو گئی ہے۔ اونچے اونچے اپارٹمنٹس

بنتے جا رہے ہیں، ان کی تعمیر میں ناقص میٹریل کے استعمال کا معاملہ تو اپنی جگہ مگر زیادہ سے زیادہ مال کمانے کی ہوس میں کوشش ہوتی ہے کہ پلاٹ کا ایک انچ بھی ''ضایع'' نہ جائے، چاہے فلیٹوں کی تعداد بڑھاتے ہوئے ہنگامی صورت حال میں باہر نکلنے کا راستہ ہی کیوں نہ ختم کرنا پڑے۔ بس ایک چھوٹی سی راہداری بنائی، آگے دکانیں تعمیر کیں اور عمارت مکمل۔ اب ہوتا یہ ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں متاثرہ افراد کو جان بچانے کی کوئی راہ نہیں ملتی اور ان کی زندگی سمیت سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ عمارتوں اور ان کے ڈیزائن سے متعلق ادارے یہ دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ تعمیر ڈیزائن کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں اور ان عمارتوں میں ہنگامی حالت میں جانیں بچانے کی سہولت مہیا کی گئی ہے یا یہ سہولت صرف نقشے پر موجود ہے۔

مستقبل کے خدشات کے حوالے سے ہمارا انفرادی رویہ بھی یہی ہے، جس کی عکاسی ہمارے طرزِ زندگی سے ہوتی ہے۔ ہم ڈرائنگ روم سجانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں، لیکن بتایئے! ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گھروں میں آگ بجھانے کے سلنڈر رکھے ہوئے ہیں؟ سردیوں میں ہم گیزر چلا کر بے فکر ہو کر سوتے ہیں اور احتیاطی تدابیر نہیں کرتے کہ کم از کم رات سونے سے پہلے کم از کم اس بات کا اطمینان کر لیں کہ گیزر کے آس پاس موجود ایسی چیز ہٹا دی جائے جو آگ لگنے کا باعث بن سکتی ہو۔ ہم مغرب کی نقالی کرتے ہوئے اپنے گھروں کی

تعمیر اور تزئین کراتے ہیں اور اس ضمن میں اپنے ماحول اور مسائل کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ ہم امریکن اور آسٹریلین کچن بنواتے ہیں، جن میں ہر طرف لکڑی کی کیبنٹس ہوتی ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ مغرب میں عموماً ہماری طرح کھانے تیز آنچ پر نہیں پکائے جاتے۔ ہمارا یہ چلن خطرے کو دعوت دینے کا عمل نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم یہ نہیں سوچتے کہ ترقی یافتہ مغرب میں کسی حادثے کی صوت میں امدادی عملہ منٹوں میں پہنچ جاتا ہے، وہاں عمارات میں حفاظتی ذرائع اور وسائل لازماً ہوتے ہیں، جب کہ ہم امداد کی اس سرعت اور حفاظتی ذرائع، سب سے محروم ہیں۔

اس بدنصیب کنبے پر گزرنے والے المیے کا سوچیے اور پھر اپنے طرز زندگی اور حالات پر نظر ڈالیے، آپ کو اپنے اردگرد کتنے ہی خطرات نظر آئیں گے۔ سو اپنے بچاؤ کے لیے جتنا ہو سکتا ہے اتنا تو کیجیے۔

# صہیونیوں اور حماس کا ایک اور محاذِ جنگ.... سوشل میڈیا

صہیونیوں اور حماس کا ایک اور محاذِ جنگ.... سوشل میڈیا

اسرائیل سے داغا جانے والا ڈرون احمد جباری کی کار پر آ کر لگا اور یہ فلسطینی مجاہد بھڑکتی آگ میں شہید ہوگیا۔

اسرائیل اور اس کے ہم نواؤں کی نظر میں دہشت گرد قرار پانے والا ارضِ فلسطین کا بہادر سپوت اور حماس کا راہ نما احمد جباری اسرائیلیوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا، لہٰذا نومبر 2012 میں حماس کے کچلنے کے لیے کیے جانے والے فضائی اور زمینی حملوں کے دوران ہی یہ کارروائی انجام دی گئی۔

احمد جباری کی شہادت کے فوراً بعد اس کام یابی پر بغلیں بجاتے ہوئے اسرائیلی فوج نے اس واقعے کی وڈیو یوٹیوب پر اپ لوڈ کردی، جس کے بعد یہ وڈیو ٹوئٹر اور فیس بُک پر لائی گئی۔ اسرائیلیوں کے سوشل میڈیا پر متحرک ہونے کے بعد فریقِ ثانی بھی حرکت میں آگیا اور حماس سے تعلق رکھنے والے القسام بریگیڈ کے ٹوئٹر اکاؤنٹ سے یہ ٹوئٹ کیا گیا، "ہمارے ہاتھ تمھارے راہ

نماؤں اور سپاہیوں تک پہنچیں گے، چاہے وہ جہاں بھی ہوں۔ تم اپنے لیے جہنم کے دروازے کھول لو۔ اس کے ساتھ ہی سوشل میڈیا پر دو دیرینہ دشمنوں اسرائیلی فوج اور فلسطینیوں کی تنظیم حماس کے درمیاں جنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ اب بھی زور شور سے جاری ہے، جس کے ذریعے سوشل ویب سائٹس استعمال کرنے والوں کو فریقین کے موقف اور مشرق وسطیٰ کی صورت حال جاننے کا موقع ملتا ہے۔

اگرچہ دنیا کے دیگر خطوں، جیسے شام، بحرین، لیبیا، مصر، کینیا اور صومالیہ وغیرہ میں باہم متحارب فریقین بھی سوشل میڈیا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ جاری رکھے رہے ہیں یا رکھے ہوئے ہیں، مگر دنیا کے اس مسلسل گرم محاذ یعنی فلسطین اور اسرائیل سے دنیا کو خاص دل چسپی ہے اور فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دنیا تک اپنا موقف تیزی سے اور زیادہ سے زیادہ پہنچائیں، چناں چہ سوشل میڈیا کی صورت میں انھیں بہت موزوں ذریعہ میسر آگیا ہے۔ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف عملاً مصروفِ جنگ گروہ اپنے حق میں لوگوں کے دل اور دماغ جیتنے کے لیے "سائبر معرکوں" میں بھی مصروف ہیں۔

اس جنگ میں اسرائیلی فوج کی سوشل میڈیا پر ہونے والی سرگرمیاں ایک خاتون Avital Leibovich کی زیر قیادت جاری ہیں۔ وہ اسرائیلی فوج کی طرف سے سوشل

ویب سائٹس پر متحرک پینتیس رکنی ٹیم کی قائد ہے، جس کی قیادت میں یہ ٹیم ٹوئٹر پر گوگل پلس اور مختلف بلاگز پر تصاویر، Instagrams، ٹوئٹس کرتی ہے اور فیس بک اور وڈیوز اپ لوڈ اور اپ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس ٹیم کے ارکان اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مختلف اپلی کیشنز بھی بناتے ہیں۔ اسرائیلی فوج کے سوشل میڈیا سے متعلق شعبے نے 2009 میں اپنے کام کا آغاز یوٹیوب پر کچھ وڈیوز اپ لوڈ کرکے کیا تھا اور اب وہ اپنی کارکردگی کا دائرہ کہیں وسیع کرتے ہوئے سوشل میڈیا کے تمیں پلیٹ فارمز استعمال کر رہا ہے، جب کہ یہ ٹیم اپنا پیغام اور پوسٹس چھے زبانوں میں لوگوں تک پہنچا رہی ہے، جن میں عبرانی، عربی، انگریزی، اسپینش، فرنچ اور رشین شامل ہیں۔

Avital Leibovich کا کہنا ہے، "یہ سلسلہ اس لیے شروع کیا گیا کہ ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوگیا کہ دنیا میں میڈیا کا ایک نیا شعبہ تشکیل پا رہا ہے۔ ہم اسے شعبے سے منسلک ہونا، اس پر موثر کردار ادا کرنا اور اس کے ذریعے اپنا اثرونفوذ چاہتے تھے۔"

Avital Leibovich کا یہ بھی کہنا ہے کہ فوج ایک "بند" ادارہ ہے، جو اپنے معاملات دوسرے لوگوں سے شیئر نہیں کرتی اور ممکن ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ سخت زبان استعمال کرے، "مگر ہم اس کے یکسر مختلف ہیں۔ ہم تخلیقی صلاحیت کے حامل، کھلے ڈلے، لوگوں سے تبادلۂ خیال کرنے والے اور اپنے معاملات شیئر کرنے والے ہیں۔"

صہیونی ریاست کا دفاعی ادارہ اپنی روایتی عیارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ فلسطینی خاص طور پر حماس صہیونی ریاست کے لیے خطرہ ہیں۔ اس مقصد کے لیے تصاویر اور وڈیوز پر مبنی پوسٹس استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طرح فلسطینیوں پر ظلم ڈھانے میں مصروف اسرائیلی فوج سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے یوزرز کی ہم دردیاں حاصل کرنے اور عالمی رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے تن دہی سے کوشاں ہے، تاکہ غزہ اور حماس پر کیے جانے والے حملے اور فلسطینیوں پر ڈھائے جانے مظالم کو اسرائیل کی دفاعی کارروائی سمجھا جائے۔

دوسری طرف وسائل سے محروم حماس سوشل میڈیا پر اپنے موقف کے حق میں رائے ہموار کرنے میں مصروف ہے۔ حماس کے عسکری شعبے القسام بریگیڈ نے اس سلسلے میں اپنا فیس بک پیج بنایا تھا اور اور اپنے یوٹیوب چینل کے ذریعے بھی مصروفِ عمل تھی، مگر یہ دونوں ذرائع زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکے۔ تاہم القسام بریگیڈ کا انگریزی میں ایک بلاگ انٹرنیٹ پر موجود ہے، جو متحرک کردار ادا کر رہا ہے۔ اس تنظیم کی موثر موجودگی ٹیوٹر پر نظر آتی ہے، جہاں القسام بریگیڈ کی متعلقہ ٹیم کے ارکان ہر روز درجنوں ٹوئٹس کرتے رہے ہیں۔ تاہم اس سال 9 جنوری کو القسام بریگیڈ کا ٹوئٹر اکاؤنٹ، جو انگریزی میں

تھا، معطل کر دیا گیا۔ ٹوئٹر انتظامیہ نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے یہ اقدام کیوں کیا، تاہم صاف ظاہر ہے کہ مغرب سے تعلق رکھنے والی اس سائٹ کی انتظامیہ کو اسرائیل کی خوش نودی عزیز ہے۔ اب القسام بریگیڈ ایک متبادل ٹوئٹر اکاؤنٹ استعمال کر رہی ہے، جو عربی میں ہے۔

حماس کو یہ مشکل درپیش ہے کہ اسے امریکا، کینیڈا اور یورپی یونین نے دہشت گرد تنظیم قرار دے رکھا ہے، چناں چہ امریکا بیسڈ فیس بک اور اس جیسی دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اکاؤنٹ بنانا، برقرار رکھنا اور ان کے ذریعے اپنا موقف سامنے لانا حماس کے لیے ایک نہایت مشکل ہدف ہے۔ ان سائٹس کے منتظمین کا مخاصمانہ رویہ بھی حماس کے راہ کی رکاوٹ ہے، جیسے یوٹیوب پر قائم القسام بریگیڈ کا اکاؤنٹ ہٹا دیا گیا۔

ان مشکل حالات اور ناموافق فضا کے باوجود القسام بریگیڈ سوشل ویب سائٹس پر کسی نہ کسی طور اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہی کچھ جو فلسطین کی سرزمین پر ہو رہا ہے وہی سوشل میڈیا کی دنیا میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف طاقت سے لیس اسرائیل ہے جسے دنیا بھر کے صہیونی فکر کے یہودیوں، امریکا اور مغرب کی حمایت حاصل ہے اور دوسری طرف مظلوم اور ہر وسیلے سے محروم فلسطینی، ایسے میں سوشل میڈیا سے وابستہ ہر مظلوم دوست اور خاص طور پر

مسلمان یوزرز کی ذمے داری ہے کہ وہ فلسطینیوں کے موقف کو زیادہ سے زیادہ دنیا میں پھیلائیں، اگر ایسا ہوا تو اسرائیل تمام تر وسائل کے باوجود سوشل میڈیا پر یہ جنگ ہار جائے گا۔

# سوشل میڈیا کی دنیا میں بی بیوں کی بستیاں

سوشل میڈیا کی دنیا میں بی بیوں کی بستیاں

کچھ سماجی ویب سائٹس جو خواتین کے لیے مخصوص ہیں

ان سائٹس پر بچوں کی تربیت سے فیشن تک تمام نسوانی دل چسپیاں دست یاب

یوں تو خواتین کھیت کھلیانوں سے فیکٹریوں اور دفاتر تک زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں، اسی طرح تقریبات سے سوشل ویب سائٹس تک خواتین مردوں کے ساتھ سماجی تعلق سے مربوط ہیں، لیکن فطری طور پر "بی بیاں" اپنی ایک الگ دنیا بھی چاہتی ہیں، سو ان کی اس فطرت کا اظہار خواتین کی تنظیموں سے "مینا بازار" تک مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ یہاں ہم اپنی خاتون قارئین کے لیے کچھ ایسی سوشل ویب سائٹس کا تعارف پیش کر رہے ہیں جہاں خواتین اپنی ہم صنفوں کے ساتھ سماجی رابطے قائم کرتے ہوئے اپنی دل چسپی کی سرگرمیوں میں حصہ لی سکتی ہیں۔

☆iVillage

1995 سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرنے والی iVillage خواتین کی ویب سائٹس میں

قدیم ترین ہونے کا اعزاز رکھتی ہے۔ یہ سائٹ خواتین کے لیے صحت، زچگی، حُسن، اسٹائل اور دیگر حوالوں سے مواد اور معلومات تک رسائی کا ایک بہت اچھا پلیٹ فارم ہے۔ اس سائٹ پر یوزرز اپنا اکاؤنٹ بنا سکتی ہیں، اس کے علاوہ اپنا بلاگ اور گروپ بھی تشکیل دے سکتی ہیں۔ اس سائٹ پر تصاویر اور وڈیوز پوسٹ اور اپنی دوستوں کو پر مختلف موضوعات سے متعلق ہزاروں کی تعداد iVillage پیغامات بھیجے جا سکتے ہیں۔ میں میسیجز بورڈ موجود ہیں، جہاں جاکر آپ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی ہیں۔ خواتین کی اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر شادی سے متعلق بھی ایک خصوصی سیکشن موجود ہے، جہاں آپ دلہنوں کے فیشن، اسٹائل، شادی کی تقریب کے کھانوں اور تقریب کی منصوبہ بندی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔ اس سب کے ساتھ یہ سائٹ اپنی یوزرز کو آن لائن شاپنگ اور آن لائن کورسز کی سہولت بھی فراہم کرتی ہے۔

☆CafeMom

بچوں کی پرورش اور نگہ داشت کے حوالے سے ماؤں کے لیے بنائی گئی "CafeMom" سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے۔ یہ منفرد سائٹ 2006 میں وجود میں آئی، جس کے بعد سے اس نے بچوں کی دیکھ بھال کے حوالے سے ماؤں کی راہ نمائی میں شان دار کردار ادا کیا ہے۔ اس سائٹ سے وابستہ خواتین کی تعداد ایک ملین تک جا پہنچی ہے، جب کہ ہر مہینے چھے ملین یوزر اس سائٹ کا وزٹ کرتے ہیں۔ ماؤں کے امور

سے متعلق اس سائٹ پر 35 ہزار گروپ موجود ہیں اور فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان گروپس میں زچگی، کھانے پکانے کی ترکیبوں اور شادی سے متعلق گروپ بھی شامل ہیں۔ اس سائٹ سے وابستہ ہو کر آپ اس پر اپنا جرنل تخلیق کر سکتی ہیں اور اپنی کہانیاں دیگر ممبرز کے ساتھ شیئر کر سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ بہ طور یوزر مختلف پولز اور سروےز میں بھی حصہ لے سکتی ہیں اور دیگر ممبرز کے ساتھ تصاویر شیئر کر سکتی ہیں۔ اس سائٹ کا ایک سیکشن رکن ماؤں کی سال گرہ کی تاریخ ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ حاملہ خواتین، سائٹ سے وابستہ ہونے والی نئی ارکان، ٹاپ کنٹری بیوٹرز، فوٹو آف دی ڈے، تھیم آف دی ڈے، پوسٹ آف دی ڈے اور گروپ آف دی ڈے کے اعلانات بھی اس سیکشن کا حصہ ہیں۔

☆Glam

اس سائٹ پر موجود مختلف سیکشنز میں آپ فیشن، بیوٹی، سیلیبریٹیز، انٹرٹینمینٹ، طرزِ حیات، صحت اور شاپنگ کے حوالے سے معلومات سے مستفید ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں وڈیوز بھی شیئر کی جا سکتی ہیں اور معلوماتِ عامہ کے مقابلوں میں حصہ لیا جا سکتا ہے۔ اس سائٹ پر مختلف نوعیت کے بلاگز کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ اپنے یوزرز کو پروفائل بنانے، دوسرے یوزرز کا پروفائل چیک کرنے اور مختلف موضوعات پر رائے کے اظہار کی سہولت فراہم کرتی ہے۔

☆ParentsConnect

پیرنٹس کنکٹ ” کے نام سے بنائی جانے والی یہ سائٹ ماؤں کو بچوں کی پرورش کے ” امور سے متعلق راہ نمائی فراہم کرنے کے لیے مخصوص ہے۔ اس سائٹ پر بچوں کی نگہہ داشت کے حوالے سے روزانہ ٹپس فراہم کی جاتی ہیں، جن میں بچوں کی غذا، ان کی سرگرمیوں اور بچوں سے متعلق پروڈکٹس کے بارے میں معلومات اور اطفال کی دیکھ بھال کی بابت دیگر آگاہی شامل ہے۔اس سائٹ پر آپ بچوں کی نگہ داشت سے متعلق اپنی ٹپس، بچوں کی خوراک کی ترکیبیں، مقامی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں، تصاویر اور کہانیاں شیئر کر سکتی ہیں اور دیگر پوسٹ پر کمنٹ کرنے کے ساتھ انھیں "ریٹ" بھی دے سکتی ہیں۔

☆Kaboose

یہ سائٹ بھی گھریلو امور اور بچوں کی پرورش سے متعلق ہے، جس پر بچوں کی نگہ داشت کے امور سے متعلق معلومات کے علاوہ زچگی اور صحت سے متعلق ٹپس اور کھانے کی ترکیبیں دست یاب ہیں۔ س سائٹ پر "صرف ماؤں کے لیے" کے زیر عنوان ایک سیکشن قائم ہے، جس میں ماؤں کے امور کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اس سائٹ پر یوزر اپنا پروفائل بنا سکتی ہیں، بلاگ بنا سکتی ہیں، ڈسکیشن فورم سے وابستہ ہو سکتی ہیں اور دیگر ممبرز سے تصاویر شیئر کر سکتی ہیں۔

☆TeamSugar

یہ نوجوان خواتین کی سائٹ ہے، جہاں لڑکیاں تازہ ترین دل چسپ خبروں اور گیمز پر تبادلہ خیال کر سکتی ہیں اور فیشن سے متعلق ٹپس، بیوٹی سیکرٹس، کھانے کی ترکیبیں، تصاویر اور وڈیوز شیئر کر سکتی ہیں۔اس سائٹ پر سیلیبیریٹیز، فیشن، اسٹائل، انٹرٹینمینٹ، نیوز، سیاست، کیریر، صحت اور فٹنس، خوراک، ٹیکنالوجی، لطائف، شاپنگ، شادی بیاہ اور دیگر موضوعات پر مختلف سیکشنز موجود ہیں۔ اس سائٹ پر یوزرز اپنا بلاگ اور ہوم پیج بھی بنا سکتی ہیں اور دیگر یوزرز سے چیٹنگ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مختلف پوسٹس پر کمنٹ دیے جا سکتے ہیں، گروپ تشکیل دیے جا سکتے ہیں اور دیگر سرگرمیاں بھی جا سکتی ہیں۔

☆ClubMom

یہ سائٹ 1999 سے قائم ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں مائیں دوسری ماؤں سے رابطے میں رہ سکتی ہیں۔ اس سائٹ پر مائیں دوسری ماؤں سے بچوں کی صحت، تربیت اور ان سے متعلق دیگر امور کی بابت سوال کر سکتی ہیں اور جواب حاصل کر سکتی ہیں۔ ان جوابوں پر کمنٹ کیے جا سکتے ہیں اور ان کی ریٹنگ بھی ہوتی ہے۔ ClubMom موم میں زچگی سے ٹین ایجرز اور کھانا پکانے سے تعلقات تک مختلف موضوعات پر یوزرز تبادلہ خیال کر سکتی ہیں۔ اس سائٹ سے تعلق جاننے والی

خواتین تصاویر شیئر کر سکتی ہیں اور انعامات حاصل کر سکتی ہیں۔ اس سائٹ پر موجود کلب مام ریوارڈز پروگرام" ایک پُر کشش سلسلہ ہے، جہاں مائیں پوائنٹس لے کر کلب" لائن آن لائن مال سے مختلف اشیاء حاصل کر سکتی ہیں۔

☆Maya's Mom

"Maya's Mom" بھی ایک ایسی سائٹ ہے جہاں مائیں ایک دوسرے سے رابطے میں رہ سکتی ہیں اور اپنے معاملات اور مسائل پر باہم تبادلہ خیال کر سکتی ہیں۔ اس سائٹ کی یوزرز کے لیے مختلف گروپس سے وابستہ ہونے اور اپنا گروپ بنانے کی سہولت بھی موجود ہے۔ یوزرز ایک دوسرے سے مشورے بھی لے سکتی ہیں۔ اس سائٹ سے وابستہ خواتین سائٹ پر اپنے جنرلز بنا سکتی اور اپنے بچوں کی تصاویر پوسٹ کر سکتی ہیں۔

☆Minti

یہ سائٹ بھی بچوں کی پرورش کے حوالے سے والدین کی مددگار ہے، جہاں مائیں ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہوئے اپنی الجھنیں سلجھا سکتی ہیں۔ اس سائٹ پر یوزرز مضامین کی صورت میں تحریری مواد دیتی ہیں، جس پر دیگر یوزر تبصرے کرتے ہیں اور ان مضامین کی ریٹنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سائٹ پر جن موضوعات کے سیکشن موجود ہیں ان میں حمل کا دور، زچگی کے بعد کا دور، شیر خوار بچے ،

کم سن بچے، اسکولنگ، جڑواں بچے اور ٹین ایجرز سے متعلق سیکشن موجود ہیں۔ سائٹ پر رجسٹریشن کے بعد آپ کو اپنا فیملی پیج بلاگ اور فوٹو البم کی سہولت کے ساتھ مل جاتا ہے۔ "ممٹی" پر رینکنگ سسٹم بھی بنایا گیا ہے۔ اس سائٹ پر 600 سے زیادہ انٹرسٹ گروپ موجود ہیں، جن میں سے اپنی دل چسپی کا حامل کوئی بھی گروپ آپ جوائن کر سکتی ہیں۔

## اس درندگی کی سزا صرف موت

زنا بالجبر ایک ایسا فعل ہے جس کی سزا موت ہونی چاہیے۔ جنسی زیادتی ایک بھیانک جرم ہے۔ قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم۔ قتل کی صورت میں تو ایک بار جان چھین لی جاتی ہے، جب کہ جنسی درندگی کا نشانہ بننے والا جسم بار بار مرتا ہے۔ اس کی روح کو اس طرح نوچا گیا ہوتا ہے کہ وہ گھائل روح زندگی کی طرف کبھی نہیں لوٹ پاتی۔ جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن وجود مر جاتا ہے۔

کسی بھی انسان کے قتل کا کوئی جواز ہو سکتا ہے، مگر کسی کو بے عزت کرنے کا کوئی جواز تلاش نہیں کیا جا سکتا، سوائے اس کے کہ انسانیت درندگی کی غلام بن جائے۔

میں یہ بات بہ بانگ دہل کہتی ہوں کہ اس درندگی کے مرتکب شخص کو سر عام پھانسی دی جائے، تاکہ آئندہ کوئی کسی کی زندگی کو گدھ بن کر نوچنے کی ہمت نہ کر سکے۔

پاکستان کے قوانین کے مطابق زنا بالجبر کے مجرم کی سزا عمر قید ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ چوبیس سال قید۔ یہ عرصہ دن رات ملا کر بارہ سال ہو جاتا ہے۔

اس معاملے میں اول تو جرم ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے، کیوں کہ جائے وقوع پر چار عاقل بالغ افراد کا موجود ہونا ضروری ہے، جو کہ اس سنگین جرم کے حوالے سے فقط ایک مذاق ہے۔ وہ عورت جو زیادتی کا نشانہ بنتی ہے، کیس ممکن ہے کہ وہ زیادتی کا نشانہ بننے سے پہلے چار گواہ اکٹھے کرے اور پھر ظلم کا شکار ہو۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں بھی جہالت کا سارا سامان ہم نے ایک گٹھری میں باندھ رکھا ہے اور ہمارا قانون اس گٹھری کو سر پر رکھے ناچ رہا ہے۔ چار گواہوں یا گواہیوں کی یہ شرط دراصل صرف زنا بالرضا کے لیے ہے، اور بعض علماء اس کی مصلحت یہ بتاتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جہاں کم از کم بے حیائی عام یا کھلے عام نہ ہو۔ جہاں تک زنا بالجبر کا تعلق ہے تو یہ ایک اور طرح کا جرم اور نہایت خوف ناک ظلم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل، سمجھ بوجھ دے کر پیدا کیا، ورنہ انسان اور جانور میں کیا فرق رہ جاتااور آج ہم اس دور میں رہتے ہوئے بھی حالات اور تقاضوں کو ایک طرف رکھ کر زنا بالجبر کا جرم ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی بات کرتے ہیں۔ قارئین ! لمحہ بھر کے لیے سوچیے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خدا جو انسان سے بے حد محبت کرتا ہے اپنے دین میں ایسے سخت قوانین دے سکتا ہے، ہر گز نہیں۔ یہ قتل نہیں، یہ چوری نہیں، یہ ڈاکا نہیں، یہ روح کو زخم زخم

کر دینے والا وار ہے۔ یہ عورت کی بدترین تذلیل ہے۔ یہ معصوم بچوں کی معصومیت چھین لینے والا بھیانک فعل ہے۔ ایک سنگین جرم، تو ہم آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں رہتے ہوئے زنا بالجبر کے مقدمات میں ڈی این اے رپورٹ کی گواہی کو کیوں کر مسترد کر سکتے ہیں۔

کاش کہ ہمارا قانون اس عقلِ سلیم کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے۔

کچھ دنوں پہلے آبرو ریزی کے حوالے سے بنائے گئے قانون میں ترمیم کا ایک بل سینیٹ میں پیش کیا گیا ہے، جس کے تحت جنسی زیادتی کے مقدمات میں ناقص تفتیش پر بھی سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ اس تجویز کو قانون کی شکل اختیار کرنی چاہیے، مگر سزا تو آپ اس وقت تجویز کریں جب ان پر عمل درآمد کیا جا رہا ہو، یہاں تو جرم ثابت ہی نہیں ہوتا۔

انسدادِ زنا بالجبر کے ترمیمی بل میں تجویز کیا گیا ہے کہ تھانے، اسپتال، دارالعلوم اور فلاحی اداروں سمیت کسی بھی جگہ کوئی سرکاری اہل کار اپنے زیرِ نگرانی کسی خاتون یا کسی بھی شخص کے ساتھ زنا بالجبر کا مرتکب ہو تو اسے سزائے موت یا عمر قید کی سزا دی جائے۔ اس بل میں کم عمر بچوں اور حاملہ خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والے اہل کاروں کے لیے بھی موت یا عمر قید کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ ترمیمی بل میں اجتماعی زیادتی کے مرتکب ایسے اہل

کار جن کے عزائم مشترک ہوں، کے لیے بھی یہی سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ یہ بل کہتا ہے کہ زنا بالجبر کا شکار عورت یا متاثرہ شخص کا نام ظاہر نہ کیا جائے اور نہ ہی اخبارات میں شایع کیا جائے۔ ایسا کرنے والے کو دو سال قید یا جرمانے کی سزا دی جائے۔ ساتھ ہی زنا بالجبر کے مقدمے میں بہ طور تفتیشی افسر فرائض میں کوتاہی اور عدالت میں مقدمے کی مناسب پیروی نہ کرنے کے عمل کو جرم مانا جائے۔ ایسی کوتاہی کے مرتکب اہل کاروں کو تین سال کی سزا دی جائے اور ان پر جرمانہ عاید کیا جائے۔ ترمیمی بل کے اس مسودے کے تحت عدالتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ مقدمے کی کارروائی مکمل کرکے چھے مہینے کے اندر فیصلہ سنائیں۔ تاخیر کی صورت میں متاثرہ شخص کو متعلقہ ہائی کورٹ میں مقدمہ جلد نمٹانے کے لیے درخواست دائر کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں یہی تو اچھی بات ہے کہ یہاں قوانین بہت بنائے جاتے ہیں... لیکن ان پر عمل کم کم ہی ہوتا ہے۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق پاکستان میں ہر دو گھنٹے کے بعد ایک فرد جنسی زیادتی کا نشانہ بنتا ہے، جب کہ ہر چار سے آٹھ دنوں میں اجتماعی زیادتی کا ایک واقعہ سامنے آتا ہے۔ یہ تو وہ کیسز ہیں جو رپورٹ کیے جاتے ہیں، کیس کا سامنے نہ آنا اور متاثرہ خاتون کا خاموش رہنا جرم کو چھاپنے

میں کردار ادا کرتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں جنسی زیادتی کا شکار ہونے والی خاتون کو بے انتہا مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے ہمیں اپنی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ معاشرے میں تعلیم کی کمی بھی اس قسم کے جرائم کے بڑھنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہمارے یہاں، خاص طور پر قبائلی اور جاگیردارانہ معاشروں میں، چوں کہ جنس کی بنیاد پر مرد کو برتر تصور کیا جاتا ہے اور عورت کو صرف ایک شے سمجھا جاتا ہے، اس لیے زورآور مرد عورت کو زیادتی کا نشانہ بنانے جیسے فعل پر بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ مردوں کو فوقیت دینے والے ہمارے سماج میں یہ خیال تقویت پا چکا ہے کہ عورت فقط ایک ایسی شے ہے جسے صرف مرد کے جنسی فوائد حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

دوسری طرف جرم کرنے والا یہ بات جانتا ہے کہ اس کا جرم ثابت نہیں ہو سکے گا اور اگر ثابت ہو بھی گیا تو اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر وہ سزا سے بچ جائے گا۔ ایسے کتنے کیس ہیں جن میں زیادتی کرنے والے نے سزا پائی ہو یا اپنی سزا کی مدت مکمل کی ہو۔ کوئی بھی سفارش اور پیسہ اسے بچانے کے لیے کافی ہے۔

جنسیات وہ موضوع ہے جس پر ہمارے معاشرے میں کھل کر بات نہیں کی جاتی، جب کہ ہم میں سے ہر ایک اس حقیقت سے واقف ہے کہ ہمارا معاشرہ کس حد تک تنزلی کا

شکار ہوچکا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ حکومتی سطح پر اور این جی اوز اس طرح کے معلوماتی پمفلٹ شایع اور آگاہی کے پروگرام مرتب کریں، جن میں جنسی بے راہ روی کے نقصانات کے بارے میں بتایا جائے اور خواتین کی عزت اور احترام سے متعلق بنیادی باتوں کا شعور دیا جائے۔ ساتھ ہی خواتین کو بھی اس بارے میں آگاہی دی جائے کہ وہ کس حدتک کسی غیر مرد سے رابطے میں رہیں، تاکہ انھیں اپنی حدود کا علم اور حفاظت کا خیال رہے۔

پاکستان میں زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی ایک وجہ الیکٹرانک میڈیا پر دکھائے جانے والے ہیجان انگیز مناظر بھی ہیں۔ ایسے مناظر جنس کی طرف مائل افراد کی نفسیات پر بہر حال اثرات مرتب کرتے ہیں اور ایک ایسے ملک میں جہاں بڑے سے بڑا جرم کرنے والے بھی سزا سے بچ نکلتے ہوں، وہاں یہ مناظر بھی کسی انسان کو درندہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔

حکومت ہو، میڈیا یا معاشرہ، اپنے سماج کو اس درندگی سے بچانے کے لیے ہم سب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا جو کتنی ہی عزتوں کو پامال کرچکی ہے۔

# فیس بک کو اُردو میں منتقل کیسے کیا جائے؟

زبان وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنا احساسات اور خیالات دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔

گویا زبان رابطے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ جب ہم سوشل میڈیا کی بات کریں تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سوشل ویب سائٹس پر ہم اپنی قومی زبان اردو کے بہ جائے انگریزی استعمال کرتے ہیں یا اردو رومن میں لکھتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ انٹرنیٹ کی اس دنیا میں، جہاں سوشل ویب سائٹس کے نام سے باہمی رابطوں کا جال پھیلا ہے، اگر ہم نے اپنی زبان کو رواج نہ دیا تو رفتہ رفتہ یہ زبان صرف ''بولی'' ہو کر رہ جائے گی۔ اسی طرح اگر اردو رومن رسم الخط میں لکھی جاتی رہی تو اس طرح ہم اپنی زبان کا چہرہ بگاڑ دیں گے۔

ایک زمانہ تھا کہ ایس ایم ایس کرنا ہو یا کسی سوشل ویب سائٹ پر اردو میں کمنٹس کرنا، ٹولز کی عدم دست یابی کی وجہ سے ہماری مجبوری تھی کہ ہم انگریزی استعمال کریں یا رومن میں اردو لکھ کر کام چلائیں، مگر اب ایسا نہیں۔ اردو سے محبت کرنے والے تیکنیکی ماہرین نے پیہم کوششیں کرکے اب ہماری

قومی زبان کو اس قابل بنادیا ہے کہ اسے بہ آسانی سوشل ویب سائٹس پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سوشل ویب سائٹس کی کمپنیاں بھی اب اردو کو قبول کر رہی ہیں اور اپنے صفحات کو دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی منتقل کر رہی ہیں۔ ان سائٹس میں فیس بک سرفہرست ہے۔ دیگر زبانوں کے ساتھ فیس بک کا اردو ورژن بھی موجود تھا مگر تین سال قبل اسے ختم کردیا گیا تھا، تاہم اسے اب بحال کردیا گیا ہے۔ اب ہمیں جاننا یہ ہوگا کہ فیس بک کو اردو میں کیسے منتقل اور استعمال کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر ہم کیسے اردو استعمال کرسکتے ہیں؟

طریقہ: جب فیس بک کا پیج کھولتے ہیں، ہمارے سامنے بہت سے زبانوں کے آپشنز آجاتے ہیں، جن میں اردو سمیت چون زبانیں شامل ہیں۔ اردو کا آپشن سامنے ہی نظر آئے گا، آپ اس پر کلک کریں، آپ کی ویب سائٹ آپ کو اردو میں نظر آنے لگے گی۔ اس کے بعد آپ اپنا ای میل ایڈریس اور پاس ورڈ ڈال کر لاگ ان کردیں۔ لیکن یہ کیا، آپ کی فیس بک وال تو اب بھی انگریزی زبان ہی میں ہے۔ پریشان مت ہوں۔ اپنی فیس بک وال پر دائیں طرف موجود سیٹنگز کے نشان پر جایئے، اسے کلک کرنے پر جو لسٹ کھلے گی اس میں سیٹنگز کا آپشن نظر آئے

گا۔ اس پر کلک کیجیے۔ اب آپ کے سامنے ''جنرل اکاؤنٹ سیٹنگز'' کی ونڈو اوپن ہوجائے گی۔ آپ کو سے آخر میں ''لینگویج'' کا آپشن دکھائی دے گا۔ اس آپشن پر کلک کیجیے اور اس پر کلک کیجیے۔ لیجیے ! ''save changes'' آپشن میں جا کر اردو زبان کو منتخب کیجیے۔ اب آپ کی فیس بک وال آپ کو اردو مواد کے ساتھ دکھائی دے رہی ہوگی۔

فیس بک کو اردو میں منتقل کرنے کے بعد خاص طور پر وہ لوگ جن کی انگریزی پر دسترس نہیں، وال پر موجود ہدایات اور تیکنیکیں بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنی بات اپنے ہم وطنوں تک زیادہ مؤثر انداز میں پہنچا سکتے ہیں اور یہ اپنی قومی زبان سے ہماری محبت کا اظہار بھی ہوگا۔ فیس بک پر اردو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے کمپیوٹر میں اردو ٹائپنگ کا آپشن موجود ہو۔

کسی بھی سوشل ویب سائٹ پر اردو زبان کے ذریعے ابلاغ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو ''یونی کوڈ'' میں ٹائپ کی جائے، جو نہایت آسان ہے۔ اپنے کمپیوٹر میں اردو انسٹال کرنے کے لیے اس ویب سائٹ پر جائیے:

اس ویب سائٹ پر کمپیوٹر میں اردو فونٹ، http://www.mbilalm.com/ انسٹال کرنے کا آسان ترین ذریعہ موجود ہے۔ اردو لکھنے کے لیے اردو کی بورڈ

ہارڈویئر" کی ضرورت نہیں ہوتی، بل کہ صرف "پاک اردو انسٹالر" انسٹال کرکے "
نہایت آسانی سے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔

پہلے فیس بک کا پیج اردو کے جس فونٹ میں تھا اسے پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن اب اردو "ہوما فونٹ" میں ہے، لیکن اکثر احباب اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ انھیں اردو نستعلیق فونٹ میں نظر آئے، اس مسئلے کا حل بھی اس ویب سائٹ پر موجود ہے، اگر آپ کے پاس "پاک اردو انسٹالر" ہے تو آپ اپنے فیس بک یا ٹوئٹر اکاؤنٹ پر "اسٹائلش پلگ ان" ایڈ کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے فیس بک، ٹوئٹر اور وکی پیڈیا، اور اردو کے آن لائن صفحات پر موجود اردو آپ کو نستعلیق فونٹ میں نظر آنے لگے گی۔ اگر آپ کو "HTML" وغیرہ کی تھوڑی بہت سمجھ ہے تو اس کوڈ میں مزید ویب سائٹس اور کوڈ آپ خود شامل کر سکتے ہیں۔

جب ہم وائس کال کی سوشل ویب سائٹ اسکائپ پر چیٹ کرتے ہیں، تو عموماً ہمیں وہاں بھی فونٹ کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا حل بھی نہایت آسان ہے۔ اپنے اسکائپ اکاؤنٹ پر لاگ ان ہوکر "ٹولز" میں جایئے، سب سے آخر میں آپ کو آپشن کا آئیکون نظر آئے گا۔ اس پر کلک کیجیے۔ آپ کے سامنے "جنرل آپشن" کی ونڈو کھل جائے گی، یہاں آپ کو IM & SMS کا آپشن نظر

پر کلک کیجیے۔ یہاں آپ کو IM appearance آئے گا۔ اس آپشن میں جا کر
کی سہولت نظر آئے گی۔ اس آپشن پر کلک کیجیے، اپنے فونٹ کو ''change font''
save پر سیٹ کرکے (jameel noori nastaleeq) ''جمیل نوری نستعلیق''
کرلیجیے۔ اب آپ کے اسکائپ پر بھی نستعلیق میں فونٹ کی سیٹنگ ہوچکی ہے، اب آپ
اپنے میسیجز بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔

کمپیوٹر پر اردو لکھنے کے لیے مختلف سوفٹ ویئر استعمال کیے جاتے ہیں، جن میں ان پیج
سب سے زیادہ مقبول ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، مختلف سوفٹ ویئرز
نے ان پیج کی جگہ لے لی ہے۔ اب آپ مائیکروسافٹ میں بھی اردو لکھ سکتے ہیں، چوں
کہ مائیکروسافٹ ورڈ آفس زیادہ تر لوگوں کے پاس موجود ہے، لہذا آپ دنیا کے کسی
بھی کونے پر اپنا مواد اردو میں بھیج سکتے ہیں، کیوں کہ اگر مائیکروسافٹ ورڈ آفس
موجود نہ ہو تب بھی مائیکروسافٹ ان فائلز کو آن لائن کھولنے کی سہولت دیتا ہے، جو
اردو کے حوالے سے بہت فائدہ مند سہولت ہے۔ یہی طریقہ اپناتے ہوئے آپ گوگل
پلس، لنکڈان اور اپنی ای میلز میں اردو میں لکھ سکتے ہیں۔

اس طرح آپ کسی بھی بھی زبان کی ویب سائٹ کو اردو میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ
Show ، گوگل کروم استعمال کرتے ہیں تو اس کے سیٹنگز کے آپشن میں جائیے

پر کلک کیجیے۔ یہاں آپ کو لینگویج کا آپشن نظر آئے گا۔ یہاں advanced settings لینگویج اینڈ اِن پُٹ سیٹنگز'' پر کلک کیجیے، ایک ونڈو اوپن ہو جائے گی۔ اب یہاں'' کر دیجیے۔ اب آپ کی مطلوبہ ویب سائٹ آپ کو ''done'' پر کلک کیجیے اور Add اردو میں دکھائی دے گی۔

گوگل کروم ویب سائٹ پیج کے اوپر ''ٹرانسلیٹ دس پیج'' کا آپشن شو ہوگا، جس کے مطابق یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنی مرضی کے مطابق اس ویب سائٹ کو اردو یا انگریزی میں کر سکیں۔ انٹرنیٹ خاص طور پر سوشل ویب سائٹس استعمال کرتے ہوئے اردو کو زیادہ سے زیادہ برتنا اس امر کا آئینہ دار ہوگا کہ دوسری قوموں کی طرح ہماری بھی ایک خوب صورت اور ہر صلاحیت سے مالا مال زبان ہے جس سے ہمیں محبت ہے۔

## مسیحاؤں کے نام

معمولی نزلہ زکام میں مبتلا بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے اور معائنہ کر کے ڈاکٹر سند جاری کر دے کہ بچے کے دل میں سوراخ ہے، تو تصور کیجیے کہ اس کے ماں باپ کے دل پر کیا گزرے گی، جب کہ بچہ ہنستا کھیلتا بھاگتا دوڑتا ہے اور جسمانی طور پر بہ ظاہر مکمل صحت مند اور چست و توانا نظر آتا ہے۔ عموماً دل میں سوراخ ہونے کی صورت میں بچے کا وزن عمر کے مقابلے میں کم ہو جاتا ہے اور وہ کھیل کود میں زیادہ حصہ نہیں لے سکتا۔ لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ہمارے عزیز کراچی کے ایک بہت بڑے اسپتال میں موسمی بخار کی دوا لینے اپنی بچی کو لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر کی فیس بھی بہت تھی اور وہ کراچی کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ بچی کا معائنہ کرتے ہی کہا گیا کہ ہمیں ڈر ہے کہ اس کے دل میں سوراخ ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ تشخیص کرنے والے ڈاکٹر نے ایک اسپتال اور ایک دوسرے ڈاکٹر کا نام لکھ کر پرچہ ہاتھ میں تھما دیا کہ ان کے پاس جایئے اور وہاں یہ پرچہ دیجیے گا۔ پرچے پر بچی کے سینے کے ایکسرے، ECG اور ECHO کے ٹیسٹ لکھے گئے تھے۔

ہمارے عزیز روتے پیٹتے ماتم کرتے گھر پہنچے تو سارا گھر سوگوار ہو گیا۔ ٹیسٹ کروانے کے لیے سوچا گیا کہ گھر کے قریب موجود لیب سے رجوع کیا جائے۔

وہاں جا کر معلومات کیں تو پتہ چلا کہ یہ ٹیسٹ ان کی اس برانچ میں نہیں ہوتے دوسری برانچ میں ہوتے ہیں۔ جب وہاں پہنچے تو لیبارٹری کے اہل کار نے بچی کی عمر چار سال ہم نہیں کر سکتے۔ یہ سہولت یا تو جناح اسپتال ECHO ٹائپ کرتے ہی کہا کہ بچے کا میں میسّر ہے یا اس اسپتال جایئے جس کی پرچی آپ کے ڈاکٹر نے بنا کر دی ہے۔

غم زدہ اور پریشان حال ماں باپ بچی کو لے کر جناح اسپتال پہنچے، وہاں لگی لمبی قطار میں بیٹھنا ان کے لیے ایک تکلیف دہ عمل تھا، لہٰذا انھوں نے اس اسپتال کا رخ کیا جس کا نام ڈاکٹر نے اپنے دستخط شدہ پرچے پر لکھ کر دیا تھا۔ اس اسپتال میں ٹیسٹ کروایا گیا۔ ٹیسٹ کی رپورٹ کے ساتھ بچی کے والدین کے ہاتھ میں تشخیص کرنے والے ڈاکٹر ECHO کے نام ایک خط بھی تھما دیا گیا۔ رپورٹ میں کیا تھا؟ اس سوال کے جواب میں آپ کی بیٹی بالکل ،She is all right کرنے والے ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا ٹھیک ہے۔

اپنی بیٹی کی صحت یابی کی اطلاع پر ہمارے عزیز اور ان کی اہلیہ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ لیکن انھیں ڈاکٹر کے بلاوجہ ڈرانے اور اس کی وجہ سے پریشانی اٹھانے پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ لہٰذا اخلاقی اقدار کو ایک طرف رکھتے ہوئے اسپتال سے ڈاکٹر کو بھیجے جانے والا خط کھول لیا گیا۔ خط پڑھتے ہی یہ حیران

کُن حقیقت سامنے آئی کہ نہایت پُرخلوص جذبات پر مبنی کلمات کے ساتھ مریض کو مذکورہ اسپتال ریفر کرنے پر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ یعنی یہ سارا کھیل اس کمیشن کا تھا جو ٹیسٹ کروانے پر اس اسپتال سے ڈاکٹر کو ملنا تھا۔ کمیشن دینے اور لینے والوں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کمیشن کی خاطر کسی فرد یا خاندان کو کس حد تک ذہنی کرنا پڑا، کسے فکر ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ دو مزید ایسے کیسز ہمارے سامنے آئے کہ بچے کے دل میں سوراخ تشخیص یا ایسا ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا، مگر پھر حقیقت کھلی کہ سارا چکر کمیشن کا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں تحقیق کرنے کا ارادہ کیا تو کیا دیکھتی ہوں صاحب کہ تحقیق کی تو ضرورت ہی نہیں سارے کھاتے سامنے ہی ہیں۔ درونِ خانہ معاملات کی کھوج کیا لگائی جائے، یہاں تو لیبارٹریز، اسپتال، میڈیکل اسٹورز، ڈاکٹر۔۔۔۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

عباسی شہید اسپتال ناظم آباد کے اطراف میں کئی لیبارٹریز کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لیب میں جا کر میں نے پوچھا، ''بھائی! یہاں کی رپورٹس قابل اعتبار ہوتی ہیں نا؟'' تو وہاں موجود عملے میں سے ایک لڑکے نے اس انداز میں

جواب دیا جیسے میں لان کا سوٹ خریدنے کسی دکان پر آئی ہوں اور وہ سیلز مین ہے،

باجی ! آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہمارے یہاں ٹیسٹ کے لیے دوسری بہترین کوالٹی کا کیمیکل ’’استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم گھٹیا کوالٹی کا کیمیکل استعمال نہیں کرتے۔

میرے لیے یہ حیران کُن بات تھی۔ جانچ کے لیے استعمال ہونے والا کیمیکل تو کیمیکل ہوتا ہے۔ یہ پہلا، دوسرا اور تیسرا کیا ہوا؟

بہرحال جس طرح کی بھی لیبارٹری ہو اس میں رش دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس لیب میں، میں موجود تھی اس کا بھی یہی حال تھا۔ لوگ دور دور سے مطلوبہ لیب کو ڈھونڈتے وہاں پہنچے تھے۔ وجہ وہی ہے کہ ان کے ڈاکٹر ان سے اس لیب ہی سے ٹیسٹ کروانے کو کہا تھا، کسی اور لیب کا ٹیسٹ وہ قبول ہی نہیں کرتے۔ وہی کمیشن یہاں بھی کارفرما نظر آیا۔

کراچی سمیت پورے سندھ میں سیکڑوں غیر قانونی لیبارٹریز کام کر رہی ہیں، جو بیماریوں کی درست تشخیص کی اہم نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی مناسب قانون بنایا ہی نہیں گیا تو ناقص سامان پر مبنی یا غیر قانونی لیبارٹریز کو قائم ہونے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔

سندھ بھر میں بیماریوں کو تشخیص کرنے کی رجسٹریشن کا

کوئی قانون موجود نہیں، جب کہ صرف کراچی میں قائم ایک ہزار سے زاید لیبارٹریز کا معیار جانچنے کا کوئی پیمانہ موجود نہیں۔

شہر کے گلی محلوں میں قائم چھوٹی لیبارٹریز کو چلانے والے بیشتر افراد پیتھالوجسٹ نہیں۔ بیشتر لیبارٹریز کو ٹیکنیشنز چلا رہے ہیں اور ان کا عملہ بھی غیر تربیت یافتہ ہے۔ اور پھر ان میں موجود تجزیاتی سامان اور کیمیکلز وغیرہ کا غیر معیاری ہونا، اس صورت حال نے غلط ٹیسٹ رپورٹس کی صورت میں مریضوں کی زندگیوں کو خطرات سے دوچار کر رکھا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ کون سی لیبارٹری کس معیار کی ہے اور قانونی ہے یا غیر قانونی، ہر لیب مختلف ٹیسٹس کے لیے مختلف رقوم وصول کرتی ہے اور ایسا کوئی ذریعہ، اصول اور ضابطہ نہیں جس سے شہری یہ جان سکیں کہ کسی مخصوص ٹیسٹ کے لیے جو رقم دینا پڑ رہی ہے وہ کس بنا پر دینا پڑ رہی ہے۔ یعنی ٹیسٹس کے معاوضوں میں جو فرق ہے اس کی وجہ کیا ہے، کیوں ایک ٹیسٹ پانچ سو میں ہوتا ہے اور دوسرا کئی ہزار میں؟

دوسری طرف ڈاکٹر بلاضرورت ٹیسٹ لکھ دیتے ہیں، کیوں کہ انھیں اس کا کمیشن ملتا ہے۔ بے حسی کی انتہا ہے کہ وہ شعبہ جس کا کام مسیحائی ہے، زندگی بچانا

اور صحت کا تحفظ ہے، وہی ہماری آپ کی جان کا دشمن ٹھہرا۔ اس شعبے سے کیا گلہ کریں کہ جس سماج میں پیسہ ہی سب سے بڑی قدر بن چکا ہو وہاں انسانیت اور اخلاقی اقدار کی کون سنتا ہے، مگر عوام کے جان و مال کی محافظ حکومت کیا کر رہی ہے۔ لیبارٹریوں کا معیار مقرر کرنے، انھیں اس معیار کا پابند بنانے اور کمیشن کے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے حکومت کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتی؟ یہ اہم مسئلہ قانون بنانے والوں اور متعلقہ اداروں کی توجہ کا طلب گار ہے۔

## ریڈیو کے عالمی دن پر

رات کے دو بجے ایف ایم ریڈیو کی نشریات نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔
ریڈیو کے پروگرام میں فون کرنے والی خاتون کالر پروگرام پریزنیٹر سے یوں محو گفتگو تھیں جیسے ان کی یہ نازیبا گفتگو کوئی تیسرا سن ہی نہیں رہا۔ میں نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور غور سے دیکھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ انٹرنیٹ کے ذریعے کسی اور ملک کا چینل ٹیون ان کرلیا ہے۔ لیکن نہیں جناب! یہ ہمارے پیارے دیس ہی کا ریڈیو چینل تھا، جہاں اخلاقی قدروں کو بہت پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔
ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اس سلسلے کی شروعات 2000 کے عشرے میں ہوئی جب مشرف حکومت نے ریڈیو چینلز کے لائسنس کوڑیوں کے مول بیچنا شروع کردیے۔ بہ ظاہر معاشی گہما گہمی کی وجہ سے اشتہارات کا تو دور تھا ہی، نئی صدی، آواز کی دنیا کا سحر، ان سب وجوہات کی بنا پر ریڈیو چینل خودرو پودوں کی طرح اگتے گئے۔ شروع میں چند لاکھ روپے میں ریڈیو چینل کے لائسنس جاری کیے گئے۔ لائسنس کے حصول کے لیے کسی بھی درجے کی تعلیمی قابلیت اور تجربے کی ضرورت نہیں تھی۔

جو ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہے فیس دے کر لائسنس لے اور قائم کرلے۔ اس صورت حال سے ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب تیرہ سال گزرنے کے بعد ریڈیو اس نہج پر پہنچ گیا ہے کہ ہم اپنے یہاں گھر گھر سنے جانے والے ایف ایم ریڈیو چینلز کو پاکستانی تو نہیں کہہ سکتے۔

مختلف اقسام کے ذرائع ابلاغ وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ اکیسویں صدی میں سامنے آتے جارہے ہیں اور اس شعبے میں مزید ترقی کے روشن اور قوی امکانات موجود ہیں، لیکن ابلاغ کا کوئی بھی ذریعہ چاہے کتنا پُرانا ہوگیا ہو اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کچھ ریڈیو کا بھی احوال ہے۔ میرے پاس آج ابلاغ کی جدید ترین سہولیات موجود ہیں، اس کے باوجود میں ریڈیو سنتی ہوں۔ میرے اس شوق ہی نے مجھے ایک انٹرنیٹ ریڈیو چینل سے وابستہ کردیا اور پھر اس شعبے کے راز میرے سامنے کھلتے چلے گئے۔

پاکستان میں جب لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایک بار پھر ریڈیو کی طرف مائل ہوئی تو لائسنس ایشو کرنے والے اداروں کو بھی اس کی فیس بڑھانے کا خیال آیا۔ یوں وہ لائسنس جو بنا کسی قابلیت کے چند لاکھ روپے میں دست یاب تھے، ان کی مالیت کروڑوں تک جا پہنچی۔

اصول یہ مرتب کیے گئے کہ ''میٹروسٹی'' یعنی وہ شہر جس کی آبادی ایک ملین سے زیادہ ہو، وہاں لائسنس کی بولی لگ بھگ پچاس لاکھ ہے، جب کہ ایک ملین سے کم آبادی والے شہر جو ''جنرل'' کے زمرے میں آتے ہیں، وہاں یہ شروعات ایک لاکھ روپے سے ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ ریڈیو ابلاغ کا سستاترین اور آسان ذریعہ ہے۔ ایک تو ٹیلی وژن کے مقابلے میں ریڈیو چینل قائم کرنے پر بہت کم رقم خرچ ہوتی ہے۔ دوسرے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ ایک شخص انفرادی طور پر بنا کسی خرچ کے ریڈیو کی نشریات سن سکتا ہے۔ یعنی ایک ایسا میڈیم جسے ہم سامعین کے لیے مکمل طور پر مفت کہہ سکتے ہیں۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے اس کی لائسنس فیس اتنی زیادہ کیوں ہے۔

المیہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر ریڈیو نشریات جو پہلے ''اینالوگ'' تھیں اب جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ڈیجیٹل کر دی گئی، جس کی بدولت آواز کا معیار بہتر ہوا۔ پاکستان میں لائسنس فیس تو آسمان تک پہنچا دی گئی لیکن نشریات کا معیار بہتر بنانے کے لیے ہم جدید ٹیکنالوجی اب تک نا اپنا سکے۔ ہمارے یہاں نشریات اب بھی اینالوگ ہے، ساتھ ہی کونٹینٹ مینجمینٹ'' پر بھی خاطر''

خواہ توجہ نہ دی گئی۔ لائسنس فیس اب اتنی زیادہ ہے کہ اس شعبے کی قابلیت رکھنے والے پروفیشنلز میدان سے باہر ہوگئے اور اناڑی کھیل کھیلتے نظر آتے ہیں۔

یہ وہی ریڈیو ہے جو عشروں تک ہماری ذہنی تربیت کرتا رہا ہے۔ یہ وہی ریڈیو ہے جس نے بڑے بڑے فن کار پیدا کیے۔ یہ وہی ریڈیو ہے جو زیڈاے بخاری کی قیادت میں ایک اعلیٰ درجے کا ادارہ بن کر ابھرا۔ مگر ایف ایم چینلوں کی فصل اگنے کے بعد اس ذریعۂ ابلاغ پر اشتہارات کی بھرمار ہو گئی۔ ریڈیو پروگرام کے لیے حکومتی اور نجی سطح پر تربیت کا کوئی ادارہ نہ تو قائم کیا گیا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی منصوبہ بندی کی گئی۔ جب پیسہ ہی سب کچھ ٹھہرا تو ریڈیو کی دنیا میں پروفیشنلز پیچھے رہ گئے اور سیلز، مارکیٹنگ کے لوگ آگے آ گئے۔ کیسا اور کس معیار کا پروگرام چل رہا ہے؟ اس پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ ٹی وی چینلز کے کسی نازیبا پروگرام پر ایکشن لے بھی لیا جاتا ہے، مگر ریڈیو کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔ اس وقت پورے پاکستان میں 150 کے قریب ایف ایم چینل قائم ہیں۔ صرف کراچی میں 13 ریڈیو چینل کام کر رہے ہیں۔ تاہم ان میں سے کوئی چینل دوسرے سے مختلف نہیں۔ ایک بھیڑ چال ہے اور سب اسی میں مگن۔ کوئی سا بھی چینل لگالیجیے، ایک طرح کے مکالمے، ایک جیسے پروگرام آپ کی سماعتوں سے ٹکرائیں گے۔ کسی قسم کی کوئی اسکرپٹنگ نہیں۔ رات کے شوز میں بے ہودگی

عروج پر ہے۔ اس بہتی گنگا میں سب ہاتھ دھو رہے ہیں، کہ جہاں مقصد کمرشیل ازم ہی قرار پایا وہاں اخلاقی اور ثقافتی اقدار کی کیا حیثیت۔ مستقبل کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر ہم رفتہ رفتہ اپنی روایات کو دفن کر رہے ہیں۔ لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ وہ کیسی نسل ہو گی جو ہمارے بعد آ رہی ہے اسے ہم کیا دے رہے ہیں۔

فقط لائسنس فیس کم کر کے، اداروں کی اجارہ داری ختم کر کے اور باقاعدہ ضابطۂ اخلاق بنا کر اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہوئے اس صنعت کو پورے ملک میں مزید فعال کیا جا سکتا ہے۔ اب بھی اس میں بہت کھپت کی گنجائش ہے۔ حکومت کے لیے آمدنی کے ذرائع کھلے ہیں۔ فقط نظرثانی کی ضرورت ہے۔

اصول بنائے بھی جاتے ہیں تو اس طرح کے کہ ریڈیو پاکستان کے علاوہ کوئی چینل کرنٹ افیئرز اور نیوز کے پروگرام نہیں چلا سکتا۔ فقط نیوز بلیٹن دینے کی اجازت ہے، اس اصول کا کوئی منطقی جواز موجود نہیں۔

ریڈیو کی ایک اور نوع جس نے گذشتہ سالوں میں اپنا مقام بنایا ہے انٹرنیٹ ریڈیو ہے۔ انٹرنیٹ ریڈیو ساری دنیا میں اداروں اور انفرادی سطح پر چلائے جا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ ریڈیو شروع کرنے کے لیے ''اسٹیمنگ'' اور ''سرور'' ورلڈ وائڈ ویب سے نہایت کم نرخوں پر خریدا جا سکتا ہے اور پھر سالانہ فیس ادا کرنا ہوتی ہے۔ پاکستان میں انٹرنیٹ ریڈیو کا حال بھی یوٹیوب کی طرح ہے۔

یعنی جس طرح بہ ظاہر بند ہونے والی یوٹیوب تک بہ آسانی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے، اسی طرح انٹرنیٹ ریڈیو کسی لائسنس اور اجازت کے بغیر ہمارے یہاں دست یاب ہیں۔ لیکن چوں کہ انٹرنیٹ کی سہولت پاکستان میں نسبتاً کم لوگوں کو میسر ہے، لہذا انٹرنیٹ ریڈیو کے سامعین بھی محدود ہیں۔

اس طرز پر کام کرنے والے ریڈیو چینلز کا معاہدہ عالمی سطح پر انٹرنیٹ کی سب سے بڑی کمپنی سے ہے، لہذا حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر ایسے کسی چینل سے ہمارے ملک میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہو یا اس کی نشریات ہماری اخلاقی اقدار سے متصادم ہوں تو انٹرنیٹ پروٹوکول سے اس جگہ کی نشان دہی ہو سکتی ہے جہاں سے یہ چینل چلایا جا رہا ہے اور اس کے خلاف ایکشن لیا جا سکتا ہے۔

ایسے قابل ذہین اور ریڈیو کے سچے خیر خوا جنہیں اپنی روایات سے پیار ہے، پاکستان سے پیار ہے، لیکن لائسنس فیس زیادہ ہونے کے باعث ایسے سچے لوگ پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کو غیر تجارتی بنیاد اور محدود فریکوئنسی پر لائسنس کا اجراء کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تو سوچا جائے کہ اس قسم کا لائسنس جاری کر بھی دیا جائے تو اشتہار کے بغیر کوئی ریڈیو کیسے چلایا جا سکتا ہے۔

پوری دنیا میں ''شارٹ ٹرم لائسنسز'' جاری کیے جاتے ہیں۔ چند ماہ ریڈیو چینل کی کارکردگی کو دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد باقاعدہ لائسنس کا اجراء کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو یہ اصول ہے کہ اگر کوئی پیسے کے بل پر کسی میٹرو سٹی کا لائسنس لے لیتا ہے تو چھوٹے شہروں کے لیے لائسنس لینا اس کے لیے مشکل نہیں رہتا۔ مدعا فقط یہ ہے کہ جو پیشہ ورانہ مہارت کی بنا پر لائسنس کا صحیح حق دار ہے وہ کہاں جائے؟

آج 13 فروری کو عالمی سطح پر ''ریڈیو کا دن'' منایا جارہا ہے۔ یہ دن اس تصور کی بنیاد پر منایا جاتا ہے کہ ریڈیو وہ ذریعۂ ابلاغ ہے جو فرد کے اندر شعور پیدا کرنے کے ساتھ عالمی سطح پر قوموں کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہے اور ایک ایسا ذریعہ ہے جو بیک وقت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ آواز کی اس دنیا میں ہوا میں رقصاں الفاظ ہماری سماعتوں سے ٹکراتے ہیں اور جاوداں ہوجاتے اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنا اہم میڈیم، جس کی آواز گھر گھر گونجتی ہے، ہمارے یہاں بری طرح نظرانداز کیا جارہا ہے۔ میں حکومت اور پاکستان میں کام کرنے والے تمام ریڈیو چینل مالکان سے ریڈیو انڈسٹری کے حوالے سے قوانین مرتب کرنے اور مرتب شدہ قوانین پر سختی سے عمل درآمد کی درخواست کرتی ہوں۔

## عام آدمی

بس اسٹاپ پر کھڑے اسے آدھا گھنٹہ ہوگیا تھا۔ سڑک پہ آتی جاتی گاڑیوں کو وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گدھ اپنے شکار کو دبوچنے کے لیے نظریں گاڑھے بیٹھا ہو۔ بظاہر اس نے اپنے لب بھینچ لیے تھے کہ جیسے گویا برسوں سے کوئی لفظ ان لبوں سے ادا ہی نا ہوا ہو۔ پر آنکھیں تھیں کہ چیخیں جا رہی تھیں۔ اس کے اندر شور بہت تھا لیکن باہر کا شور اسے اس بات کا یقین دلا چکا تھا کے بولنے کا کوئی ثمر نہ ملے گا۔ لحاظا ہونٹ خاموش تھے۔ اس کے اندر پکنے والا جوالا پھٹنے کو تھا۔ لیکن دھواں اسے باہر دکھائی دیا سڑک پر گزرتی گاڑیوں کا دھواں۔ اب اس کی آنکھیں غصے کی بجائے فکر کے گھیرے میں تھیں۔ ''میں آج بھی لیٹ ہوگیا تو شاید نوکری چلی جائے۔'' وہ بند لبوں سے ہی خود سے مخاطب ہوا۔ اس نے ایک خالی رکشے کو دیکھ کر رکنے کا اشارہ کیا۔ رکشہ والے نے دفتر تک جانے کا ڈبل کرایہ مانگ لیا۔ مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں۔ وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ رکشہ والا اپنے بتائے کرائے پر بضد تھا۔ اس کی اکڑ تھی بھی ٹھیک۔ شہر میں سی این جی یوں تو غائب تھی اور لیکن اس رکشے والے کے پاس موجود تھی، سو فائدہ تو اسے اٹھانا تھا ہی۔ آخر اس نے رکشے میں نہ جانے کا فیصلہ کیا اور دوبارہ بس کا انتظار کرنے لگا۔ دو گھنٹے شدید تکلیف دہ انتظار کے بعد دور سے مطلوبہ بس آتی

نظر آئی، اب اس نے بس دبوچنے کی منصوبہ بندی شروع کردی تھی۔ دھیمی رفتار سے چلتی مسافروں سے کھچاکھچ بھری بس آخر اسٹاپ پر آکر رک گئی۔ وہ اپنی ساری تہذیب اور نفاست ایک طرف رکھ کر بس کی چھت کو جاتی سیڑھی پر پیر جمائے اوپر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک نقاہت کی وجہ سے اسے اپنا وجود بے جان ہوتا محسوس ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کم زوری کیسی، چکر کیوں آرہے ہیں؟ اسے یاد آیا کہ آج تو وہ بنا کچھ کھائیپیئے گھر سے نکلا تھا، مہینے کا بچاکھچا راشن تو موجود تھا، مگر گیس تھی ہی نہیں تو گھر کے چولہے کیا خاک جلتے۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے وہ پاپے خرید لایا تھا، آج بس وہ اتنا ہی خرچہ کر سکتا تھا، لحاظا خود بھوکا دفتر روانہ ہوگیا۔ باہر کا کھانا اس کے بجٹ سے باہر تھا۔ تندور کی روٹی بھی تو آٹھ روپے کی ہو گئی۔ آخر کب تک یہ فضول خرچی ہوتی۔ بس کی سیڑھی سے لٹکا وہ گزرے ہفتے کی باتیں یاد کر رہا تھا۔ نان بائی کے پاس کھڑے ہو کر وہ سوچتا کہ اسے آٹا پانی میں گھول کر پی لینا چاہیے، کم سے کم نان بائی کو اسی روپے تو نہیں دینے پڑیں گے۔ مگر وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسے کے سب سے چھوٹے بچے نے اس کی جیب میں ایک ٹافی ڈالی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سیڑھی سے ہٹا کر بہ مشکل جیب میں ڈالا اور ٹٹول کر ٹافی نکال کر منہ میں رکھ لی۔ اب وہ خود کو کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا وہ بس کی چھت پر جا بیٹھا اور سوچنے لگا کے کل بھی اسے ایک ایسے ہی دن کا سامنا کرنا ہوگا۔ ''کرایہ کرایہ'' اس کی سماعت

میں آتی سدا بیوی کی آواز میں ڈھل گئی، ''گھر کا کرایہ... جاوید... گھر کا کرایہ... دوسرا مہینا شروع ہونے کو ہے۔ اس ماہ کے بارہ اور اگلے ماہ کے بارہ کل ملا کہ چوبیس ہزار دینے ہیں...'' کرایہ کرایہ۔۔اب وہ آواز کرخت ہو گئی ''کرایہ دے دے بھائی، کیا بھنگ پی کر گھر سے نکلا ہے۔'' اس بار لہجہ خاصا سخت تھا۔ اس سے عمر میں کوئی دوگنا چھوٹا کنڈیکٹر اس کی تذلیل کر رہا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالتے ہوئے اس نے غصے سے کہا، ''ابے دے رہا ہوں، مر کیوں رہا ہے۔ بات تو تمیز سے کر۔'' کنڈیکٹر چلتی بس کی سیڑھی سے لٹکے لٹکے چلایا، ''میں تو جاہل ہوں، تو تو پڑھا لکھا جاہل ہے۔ ہاں نہیں تو، آجاتے ہیں صبح صبح دماغ کی دہی کرنے۔'' جاوید بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ بس پر بیٹھے دوسرے مسافروں کی نظروں کی گرمی اسے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی، جیسے ہر نگاہ اس کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ اس نے پیسے کنڈیکٹر کو پکڑاتے ہوئے گیدڑ بھپکی لگائی، ''دوں گا ابھی اُلٹے ہاتھ کا، چل نکل۔

کنڈیکٹر نے ''ہوررررر'' کی صدا لگائی اور نیچے اتر گیا۔

ساتھ بیٹھے ایک مہذب اور باریش شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولتا چلا گیا۔ وہ اس کی باتیں

سننا نہیں چاہتا تھا لیکن سفر ختم ہونے تک یہ سماع خراشی اس کی مجبوری تھی۔ مہذب شخص بولے جا رہا تھا''ارے صاحب ! آپ کہاں ان چماروں کے منہ لگتے ہیں۔

ان کا تو روز کا یہی کام ہے۔ آپ ٹھیرے شریف آدمی اور شریف آدمی کو چپ کرانے کے لیے یہ حربہ ہی کافی ہے کہ اسے بھری محفل میں گالی دے دی جائے۔ آپ ماشاء اللہ کیا جاب کرتے ہیں؟'' جاوید کو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنی گردن میں تناؤ محسوس ہوا۔''جی میں ایک کمپنی کے آئی ٹی ڈیپارٹمینٹ کے ہیڈ کا اسسٹنٹ ہوں۔
''.سوفٹ ویئر انجنیئر کہہ لیجیے

بارلیش شخص مسکراتے ہوئے گویا ہوا،''ماشاء اللہ ماشاء اللہ بھائی پھر تو آپ کو چھوٹی موٹی گاڑی لے لینی چاہیے۔ اب سی این جی کے بحران کی وجہ سے پبلک ٹرانسپورٹ کے مسائل تو ختم ہوں گے نہیں۔ آپ
جیسا پڑھا لکھا شخص بس کی چھت پر بیٹھ کر سفر کرے۔ رکشہ کر لیتے ۔آرام سے جاتے۔
''اب اس گرمی میں کہاں پریشان ہو رہے ہیں۔

رکشہ ملا ہی نہیں، کافی دیر انتظار کیا۔'' جاوید نے مہارت سے جھوٹ داغ دیا۔''
اچھا اچھا، بس بھئی یہی ہے اس شہر کا حال، سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا،''
''گیس بند اور۔۔۔

وہ بولے جا رہا تھا مگر جاوید کے کانوں میں بس اپنی بیوی سعدیہ کے الفاظ گونج رہے تھے،''گھر کا کرایہ جاوید گھر کا کرایہ۔ پورے بارہ ہزار دینے ہیں۔ کل پہلی ہے۔ ابھی پچھلے مہینے کا کرایہ بھی نہیں دیا۔ تیس ہزار روپے میں گھر

نہیں چلتا۔ مہینے کا راشن ہی دس پندرہ ہزار لے جاتا ہے۔ پھر تمھاری بہنوں کی آئے دن کی دعوتیں، امی کی دوا، میری زچگیوں پر اٹھنے والے اخراجات۔ دو بچوں کی دفعہ تو نارمل ڈیلیوری تھی، اس بار ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپریشن کرنا ہوگا۔ میں نے پتا کیا تھا، اسپتال میں پچاس ہزار جمع کروانے ہوں گے۔ پھر آپریشن کے بعد حساب ہوگا، رقم بچی تو وہ واپس کردیں گے۔ وہ ایمرجینسی کے لیے اپنے پاس ایڈوانس رقم رکھتے ہیں۔ بس کو جھٹکا لگا اور سعدیہ کی آواز جو وہ بڑے غور سے مہذب شخص کے ہونٹوں سے نکلتے سن رہا تھا۔ اچانک پھر بھاری آواز میں شہر کا نوحہ سنانے لگی۔ ''کل پھر ہڑتال ہے۔ آپ کہاں جارہے ہیں؟'' جاوید تیز دھوپ میں چندھیائی آنکھوں سے مخاطب کو دیکھتے ہوئے بولا، ''میں زینب مارکیٹ پر اتروں گا۔ وہاں سے میرا آفس دس منٹ کے فاصلے پر ہے۔
''

اچھا اچھا....منہگائی بہت بڑھ گئی ہے، بچوں کی فیس....'' وہ شخص پھر شروع ہوگیا۔ '' اب جاوید کو اس کے ہونٹوں سے اپنے بچوں کی آواز آرہی تھی، ''پاپا فیس واوچر مل گیا ہے۔ آپ فیس لیٹ کردیتے ہیں، پینلٹی لگ جاتی ہے۔ میرے ایگزامز ختم ہوں گے تو میں سکستھ کلاس میں چلا جاؤں گا۔'' اب کی بار چار سالہ عمیمہ کی ننھی سی آواز سماعت سے ٹکرائی، ''پاپا باربی ہاؤس، پاپا باربی ہاؤس....دلائیں گے ناپاپا۔'' عمیمہ کی خفگی بھری معصوم سی آواز نے اسے لمحے بھر کو سکون

دیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بارلیش شخص نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ آواز پھر بدل گئی۔ ’’کیا ہوا بھائی صاحب! آپ کو میری بات مذاق لگتی ہے۔ ’’یہاں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ یہ قوم ڈنڈے ہی سے سدھر سکتی ہے۔

بس زینب مارکیٹ کے اسٹاپ پر پہنچ چکی تھی۔ جاوید جلدی میں اٹھا۔ پیچھے سے بارلیش شخص کی آواز آئی ’’میں بولتا بہت ہوں، خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اپنا خیال رکھیے گا۔‘‘ جاوید پیچھے مُڑ کر قدرے زور سے بولا ’’ارے نہیں، مجھے تو بہت اچھا لگا آپ کے ساتھ۔‘‘ بس سے اترنے کے لیے اس نے گھوم کر قدم سیڑھی پر جمائے ہی تھے کہ بس چل پڑی۔ اس نے جلدی سے دوسرے اسٹیپ پر پاؤں رکھا۔ اب تیسرا اور آخری اسٹیپ تھا۔ بس نے اسپیڈ پکڑ لی۔ جاوید کو خطرہ تھا کہ بس اسے اگلے اسٹاپ تک نہ لے جائے۔ باس کی صورت خوف بن کر نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس نے سوچا ابھی بس کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوئی، وہ اتر سکتا ہے۔ اس نے چلتی بس سے چھلانگ لگا دی، مگر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا، پیر مُڑا اور وہ

سڑک پر گر پڑا۔ وہ ابھی اٹھنے کی کوشش بھی نہ کر پایا تھا کہ تیزی سے آتی ہوئی ایک کرولا اسے روندتے ہوئے گزر گئی۔ سڑک پر جا بہ جا خون بکھرا ہوا تھا۔ ہاتھ اور گردن کٹ کر الگ ہو چکے تھے۔ لُہولان لاش کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ’’ابے روکو

''اس گاڑی والے کو، مار کے نکل گیا سالا...''، ''فون کرو کوئی ایمبولینس کو۔

جاوید مجمع میں شامل ہو کر اپنے مُردہ جسم کو تک رہا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ مُردہ جسم تو میرا ہے، یہ مسخ شدہ چہرہ میرا ہے، یہ بکھرا ہوا خون میرا ہے، تو مجھے تکلیف کیوں نہیں ہو رہی۔ لمحے کے دسویں حصے میں جاوید یہ حقیقت سمجھ چکا تھا کہ اس کی روح جسم سے الگ ہو گئی ہے اور وہ مر چکا ہے۔

اب وہ بھی تماشائیوں میں شامل ہو گیا۔ ایک نوجوان جوش میں آگے بڑھا اور اس کے شکستہ جسم کو سمیٹنے لگا۔ اتنے میں دوسرے نوجوان نے آواز لگائی، ''پاگل ہو گیا ہے کیا۔ اسے اسپتال پہنچایا تو انتظامیہ گلے پڑ جائے گی۔ چل نکل، دیر ہو رہی ہے۔'' دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا، ''یہ ہے انسان کی زندگی۔ کُتے بلی کی طرح مار کے چلے جاتے ہیں۔ توبہ استغفار۔'' کوئی بیس منٹ بعد ایمبولینس کی آواز سنائی دی تو مجمع چھٹنے لگا۔ پولیس کی موبائل بھی ایمبولینس کے ساتھ تھی۔ وہ تماشائیوں کے بیچ کھڑا اپنا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے جسم کو ایک چادر میں لپیٹ کر ایمبولینس میں ڈالا گیا اور وہ ایمبولینس اس کی نظروں کے سامنے سائرن بجاتی ہوئی نکل گئی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر چیخا، ''روکو روکو'' لیکن اس کی آواز کوئی نہیں سُن رہا تھا۔ مجمع چھٹ گیا، جائے حادثہ

سے گاڑیاں گزرنے لگیں، سب اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ اور جاوید سڑک کے بیچوں بیچ اپنے بکھرے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔

## یہ ہے انٹرنیٹ ریڈیو

اکیسویں صدی کو انٹرنیٹ کی صدی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نئی نئی ٹیکنالوجیز متعارف ہورہی ہیں اور ہم ان کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے ہم انگلیوں کی ذرا سی جنبش سے ہم اپنا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچا سکتے ہیں۔ رابطے کے ان آسان ترین ذرائع نے جہاں پیغامات کی ترسیل کا کام نہایت آسان بنادیا ہے، وہیں اس ضمن میں سماجی ویب سائٹس بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس نئی دنیا میں پُرانے ذرائع ابلاغ بھی نئی صورت اختیار کر رہے ہیں، جیسے ریڈیو۔ کسی زمانے میں ریڈیو سیٹ ہی کے ذریعے ریڈیو کی نشریات سنی جاسکتی تھیں، پھر ہم گاڑی میں یہ نشریات سننے کے قابل ہوگئے۔ اس کے بعد موبائل فون کے وسیلے سے بھی ریڈیو کی نشریات تک ہماری رسائی ہونے لگی۔

بعد ازاں انٹرنیٹ پر سماجی رابطوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انٹرنیٹ ریڈیو کی صورت میں ذرائع ابلاغ کا ایک نیا سلسلہ سامنے آگیا۔ یہ ریڈیو ملکوں اور سرحدوں کی ضرورتوں سے آزاد ہیں اور ہم دنیا بھر میں قائم

ہزاروں ریڈیو چینلز ویب سائٹس کے ذریعے سن سکتے ہیں، بس ویب سائٹ ایڈریس ڈالیے اور مطلوبہ ریڈیو کی نشریات آپ کی سماعت میں گونجنے لگیں گی۔ یوں انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے کام کے دوران ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگراموں اور گانوں سے بھی لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔

ریڈیو کی یہ نئی نوع یعنی انٹرنیٹ ریڈیو جس نے گذشتہ سالوں کے دوران اپنا مقام بنایا ہے، تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ انٹرنیٹ ریڈیو ساری دنیا میں اداروں کی اور انفرادی سطح پر چلائے جارہے ہیں۔ انٹرنیٹ ریڈیو شروع کرنے کے لیے اسٹیمنگ" اور "سرور" ورلڈ وائڈ ویب سے نہایت کم نرخوں پر خریدا جاسکتا ہے اور" پھر سالانہ فیس ادا کرنا ہوتی ہے۔ پاکستان میں انٹرنیٹ ریڈیو تک بہ آسانی رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چوں کہ انٹرنیٹ کی سہولت پاکستان میں نسبتاً کم لوگوں کو میسر ہے، لہٰذا انٹرنیٹ ریڈیو کے سامعین بھی محدود ہیں۔

اس طرز پر کام کرنے والے ریڈیو چینلوں کا معاہدہ عالمی سطح پر انٹرنیٹ کی سب سے بڑی کمپنی سے ہے، لہٰذا حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی۔ البتہ اگر ایسے کسی چینل سے ہمارے ملک میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہو یا اس کی نشریات ہماری اخلاقی اقدار سے متصادم ہوں تو انٹرنیٹ پروٹوکول سے اس جگہ

کی نشان دہی ہو سکتی ہے جہاں سے یہ چینل چلایا جا رہا ہے اور اس کے خلاف ایکشن لیا جا سکتا ہے۔

ان انٹرنیٹ ریڈیو چینلوں کے سننے والوں کے علاوہ ٹوئٹر اور فیس بک کے یوزرز بھی مستقل بنیادوں پر ان ریڈیو چینلوں سے رابطے میں رہتے ہیں، کیوں کہ سماجی رابطوں کی ان ویب سائٹس پر مختلف لنکس دیے گئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ویب سائٹس پر ایک قسم کا چیک باکس ہوتا ہے، جہاں پر کوئی بھی کسی بھی وقت وائس چیٹ کی صورت میں مختلف لوگوں تک اپنا پیغام اور رائے پہنچا سکتا ہے۔

ان سائٹس پر اہم امور پر ڈسکیشنز کیے جاتے ہیں۔ سامعین کی سہولت کے لیے ریکارڈ کیے گئے پروگرام کو دوبارہ سننے کے لیے آپشنز بھی دیے جاتے ہیں۔ ان ویب سائٹس کے چیٹ باکس کے ذریعے آپ فوری طور پر اپنے پسندیدہ گانوں کو پلے کرنے کی ریکویسٹ ریڈیو انتظامیہ کو سینڈ کرتے ہیں اور لمحہ بھر میں آپ کی ریکویسٹ وہاں پہنچ جاتی ہے۔

انٹرنیٹ ریڈیو کی زیادہ تر ویب سائٹس گوگل کروم ہی میں ٹھیک طرح کام کرتی ہیں۔ یہ ریڈیو مختلف اسمارٹ فونز میں ایپلی کیشنز کی صورت میں بھی ڈاؤن لوڈ

کیے جا سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں ان ویب سائٹس پر اسمارٹ فونز کے ایپ ڈاؤن لوڈنگ آپشنز بھی دست یاب ہوتے ہیں، جن کی مدد سے آپ ان انٹرنیٹ ریڈیوز کو ایک کلک پر ہی اپنے فون پر سن سکتے ہیں۔

کسی بھی جدید ٹیکنالوجی کے مثبت اور منفی پہلو ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ بھی آیا ہے کہ ان ویب سائٹس کا غلط استعمال کرتے ہوئے بہ طور ذریعۂ ابلاغ ریڈیو امیج کو نقصان بھی پہنچا ہے، کیوں کہ انفرادی طور پر پروفیشنل ازم کی کمی کی وجہ سے ریڈیو چینل کی بنیادی ضرورتوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے ریڈیو چینل کی روح مر جاتی ہے۔ اکثر نوجوانوں نے سنگل لیپ ٹاپ پر بھی ریڈیو چینل قائم کر رکھے ہیں، جو کہ کسی بھی صورت میں ریڈیو کی شرائط پر پورے نہیں اترتے اور انھیں ریڈیو کہنا غلط ہوگا۔

انٹرنیٹ ریڈیو کے قیام کے لیے بھی باقاعدہ طور پر اسٹوڈیو سیٹ اپ کا ہونا ضروری ہے، جس میں مختلف اقسام کے کم از کم پانچ کمپیوٹر، کنٹرول پینل، پروفیشنل مائیک، پروفیشنل ہیڈ فونز، بجلی کی چوبیس گھنٹے فراہمی اور باقاعدگی سے پروگرام کے شیڈول کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اس منصوبہ بندی میں انٹرویوز کے لیے مختلف شخصیات سے روابط اور کسی تھیم کے مطابق پریزینٹرز کا پروگرام کرنا شامل ہیں، جس کے لیے اچھے لاکھوں روپے کے سرمائے کی ضرورت

ہوتی ہے۔

امکان ہے کہ مستقبل قریب میں انٹرنیٹ ریڈیو، ریڈیو کی سب سے زیادہ مقبول صورت اختیار کر جائیں گے۔

## تعلیم کا بیوپار

ہائے رے مڈل کلاس طبقہ...

جیب اجازت دے یا نہ دے اپنے بچے کو اس عزم کے ساتھ مہنگے پرائیویٹ اسکول میں داخل کرایا جاتا ہے کہ پیٹ بھر کے روٹی نہیں کھائیں گے مگر اپنے بچے کو کم سے کم ایسے اسکول میں تو ضرور پڑھائیں گے جہاں ہر کوئی انگریزی زبان میں بات کرتا ہو۔ یہ الگ مسئلہ ٹھہرا کہ اسکول میں داخلے والے دنوں میں تو چپڑاسی بھی انگریزی بولتا نظر آتا ہے۔ بعد ازاں داخلے کے چند ماہ بعد یہ راز کھلتا ہے کہ انگریزی پڑھانے والی ٹیچر بھی انگریزی پڑھانے سے قاصر ہے۔ لیکن معاشرے میں اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے ساتھ ساتھ اس پر اسٹیٹس کا گوٹہ ٹانکنا بھی تو ضروری ٹھہرا۔ سو انگریزی اسکول جیسا بھی ہو اپنے بچے پر انگلش میڈیم کا ٹیگ ہونا ہی چاہیے۔ پاکستان میں معاشی حالات جس ڈگری پر چل رہے ہیں ان میں یہ ہر گھر کی کہانی ہے، کہ انگریزی کا ٹیگ ہی بچے کا معاشی مستقبل سنوار سکتا ہے۔ اسکول فیس اور اخراجات کے بڑھنے کی صدا گھر گھر سے آتی ہے۔ امیر طبقہ امیر سے امیر تر اور غریب غربت میں دھنستا جا رہا ہے۔ رہی مڈل کلاس تو وہ ایسی دلدل میں پھنسی ہے کہ بس دم نکلنے کی دیر ہے۔

اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دینے کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے جسم کا لہو دان کرنا پڑتا ہے اور یوں فیس دینے کی آخری تاریخ یعنی ہر ماہ کی دسویں خون خشک کرجاتی ہے۔ جو نہ دے سکے تو پندرہ کو جرمانے کے بعد، 20 تاریخ کو ڈبل جرمانے کے ساتھ فیس جمع کروانا ضروری ہوتا ہے، ورنہ 21 کو تو بچے کا نام ہی اسکول سے خارج کردیا جاتا ہے۔ اب وہ کون ہوگا جو اپنے بچے کو اسکول میں رسوائی کا سامنا کرنے دے۔ الہذا کہیں سے بھی رقم کا انتظام کرکے فیس ادا کی جاتی ہے۔

معاملہ یہی ختم نہیں ہوتا۔ بڑا انگریزی میڈیم اسکول ہو یا چھوٹا، چونچلے اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ گوروں کے تمام تہوار منانا تو ہم پر فرض ٹھہرا۔ مذہبی ''فنکشنز'' میں بھی پیسے کو پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے دین کی اصل روح تو کہیں فنا ہوچکی ہے، جب کہ اخراجات کی مد میں آنے والا تمام خرچہ والدین کی جیب سے پورا کیا جاتا ہے۔ پانچ سو، ہزار، منگوانا تو عام سی بات ہے، پھر ارتھ ڈے سے لے کر یلو، گرین، بلو، ریڈ ڈے پر دن کی مناسبت سے لباس کی تیاری الگ۔ ان سب پر رقم دان کرنے کے بعد سکون کا سانس لینا کسے نصیب ہے۔ کبھی بچے کو خرگوش بنانے کے لیے کپڑے ضروری ہیں، تو کبھی شیر اور بھالو کے مختلف اقسام کے فینسی ڈریس خریدنا۔ والدین کی مجبوری ٹھہری، جیب چاہے چیخ اٹھے لیکن اپنے بچے کو

اسٹیڈس مینٹین رکھنے کی دوڑ میں شامل کرنا ضروری ہے۔ سو اس قسم کے فینسی ڈریس جن کی قیمت 500 روپے سے تین ہزار تک ہوتی ہے اور جنھیں بچہ فقط 15 سے 20 منٹ پہنتا ہے، خریدنا ہی پڑتے ہیں۔

یہ الگ بحث ہے کہ اسکولوں کے ساتھ اس طرح کے فینسی ڈریسز بنانے والوں کے باقاعدہ معاہدے ہوتے ہیں اور ہر لباس پہ اسکول انتظامیہ اپنا کمیشن رکھتی ہے۔ جو اسکول کمیشن نہیں لیتے وہ پروگرام تو بہر حال ضرور منعقد کرتے ہیں تاکہ اپنے اسکول کے طالب علموں کو جانوروں.... معاف کیجیے گا، میرا مطلب ہے اینیملز سے مشابہت رکھنے والی پر فارمینس دکھانے پر ان کی تصاویر بنائیں اور نئے آنے والے گاہکوں... میرا مطلب ہے والدین کو ان تصاویر کی مدد سے پھانسا جاسکے۔

اب لیجیے کورس کی کتابوں کو، جو ادارہ زیادہ مراعات اور کمیشن کی بات کرے جناب! اسی کی کتاب خریدنا ضروری ہے۔ میں آج تک یہ بات نہ سمجھ سکی کہ اردو اور انگریزی میڈیم اسکولز میں کتابوں کا معیار مختلف ہو سکتا ہے، لیکن ہر انگریزی اسکول دوسرے سے مختلف کورس کیوں پڑھا رہا ہے۔ پیسے بٹورنے کا نیا حربہ یہ اپنایا گیا ہے کہ وہ اسکول جن کی لاتعداد برانچز ایک ہی شہر میں قائم ہیں،ان اسکولز میں سال شروع ہوتے ہی فیس چالان کے ساتھ ایک اور چالان

تھما دیا جاتا ہے اور یہ چالان کتابوں کی خرید کی مد میں جمع کروائی جانے والی رقم کا ہوتا ہے۔

زیادہ پرانی بات نہیں کہ کسی کو یاد نہ ہو، کتابوں کی ایک فہرست اسکول کی طرف سے مہیا کی جاتی تھی اور وہ والدین جو نئی کتابیں خریدنے سے قاصر تھے وہ پرانی کتابیں اور نئی کاپیاں دے کر بچے کی پڑھائی کے خواب کو آگے بڑھاتے تھے۔ اب انھیں کتابوں کی فہرست ہی نہیں دی جاتی جس کی مدد سے وہ جان سکیں کہ کون سی کتاب خریدنی ہے اور کون سی نہیں؟ وہ اس پر مجبور ہیں کہ اسکول کے بک اسٹور یا بتائے گئے مخصوص بک اسٹور ہی سے کتابیں خریدی جائیں، یہ بھی اچھی رہی کہ کتابوں کا نام ہی نا بتایا جائے ۔کیونکہ اس صورت میں تو والدین پرانی کتابیں خرید لیں گے۔ اور اس طرح نا ہی اسکول انتظامیہ کی روزی میں برکت ہوگی اور نا ہی والدین پر مہنگائی کا عذاب نازل ہوگا۔

کتابوں کے معیار اتنے اعلیٰ ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ چھوٹا سا بچہ کس طرح اس فلاسفی کو سمجھ سکے گا۔ اب مسئلہ سمجھنے نہ سمجھنے کا تو رہا ہی نہیں۔ سمجھانے کی ذمے داری تو ماں باپ کی ہے۔ لہٰذا ٹیوشن کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ٹیوشن کی فیس کی ادائیگی ایک چھوٹے اژدہے کی مانند گلے میں لٹکی ہوتی ہے اور اسکول کی فیس کا بڑا اژدہا دو دو ماہ کی اکٹھی فیسوں کے ساتھ

زبان لٹکائے ڈرا رہا ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی سالانہ فیس دینے کا مہینہ یعنی اپریل شروع ہوتا ہے، یہ اژدہا پورا منہ کھول کر والدین کو نگلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسکول وین کی فیس ادا کرنا تو واجب قرار پایا۔ اب ہمارا وین ڈرائیور جون جولائی میں اپنا گھر کیسے چلائے گا۔ سو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا اس کے لیے بھی لازم ٹھہرا۔ پہیہ چلے نہ چلے دو ماہ کی تعطیلات میں یہ فیس ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک اور رواج چل نکلا ہے، اسکول کی امتحان کی کاپیاں فائلیں رنگ اور رنگ برنگی شیٹیں، جو کہ اسٹیشنری کے زمرے میں آتی ہیں، وہ بھی اسکول سے سال شروع ہوتے ہی خریدنا ہوتی ہیں۔ اب اس سامان سے بچہ فائدہ اٹھاتا ہے یا اسکول کا مالک، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

ایک معیاری انگریزی میڈیم اسکول کی فیس کم سے کم ڈھائی ہزار روپے ہے، جب کہ اس سے کم فیس والے اداروں کو معیار کی فہرست میں ہم والدین ہی نہیں لاتے اور زیادہ سے زیادہ فیس 12 ہزار ہے۔ اتنی فیس لینے کے باوجود ان ٹیچرز کو بھرتی کیا جاتا ہے جو کم سے کم تنخواہ میں کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اپنے اپنے شعبے میں مہارت رکھنے والے اساتذہ تو جیسے ناپید ہو چکے ہیں۔ آج سب سے آسان دھندا اسکول کھول کر کمائی کرنے کا بن گیا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ایسے مخلص لوگ بھی موجود ہیں جو اس شعبے سے ایمان داری برت رہے ہیں، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر

ہے۔ رہا گورنمنٹ اسکولز کا معاملہ، تو اس کا احوال میں اپنے گلے کالم میں بیان کروں گی۔
انگریزی میڈیم اسکولز کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ میں پرائیویٹ اسکولوں کی تنظیموں سے سوال کرتی ہوں کہ آخر کیوں ایسے اصول و ضابطے مقرر نہیں کیے گئے جن کی رو سے اسکول انتظامیہ جوابدہ ہوں کہ وہ فیس کس پیمانے پر مقرر کرتے ہیں۔ کتابیں کیوں اسکول سے خریدنا ضروری ہیں۔ آئے دن ہونے والے فنکشنز پر اٹھنے والا پیسہ کس کی جیب سے جاتا ہے۔ چلیں آپ کچھ نہ کریں اتنا تو بتادیجیے کہ انگریزی اسکولز کو آپ جتنی کیٹگریز میں تقسیم کرتے ہیں، آخر ان کیٹگریز کی فیسیں کیوں مختلف ہوتی ہیں؟

اس اندھیر نگری میں اسکول کا کاروبار کرنے والوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ تو اب کوئی بھی میٹرک فیل بے روزگار اپنے گھر کے احاطے میں اسکول کھول سکتا ہے، کیوں کہ یہاں قابلیت کون پوچھتا ہے۔ ہر بچہ اس بھٹی میں قابلیت کی آگ میں نہیں جلتا، بل کہ اسکول مالکان کے ہاتھوں میں ایک نئے کرارے نوٹ کی حرارت بنا رہتا ہے۔

## اب نکلو پاکستان سے

اپنے ارد گرد نظر دوڑایئے، گلی، محلہ، خاندان اور واقف گھرانوں کا جائزہ لیجیے، آپ پر انکشاف ہوگا کہ ان میں سے چند ہی گھرانے ہیں جن کے تمام افراد پاکستان میں مقیم ہیں، ورنہ تقریباً ہر گھر کا کوئی ایک فرد ترک وطن کرچکا ہے بعض تو پورے کے پورے کنبے ہی پردیس سدھار چکے ہیں۔ گویا ایک جنون ہے، مہم ہے، تحریک ہے ''اب نکلو پاکستان سے۔'' یورپ، امریکا اور آسٹریلیا میں بسیرے کے لیے کوئی اپنی تعلیم، صلاحیت اور مہارت کو سہارا بناتا ہے تو کوئی وہاں مقیم اپنے رشتے داروں کے آسرے پر کوشاں ہوتا ہے اور ایسوں کی بھی کمی نہیں جو کسی گرین کارڈ ہولڈر یا کسی اور مغربی ملک کی شہری سے شادی کے ذریعے اپنی منزل پانے کا خواہش مند اور اس کے لیے کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے۔

ہمارے نوجوانوں میں کے دل ودماغ میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہوچکا ہے کہ سکون اور راحت تو پردیس میں ہے، ''یہاں کیا رکھا ہے۔'' پردیس کا مذہب اور معاشرت جدا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے، وہاں اجنبی بن کے رہنا پڑے تو کیا حرج، بس جیب میں اس دیس کی کرنسی ہونی چاہیے، تاکہ عیش وآرام کی زندگی گزاری

جاسکے۔

شادی کے ذریعے بیرون ملک جانے کے لیے کنوارہ ہونے کی بھی شرط نہیں۔ ایسے لاتعداد مرد ہیں جنھوں نے شادی شدہ ہونے کے باوجود "پیپر میرج" کی اور پردیس میں بس کر اپنا مستقبل سنوار لیا۔ کراچی ایکسپو سینٹر میں منعقدہ ایک نمائش میں شریک ہونے ہمارے ایک قریبی عزیز "ورک ان ملائیشیا" کے اسٹال پر گئے، جہاں انہیں ملائیشیا کے بارے میں تمام معلومات فراہم کی گئیں کہ وہاں کس طرح بزنس سیٹ کیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے یہاں وہاں سے پیسے اکٹھا کرکے ملائیشیا کا ٹکٹ کٹوایااور پردیسی ہوگئے۔ موصوف شادی شدہ ہی نہیں چار بچوں کے باپ بھی تھے، لیکن باہر جاکر کچھ تو کرنا تھا، سو جب انہیں پتا چلا کہ ملائیشیا میں خواتین پیسے لے کر پیپر میرج" کی سہولت فراہم کرتی ہیں، تاکہ ملائیشیا میں رہتے ہوئے امیگریشن کے" مسائل سے نمٹا جاسکے، تو انھوں نے وہاں شادی کرلی، بزنس کیا اور آج ایک کام یاب زندگی گزار رہے ہیں۔ بس کام یابی منزل ہے، چاہے اس کے لیے پیپر میرج کا غیر قانونی اور غیراخلاقی راستہ ہی کیوں نہ اپنانا پڑے۔

بیرون ملک جاکر مستقبل سنوارنا اور زندگی بنانا یوں تو تقریباً ہمارے ہر نوجوان کا خواب ہے، مگر باصلاحیت، ذہین اور پروفیشنل افراد کی آنکھوں میں

اترنے والا یہ سپنا پورا ہو کر ہمارے ملک کو رفتہ رفتہ محنت اور ذہانت کے اثاثے سے محروم کر رہا ہے۔ درحقیقت ہر شخص اپنے لوگوں اور اپنے ماحول میں رہنا چاہتا ہے، یہ حالات ہوتے ہیں جو اسے ترک وطن پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہمارے لوگ بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہیں اور مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنا دیس چھوڑ کر بیرون ملک رہائش اختیار کی جائے۔ بیرون ملک جانے والے وہاں کوئی آسان زندگی بسر نہیں کرتے، وہ بہت مشکل روز و شب گزارتے ہیں۔ بڑی محنت اور تنگ و دو کے بعد وہ مقام حاصل ہوتا ہے جس کی آرزو لے کر انھوں نے ہجرت کی تھی، اور بہت سوں کے تو خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ وہ محنت پاکستان میں رہ کر کیوں نہیں کی جا سکتی جس کے ذریعے ہمارے لوگ دیگر ممالک میں زندگی بناتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو صورت حال ہے اس میں محنت اور مشقت کا سفر اکثر کولہو کے بیل کی دائرے میں گردش بن کر رہ جاتا ہے۔

امن و امان کی صورت حال کے باعث روزگار کے مواقع کی کمی بل کہ نایابی، سرکاری اداروں میں اقربا پروری اور ملازمتوں کی فروخت جیسے مسائل اپنی جگہ، اس سب کے ساتھ ہمارے یہاں لوگوں کو ملازمت پر رکھنے کا معیار بھی عجیب و غریب ہے۔ ہمارے ملک کے نجی اداروں میں عموماً ''ٹین ان ون'' کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس شخص کو ملازمت دی جائے جو بیک وقت

آٹھ دس کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یعنی وہ تعلیم یافتہ بھی ہو، تیکنیکی صلاحیت کا بھی حامل ہو اور انتظامی معاملات بھی سنبھال سکتا ہو۔ چناں چہ اکثر اداروں میں ایک ہی شخص مختلف نوعیت کے دس کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خاص طور پر ترقی یافتہ ممالک میں ایک شخص میں ایک ہی صلاحیت تلاش کی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر اسے ملازم رکھا جاتا ہے۔ کسی شخص سے اس کے رجحان، صلاحیت اور شوق کے برعکس کام لینا اس کے لیے ہمت شکنی اور بے زاری کا باعث بنتا ہے، مگر ہمارے یہاں اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

ہمارے ملک میں کتنے ہی ذہین، تعلیم یافتہ اور با صلاحیت نوجوان بے روزگاری کے صدمے جھیل کر ایک عمر گزار دیتے ہیں، مگر روزگار کی فراہمی کے لیے کوئی جامع منصوبہ بندی نہیں کی جاتی۔ ایسے میں بے روزگار نوجوان اپنی صلاحیت اور رجحان کے برعکس مجبوری میں کسی نہ کسی روزگار سے وابستہ ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، مگر ان کے خواب پورے ہونے کو بے تاب اور تمنائیں ناآسودہ ہی رہتی ہیں۔ بہت سے ممالک میں بے روزگاروں کو بے روزگاری الاؤنس ملتا ہے، اس بنیاد پر کہ روزگار فراہم کرنا ریاست کی ذمے داری ہے، اگر وہ یہ فریضہ پورا نہیں کر پا رہی تو کم از کم ملازمت سے محروم افراد کو ماہانہ کچھ رقم دے کر ان کی ضروریات کسی حد تک پوری کی جائیں، لیکن ہمارے یہاں ریاست یہ ذمے داری اٹھانے کو تیار نہیں۔

نوجوانوں کو قرضوں کی فراہمی کے لیے مختلف حکومتوں نے جو اسکیمیں شروع کیں وہ بھی مختلف وجوہات کی بنا پر بے روزگاری کے مسئلے سے نمٹنے میں ناکام رہیں۔ مثلاً موجودہ حکومت نے حال ہی میں بے روزگار نوجوانوں کو کاروبار کے لیے قرضوں کی فراہمی کی اسکیم شروع کی ہے، جس پر حکومت کے حامی واہ واہ کی صدائیں بلند کر رہے ہیں، لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکل سکا۔ اس اسکیم کے تحت اربو روپے مالیت کے قرضے دینے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ تاہم اس اسکیم کے حوالے سے نیشنل بینک نے قرضوں کی فراہمی کے لیے جو سخت ترین شرائط عاید کی ہیں ان پر ملک کے مختلف شہروں میں نوجوان سراپا احتجاج نظر آتے ہیں۔ قرضوں کے طلب گار نوجوان پریشان ہیں کہ اتنی بھاری مالیت کی ضمانت دینے والے ضامن کہاں سے لائیں؟ اس احتجاج کے باوجود نیشنل بینک کی شرائط جوں کی توں رہیں۔ دوسری طرف ہر ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ یہ قرضے آٹھ سال کی مدت کے لیے دیے جا رہے ہیں، جب کہ حکومت پانچ سال رہے گی، پھر کون پوچھے گا کہ پیسہ کسے دیا کہاں گیا، چناں چہ نیشنل بینک نے شرائط ہی ایسی عاید کردیں کہ عام نوجوان کے لیے اس قرضے کا حصول خواب بن کر رہ جائے۔ اب حکم راں جماعت کے کارکن اس اسکیم کو اپنی حکومت کا کارنامہ بتاتے ہوئے اسکیم کو پروموٹ کر رہے ہیں کہ ''قرضہ لے لو، قرضہ لے لو'' مگر قرضہ ملے گا تو لیا جائے گا نہ۔ اب حکومت بھی خوش کہ وہ دعویٰ کرسکے گی کہ اس نے بے روزگار نوجوانوں کے لیے

اسکیم جاری کی اور نیشنل بینک مطمئن کے اس نے کڑی شرائط کے ذریعے پیسہ بچالیا۔
ان حالات میں ہمارا نوجوان کیا کرے؟ وہ پاکستان چھوڑ کر بیرون ملک جانے کی کیوں نہ ٹھانے، جہاں سخت محنت ہے تو اس کا صلہ بھی ملتا ہے، سپنے پورے ہونے کے روشن امکانات ہیں، اور کچھ نہیں تو وہاں کم از کم جان تو محفوظ ہے۔ امن وامان قائم نہ کرسکنا ہماری حکومت کی مجبوری ٹھہری، لیکن اتنا تو کیا ہی جاسکتا ہے کہ ذہین، با صلاحیت اور پرفیشنل نوجوانوں کو باعزت روزگار اور مناسب طرز زندگی کی حامل تن خواہیں فراہم کی جائیں، ورنہ ذہانت اور صلاحیت کا یہ سفر جاری رہا تو ہمارا ملک صرف دانش اور اہلیت کا پروڈکشن یونٹ بن کر رہ جائے گا، جس کی پیداوار دوسروں ہی کے کام آئے گی۔

## سب سے آگے پاکستان

تعلیم، خوش حالی، امن اور ترقی سمیت حقیقی معنوں میں کوئی قابل فخر شعبہ ایسا نہیں جس میں ہمارا ملک نمبر ایک نہیں تو ٹاپ ٹین ہی میں شمار کیا جائے، اسی الیے کو طریے میں بدلنے کی خاطر ہم نے حال ہی میں سر سے ناریل توڑنے اور زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں تھامے پرچم لہرانے جیسے کئی ریکارڈ بنائے، لیکن گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے صفحات پر جگمگاتے یہ ریکارڈز ان اندھیروں میں ذرا بھی روشنی نہ کرسکے جن میں ہم گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارا بنایا ہوا ایک اور ریکارڈ نشان دہی کر رہا ہے کہ یہ اندھیرے کتنے مہیب اور کس قدر دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بچوں کے تحفظ اور ان کی زندگی بہتر بنانے کے لیے عالمی سطح پر کام کرنے والی تنظیم charity Save the Children نے گذشتہ دنوں شیر خوار بچوں کی اموات کے حوالے سے ایک رپورٹ جاری کی ہے، اس رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں سب سے زیادہ شیر خوار بچوں کی اموات جس ملک میں ہوتی ہیں وہ پاکستان ہے۔برطانیہ سے تعلق رکھنے والی اس تنظیم کی جاری کردہ رپورٹ بتاتی ہے کہ نوخیز بچوں کی موت اور مردہ بچوں کے پیدائش کی شرح پاکستان میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ

ایک ہزار زچگیوں میں 40.7 فی صد ہے۔ ہم اس معاملے میں جنگ، بدامنی اور شدید ترین غربت کا شکار ممالک جیسے نائجیریا (32.7 فی صد)، سرے لیون (30.8 فی صد)، Guinea-Bissau(29.7 فی صد)، افلاس اور قحط کی مثال صومالیہ (29.4 فی صد) اور اپنے ہم سائے افغانستان (29.0 فی صد) سے بھی کہیں آگے ہیں۔ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ پاکستان میں زچگی کے عمل سے گزرنے والی عورتوں میں سے نصف سے بھی کم کو تربیت یافتہ اور ماہر طبّی عملہ میسر آتا ہے، جس کی وجہ انھیں تن خواہوں کا بروقت نہ ملنا ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں متعلقہ دواؤں کی عدم دست یابی اور متعلقہ آلات کا دست یاب نہ ہونا یا ان کا غیر فعال ہونا بچوں کی اموات کے اہم اسباب میں شامل ہیں۔

charity Save the Children نے، جو دنیا کے 120 ممالک میں سرگرم عمل ہے، اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دنیا بھر کے حکمرانوں، انسان دوستوں اور پرائیویٹ سیکٹر سے اپیل کی ہے کہ بچوں کی اموات روکنے کے سلسلے میں اقدامات کریں۔

باقی دنیا کا تو پتا نہیں، مگر ہمارے ملک میں اس رپورٹ پر حکومت سمیت شاید ہی کوئی توجہ دے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ ہول ناک رپورٹ میڈیا میں نمایاں خبر کے طور پر سامنے آتی، ٹاک شوز میں اس پر بات کی جاتی اور ملک کے

منتخب ایوانوں میں اس حوالے سے بحث ہوتی، مگر ہر طرف خاموشی چھائی رہی، کیوں کہ بن کھلے یا کھلتے ہی مرجھا جانے والے یہ پھول مزدوروں، کسانوں اور ناداروں کے آنگن میں اپنی مہک چھوڑ کر خزاں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ننھی منی قبروں سے بھرے قبرستانوں والے اس ملک میں پولیو کے قطرے پلانے والی ورکرز کے جسموں میں بارود اتارا جارہا ہے، تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہم صورت حال کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھیانک غربت اور ناخواندگی ہے جس کے باعث پاکستان میں ہر سال ہزاروں بچے (مذکورہ رپورٹ کے مطابق) اپنی پانچویں سال گرہ منانے سے پہلے ہی موت کی وادی میں اتر جاتے ہیں۔ بچوں کی اموات میں غذا کی قلت اہم ترین سبب ہے۔ نوخیز بچوں کے یا تو صحت بخش غذا سِرے سے ملتی ہی نہیں یا اتنی کم مقدار میں نصیب ہوتی ہے کہ ان کے نرم ونازک جسم اس مدافعت اور توانائی سے محروم رہتے ہیں جو بیماریوں کا مقابلہ کرسکے۔ ظاہر ہے غذا کی یہ کمی اور محرومی افلاس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے غریب ماں باپ کو اس قابل ہیں نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے بچوں کو پھل اور دودھ سمیت ان کے لیے مناسب مقدار میں غذا فراہم کرسکیں۔

غربت کے علاوہ مختلف رپورٹ پاکستان میں بچوں کی زیادہ شرح اموات کی جو وجوہات بتاتی ہیں ان میں سینیٹری اور حفظان صحت کا ناقص نظام سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ یہ رپورٹس بتاتی ہیں کہ ایک ہی گھرانے میں پانچ سال سے کم عمر کے دو اور اس سے زیادہ بچوں کا ہونا بھی اس صورت حال کا سبب ہے، کیوں کہ ایسے میں سارے بچے مناسب غذا سے محروم رہتے ہیں۔ اور ایک کنبے میں پانچ سال سے کم عمر کئی بچوں کا ہونا خاندانی منصوبہ بندی نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ رپورٹس بچوں کی اموات کے جو دیگر اسباب بتاتی ہیں ان میں ماؤں کا ناخواندہ ہونا اور معاشرے میں رائج توہمات اور ٹیبوز سرفہرست ہیں۔

charity Save the Childrenکی یہ دل دکھاتی رپورٹ ایسے وقت میں سامنے آئی ہے جب تھر کے صحرا میں بچے بھوک اور بیماریوں کے ہاتھوں جان دے رہے ہیں۔

یہ حالات صحت اور تعلیم کے بارے میں ہماری حکومتوں کے رویے کا شاخسانہ ہیں۔

صحت اور تعلیم کی مدوں میں جو جیسا تیسا بجٹ رکھا جاتا ہے وہ بھی مناسب طریقے سے استعمال نہیں ہوتا اور اس کا بہت بڑا حصہ بدعنوانی اور بدنظمی کی نظر ہو جاتا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ جس میں جنم لینے والے ہر ہزار بچوں میں سے چالیس فی صد سے زیادہ پیدا ہوتے ہی اجل کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہوں، وہاں اس صورت حال کے

تدارک کے لیے سوچنا تو کجا اس پر بات بھی نہیں ہو رہی۔ ہمارے حکم راں بچوں کی زندگی بچانے کے لیے غربت مٹانے اور تعلیم عام کرنے کی خاطر اقدامات کرنے کے بہ جائے فیسٹول منانے اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اندراج جیسی تفریحات میں مشغول ہیں اور عوام کو بھی انھی مشاغل میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔

پاکستان میں بچوں کی اموات کا نوحہ سناتی یہ رپورٹ کیا ملک میں دہشت گردی کے المیے سے چھوٹا سانحہ ہے جس پر حکومت تو کیا میڈیا نے بھی توجہ نہیں دی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مقتدر حلقے ہوں، منتخب نمائندے، سماجی کارکن یا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا، کسی نے اس رپورٹ کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں، حالاں کہ یہ رپورٹ پاکستان میں غربت اور تعلیم کی کمی کی دل دہلا دینے والی صورت حال سامنے لائی ہے۔ اگر ہماری حکومت کی ترجیحات میں غربت کا خاتمہ، تعلیم کا فروغ، صحت کے لیے اقدامات اور مرتے ہوئے بچوں کی جان بچانے جیسے امور شامل نہیں تو صحت سے متعلق نجی تنظیموں، اداروں، بڑے بڑے اسپتالوں اور سماجی حلقوں کو کیا ہوا ہے جو وہ حالات کو بدلنے کے لیے آگے نہیں آتے۔

کتنا بڑا المیہ ہے، کیسا دل کو چیر کر رکھ دینے والا سانحہ ہے کہ غربت کے باعث لوگ اپنے بچوں کو تعلیم، آرام دہ زندگی اور تفریح تو کجا زندگی بھی

نہیں دے پا رہے، مگر ہمارے یہاں اس سانحے پر بات بھی نہیں کی جا رہی ہے، جو اس سانحے سے بھی بڑا المیہ ہے۔

## یہ ہوتی ہے جمہوریت

استنبول میں سیاسی دھماکا ہوا اور برسر اقتدار جماعت شدید متاثر ہوئی۔ سیاسی گہما گہمی ایک بار پھر عروج پر پہنچ گئی۔ ہوا یوں کہ ہمارے برادر مسلم ملک ترکی کی حکم راں جماعت کے آٹھ ہزار اراکین نے اجتماعی استعفٰی دے دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان اراکین کو اپنی جماعت کے حکم رانوں کی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر اعتراض تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں کارکنوں اور عہدے داروں نے اپنے استعفے ایسے وقت میں دیے جب ان کی جماعت نہ صرف پورے استحکام کے ساتھ ملک میں برسراقتدار ہے، بل کہ اس نے ترکی میں ہونے والے حالیہ بلدیاتی انتخابات میں بھی زبردست کام یابی حاصل کی ہے۔

ہونے والا واقعہ رونما ہوچکا۔ میں محو حیرت اس بات پر ہوں کہ حکومت میں ہوتے ہوئے بھی اراکین نے اصولوں پر سودا نہ کیا اور اصولی موقف اختیار کرتے ہوئے پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ بطور پاکستانی میرے لیے یہ ایک اچھنبے کی بات ہے، کیوں کہ میں نے جو ماحول پاکستان کی سیاست کا دیکھا ہے، اس میں ایسے واقعات کے رونما ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری سیاست میں اختلاف کبھی اصولوں کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ یہاں ذاتی مفادات، مالی

فائدے اور باہمی سود و زیاں کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اصول مرتب کیے جاتے ہیں۔ اب تو اس مدعے پر یہ بحث بھی نہیں ہوتی کہ ہماری سیاسی جماعتیں، جو ہر وقت جمہوریت کا راگ الاپتی ہیں، جمہوریت کی چیمپیئن بنتی اور اس کے لیے قربانی کے دعوے کرتی ہیں، در حقیقت ان کے اندر اوپر سے نیچے تک جمہوریت کہیں نظر نہیں آتی۔

استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر خاص طور پر ہر بڑی جماعت کسی نہ کسی فرد یا خاندان کی ذاتی ملکیت نظر آتی ہے، جس میں موروثی نظام پوری ڈھٹائی کے ساتھ رائج ہے، جہاں یہ امر طے شدہ ہے کہ جماعت کی سربراہی فقط جماعت کے قائد کے خاندان کا کوئی فرد ہی کرے گا، چاہے پارٹی کا کوئی دوسرا راہ نما یا رکن کتنا ہی جاں نثار، قابل اور مخلص کیوں نہ ہو۔ باپ کے بعد بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی اور بہو یا داماد ہے جماعت کی قیادت کے اہل قرار پاتے ہیں۔

یعنی ہمارے دیس میں سیاسی قیادت بھی کسی جائیداد کی طرح بہ طور ورثہ دی جاتی ہے، جس کا معیار خونی یا قریب ترین رشتہ قرار پاتا ہے، صلاحیت نہیں۔ دیکھیے اور غور کیجیے! سیاسی جماعتوں کے جو نام نہاد پارٹی الیکشن کیے جاتے ہیں ان کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ وہاں پارٹی قیادت کے من پسند اور خوشامدی

اور راہ نماؤں کے باپ، بیٹا، بہن، بھائی ہی ''کام یاب'' قرار پاتے ہیں۔ اسی طرح جب عام انتخابات یا ضمنی الیکشن کے موقع پر ٹکٹوں کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو قربانیوں، صلاحیت اور دیرینہ وابستگی پر راہ نماؤں کے رشتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یعنی کہ ''گدی فکس'' کے اصول پر پارٹی قائم ہے۔

پارٹی کی بنیاد جس منشور پر رکھی گئی ہے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ چاہے پارٹی اس سے انحراف کر جائے یا قیادت الٹی قلابازی کھالے، پارٹی کے عہدے داروں اور کارکنوں میں سے کوئی اف تک نہیں کرتا۔ بہ طور حکم راں جماعت کوئی سیاسی پارٹی اپنے منشور کے خلاف یا عوام دشمنی پر مبنی پالیسی اختیار کرلے، پارٹی کے اندر سے کئی آواز اس کی مخالفت میں نہیں اٹھتی، بل کہ اس کے چھوٹوں بڑوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی اہلیت کے مطابق پارٹی قیادت کے طرز عمل کا دفاع پورے جوش وخروش کے ساتھ کرتا ہے، کیوں کہ سب مزے میں ہیں، اجارہ داری قائم ہے، مقام مستقل ہے، اجی توبہ کیجیے کون پارٹی کو چھوڑے گا، جیسی بھی ہے آخر ''ہماری'' پارٹی ہے جیسا بھی ہے آخر ہمارا'' لیڈر ہے۔ اصول ضابطے کون دیکھتا ہے بس گدی اہم ہے۔''

یہاں معاملہ صرف مفاد پرستی کا نہیں۔ اصولوں اور نظریات کے بجائے افراد اور گروہوں سے غیر مشروط وابستگی ہمارے لوگوں کی اجتماعی نفسیات بن گئی ہے۔ ہم پارٹی کی وفاداری کو ملک سے وفاداری کے مقابلے میں زیادہ اہم گردانتے ہیں۔

کبھی بادشاہ ہوتا تھا اور سارے درباری اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، انکار کر بھی کون سکتا تھا جو خوشامدی ہوتا اسے عہدہ اور انعام و اکرام سے نوازا جاتا اور جو بادشاہ کے فیصلے پر آواز بلند کرتا اس کا ٹھکانا زنداں ہوتا یا تلوار اس کی اٹھے سر کو تن سے جدا کردیتی۔ بس کچھ ایسا ہی ہے۔ بادشاہ گئے تو ہم نے غلامی کی صدیوں پرانی عادت کے تحت اپنے سر جاگیرداروں، سرداروں اور پھر لیڈروں کے سامنے جھکا دیے۔ بادشاہ اور جاگیردار کی غلامی تو عموماً حالات کے جبر کے تحت کی جاتی تھی، مگر لیڈروں کو خوشی خوشی غلامی کرنے والی رعایا اور ہر حکم مان لینے کو تیار مزارع میسر ہیں۔

یہ سیاسی پارٹی سے وفاداری کم اور پیری مریدی کے تماشے زیادہ لگتے ہیں۔ سیاسی لیڈر پیر اور سارے کارکن اس کے مرید، آواز احتجاج کون بلند کرے۔ البتہ کچھ موقع آتے ہیں جب یکایک کسی سیاسی جماعت سے وابستہ افراد کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور وہ اختلاف سے بھی آگے بڑھ کر بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ جیسے پارلیمنٹ میں تحریک عدم اعتماد کی آمد ہو یا صدارتی انتخابات مرحلہ، ایسے مواقع پر منتخب ایوانوں میں بیٹھے مریدوں کی منڈی لگ جاتی ہے اور اس منڈی میں وفاداریاں بکتی ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ پارٹی پر برا وقت آتے ہی دور اقتدار میں ساتھ رہنے

والے جو وفا کی علامت بنے رہتے ہیں، جھٹ سے دوسری جماعت کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن حکومت میں ہوتے ہوئے جب وزارتیں، عہدے، مراعات دان ہوتے ہیں تو کوئی حکومت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، چاہے جو اصول مرتب کیے جائیں چاہے جیسی پالیسی تشکیل دی جائے، لیکن گدی اہم ہوتی ہے۔

اس کے برعکس جب ہم ترکی کے سیاسی کارکنوں کا شعور دیکھتے ہیں تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ وہاں جمہوریت کیوں مستحکم ہے، وہاں حکم راں ہمارے اہل اقتدار کے مقابلے میں زیادہ دیانت دار کیوں ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں سیاسی کارکن بھی شعور کی یہی سطح پالیں اور افراد کے بجائے نظریے اور جماعت سے وابستگی پر یقین رکھیں، تو ہماری سیاسی قائدین کے رویے بھی تبدیل ہو جائیں گے۔

# یہ سنگھار کے کارخانے

اب بنّو کالی ہو یا گوری شادی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بنّو کا بنّا چاہے جیسا ہو، اب حور کے پہلو میں لنگور والی کسی مثال کا وجود نہیں۔ حُسن کو نکھارنے کے کارخانے گلی گلی قائم ہیں۔ حسن کے کارخانوں کی بھٹی میں جس کسی کو بھی ڈالیے ایسا روپ نکھر کر سامنے آتا ہے کہ یقین ہی نہیں آتا یہ وہی چہرہ تھا۔

بھٹی میں اپنا آپ خوب صورت بنانے کی خاطر خود کو جھونک دینے کی شرط فقط صنف نازک ہونا ہی نہیں، مرد وزن میں فرق کے ہم نہیں قائل،.برابری کا زمانہ ہے۔ سو سب ہی خود پر حسن کے کارخانوں کا ہنر آزماتے ہیں۔

گنجا پن دور کیجیے

جھانوے جیسے بالوں کو نرم و ملائم اور چمک دار بنایئے

چہرے کے بالوں کو ختم کروایئے

موٹاپے کو کہیے بائے بائے

سلون کے ساتھ جم کی سہولت بھی موجود ہے

کیا ہوا اگر ماں باپ کی طرف سے سانولی رنگت آپ کو ورثے میں ملی ہے۔

اب گوری رنگت خواب نہیں۔

فقط جیب میں پیسہ ہونا ضروری ہے۔

پیسہ پھینک تماشا دیکھ" شاید یہ مثال موجودہ دور میں سب سے زیادہ استعمال کی جاتی" ہے۔

اب یہ مت کہیے گا کہ ہاں ہاں ایسا ہے، کیوں کہ ہمیں علم ہے کہ ایسا ہی ہے۔

بیوٹی پارلر ہوں یا مین اینڈ وومن سیلونز، یہ "دکان" شہر کے ہر گلی محلے میں ایک نہ ایک تو آپ کو نظر آ ہی جائے گی۔

خوب صورت نظر آنا ہر ایک، خاص طور پر خواتین، کا حق ہے اور اس کے لیے جتن کرنا بھی معیوب نہیں۔ لیکن اپنے آپ کو کسی بھی "نیم حکیم خطرہ جان" کے حوالے کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ایک شخص آپ کے چہرے پر لگانے والی کریم کے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے کا بھی اہل نہیں، وہ بھلا ان اجزائے ترکیبی سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے جو اس کریم کی بناوٹ میں استعمال کیے گئے ہیں؟

میڈیا نے خوب صورت چہرے دکھائے اور انسان کے اچھے ہونے نہ ہونے کا معیار اس کا ظاہر ٹھہرا۔ خوب سے خوب تر نظر آنے کی خواہش میں ہوا کچھ یوں کہ گھر کے بجٹ میں سے جو پیسے ضروریات پوری کرنے یا کتاب خریدنے سمیت کسی مثبت سرگرمی

کے لیے مختص ہوتے تھے، وہ نت نئی کریموں، شیمپوز اور پرفیومز کی مد میں خرچ ہونے لگے۔

مزید کچھ پیسوں کی گنجائش نکلی تو وہ سنگھار کے کارخانوں کے سپرد کردیے گئے۔ سو اس کاروبار سے وابستہ افراد کی چاندی ہوگئی۔

اس کاروبار نے جہاں ترقی کی وہیں نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ، ایک خبر کے مطابق، صرف کراچی میں 20 ہزار سے زائد بیوٹی پارلر قائم ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

حکومت کی جانب سے بیوٹی پارلر کھولنے کے لیے قواعد بنائے گئے ہیں نہ کوئی طریقۂ کار وضع کیا گیا ہے۔ اجازت اور لائسنس کا بھی کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی تربیت رکھنے والے افراد بھی یہ کاروبار بلا روک ٹوک کر رہے ہیں۔ کراچی میں قائم ان سنگھار کے کارخانوں میں ایک لاکھ سے زاید خواتین اور مرد کام کرتے ہیں، جن میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے، جب کہ صرف تین ہزار بیوٹی پارلر رجسٹرڈ ہیں اور صوبائی حکومت ان سے ٹیکسٹ بھی وصول کر رہی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ انسانی جلد جیسے حساس عضو کے لیے سرکاری سطح پر تین ماہ کا بیوٹیشن کورس کرایا جاتا ہے اور یہ کورس سندھ ٹیکنکل بورڈ کرواتا ہے۔ اس کورس کی مدت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری حکومت کی نظر میں فولادی مشینوں کے متعلق کورسز اور انسانی جلد کے متعلق کورس میں کوئی فرق نہیں۔

تین ماہ کا بیوٹیشن کورس کرنے کے بعد یہ افراد اپنا کاروبار شروع کردیتے ہیں یا کسی اور بیوٹی پارلر میں کام کرتے ہوئے انسانی جلد پر "تجربات" کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

سنگھار کے ان کارخانوں میں کام کرنے والے غیر تربیت یافتہ عملے اور غیر معیاری مصنوعات کے استعمال کے اثرات کا اندازہ تیزی سے بڑھتے ہوئے جلدی امراض سے لگایا جاسکتا ہے۔ جلدی امراض کے اسپتال میں روز تقریباً 20 ایسے مریض آتے ہیں جو ان بیوٹی پارلرز، سیلونز سے متاثر ہوئے ہوتے ہیں۔

خواتین کے چہرے پر بالوں کا بڑھ جانا اور غیر معیاری کریموں کے استعمال کی وجہ سے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی جلد کا جھلس جانا عام مسئلہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص بالخصوص خواتین جاذب نظر دکھائی دینا چاہتی ہیں، جو ان کا حق ہے اور اس کے لیے، خاص کر تقریبات میں شرکت کی خاطر یا اہم مواقع پر، بیوٹی پارلرز کا رخ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس شعبے سے خواتین کی بھاری تعداد سمیت لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے۔ عورتوں کے لیے یہ ایک ایسا ذریعہ معاش ہے جس کے ذریعے وہ گھر بیٹھے بھی اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ضروریات پوری کر سکتی ہیں، مگر اس معاملے کے اور بھی پہلو ہیں۔

ہمارے معاشرے میں کسی انسان کے اچھے اور برے ہونے کا پیمانہ اس کے پاس موجود دولت اور ظاہری خدوخال کو بنالیا گیا ہے۔ اس دوڑ میں خواتین بلاشبہہ حدود سے تجاوز کر گئی ہیں۔ بیٹی اگر معمولی شکل و صورت کی ہو تو بعض مائیں اسے جاذب نظر بنانے کے لیے مختلف طریقے اپنانے پر اکساتی ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ کیسے کیسے اچھے شریف گھرانوں کی خواتین بھی بیوٹی پارلر میں خود کو اور اپنی بیٹیوں کو بنا ہچکچاہٹ کے بیوٹیشنز کے سپرد کر دیتی ہیں۔ پارلرز میں اب اس بات کا رواج ہو چکا ہے کہ کسٹمرز آتے ہی وہ مختصر لباس زیب تن کریں گی جو کہ پارلر میں ان کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہ لباس ناقابل بیان حد تک غیر شائستہ ہوتا ہے جب کہ بعض پارلرز میں جگہ جگہ کیمرے بھی نصب ہوتے ہیں۔ حجاب لینے والی خواتین ہوں یا بے پردہ بی بیاں، پارلر میں جا کر یہ لباس پہننا ان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ایسے کتنے ہی کیسز سامنے آئے ہیں کہ

جن میں جسم کی ویکسنگ کے دوران خواتین کی ویڈیوز بنالی گئیں، جس سے یہ خواتین خود بھی آگاہ نہیں ہوتیں۔ بعد میں ان وڈیوز کو مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ ایسے کتنے ہی بیوٹی پارلرز اور سیلونز ہیں جو غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور جسم فروشی کے دھندے سے لے کر خواتین کی قابل اعتراض ویڈیوز بنانے اور اغوا جیسے گھناؤنے فعل تک کے مرتکب ہیں۔ حکومت سے تو کسی خیر کی توقع ہی نہیں لیکن ہماری خواتین کو آخر کیا ہوا ہے؟

اصراف اور اقدار کا نوحہ اپنی جگہ، مگر انسانی صحت ایسا معاملہ ہے جس کے تحفظ پر کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ بیوٹی پارلرز کے حوالے سے قواعد وضوابط اور قوانین بنائے اور ان کا موثر اطلاق کرے۔ حکومت کوئی اقدام کرتی ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ خوب صورت نظر آنے کی خواہش ہوس کا روپ کیوں دھار چکی ہے، جس کی نذر ہمارا پیسہ بھی ہو رہا ہے اور صحت بھی۔ بیوٹی پارلروں میں تراشے ہوئے میک اپ سے لتھڑے چہروں کی دن بہ دن بڑھتی تعداد کیا یہ نہیں بتاتی کہ محض ظاہر کے حسن کو معیار بنا کر ہم مجموعی طور پر بدصورت ہوتے جا رہے ہیں؟

## !...وہ کتنے با اثر ہیں

پاک بھارت کرکٹ میچ ہوا بنگلا دیش میں، مگر کسے جیتنا ہے اور کون ہارے گا؟ اس کا انکشاف کیا پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبے کی تنگ گلی میں رہنے والی ''بی بی شکورن'' نے۔ بی بی شکورن کرکٹ کی بے تاج ملکہ ہیں۔ جب کسی میچ پر نوجوانوں کو شرط لگانی ہو تو بی بی شکورن کے دروازے پر ''پرچی'' لینے والوں کی ایک لمبی قطار لگ جاتی ہے۔ یہی نہیں بی بی شکورن بگڑی سنوارنے میں بھی ماہر ہیں۔ محلے والوں کے گھر چاہے ایک وقت کا چولہا نہ جلے، لیکن بی بی شکورن کے تعویز کے لیے دو سو روپے دینے میں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

اب اس قصبے سے باہر آیئے، شہر میں قدم رکھیے، یہاں ایک بی بی شکورن نہیں بلکہ ان جیسی کتنی ہی بیبیاں بھی ملیں گی اور بابا بھی۔ جگہ جگہ بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں، سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں، رشتے کی بندش کا توڑ ہمارے پاس موجود ہے، بگڑا کام منٹوں میں بنایا جاتا ہے۔ کاروبار میں ترقی ہو یا نوکری کے مسائل ہر مسئلے کا حل ان کے پاس موجود ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ کہ دنیا کے مسائل حل کرنے والے خود اپنے مسائل کیوں حل نہیں کر سکتے؟

آج سے دس سال قبل میں جب ان ''باباؤں'' کے قصے سنتی تھی تو مسکراتی تھی۔ دل میں خیال آتا تھا کہ اب وقت بدل رہا ہے لوگ تعلیم یافتہ ہوتے جارہے ہیں، ان میں آگہی بڑھ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ کالے جادو اور عاملوں کے نام سے کھلنے والے جہالت کے یہ کارخانے بند ہوجائیں گے۔ لیکن میں غلط تھی۔ جہالت کے ان کارخانوں کا کاروبار تو اور وسیع ہوتا گیا۔

اور افسوس میں ڈوبی حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ جہالت کے اس دھندے کو شعور اور آگہی پھیلانے کے دعوے دار میڈیا کی بدولت بڑھاوا ملا اور مل رہا ہے۔ لائیو نشر ہونے والے مارننگ شوز اور دیگر پروگراموں میں جنوں کی حاضری، جادو اور سائے'' کے زیر اثر افراد کی کہانیاں اور انسانوں سے غیر انسانی آوازیں نکالنے والے'' منظر انتہائی متاثر کن ہوتے ہیں۔ یہ مناظر دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے تو مجھ جیسی ان سب باتوں پر یقین نہ رکھنے والی خاتون بھی ششدر رہ گئی کہ بظاہر عام نظر آنے والے شخص نے کس کمال سے ایک انسانی جسم کو ''جن کے قبضے'' سے آزاد کرالیا۔ یعنی پہلے تماشے چھپ کر کیے جاتے تھے، اب کروڑوں افراد گھر بیٹھے یہ سب دیکھتے اور متاثر ہوتے ہیں۔ چناں چہ توہمات پر یقین میں اضافے کے ساتھ جعلی عاملوں اور جعلی پیروں پر لوگوں کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اور اس کے اتنے بھیانک نتائج سامنے آئے ہیں کہ ہم سوچ نہیں سکتے۔

خاص طور پر حال ہی میں ہونے والے دو انتہائی افسوس ناک واقعات نے اس صورت حال کی سنگینی واضح کر دی۔

ان میں سے ایک دل لرزہ دینے والا سانحہ مری میں پیش آیا، جس میں دو معصوم بچے جان سے گئے، اور ان پھولوں کو مسل دینے والا کوئی اور نہیں ان کا اپنا سگا ماموں تھا۔ ماموں کا رشتہ کتنا پیارا ہے، جبھی تو بچے چاند کو چندا ماموں کہتے ہیں۔ وہ ننھے منے معصوم بچے بھی اسی رشتے پر اعتبار کے سہارے گئے تھے۔ نہ جانے انھیں سیر کرانے کے بہانے لے جایا گیا تھا کہ چیز دلانے کا لالچ دے کر، اور وہ خوشی خوشی اپنے "پیارے ماموں" کا ہاتھ تھامے چل دیے۔ یہ جانے بغیر کہ جن ہاتھوں کو وہ اتنے اعتماد سے اتنے پیار سے تھامے ہیں وہ کچھ ہی دیر میں ان کے لیے دست اجل بننے کو ہیں۔ خوشی سے دمکتی آنکھیں اس وقت شاید خوف سے زیادہ حیرت سے پھیل گئی ہوں گی جب ماموں نے اپنے ان پھول سے بھانجوں کے گلے کاٹے ہوں گے۔ ان میں سے دو بچے اپنے گلے پر چلنے والے تیز دھار آلے کی تاب نہ لاسکے اور جان سے گزر گئے۔ ہاں ایک کی زندگی بچ گئی۔ مگر وہ بچ جانے والی زندگی وہ ایک معصوم بچہ شائد عمر بھر اس خوفناک حادثہ کی قید سے اپنا وجود آزاد نا کرسکے۔

مری میں پیش آنے والا دل کے ٹکڑے کرتا یہ واقعہ خبر کی صورت آپ کی نظروں اور سماعتوں سے گزر چکا ہوگا۔ اس واقعے کا ایک الم ناک پہلو یہ ہے کہ ان ننھے منے بچوں کی جان لینے والے اس سفاک شخص نے یہ سب ایک جعلی عامل کے کہنے پر کیا۔

اور دوسرا المیہ ملتان کا ہے۔ ایک زندگی کے خاتمے اور ہمارے سماج میں پھیلی جہالت کا نوحہ سناتا المیہ۔ خبروں کے مطابق ملتان سے تعلق رکھنے والے نوجوان ذیشان سے ایک جعلی عامل نے کہا تھا کہ اس کے گھر میں خزانہ دفن ہے، جسے وہ ڈھونڈ نکالے۔ پھر کیا تھا، ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کی طرح محنت مشقت کے بغیر مالامال ہونے کی خواہش رکھنے والا یہ بدقسمت نوجوان جعلی عامل کی باتوں میں آکر مسرور ہوگیا اور اس نے خزانہ نکالنے کے لیے اپنے گھر میں کھدائی شروع کردی۔ خزانے کی تلاش میں اس نے سرنگ بنائی اور اس میں اترتا چلا گیا، خزانہ تو ہاتھ نہ آیا مگر اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ موت کی پاتال میں اتر گیا۔

یہ دونوں سانحے بتا رہے ہیں کہ جعلی عامل ہمارے معاشرے میں کتنے بااثر ہیں کہ انسانوں کو بھینٹ چڑھانے کی مکروہ رسم کب کی ختم ہوچکی، مگر یہ ظالم اسے آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں اور ان عاملوں کے کہنے پر ان کے جال میں پھنسے

ہوئے لوگ نہ صرف دوسروں کی جان لے لیتے ہیں، بل کہ اپنی جان بھی خطرے میں ڈالنے سے دریغ نہیں کرتے۔

منشیات فروشی اور جرم کے دیگر بہت سے دھندوں کی طرح جعلی عامل اپنا کاروبار چھپ چھپا کر نہیں چلا رہے، بل کہ اعلانیہ اپنی تشہیر کرتے ہیں۔ دھوکا دہی اور جعل سازی کا یہ مکروہ ترین اور سفاکانہ دھندا زور شور سے پورے ملک میں جاری ہے۔ جعلی عامل دیواروں کو ہی اپنی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنائے ہوئے باقاعدہ اشتہارات کی صورت میں بھی اپنے کالے جادو اور پُراسرار علوم کو ہر مسئلے کا حل ثابت کرنے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور پھر الیکٹرانک میڈیا پر نشر ہونے والے توہمات پر مبنی پروگراموں نے تو گویا انھیں سندِ تصدیق عطا کر دی ہے۔

حکومت کا کام اور ریاست کا بنیادی فریضہ اپنے شہریوں کی جان اور مال کا تحفظ ہے۔ دہشت گردوں، ڈاکوؤں اور راہ زنوں سے شہریوں کو محفوظ نہ رکھنے پانے میں تو ہماری حکومت ''مجبور'' ہے کہ وہ ہاتھ ہی نہیں آتے، اور پکڑے بھی جائیں تو تھانوں سے عدالتوں تک پھیلے پیچیدہ نظام کی وجہ سے چھوٹ جاتے ہیں، لیکن عوام کی جان و مال کے یہ دشمن، یہ لٹیرے، جو کھلے عام، اعلانیہ طور پر اور اشتہار دے کر اپنی وارداتیں کرنے میں مصروف ہیں، انھیں روکنے

اور اس صورت حال کا سدباب کرنے میں آخر کون سی مجبوری اور کیا رکاوٹ حائل ہے۔

کیا حکومت کی چشم پوشی یوں برقرار رہے گی اور الیکٹرانک میڈیا پر نشر ہونے والے توہمات میں اضافہ کرتے پروگرام یوں ہی جاری رہیں گے؟ اگر صورت حال یہی رہی تو پھر مری کے ان بچوں کی طرح زندگیاں چھینی جاتی رہیں گی، ملتان کے نوجوان کی طرح لوگ خود اپنی موت کی سرنگ میں اترتے رہیں گے اور عزتیں پامال ہوتی رہیں گی۔

## کیا عورت صرف مظلوم ہے؟

علم و دانش سے محبت رکھنے والا کون پاکستانی ہوگا جو پروفیسر شاہدہ قاضی کے نام سے واقف نہیں۔ ابلاغیات کی تدریس ان کی پہچان ہے، لیکن ان کی فکر اور علم اس شعبے تک محدود نہیں۔ ایک سچے دانش ور کی طرح وہ ان مسائل پر بھی نظر رکھتی ہیں جو بہ ظاہر چھوٹے اور غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ مسئلے بہت اہم ہوتے ہیں، جس کا اندازہ مجھے پروفیسر شاہدہ قاضی کی جانب سے سماجی رابطے کی مشہور اور سب سے زیادہ مقبول سائٹ فیس بک پر کی گئی ایک پوسٹ سے ہوا۔

پروفیسر شاہدہ قاضی نے ایک ٹی وی چینل کے ایک ڈرامے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اپنی پوسٹ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی جارہی ہے جو جوانی میں بیوہ ہوجاتی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو دو بچوں کی ماں ہے اور شوہر کے انتقال کے بعد اپنے ماں باپ کے گھر بچوں کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ پھر اس کی زندگی میں مسائل شروع ہوجاتے ہیں۔ ہر شخص اس کی زندگی، احساسات اور خوشیوں کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک انٹرپاس لڑکی ہے، ایک چھوٹی موٹی نوکری کرلیتی ہے لیکن دوسری شادی کی تلوار اس کے سر پر لٹکی رہتی ہے، جب کہ وہ اپنے بچوں کی خاطر دوسری شادی نہیں کرنا

چاہتی۔ یہ کہانی اور کردار عورتوں کے لیے ہمت شکن ہیں۔

لمحہ بھر کے لیے پروفیسر شاہدہ قاضی کی طرح میرے جسم میں بھی جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایک سوال میرے دل و دماغ میں گونجنے لگا۔ کیا عورت اتنی ہی مظلوم ہے۔ کیا آج کی عورت اتنی ہی بے اختیار ہے کہ اس کی زندگی کے ساتھ کوئی کچھ بھی کرتا رہے۔ وہ اپنے حق اور زندگی کے لیے کیا کچھ نہیں کرسکتی ہے، وہ بھی ایک شہری عورت جو دیہات کی ناخواندہ اور پسی ہوئی خواتین کے مقابلے میں کہیں زیادہ عقل و شعور رکھتی ہے۔

لیکن سیلف میڈ عورت کی حیثیت سے میں اس سوچ کو رد کرتی ہوں، عورت زندگی ہے، عورت شعور کا دوسرا نام ہے، پھرکیسے اسے کچلا جاسکتا ہے۔

یہ صرف ایک ٹی وی ڈرامے کا حال نہیں ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے 80 فی صد ڈرامے عورت کی تذلیل کی منظر کشی کر رہے ہیں۔

اس بات سے کون انکاری ہے کہ ٹی وی ڈرامے ہماری زندگیوں پر کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں لاشعوری طور پر وہ ہماری ذہن میں بیٹھ جاتا ہے اور جب اس طرح کے حالات ہمارے سامنے آتے ہیں جنہیں اپنے

لاشعور میں سجائے گئے اسٹیج پر ہم پہلے ہی بٹھا چکے ہیں، تو ہم ویسا ہی ایکشن دیتے ہیں۔ یہ انسانی نفسیات ہے۔

پاکستان میں ڈراما انڈسٹری نے تیزی سے ترقی کی ہے۔ پاکستانی ڈرامے نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں دیکھے جاتے ہیں لیکن آج کل جو کلچر ہمارے ڈراموں میں دکھایا جارہا ہے کیا وہ ہمارا کلچر ہے؟ کیا وہ ہماری روایات ہیں، ہر گز نہیں۔ یہ ایک گھناؤنا مذاق ہے جو ہم سے اور ہماری آنے والی نسلوں سے کیا جارہا ہے۔ میں آج اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کسی ٹی وی ڈرامے کو دیکھنے کا تصور نہیں کرتی کیوں کہ اکثر ڈرامے اس قابل ہی نہیں کہ انھیں فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا جاسکے۔

میڈیا پر جو کچھ دکھایا جائے گا وہ دیکھنے والوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہوگا، یوں ہم معاشرے کی سوچ کو بھی اسی طرح سے بدل سکیں گے جس طرح ہم بدلنا چاہتے ہیں۔

لیکن ہمارے میڈیا نے عمومی طور پر ہمارے معاشرے کی سوچ کو مثبت انداز میں بدلنے کے بجائے منفی سوچوں کو پروان چڑھایا ہے۔ آپ بتایئے کیا وہ زبان ہم اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں وہی ہے جو زبان آج کل ٹی وی ڈرامے دکھارہے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ یہ تو زبان کے وہ چٹخارے ہیں جنہیں ہمارے نوجوان

کچھ وقت کے لیے اپناتے ہیں اور پھر یہ ان کی اپنی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔
فلم ہو یا ڈراما تفریح کے یہ ذرائع اپنے اندر دل چسپی کے پہلو رکھنے کی وجہ سے ناظرین کی بھرپور توجہ حاصل کرتے ہیں۔ خاص کر ٹی وی ڈرامے کی رسائی گھر گھر تک ہے، اس لیے اس کے اثرات بھی گہرے، دور رس اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں کتابیں پڑھنے اور ان کے ذریعے شعور کی سطح بلند کرنے کا کلچر ناپید ہے۔ ہماری عورتوں اکثریت کی تفریح ٹی وی ڈراموں اور زیادہ سے زیادہ خواتین کے ڈائجسٹوں تک محدود ہے، جن میں چھپنے والا مواد اپنی قارئین کو حقائق سے دور رومان اور خوابوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ ڈائجسٹ پڑھنے کا رجحان تو خیر اب بہت کم ہوگیا ہے مگر کون سا گھر ہے جہاں ٹی وی نہ دیکھا جاتا ہو اور جس کی خواتین اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ ڈرامے دیکھنے میں نہ صرف کرتی ہوں۔ بات ڈراما دیکھ کر "ٹائم پاس" کر لینے ہی پر ختم نہیں ہوتی، بل کہ اس کے کرداروں کے افعال اور اعمال پر بڑی سنجیدگی سے تنقید اور تبصرے ہوتے ہیں، کرداروں کے دکھوں کا غم منایا جاتا ہے اور ان کی خوشیوں پر اظہارِ مسرت کیا جاتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹی وی ڈراما کس طرح اپنے دیکھنے والوں خاص طور پر ناظر خواتین پر اثرات مرتب کرتا ہے اور ہمارے یہاں یہ ڈرامے کس قدر محویت کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔
کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ٹی ڈراما ایک نہایت طاقت ور ذریعہ ہے، جس میں دکھائے

جانے والے حالات، واقعات کرداروں کے عمل اور ردعمل ناظرین کے ذہنوں اور سوچ کو متاثر کرتے ہیں۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں ناخواندگی، تعلیم کی کمی اور ذہنی پسماندگی عام ہے، وہاں ڈرامے ذہنوں کو کس طرح متاثر کرتے ہیں اور کر رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ ٹی وی ڈرامے کے اس طاقت ور اور موثر ذریعے کو لوگوں خصوصاً خواتین میں شعور اجاگر کرنے، ان کی ہمت بڑھانے اور انھیں حوصلہ دینے کے لیے استعمال کیا جائے، کیوں کہ افراد کی تربیت عورت ہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس کے برعکس ڈراموں میں عورتوں کو محض مظلومیت کی نشانی بنا کر پیش کرنا نہ حقائق کے مطابق ہے اور نہ ہمارے معاشرے کے لیے کسی طور بھی سود مند۔

# کم عمری کی شادی

گھر میں مہکتی پھولوں کی مہک اسے بہت خوش گوار لگ رہی تھی۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو اسے اپنے طرف کھینچتی۔ وہ ابٹن سے بھرے پیالے کو دوسروں سے نظریں چرا کر چپکے سے اپنے ہاتھ میں اٹھالیتی، سونگھتی اور پھر رکھ دیتی۔ اب وہ گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو اس نے اپنی گڑیا کی شادی کی تھی، لیکن اسے اپنی گڑیا سے پیار بہت تھا۔ اس لیے اس نے گڑیا کو رخصت نہ کیا۔ اپنے پاس ہی رکھا اور اپنی دوست کے گُڈے کو بھی اس کے ساتھ واپس بھیج دیا، یہ کہہ کر کہ تمہارا گڈا مجھے پسند نہیں آیا۔ گڈا پسند نہ آنا تو ایک بہانہ تھا، حقیقت میں وہ اپنی پیاری گڑیا کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔

آج اس کے چھوٹے بھائی نے اسے بتایا کہ کل تیری شادی ہے۔ اسے یہ پتا تھا کہ شادی میں کھانا ہوتا ہے۔ اسے یہ پتا تھا کہ دلہن شادی میں لال کپڑے پہنتی ہے۔ اسے یہ پتا تھا کہ ہر دلہن کا ایک دولہا ہوتا ہے۔ ہاں دولہا..... دولہا بھی تو اس کے ماموں کا بیٹا تھا، جو اس سے دو سال بڑا تھا۔ اس کی اماں نے کہا تھا کہ ماموں کے گھر گڑیا کو مت لے کر جانا۔ شادی کے بعد اسے اپنی گڑیا کو چھوڑنا پڑے گی۔ اسے اس بات کا بہت دکھ تھا۔ دوسرا دن شادی کا تھا۔ شادی کا دن آیا اور یوں ایک گیارہ سال کی دلہن کو تیرہ سال کے دولہا

کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔
ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بتیس 32 فی صد شادیاں اٹھارہ سال سے کم عمر ہی میں ہو جاتی ہیں۔ قصبوں اور دیہات سے تعلق رکھنے والے اٹھارہ فیصد مرد جب کہ اٹھاون فیصد خواتین 20 سال کی عمر سے پہلے ہی شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔
دوسری طرف اگر شہری علاقوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ 21 فیصد خواتین اور 5 فیصد مرد بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔
ان اعداد و شمار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کم عمری کی شادی کرنے والوں میں خواتین کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔
آخر بلوغت کی عمر ہے کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جہاں ہم خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں اس مسئلے کو یا تو بری طرح سے نظر انداز کیا جا رہا ہے یا ہم اس پر بات کرنا نہیں چاہتے۔

یو این او کنوینشن آف ہیومن رائٹس کے مطابق ہر وہ شخص جو اٹھارہ سال سے کم ہے، کا شمار بچوں میں ہوگا یا وہ بالغ تصور نہیں کیا جائے گا، جب کہ دنیا کی بعض دوسری تنظیمیں یہ منوانے کے لیے کے لیے سرگرم ہیں کہ نوجوانی یا بلوغت کی عمر اکیس سال تصور کی جائے۔ سی ای ڈی اے ڈبلیو CEDAW ان دنوں اس بات پر زور دے رہی ہے کہ شادی کے لیے لڑکا لڑکی دونوں کی عمر 21 سال ہونی چاہیے۔

دنیا کے اصول ضابطے اور قوانین سے قطع نظر جب میں زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لاتی ہوں تو سوال کے جواب ملتے چلے جاتے ہیں۔ کیا ایک لڑکی یا لڑکا جو اٹھارہ سال سے کم عمر کے ہیں، وہ ذہنی طور پر اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے اور اپنے شریک حیات کے معاملات زندگی کو سنبھال سکیں۔ ان میں اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ وہ آج کی دور میں رہتے ہوئے اپنا اور اپنے خاندان کا خیال رکھ سکیں۔ گھریلو امور نمٹا سکیں اور معاشی ذمے داریاں ادا کر سکیں، وہ اپنے بچوں کی تربیت سے لے کر ان کے مالی مسائل تک تمام معاملات کو سلجھا سکیں، ہرگز نہیں۔

میری نظروں کے سامنے کراچی جیسے شہر میں ایک مقامی اسپتال میں ایک 14 سالہ بچی ماں بننے کے عمل کے دوران لقمہ اجل بن گئی اور ایک ننھی سی جان کو اس دنیا میں بے سہارا چھوڑ گئی۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے جب میں اس معصوم

کا سوچتی ہوں۔ آخر اس کا قصور کیا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ اس عمر میں ماں بننے کی اہل نہیں تھی۔ اس کی کم عمری کے باعث اس کا انتقال ہوا۔ آخر اس لڑکی کی موت اور اس جیسی دیگر اموات کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم، آپ یا یہ معاشرہ؟

ہم کتنی آسانی سے اپنی اولادوں کی شادی بنا سوچے سمجھے کم عمری میں کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں بہت سے علاقوں میں کم عمری میں شادی کا باقاعدہ رواج ہے۔

کچھ ماں باپ اپنی مرضی سے اپنے بچوں کی شادی کم عمری میں کر دیتے ہیں اور کچھ پنچایت اور جرگے کے فیصلوں کے آگے مجبور ہو جاتے ہیں۔ سوارہ، ونی، وٹہ سٹہ اور ان جیسی دیگر رسمیں اور روایات اس کی بھیانک مثالیں ہیں۔ ایک بچی کا جسمانی طور پر شادی کے قابل نہ ہونا ایک سچ.... دوسرا کڑوا سچ یہ بھی ہے کہ ایک بچی جو کم عمری میں اس رشتے کو نبھانے کے لیے مجبور ہے وہ تعلیم سے دور ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے معاشرے کو ایک ان پڑھ ماں ملتی ہے، جو اپنے بچوں کی صحیح تربیت کرنے کی بھی اہل نہیں ہوتی۔

ذرا سوچیے! ہم کیا دے رہے ہیں اپنے معاشرے کو۔ ایک طرف ہم شخصی آزادی کو سلب کر رہے ہیں اور دوسری طرف معاشرے کو جہالت کا تحفہ دے رہے ہیں۔

ان حالات میں یہ امر خوش آئند ہے کہ سندھ اسمبلی نے ایک بل کے ذریعے صوبے میں اٹھارہ سال سے کم عمر میں شادی کرنے پر پابندی عاید کردی ہے۔ اتفاق رائے سے منظور کیے جانے والے اس قانون کی رو سے اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو تین سال قید بامشقت کی سزا دی جائے گی۔ چلیے ہمارے منتخب نمایندوں کو معاشرے کا ایک اہم مسئلہ حل کرنے کا خیال تو آیا۔ اب اس قانون پر کہاں تک عمل ہوتا ہے، یہ بعد کی بات ہے۔

کم عمری میں کی جانے والی شادی ایک ظلم ہے۔ ایک مرد پر شادی کرنے کے بعد یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اس قابل ہو کہ اپنی شریک حیات کو تحفظ فراہم کرسکے۔ اس کی عزت کا ضامن ہو اور اس کی شخصی آزادی کو مجروح نہ ہونے دے۔ کیا ایک مرد جو اٹھارہ سال سے کم عمر ہے وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے یہ بنیادی حقوق مہیا کرسکے یا وہ شخص جو ونی اور سوارہ جیسی بدلے پر مبنی فرسودہ رسومات کے تحت لڑکی کو شادی کرکے اپنے ساتھ لے جاتا ہے، وہ کبھی اسے اپنی عزت بنا کر اس کے حقوق کی حفاظت کرسکتا ہے۔ ان رسومات کی بھینٹ چڑھنے والی بچیاں فقط بدلا ہوتی ہیں انہیں عزت کا مقام کبھی نہیں دیا جاتا۔

بچپن بے فکری اور معصومیت کا نام ہے، یہ تعلیم حاصل کرنے کی عمر ہے۔ بچیوں اور بچوں کے ہاتھ سے گڑیا، کھلونے اور کتابیں چھین کر ان کے نازک کندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ ڈال دینا ظلم نہیں تو اور کیا کہلائے گا؟

## میرا کراچی

لندن میں کاروائی کا نتیجہ، کراچی میں مختلف گاڑیاں نظر آتش کر دیں گئی۔اس میں تین رکشہ بھی شامل تھے۔رکشہ والا دیر تک اپنے رکشہ کو جلتے دیکھتا رہا۔ہڑتال یا احتجاج کسی کا بھی ہو، مشتعل عوام کا پہلا نشانہ بنتی ہیں... پبلک ٹرانسپورٹ، گاڑیاں اور دوسری املاک۔ اور جلانے والے کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ انھوں نے محض کوئی بس، ویگن یا دیگر املاک کو ہی نہیں، جلنے والی املاک کے توسط سے پلنے والے پورے خاندان کو زندگی بھر سسکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

زیادہ تر ڈرائیور حضرات یہ ٹرانسپورٹ قسطوں پر حاصل کرتے ہیں اور روز کی ہونے والی کمائی سے وہ ایک خطیر رقم اس کی قسط ادا کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ شرپسند عناصر حکومت سے ناراضگی اپنے ذاتی غصے کو بجھانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ کو آگ تو لگا دیتے ہیں لیکن وہ اس سے واقف ہی نہیں ہوتے کہ ان کا یہ فعل کسی غریب انسان کی زندگی پہ کیا قیامت لا سکتا ہے۔اس کے گھر کی خوشیاں لمحہ بھر میں آگ کی زد میں آگئی اور سب ختم ہوگیا۔ اس کے بچوں کا مستقبل اب اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔ کتنا بڑا المیہ ہے، کیسا دل کو چیر کر

رکھ دینے والا سانحہ ہے کہ غربت کے باعث لوگ اپنے بچوں کو تعلیم، آرام دہ زندگی اور تفریح تو کجا زندگی بھی نہیں دے پا رہے۔ مگر ہمارے یہاں اس سانحے پر بات بھی نہیں کی جا رہی، جو اس سانحے سے بھی بڑا المیہ ہے۔ جب کہ حکومت کی طرف سے جلنے والی گاڑیوں کا معاوضہ دینے کی کوئی خاطر خواہ پالیسی سامنے نہیں آ سکی۔ ہمارے کرتا دھرتا ادھورے پاکستانی صحیح لیکن ہم عوام ان کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ شہر برسوں سے خون ریزی تباہی اور بربادی کے مناظر دیکھ رہا ہے۔ زبان کے نام پر ہونے والے فسادات کتنے ہی گھر اجاڑ چکے ہیں۔ رہی سہی قصر آئے دن ہونے والی ہڑتالوں نے پوری کر دی۔ احتجاج کرنا ہر کسی کا حق ٹھرا۔ لیکن اپنے بھائیوں کی املاک کو نقصان پہچانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کراچی کے حالات کسی ایسے ملک کے جیسے ہی ہیں جہاں جنگ ہو رہی ہو۔ قتل و غارت گری کے واقعات کی سنگینی وحشت اور زندگی کے مظاہرے اور اس میں استعمال ہونے والا اسلحہ اس تجزیئے کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ یہ میرا شہر جہاں کا شکوف ہی ڈر نہیں بانٹتی شہری اب اپنی املاک کے ختم ہو جانے کے ڈر کو ساتھ لیئے نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ اگر ریاستی ادارے عوام کے جان و مال کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتے تو کم از کم متاثرین کی اشک شوئی اور ان کے مالی نقصان کے ازالے سے گریز اور تاخیر نا کریں۔

پاکستان بھر میں ذرائع نقل و حرکت کے لیے لاکھوں کی تعداد میں پبلک

ٹرانسپورٹ سڑکوں پر دوڑ رہی ہے۔ اس پبلک ٹرانسپورٹ کی وجہ سے لاکھوں افراد اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ شہر کی سڑکوں پر رواں دواں پبلک ٹرانسپورٹ میں کئی بسیں اور ویگنیں بہت قیمتی اور مہنگی ہوتی ہیں۔ آئے دن کی ہڑتالوں میں گاڑیوں کو نذر آتش کرنے کی خبریں اب اتنی عام ہو چکی ہیں کہ انھیں سن کر اب تو اس پر توجہ بھی نہیں جاتی۔ شہر بھر میں تقریباً 15 ہزار سے زائد پبلک ٹرانسپورٹ چلتی ہے۔ اور اس ٹرانسپورٹ سے ہمارے مزدور طبقہ کا روزگار وابستہ ہے۔

اب تک 500 سے زائد گاڑیاں جلائی گئی ہیں جب کہ حکومت کی جانب سے صرف 100 کے قریب گاڑیوں کا معاوضہ دیا گیا ہے وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہے۔ اس سے قبل 2007 میں پرویز مشرف دور حکومت میں ٹرانسپورٹر کو معاوضہ دیا گیا تھا اور فی کس دو لاکھ روپے ایک گاڑی کا معاوضہ دیا گیا۔

ایسے میں حکومت کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ ٹرانسپورٹروں کو تحفظ فراہم کرے۔ کتنے ہی ایسے ڈرائیور موجود ہیں جو قسطوں پر ویگن لے کر چلاتے تھے اور ان کی ویگن شرپسندوں کے قہر کا نشانہ بن گئی۔ اگر کوئی بدنصیب کسی یونین کا رکن نہیں تو جلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آخر ان واقعات کا ذمے دار کون ہے؟

بنیادی طور پر حکومت وقت کی ذمے داری ہے کہ وہ متاثرہ ڈرائیورز کو معاوضہ دیں۔
جس طرح کے حادثات جنم لے رہے ہیں اس میں غریب عوام کہاں جائے۔ان کی خوشیوں کا ضامن آج کون بنے گا۔

کراچی کے حالات سے آج ہر شخص متاثر ہو رہا ہے۔ حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی قانون سازی کی جائے کہ جس میں ذاتی املاک کو نقصان پہنچنے کی مد میں جو اخراجات ہیں ان کی ذمے داری حکومت اٹھائے۔ حکومت معاوضوں کا اعلان ضرور کرتی ہے لیکن اکثریت اس سے محروم ہے۔ حکومت اپنے کاموں کے لیے ٹرانسپورٹرز کی جن گاڑیوں کو روکتی ہے ان کو بھی معاوضہ نہیں دیا جاتا جو کہ بہرحال غریب ڈرائیورز کے لیے پریشانی کا باعث ہے، اس سلسلے میں جلد ہی قانون سازی کرنی ہوگی۔ ورنہ ہمارے مظلوم عوام میں اشتعال بڑھتا رہے گا۔

بیروزگاری ذہنی مسائل کو جنم دے رہی جو کہ بہرحال ایک قومی مسئلہ ہے۔

امن و امان کی دن بدن خراب ہوتی صورتحال سے ہر شخص متاثر ہو رہا ہے، فوری طور پر حکمت عملی اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ کتنے ہی لوگ ہمت ہار کر ذہنی مریض بنتے جائیں گے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

# پاک لباس اور کیچڑ

رہنما قوم کے لیے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ ان کے رویے عوام کے لیے مثال بنتے ہیں، مگر ہمارے ہاں رہنماؤں کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک دوسرے پر ذاتی حملے، مخالفین کے لیے غلیظ الفاظ کا استعمال، پگڑی اچھالنا ہماری سیاست میں ''حکمت عملی'' کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کسی سیاست داں کے منہ سے اس کے مخالف کی کسی خصوصیت کی تعریف نہیں سنیں گے (البتہ مرحومین کو استثنیٰ حاصل ہے کہ ہمارا معاشرہ مرجانے والوں کی فوری بُرائی برداشت نہیں کرتا) سوال یہ ہے کہ کیا سیاست داں اپنے مخالف میں کوئی خوبی نہیں پاتے؟ کیا کوئی حکومت ایک بھی ایسا کام نہیں کرتی کہ حزب مخالف کے لوگ جس کی ستائش کرسکیں؟ ایسا نہیں، بس بات اتنی ہے کہ ہم مخالف یا تعلق کی ایک خاص شکل بدل جانے پر فریق ثانی کی تعریف یا اس کی کسی خوبی کے اعتراف کو اپنی کم زوری اور ذلت تصور کرتے ہیں۔

سماجی تعلقات کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ آج باہمی اتفاق کا رشتہ کل گہرے اختلاف کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔ کاروباری تعلق ٹوٹ کر شراکت کاروں کو تجارت کی دنیا میں حریف بناسکتا ہے۔ نظریہ اور نقطہ نظر کا بدل جانا تعلق

کا چہرہ کچھ کا کچھ کر سکتا ہے۔ گھریلو ناچاقی میاں بیوی کو ایک خاندان کی اکائی سے نکال کر دو الگ الگ گھرانوں کا فرد بنا سکتی ہے۔ تعلق کی نوعیت کا بدل جانا ہمارے ہاں دشمنی اور انتقام کی نفسیات کو جنم دیتا ہے۔ اس کا کم سے کم نتیجہ بھی نفرت اور الزام تراشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

تعلق میں دراڑ آنے کے باوجود جس سے ناتا ٹوٹا ہے اس کی برائیاں ہی نہ دیکھی جائیں خوبیوں کو بھی یاد رکھا اور ان کا کھل کے اعتراف کیا جائے۔

اختلاف اور علیحدگی کا منظر گھر کی چار دیواری میں ابھرے یا سیاست کی راہوں پر گام زن شریکِ سفر راستے الگ کرلیں، الزام اور دشنام کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ یہ کج روی ہمارے سماج میں اس قدر عام ہے کہ کوئی مثال دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی شادی شدہ جوڑے سے اس میں طلاق ہونے کے بعد فریقین سے الگ الگ ملیے، ایک دوسرے کے لیے نفرت کی زبان کے علاوہ آپ کو کچھ سننے کو نہیں ملے گا۔ اسی طرح سیاسی جماعتوں کے دو حصوں میں بٹنے یا کسی رہنما کے اپنی جماعت سے الگ ہونے کے بعد اس فاصلے کے آر پار کھڑے افراد ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے اور زبانوں سے ایک دوسرے پر انگارے برساتے نظر آئیں گے۔

یہ رویہ ہماری ذہنی پس ماندگی کی عکاسی کرتا ہے جو سماج کے ہر گوشے اور ملک

کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ رشتوں کے حوالے سے ہمارے رویے عجیب و غریب ہیں۔ جس پہ فدا ہوں اس کی ہر بُرائی سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں، اس کے گناہ بھی ثواب نظر آتے ہیں، اس پر تنقید کا ایک لفظ سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے، مذہب، اخلاق، اقدار کوئی چیز ہمیں اپنے ممدوح کی خامی تو کیا کسی سیاہ کاری کی حمایت سے بھی نہیں روکتی نہ اسے غلط کہنے کی اخلاقی جُرات دیتی ہے۔

خاص طور پر سیاست کی دنیا میں یہی چلن ہے۔ سیاسی جماعتوں کے بعض نعرے ہی سُن لیجیے اور ان پر غور بھی کیجیے، اندازہ ہوجائے گا کہ ہمارے سیاسی کارکن اور سیاست دانوں کے حامی کسی بھی نظریے اور قدر سے بے نیاز ہوکر کس طرح اپنے راہ نما سے غیر مشروط تعلق استوار کیے ہوئے ہیں۔ ایسا تعلق عشق کی داستانوں میں تو ملتا ہے مہذب معاشروں کی سیاست میں ناپید ہے۔ دوسری طرف اختلاف کی دراڑ پڑتے ہی جن پر جان فدا کردینے کی آرزو تھی، ان کی جان لینے کا جذبہ دل میں دہک اٹھتا ہے۔ قربت کے فاصلے میں بدل جانے کے بعد ہمارے نزدیک اس تعلق کی بس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، نفرت اور دشمنی۔ ہم اب تک نہیں جان پائے کہ باہمی احترام کا رشتہ ہر صورت قائم رہتا ہے، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی یہ رشتہ خود کو منواتا رہا ہے۔

## زبان کے ستائے ہوئے

عالمی بینک کی رپورٹ منظر عام پر آتی ہے کہ پاکستان میں تعلیم کا معیار خراب ہے۔ تیسری جماعت کے صرف اکتالیس فی صد بچے اردو کا جملہ پڑھ پاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ اساتذہ پڑھانے کے اہل نہیں ہیں۔ حد ہو گئی، یہ عالمی بینک، یہ یو این او اور غیر ملکی سرکاری نیم سرکاری ادارے نہ جانے کیوں اتنے پیسے خرچ کرکے اپنی تحقیقی ٹیموں کو تعلیم کے حوالے سے پاکستان میں اعداد و شمار اکٹھا کرنے بھیجتے ہیں۔ یہ بات تو حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے پاکستان کے کرتا دھرتا سیاست داں بھی جانتے ہیں اور پنساری کی دکان پر بیٹھا ایک عام آدمی بھی، بیورو کریٹ بھی اور پان والا بھی، اس میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دیہی علاقوں میں تعلیم کے حوالے سے صورت حال نہایت ابتر ہے۔ 59 فی صد بچے تیسری جماعت میں ہونے کے باوجود اردو کا ایک جملہ مکمل طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ پانچویں جماعت کے 50 فی صد اور آٹھویں جماعت کے 25 فی صد طالب علم اردو زبان میں مختصر کہانی پڑھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔

اردو.... یہ وہی اردو ہے جو ہماری قومی زبان ہے۔ آج ہمارے بچے اگر اردو سے

ٹھیک طرح سے واقف نہیں تو اس میں اچھنبے کی کوئی بات نہیں۔ فکر انگیز نکتہ تو یہ ہے کہ ہم اور ہماری آنے والی نسلیں کسی ایک زبان کی بھی نہیں۔ نہ مادری زبان، نہ قومی زبان اور نہ فرنگیوں کی زبان، ہم تو کسی ایک پر بھی عبور نہیں رکھتے۔ نہ ہم اردو میں اچھے ہیں اور نہ ہی انگریزی میں۔ ہم اردو کے سرکاری اداروں میں رائج نہ کرنے پر حکومت کو درست طور پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، مگر اس ضمن میں ہمارا اپنا کیا حال ہے؟ گھر کے دروازے پر لگی تختی سے ہمارے دعوت ناموں اور تعارفی کارڈ تک ہماری ہر پہچان انگریزی عبارت کے ذریعے ہوتی ہے۔ گفتگو میں عام سے الفاظ کے لیے بھی ہم انگریزی کا سہارا لیتے ہیں، صرف یہ جتانے کے لیے کہ ہمیں انگریزی پر کیسا عبور حاصل ہے۔ معاشرے کی اس صورت حال کا ذمہ دار بڑی حد تک ہمارا نظام تعلیم ہے۔

اسکول جایئے، کالج میں پڑھیے، یونی ورسٹیز میں جایئے، ذہانت اور اہلیت اسی کی مانی جائے گی جو انگریزی زبان جانتا ہو۔ ہم اردو کو روتے ہیں، ہمارا اصل مسئلہ تو انگریزی ہے۔ جسے انگریزی نہ آتی ہو وہ اپنے وقت کا، معاف کیجیے گا، اپنے پاکستان کا، بقراط ہی کیوں نہ ہو، اسے وہ منہ کی کھانی پڑی ہے کہ نہ پوچھیے۔

ہم میں سے لگ بھگ اسّی فی صد لوگ اس تجربے سے گزر چکے ہوں گے، باقی بیس فی

صد لوگ وہ ہیں جنھوں نے خوش قسمتی سے حقیقی معنوں میں انگریزی میڈیم اسکولوں سے تعلیم حاصل کی ہے۔

گلی گلی کھلنے والے انگریزی سکھانے کے ادارے آخر کس بات کا ثبوت ہیں؟

انگریزی زبان نہ جاننے کا احساسِ کمتری عملی زندگی میں قدم رکھنے کے ساتھ اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ نفاذِ اردو کی مہم کے ہم لاکھ گرویدہ ہوں، لیکن انگریزی سیکھنے، انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کو ہم اردو زبان میں مہارت رکھنے والے سے لاکھ درجہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حقائق سامنے رکھتے ہوئے جائزہ لیا جائے تو اردو زبان ہمارا ساتھ فقط بارہویں جماعت تک دے پاتی ہے، جب کہ گریجویشن کی سطح پر جب ہمیں تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے تو صرف پچاس فی صد کتابیں جو کہ اردو میں ہوتی ہیں ہماری علمی ضروریات پوری کرپاتی ہیں۔

اب اور آگے آتے ہیں۔ ماسٹرز میں پہنچ کر جب تمام پرچے اپنی انفرادی تحقیق کی بنیاد پر دینے کا وقت آتا ہے، تو پتا چلتا ہے کہ اردو میں زیادہ سے زیادہ صرف بیس سے پچیس فی صد ایسی کتابیں موجود ہیں، جو ایک طالب علم، ایک پروفیشنل، کی ضرورت کو پورا کر سکتی ہیں۔ یعنی جسے انگریزی نہ آتی ہو وہ تو

گیا۔

ہمارے یہاں زیادہ تر علمی شعبوں کا اردو زبان میں تحقیقی مواد موجود نہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں، ورنہ ہماری نسل تو تباہ ہو ہی چکی ہے، آنے والی نسلیں بھی اسی عذاب کو جھیلتی رہیں گی۔

ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مضامین جن میں تحقیق کے دروازے کھلے ہیں، ایسے مضامین جب تک انگریزی زبان میں اپنے بچوں کو نہیں پڑھاتے ان کا مستقبل خطرے میں ہے۔ معاشرتی علوم، سائنس، حساب، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، ان سب مضامین کو پہلی جماعت سے لے کر گریجویشن تک انگریزی زبان میں نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ نجی اسکول اور سرکاری اسکولوں کا فرق تو سمجھ میں آتا ہے، مگر انگریزی میڈیم اور اردو میڈیم کی اصطلاحوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔

دوسری صورت میں حکومت اردو کو اس کا وہ مقام دے جس کی قومی زبان حق دار ہے۔ جب ہمارے ملک کے حکم راں دوسرے ممالک میں جا کر اپنی قومی زبان میں تقریر

کرتے ہوئے خود کو کم تر محسوس کرتے ہیں، تو قوم کا کیا قصور ہے۔ پوری قوم اپنے راہ نماؤں کی روش پر ہی چلے گی۔

اگر حکومت سنجیدگی سے قومی زبان کو اس کا حق اصل مقام دینا چاہتی ہے تو اردو کو پوری طرح رائج کرنا ہوگا۔ اردو زبان میں محققین کو سامنے لانا ہوگا، اس کے لیے بہتر راستہ یہی ہے کہ دنیا بھر کی قابل ذکر نصابی کتابوں، تحقیقی مجلّوں اور نصاب میں کام آنے والے مواد کو اردو زبان میں منتقل کیا جائے، تاکہ طالب علموں کی علمی پیاس بجھانے کا سامان ہو سکے، وہ آگے آ سکیں اور دنیا کے شانہ بہ شانہ، بنا احساس کمتری کے چل سکیں۔

یہ آج ہوگا ! تو کل اردو زبان میں محققین پیدا ہوں گے۔ ان کی تحقیق کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے ان زبانوں کے بولنے والے مجبور ہو جائیں گے اور ہماری ترقی کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

اگر حکومت ایسا نہیں کر سکتی تو اردو کو فقط رابطے کی زبان ہی کے مرتبے پر رہنے دے اور طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ کرتے ہوئے تمام نصاب تعلیم مکمل طور پر انگریزی میں منتقل کردے۔

کسی طرح تو ہمارے متوسط اور غریب طبقے کے نوجوانوں کو احساس کمتری سے نجات

دلائی جائے۔ طبقاتی نظام تعلیم کے باعث ان طبقات کے نوجوان خود اعتمادی سے ہی محروم رہتے ہیں تو ترقی اور کامیابی کے راستوں پر گامزن ہونا دور کی بات ہے۔ اس طبقے کے نوجوانوں کو اعتماد اور آگے بڑھنے کا راستہ دیے بغیر نہ کوئی تبدیلی آسکتی ہے نہ ملک ترقی کر سکتا ہے۔

## غزہ لہو لہو

غزہ کی چھوٹی سی پٹی اور اس پر بسنے والے چند لاکھ افراد ہر کچھ عرصہ بعد آگ اور خون میں نہا جاتے ہیں۔ انسانیت کی بھیانک تصویر پیش کرتے فلسطینیوں کے درندہ صفت دشمن اپنے نوکیلے ناخنوں سے لاشے تک نوچ لیتے ہیں۔ غزہ کی اس مظلوم عورت کی تصویر اب بھی میری آنکھ نم کر دیتی ہے۔ وہ پہلی بار ماں بننے والی تھی۔ اسرائیلی کی جانب سے ہونے والی بم باری نے اسے یوں گھائل کیا کہ زندگی پیدا کرنے سے پہلے ہی اسے موت کا تحفہ مل گیا۔ فوری طور پر امدادی کیمپ میں لا کر اس کا آپریشن اس آس میں کیا گیا کہ شاید جسم میں پلتی ننھی جان کو بچا لیا جائے، لیکن صہیونیت کی ڈائن مادر شکم میں سانس لیتے بچوں کو بھی چبا جاتی ہے ہے، لہٰذا ماں کے ساتھ ساتھ یہ ننھی سی جان بھی بم باری کا نشانہ بنی تھی، جس کی کمر پر دشمن فوج کی کارروائی کی وجہ سے ایک گہرا زخم نمایاں نظر آ رہا تھا، اور اس نے بھی اپنی ماں کے ساتھ شہادت کا درجہ پا لیا۔

میں سوچتی ہوں روز محشر اگر اس بچے نے مجھ سے اپنے بے گناہ قتل کا سبب پوچھا تو میرے پاس کیا جواب ہوگا۔ میں کیا کہوں گی اسے کے اس کو اور اس کی ماں کو کس جرم کی پاداش میں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

کہاں ہے دنیا میں امن کے ٹھیکے دار، جو امن کے ایسے عاشق ہیں کہ امن کے نام پر جنگ مسلط کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، کہاں ہیں انسانی حقوق کے نعرے لگانے والے جو اس نعرے کی آڑ میں کسی ملک کو ہدف بنالیں تو تجارتی پابندیوں سے فضائی حملوں تک سب کچھ کر گزرتے ہیں، غزہ کی پٹی پر گھر گھر لاشے ہیں جگہ جگہ تباہی ہے، لیکن دنیا کے چوہدریوں کو نہ خون میں نہاتا امن نظر آتا ہے نہ انسانی حقوق کی بدترین پامالی دکھائی دیتی ہے۔

غزہ، یہ فلسطین، یہ کیسی عجب جگہ ہے۔ میرے رب اس کرہء عرض پر جہاں مسجدوں میں روزانہ پانچ وقت نماز ادا ہوتی ہے، غزہ کے لوگ ہر روز چھے نمازیں ادا کرتے ہیں۔ اور چھٹی نماز، نماز جنازہ ہوتی ہے۔

روح کانپ اٹھتی ہے۔ اہل غزہ کی حالت دیکھ کر دل میں آتا ہے کہ خدا کوئی وسیلہ بنادے اور میں اپنے بھائیوں بہنوں کی مدد کے لیے غزہ پہنچ جاؤں۔ میں وہاں نہیں ہوں، لیکن میرا قلم لکھتا رہے گا۔ ہر اس ظلم کے خلاف جو انسانیت پر ہوگا۔ جب تک سینے میں دل دھڑک رہا ہے، سانسوں کی روانی باقی ہے، میرا قلم ظلم کے خلاف لکھتا رہے گا۔

اسرائیل کی حمایت کرنے والے امن کے امین، اپنی اس بے رحمی اور منافقت کے

لاکھ جواز پیش کریں، خدا کی عدالت میں انہیں اسی طرح بے دردی سے کچلا جائے گا، جو ظلم آج انسانیت پر وہ کر رہے ہیں اس کا جواب انہیں دینا ہوگا۔

غزہ کا یہ چھوٹا سا مختصر آبادی والا علاقہ ہر کچھ عرصے بعد اپنے خون میں نہا کر اور بھیانک تباہی سے گزر کر ہماری دنیا کے تضادات، منافقت اور بے حسی کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ آج بھی غزہ کے مظلوم فلسطینی اپنے خون سے اس دنیا کی یہ حقیقت لکھ رہے ہیں کہ اس دنیا میں طاقت ہی سب کچھ ہے۔ طاقت کے سامنے منطق، دلیل اور اخلاقیات سب سرنگوں ہو جاتی ہیں، ہار جاتی ہیں یا مفاہمت کر لیتی ہیں۔

غزہ کی سرزمین پر بکھری معصوم بچوں کی لاشیں انسانی حقوق کے دعوے داروں سے اپنی موت پر انصاف مانگتی ہیں۔ یہ لاشیں ان دعوے داروں سے پوچھتی ہیں کہ تم تو وہ نرم دل ہو کہ جانوروں کی اذیت پر بھی تڑپ جاتے ہو، ہم جنس پرستوں کے بے حیائی سے روک دیا جائے تو تم ان کے "حقوق" کی یہ خلاف ورزی برداشت نہیں کر پاتے، چائلڈ لیبر تمھیں بے کل کر دیتی ہے، تو پھر غزہ میں اسرائیل کی طرف سے برسائی جانے والی آگ میں جلتے جھلتے یہ پھول تمھیں کیوں نظر نہیں آتے؟ کیا تم انھیں انسان نہیں سمجھتے؟ کیا تم انھیں جانور سے بھی کم تر جانتے ہو؟ یہ سوالات امن اور انسانی حقوق کے نعروں کی حقیقت سامنے لے آتے

ہیں۔ درحقیقت غزہ کا معرکہ ایک ایسی صورت حال اختیار کر گیا ہے جس نے سب ہی کو بے نقاب کر دیا ہے، امن کی دعوے دار عالمی طاقتوں کو بھی اور مسلم ممالک کے حکم رانوں کو بھی۔

وسائل سے مالامال مسلم ممالک جن کی زمینوں پر پیدا ہونے والے تیل سے عالمی طاقتوں کی معیشت کا پہیا گھومتا ہے، جن کے حکم رانوں کے بینک اکاؤنٹس مغربی ممالک کو اقتصادی طاقت فراہم کرنے کا باعث بنے ہوئے ہیں، جو ایک ارب سے زیادہ آبادی پر محیط ہیں کہ اگر امریکا اور یورپ کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں تو ان صنعتی اور معاشی طاقتوں کی معیشت ہل کے رہ جائے.... لیکن یہ ممالک اور ان کے عیش پسند خوف زدہ حکم راں اس معاملے میں دکھاوے کے اقدامات کے علاوہ کچھ کر سکے ہیں نہ کر سکیں گے، کیوں کہ ان کے ذاتی، گروہی اور نام نہاد قومی مفادات انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے۔ گویا اسرائیل کی درندگی کا طاقت سے جواب دینا تو دور کی بات ہے، مسلم دنیا کے حکم راں ایسے ٹھوس معاشی اقدامات کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے جو اسرائیل کے سرپرست اور ہم نوا ممالک کو مجبور کر دیں کہ وہ اپنے اس پالتو جانور زنجیر کھینچ لیں۔ اگر مسلم ممالک صرف اسرائیل کا ساتھ دینے والے ملکوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں تو چند ہی روز میں صورت حال بدل سکتی ہے، مگر خوف اور خود غرضی ایسا کیوں ہونے دیں گے؟

اس مسئلے کا حل صرف طاقت کا استعمال اور معاشی بائیکاٹ ہی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ جوشیلی تقریریں ہوتی رہی گی، احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوتے رہیں گے، نعرے لگتے رہیں گے، اسرائیلی اور امریکی پرچم جلتے رہیں گے، لیکن فلسطینیوں پر ڈھایا جانے والا ظلم روکا نہ جاسکے گا۔ غزہ میں ہر روز قیامت مچتی رہے گی، جنازے اٹھائے جاتے رہیں گے اور بستیاں کی بستیاں تباہ ہوتی رہیں گی۔

اپنے کالم کے آخر میں جناب محمد عثمان جامعی صاحب کی ایک نظم دے رہی ہوں، اقوامِ عالم خاص طور پر مسلم ممالک کے حکم راں اور عوام اگر غزہ کے لیے کچھ نہ کر سکیں تو کم از کم وہ تو کر ہی سکتے ہیں جس کی اس نظم میں اپیل کی گئی ہے۔

''اپیل''

گولی، راکٹ نہ بم بھیجیں
نہ چاول اور گندُم بھیجیں
نہ دینار و درہم بھیجیں
پٹّی نہ کوئی مرہم بھیجیں
نہ حرفِ مذمت کے تحفے
نہ لفظوں کے ماتم بھیجیں

غربائے غزہ کی لاشوں کو
کفنانے کی کچھ صُورت ہو
بس اقوامِ عالم ساری
اپنے اپنے پرچم بھیجیں

## ...اگر قانون کے ہاتھ ہوتے

کون سا ایسا دن ہوتا ہے جب ہمارے یہاں کوئی دردناک واقعہ جنم نہ لے، ایک المیے کی سنگینی پرانے المیے کے دکھ کو گھٹادیتی ہے۔ سینے کو غم سے بھرتی نئی خبر ایسی ہی پرانی خبروں کا تاثر ختم کردیتی ہے، نئے دن کا سانحہ گزرے دن کے حادثے کو دل ودماغ سے محو کردیتا ہے۔ ظلم کی ہر ریت ہر رواج ہمارے یہاں موجود ہے، موت کا ہر روپ اپنی پوری دہشت اور وحشت کے ساتھ ہمیں اپنا چہرہ دکھاتا ہے، کسی کو دہشت انگیز انداز میں دی گئی موت یا کلیجہ چیر کر رکھ دینے والا کوئی سانحہ خبر کی صورت سامنے آکر آنکھیں نم کردیتا ہے، دل کو شق کردیتا ہے، لیکن یہ سانحہ.....اُف خدایا! دل ہے کہ قابو میں ہی نہیں آرہا، دماغ سائیں سائیں کررہا ہے، اس سانحے سے گزرنے والے کا درد اپنے جسم وجاں میں محسوس ہوتا ہے تو سانس اٹکنے لگتی ہے، یوں لگتا ہے جیسے قلب سے روح تک ایک خنجر پیوست ہے، جس پر جان اٹکی ہوئی ہے۔ وہ خبر موت کی ہوتی، کیسی ہی بہیمانہ موت کی، تو اتنا دکھ نہ ہوتا، لیکن یہ ایک معصوم بچے کو موت سے بھی بھیانک سزا دینے کی خبر تھی، جسے زندہ رہنے

دیا گیا مگر اس سے پوری کی پوری زندگی چھین لی گئی، ”تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔“

صرف دس برس کے تبسم شہزاد سے اس کے ہاتھ چھین لیے گئے۔ اس کا قصور بس اتنا تھا کہ اس کے مویشی ایک زمیندار کے کھیت میں داخل ہو گئے تھے۔ جانور عقل و شعور سے محروم سہی اور ان کا رکھوالا یا چرواہا کم سن سہی، جس کے ننھے منے ہاتھ ان جانوروں کو زمیندار کے کھیت میں داخل ہونے سے نہ روک سکے، سب ٹھیک، لیکن ایک عالی نصب زمیندار کے مقدس کھیت کی توہین ہوئی تو ہوئی کیسے، سزا تو ملنی ہی تھی، سو معصوم تبسم شہزاد کے نرم و نازک ہاتھ مشین کے حوالے کر دیے گئے۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ گئے، دونوں ہاتھ.....۔

یہ خبر ہم سب نے سنی اور پڑھی۔ ننھے تبسم شہزاد کو ہاتھوں سے محرومی کی حالت میں اسپتال کے بیڈ پر بے بسی سے لیٹے دیکھا۔ افسوس سب کو ہوا، مگر کتنے ہوں گے جنھوں نے اس درد کو محسوس کیا جو تبسم پر گزر ہی نہیں گیا بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کی اور اس کے ماں باپ کی زندگی میں بس گیا ہے۔

اس کے ماں باپ نے جب اسے تبسم کا خوب صورت اور مسکراتا نام دیا تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ان کے خوب صورت بیٹے کے چہرے سے مسکراہٹ

ہمیشہ کے لیے چھین لی جائے گی۔ وہ مسکراہٹ جو کسی خوش گوار لمحے کی دین ہوتی ہے، جو خوشی سے جنم لیتی ہے، اور اس معصوم سے تو کتنی ہی خوشیاں ایک ہی ہلے میں چھین لی گئی ہیں۔ تتلی کے پیچھے بھاگنے اور اسے پکڑنے کی خوشی، پھولوں کو چھو کر ان کی خوش بو ہتھیلی میں بسانے کی خوشی، ہاتھ میں بیٹ، بال یا ہاکی تھام کر رن بنانے، آؤٹ کرنے، کیچ پکڑنے اور گول کرنے کی سرشاری، ڈور تھام کر آسمان کو چھوتی پتنگ اڑانے کی مسرور کُن کیفیت، برستے پانی کو ہتھیلیوں میں بھر لینے کی مسرت، جھولے کی ڈوریاں پکڑ کر اونچی اونچی پینگیں لگانے کا سرور......اور رہی قلم پکڑنے کی راحت... تو اس کا تذکرہ میں اس لیے نہیں کروں گی کہ گاؤں کے اس غریب بچے کو یہ راحت یوں بھی کون سا مل جانی تھی، ہاں ایک امکان تھا سو اب وہ بھی نہ رہا۔

تبسم شہزاد کے درندگی کا نشانہ بننے کا حکمرانوں نے نوٹس لے لیا، اس کا سرکاری خرچے پر علاج ہو رہا ہے، ملزم گرفتار کر لیا گیا ہے، سب ٹھیک، لیکن کیا تبسم کی خوشیوں بلکہ صحیح معنوں میں اس کی زندگی کے قاتل کو واقعی سزا ہو گی یا اثر و رسوخ اور دولت کے طاقت ور دست و بازو اسے ہر کٹھہرے سے نکال کر اور ہر سزا سے بچا کر لے جائیں گے۔ اس کا پتا وقت آنے پر ہی چلے گا، اس وقت تو غور طلب پہلو یہ ہے کہ ہم کس معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک ایسا سماج جہاں زور آوروں کو کسی کم زور پر ستم ڈھاتے ہوئے نہ قانون کا خوف ہوتا

ہے نہ خدا کا، یہ امید ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے کہ وہ کچھ بھی کر لیں، کیسا بھی ظلم ڈھادیں، کیسی ہی قیامت کیوں نہ برپا کر دیں ان کا پیسہ، ان کے تعلقات اور ان کی سماجی حیثیت انھیں قانون کی گرفت میں آنے سے بچالیں گے۔ چناں چہ ان طاقت وروں کو کسی بات کی پرواہ نہیں، یہ چھوٹے چھوٹے فرعون اور نمرود قوانین کو اپنے جوتوں تلے روند کر اور کم زوروں سے اپنا من چاہا ظالمانہ سلوک کر کے اپنی خدائی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔

معمولی سی خطا پر کسی بچے پر کتے چھوڑ دیے جاتے ہیں تو کس عورت کو سر عام بے آبرو کر دیا جاتا ہے، کسی کی جان لے لی جاتی ہے تو کسی کو دربدر کر دیا جاتا ہے۔

زیادہ پرانی بات نہیں، لاہور میں دس سال ہی کی ایک بچی ارم جو گھریلو ملازمہ تھی اپنی مالکن کے تشدد کا نشانہ بن کر چل بسی تھی۔ ارم پر چوری کا الزام لگا کر اس کی مالکن نے اسے لوہے کے پائپ سے اس بے دردی سے مسلسل پیٹا تھا کہ وہ جان سے چلی گئی تھی۔

یہ کون لوگ ہیں جو بچوں کے ساتھ بھی ایسی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظر میں زندہ رہنے کا حق

صرف طاقت ور کو ہے اور عزت صرف زور آور کی ہے، کم زور اور غریب کو یہ انسان ہی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اسے کچل ڈالنا، اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر دینا اور ذرا سی غلطی پر اس کے ساتھ انتہائی سفاکانہ سلوک سے بھی گریز نہ کرنا ان کے لیے عام سی بات ہے۔ تعلیم ان کے رویے بدل سکتی ہے، لیکن انھیں تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہے، کبھی ضرورت پڑی تو بی اے ایم اے کی ڈگری خرید لائیں گے۔ رہا قانون تو وہ مضبوط اور متحرک ہوتا تو ہمارے ملک میں ایسے سانحات جنم ہی نہ لیتے کم از کم اس شدت کے ساتھ اور اتنی بڑی تعداد میں یہ المیے نہ وقوع پذیر ہوتے۔ جہاں اتنا بڑا ظلم ہو جائے جیسا تبسم شہزاد کے ساتھ ہوا اور حکم راں ٹی وی پر خبر دیکھ کر اس کا نوٹس لیں، اس نوٹس لینے سے پہلے نہ تو مظلوم کا کوئی پوچھنے والا ہو اور نہ ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے کوئی ادارہ حرکت میں آئے، تو جناب! صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں سسٹم، قانون اور انتظامیہ سرے سے موجود نہیں، کم از کم غریبوں اور بے بسوں کے لیے تو نہیں۔ ایسے میں ظلم کا نشانہ بننے والے تبسم شہزاد کے سر پہ ہاتھ رکھ کر میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ ”بیٹا! اگر قانون کے ہاتھ ہوتے تو تمھارے بازو سلامت رہتے، “قانون کے ہاتھ تو نہ جانے کب کے کٹ چکے ہیں۔

## انقلاب، آزادی اور عوام

یہ کالم جب تک آپ کی نظروں سے گزرے تو ہو سکتا ہے کہ حالات یکسر بدل چکے ہوں۔ ''انقلاب'' آچکا ہو یا ''کرسی'' اور انقلاب کی باقیات کو ہم سمیٹ رہے ہوں۔ ''ڈیل'' کرنا ہمارا قومی وتیرہ بن چکا ہے۔ ملک میں ہر سطح پر ''ڈیل'' کا نظام رائج ہے۔ لگتا ہے کہ اس مرتبہ بھی کچھ ایسا ہی ہوگا دو پارٹیاں ایک ساتھ جب آبپارہ چوک کے اطراف پارلیمنٹ ہاؤس سے ایک کلومیٹر دور بیٹھی نظر آئیں تو ذہن اس خوش اسلوبی اور منظم انداز میں کی گئی ''ڈیل'' کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا ''تم اپنی حدود میں رہو اور ہم اپنی۔ مقصد ہمارا ایک ہے۔'' ڈیل کسی ''نیک'' مقصد کے لیے کی گئی ہو یا ''کرسی'' حاصل کرنے اور ''انقلاب'' لانے کی خاطر ''ڈیل تو آخر ڈیل ہی ہے نا۔''

موجودہ صورت حال سے جس طرح پاکستانی قوم گزر رہی ہے یا اس قوم کو گزرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، پاکستان کی تاریخ میں تلاش کرنے سے بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اردو اور انگریزی کی لغات میں بہت سر کھپانے کے بعد بھی مجھے کوئی ایسا لفظ نہ ملا جو انقلاب اور بلیک میلنگ کو ہم معنی ثابت کر دے، لیکن اب شاید لغات میں ان الفاظ کی تعریف کو تبدیل کرنا پڑے۔

کوئی افرا تفری سی افرا تفری ہے۔۔بڑی چھوٹی کئی سیاسی جماعتیں تو ملک میں انقلاب برپا کرنے اور ''آزادی'' کے لیے کوششوں میں مصروف ہیں اور وہ سیاسی پارٹیاں جو انقلاب کی گنگا میں ہاتھ نہ دھو سکیں، تھوڑرے سے پانی میں اپنی انگلی ڈبونے کے لیے از خود مذاکراتی کمیٹی بنانے کے فیصلے کر بیٹھیں۔ صاحب ! آپ خود سوچیے، جب میڈیا مستقل دو چار پارٹیوں ہی کے راہ نماؤں کے نام کا جاپ کر رہا ہوگا تو ''نام'' باقی نہ رہنے کا خوف اور سیاست کی بقا کی خواہش تو بہر حال پریشان کر دے گی۔ سو پیپلز پارٹی کی حکمت عملی بھی اس سارے معاملے میں خوب رہی۔ ''ننھا'' بلاول ٹوئٹر پر اپنے موبائل فون کے ذریعے پیغامات دیتا رہا اور مزے کی بات یہ ہے کہ بلاول کے انگریزی پیغامات میں ہمیشہ اردو زبان کے چٹخارے موجود ہوتے ہیں۔ وہی بلاول بھٹو زرداری جو اردو زبان سے اتنا ہی واقف ہے جتنا پاکستان میں رہنے والا کوئی سبزی فروش انگریزی زبان سے واقف ہوتا ہے۔ بلاول بھٹو کو پیغامات لکھ کر دینے والوں کو جب اتنا ہی کافی نہ لگا تو مذاکراتی کمیٹی بنانے کا اعلان سامنے آگیا۔ چلیں اچھی بات ہے۔ یہ ایک خوش آئند عمل ہے کہ ملک میں پھیلے یا پھیلائے جانے والے انتشار کو روکنے کے لیے مختلف سیاسی جماعتیں اپنا مثبت کردار ادا کر رہی ہیں یا ایسا کرتی دکھائی دے رہی ہیں۔

حکومت اور انقلابیوں کے درمیان مذاکرات کی راہ ہموار کرنے والوں کے مصالحتی کردار کو سراہے بغیر نہیں رہا جاسکتا، مگر نہ جانے یہ کمیٹیاں اس وقت کیوں نہ قائم کی جاسکیں اور اپنا کردار ادا نہ کرسکیں جب انقلاب کی خواہاں پارٹیاں چودہ اگست کے انقلاب کا بگل'' بجا رہی تھیں اور ان کی طرف سے آزادی اور تبدیلی کے ڈھول پیٹے جارہے'' تھے۔ آخر انتظار کس بات کا تھا۔ اور تو اور خود حکومت بھی جس کے خلاف معرکہ شروع ہونے جارہا تھا یوں بے اعتنائی کا مظاہرہ کررہی تھی جیسے یہ سب کسی اور دیس میں ہورہا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے سب نے سوچ رکھا ہو کہ جب میلہ سجے گا تب تماشا دیکھیں گے۔

یہ ہماری قومی خصلت بن چکی ہے کہ ہم کسی بحران اور مصیبت کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی بحران یا مشکل ہمارے دروازے پر پہنچنے کو ہے ہم سکون سے بیٹھے رہتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔ جب پانی سر سے گزرنے لگتا ہے تب ہی حالات کی بہتری کے لیے سوچا اور لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے۔ تھر میں کچھ عرصہ قبل پیش آنے والی کرب ناک صورت حال ہی کو یاد کیجیے۔ کتنے ہی معصوم بچے قحط اور خشک سالی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کتنے ہی خاندان بھوک کے صدمے سہ کر دربہ در ہوگئے۔ یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ اس خطرے کی گھنٹی کب سے بج رہی تھی، لیکن مجال ہے کہ حکومت میں بیٹھی کسی جماعت کو تھر کے معصوم لوگوں کا خیال آیا ہو یا اپوزیشن میں

بیٹھی جماعتوں نے تھر کے باسیوں کے بارے میں سوچا ہو۔

بین الاقوامی میڈیا چیخ چیخ کر حکومتی بے حسی پر طمانچے مارتا رہا۔ پاکستانی میڈیا نے شور مچایا۔ تب کہیں جاکر ہماری سیاسی جماعتیں ہوش میں آئیں۔ جب تھر میں صورت حال بہت بگڑ چکی تو کہیں جاکر حکومت نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور حزب اختلاف کی جماعتیں مدد کے لیے پہنچیں۔ مگر کیا واقعی یہ لوگ تھر کے مصیبت زدہ عوام کی مدد کر رہے تھے؟ اگر ایسا ہوتا تو حالات بہت جلدی بدل جاتے۔ درحقیقت ہر کوئی اپنی دکان چمکا رہا تھا۔ میڈیا کے سامنے اہل تھر کی مدد کے معاملے میں ایک دوسرے سے آگے رہنے کا تمغہ لینے کے لیے سب ہی بے تاب تھے۔ مدد ہوئی اور وقتی طور پر معاملات کو سلجھا دیا گیا، لیکن حکومتی اداروں سمیت مستقبل کی کوئی حکمت عملی کسی نے بھی تیار نہ کی۔ چناں چہ تھر کی موجودہ صورت حال پھر خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہے۔ خبروں کے مطابق تھر کو ایک بار پھر خشک سالی اور قحط کا سامنا ہے، لیکن اس بدقسمت خطے کے رہنے والوں کو اس آفت سے بچانے کے لیے حکومت کی طرف سے کوئی اقدام نظر نہیں آرہا، نہ ہی حزب اختلاف کی سیاسی جماعتیں اس ایشو پر آواز اٹھا رہی ہیں۔ ان حالات میں خدشہ ہے کہ تھر میں ایک مرتبہ پھر قیامت برپا ہوگی اور وہی خوف ناک اور کرب انگیز مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں گے جو کچھ عرصہ قبل ہمیں رُلا چکے ہیں۔

خدا نخواستہ اگر پھر ایسا ہوا تو ذمہ دار کون ہوگا۔ حکومت اور حزب اختلاف کی جماعتیں سب اس ''ہونے'' کے بعد کمیٹیاں تشکیل دیں گی۔

اسی طرح دہشت گردی کے خلاف آپریشن کے باعث اپنا گھربار چھوڑنے والے افراد یعنی آئی ڈی پیز کس حال میں ہیں؟ کچھ پتا نہیں۔ بعض خبریں بتاتی ہیں کہ ملک میں امن کی خاطر اپنے گھر کی قربانی دینے والے آئی ڈی پیز اب تک مسائل کا شکار ہیں، لیکن ان کی کسی کو فکر نہیں۔ حکومت کے مخالفین حکومت گرانے کی کوشش کر رہے ہیں اور حکمراں اپنا اقتدار بچانے میں مصروف، میڈیا اسلام آباد کی رونقیں دکھانے میں مشغول ہے اور ہم سب اس سیاسی میلے کے پَل پَل کے مناظر دیکھنے میں مگن ہیں۔ ایسے میں آئی ڈی پیز کو کون پوچھے گا اور تھر کی پروا کسے ہوگی۔

انقلاب، آزادی، تبدیلی، انھیں روکنے کی کوششیں، ان سرگرمیوں کی میڈیا کوریج..... یہ سب عوام کے لیے ہے، اور تھر سے ملک کے شمال تک عوام مصیبتیں جھیل رہے ہیں اور نئے مصائب کے منتظر ہیں۔

## سانحے انتظار میں ہیں

زندگی میں کچھ حادثات ایسے ہوتے ہیں جنھیں فراموش کرنا کسی صورت ممکن نہیں ہوتا۔ ہم لاکھ چاہیں کہ زندگی کے وہ واقعات و حادثات اپنے ذہن سے ہم کھرچ کر پھینک دیں لیکن ساری کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔

ہونے والی چیز ہو ہی جاتی ہے لیکن اگر وہ حادثات ہماری بے پرواہی کی وجہ سے ہوں تو میں اسے قسمت کا لکھا نہیں مانتی، بلکہ میرے نزدیک اکثر یہ ہماری شدید بے پرواہی اور غیر ذمے داری ہوتی ہے جو حادثات اور سانحات کا سبب بنتی ہے، ایسے میں ہم تقدیر کو قصور وار ٹھہرا کر خود بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ یہ تو وہ ہی بات ہوئی کہ چوتھی منزل سے چھلانگ لگا کر کوئی یہ سوچے کہ اگر قسمت میں موت لکھی ہوئی تو مرجاؤں گا ورنہ دوسری صورت میں وقت کی بچت ہوگی، سیڑھیاں اترنے کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔

آگ کے اوپر ہاتھ رکھ دیجیے اگر تکلیف قسمت میں لکھی ہے تو ضرور ملے گی ورنہ آگ کے اوپر ہاتھ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیا انسانی ذہن ان باتوں کو قبول کرتا ہے؟ نہیں ناں....یقیناً ایسا ہی ہے۔

خدا نے انسان کو دوسری مخلوقات سے اس لیے افضل بنایا ہے کیوں کہ انسان عقل

و شعور رکھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن اور دل سے اچھے.برے کی پہچان کر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ موت وزندگی تقدیر میں لکھی جاچکی ہے، لیکن قسمت بنانا یا بگاڑنا ہمارے ان ہاتھوں میں قید ہے۔

مثلاً رزق تقدیر میں لکھا جاچکا ہے اب وہ رزق ہم حلال طریقے سے کمائیں یا حرام راستہ اختیار کریں یہ ہم پر منحصر ہے۔ موت کا وقت مقرر ہے، لیکن تکلیف دہ موت ہونا یا حادثاتی موت ہونا یہ حالات پر منحصر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص جو ٹریفک حادثے میں یوں جاں بحق ہوجاتا ہے کہ اس کے جسم کی باقیات دور دور تک بکھر جاتی ہیں۔ اس وقت اس کی موت لکھی جاچکی تھی اس لیے وہ بچ نہ سکا، لیکن حادثہ ہونا ! حالات پر منحصر ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے ساتھ وہ حادثہ نہ ہوتا اور وہ کسی دوسرے شخص سے باتیں کرتے کرتے رب کو پیارا ہوجاتا ہے۔ اذیت ناک موت تقدیر کا حصہ نہیں حالات کا ستم ہے۔

اسی ستم کا شکار وہ بچہ ہوا۔

ایک سال اور دس ماہ کا عبدالباری اپنی جڑواں بہن کے ساتھ اس پروجیکٹ میں داخل ہوا جہاں اس کے نانا کا فلیٹ تھا۔ راستے میں نانا ابو نے اس کے ہاتھ میں کیلے کی تھیلی تھمائی اور دونوں بچوں کو پیار کرکے نانی کے پاس بھیج دیا۔ لیکن نانی کے پاس صرف عبدالباری کی بہن پہنچی، وہ خود کہاں گیا۔ یہ

کوئی نہیں جانتا تھا۔ فقط پروجیکٹ کے گیٹ سے لے کر فلیٹ کے دروازے تک کا مختصر راستہ، اور عبدالباری غائب ہوچکا تھا۔ گھر میں صف ماتم بچھ چکی تھی۔ نانا نانی، دادا دادی، ماں باپ، محلے والے، رشتے دار ہر کوئی ننھے عبدالباری کے لیے پریشان تھا اور اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ بظاہر کوئی بے پرواہی نہ ہوئی تھی۔ بچے کو کوئی اٹھا کر لے جائے، اس کا امکان بھی نہ تھا، کیوں کہ پروجیکٹ کے دروازے پر عبدالباری کے نانا موجود تھے۔

پانچ گھنٹے مستقل ڈھونڈنے کے بعد کسی کو پروجیکٹ کے کوریڈور میں بنے پانی کے ٹینک کا خیال آیا، جو ڈھکن سے بے نیاز تھا۔ سوچا گیا کہ کہیں بچہ اس کُھلے ٹینک میں نہ گر گیا ہو۔ کاش یہ خیال اندیشہ ہی رہتا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ڈھونڈنے والوں نے ٹینک میں جھانکا تو وہاں عبدالباری کا ننھا مُنا بے جان جسم پانی میں تیر رہا تھا۔

یہ اندوہ ناک واقعہ سنا تو مجھے ایک اور حادثہ یاد آگیا، جو میرے رب کی مہربانی سے اس کے کرم سے سانحہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، ایسا سانحہ جس کا شکار میں ہوتی۔ یہ حادثہ مجھے ماں ہونے کے احساس سے آشنا کرنے والی میری پہلی بیٹی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس کی تعلیم کے ابتدائی دن تھے۔ ایک روز وہ اور اس کی ایک ہم جماعت اسکول میں کھیلتے کھیلتے آپس میں لڑپڑیں۔ دونوں

بچیاں اور نا سمجھ۔ ہم جماعت بچی نے میری بیٹی کو دھکا دیا اور وہ کھلے ہوئے ٹینک میں جا گری۔ کسی کو اس واقعے کا پتا بھی نہ چلتا، اللہ اس بچی کا بھلا کرے جس نے سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر ٹیچرز کو اس حادثے کے بارے میں بتادیا اور یوں میری بیٹی بچ گئی۔

یہ اور اس جیسے کتنے ہی واقعات ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ایسے میں اخبار میں شایع ہونے والی ایک سا نحے کے متاثرین کو معاوضے کی عدم ادائیگی کے متعلق خبر نے اس دردناک المیے کی یاد دل میں تازہ کردی، سانحۂ بلدیہ ٹاؤن.....۔ ایک گارمینٹ فیکٹری میں آگ لگنے کا سانحہ، جس میں ڈھائی سو سے زیادہ جانیں بھڑکتی آگ کا ایندھن بن گئی تھیں۔ اس فیکٹری میں کیمیکل تھے، بوائلر تھا، اور جس وقت موت کے شعلے بھڑکے فیکٹری کے دروازے اور کھڑکیاں سب بند تھے۔ فیکٹری میں آگ لگنے کی صورت میں بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ نتیجہ قیمتی جانوں کے ضیاع کی صورت میں نکلا، جن میں سے کئی افراد اپنے گھر کے واحد کفیل تھے۔

میرے تحریر کردہ تین واقعات تین الگ الگ جگہوں پر پیش آئے، کم سن عبدالباری ایک رہائشی عمارت میں حادثے کا شکار ہوا، میری بیٹی کو ایک اسکول میں حادثہ پیش آیا اور وہ ایک فیکٹری تھی جس میں لگنے والی آگ نے درجنوں زندگیوں کو

کوئلہ کر دیا۔

ان تمام حادثات اور اس نوعیت کے دیگر واقعات کو اگر ہم ایک عنوان کے تحت لکھنا چاہیں تو وہ ہوگا ''بے پرواہی'' یا ''غیر ذمے داری۔'' کسی گھر، رہائشی عمارت یا اسکول، کا ٹینک کھلا ہے، تو کھلا رہے، کسی کو کیا پروا۔ کوئی اس میں گرتا ہے تو اس کی قسمت۔

فیکٹری میں آگ بھڑکانے کے تمام لوازمات موجود ہیں ۔ مگر آگ بجھانے کا سامان موجود نہیں، نہیں تو نہ ہوا کرے، آگ لگنا مقدر ہے تو لگے گی اور جن کے نصیب میں جلنا ہے وہ جل کر رہیں گے۔

غرض یہ کہ گھر سے اداروں تک ہماری یہی روش ہے کہ ہم حادثوں سے بچنے کی تدبیر نہیں کرتے اور حفاظتی اقدامات کو گویا حماقت سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں قوانین بھی موجود ہیں اور ادارے بھی، مگر ہمارے یہاں قانون اور اداروں کا جو حال ہے سب جانتے ہیں۔ قوانین اور اداروں کی راہ میں تو ان کی اغراض اور مالی مفادات حائل ہو جاتے ہیں، لیکن ہم عام لوگ کس مقصد اور غرض کے تحت بے پرواہی کا مظاہرہ اور حفاظتی اقدامات سے گریز کرتے ہیں۔ رہائشی عمارتوں میں بجلی کے ننگے تار اور کھلے ٹینک ہماری اس بے پرواہی کی کہانی سناتے ہیں

اور پھر کوئی حادثہ ہمیں اس کہانی کا "بدنصیب کردار" بنادیتا ہے۔

آیئے! اپنے اردگرد نظر ڈالیں، کہیں کوئی حادثہ کئی سانحہ کسی زندگی کو نگل لینے کا منتظر تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس حادثے سے بچنے کے لیے کچھ کر گزریے۔ اتنا تھوڑا سا انقلاب، اتنی چھوٹی سی تبدیلی تو ہم لا ہی سکتے ہیں نا۔

# ذرائع ابلاغ انقلاب کی زد میں

انقلاب کی سنسنی خیزی پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں سوچتی ہوں اگر ہمارا برقی ذریعہ ابلاغ اتنا برق رفتار نہ ہوتا جتنا ان دنوں اپنی ذمہ داری نبھا رہا ہے تو کیا ''انقلاب'' کے اثرات گھر بیٹھے ناظرین پر اتنے گہرے مرتب ہوتے؟ یہ سوال میرے ذہن میں گردش کرتے ہوئے سوالات اور خیالات کے کتنے ہی دائرے بنا رہا ہے۔

جن دنوں میں صحافت کی تعلیم حاصل کر رہی تھی، مجھے یاد ہے میں نے صحافت کے اصولوں پر مبنی باب کو بارہا پڑھا۔ مجھے اب تک اپنی کتاب میں موجود اس باب کے اسباق کی ترتیب پوری طرح یاد ہے۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ آزادیٔ صحافت کے موضوع پر دیے جانے والے ایک لمبے چوڑے لیکچر کے بعد آزادیٔ صحافت کی حدود کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بالترتیب صحافی اور قانون، مثالی ضابطۂ اخلاق، مدیران، مالکان اور کارکن صحافیوں کا ضابطۂ اخلاق، قانونِ صحافت و مطبوعات قانون، توہین عدالت، ہتک عزت یا ازالہ حیثیت عرفی کا قانون، حقوق اشاعت یا کاپی رائٹ کے قوانین، غرض یہ کہ صحافت کی آزادی اور ذمے داری سے متعلق تمام قوانین اور اصولوں کا

تذکرہ کیا گیا تھا۔

میرے قوانین صحافت کو اتنے انہاک سے پڑھنے کی خاص وجہ تھی۔ چوں کہ میں نے بچپن ہی سے اپنے گھر میں انقلابی اور سیاسی سرگرمیاں دیکھیں، اس حوالے سے بحثیں سنیں، سو ملکی حالات پر، مذہبی مسائل و اختلافات اور اپنے اردگرد ہونے والے واقعات پر نظر رہتی، خبروں سے دل چسپی رہتی اور ذہن ان کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس کے ساتھ ہی زرد صحافت سے شدید الجھن ہوتی۔

انھی دنوں شام کا ایک اخبار، جو پہلی دفعہ رنگین تصاویر اور جرائم کی خبروں کو نمایاں طور پر چھاپنے کے رجحان کے ساتھ سامنے آیا تھا، ہر روز میرے ہاتھ آتا۔ اگرچہ صحافت کے اصولوں سے واقفیت نہیں تھی، مگر کوئی حس تھی جو بتاتی کہ یہ صحافت نہیں، چناں چہ اس چھوٹی عمر میں بھی دل ہی دل میں اس اخبار کے مالکان کو کھری کھری سناتی..... خیر سن کون رہا تھا!

لیکن صحافت کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے جب میں نے خود پہلی مرتبہ قلم ہاتھ میں لیا تو زرد صحافت کو اپنے معاشرے سے نوچ پھینکنے کا عزم دل میں تھا۔

اب 2014 ہے۔ پاکستان میں مختلف ذرائع ابلاغ زیادہ سے زیادہ قارئین، سامعین

اور ناظرین کو اپنی گرفت میں لینے کی خواہش رکھتے اور اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ چناں چہ خبروں، تجزیوں اور پروگرام کو متوازن اور معروضیت پر مبنی بنانے سے کہیں زیادہ انھیں ''پُرکشش'' بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ رہی سہی کسر سوشل میڈیا پورا کر رہا ہے۔

کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف سے آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک شور ہے، ہنگامہ ہے، ہر کوئی اپنے کہے کو سچ ثابت کرنے کے لیے سرگرم ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کروڑوں کی تعداد میں لوگ بھاگ رہے ہوں اور ان میں سے کوئی نہ جانتا ہو کہ اس کی منزل کیا ہے۔ بس لوگ بھاگ رہے ہوں۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ایسی خواہش ہے جس کے تحت یہ بھی نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ کتنے ہی سر بھاگتے بھاگتے پیروں تلے روندے جا چکے ہیں۔

انقلاب کی بات اچھی ہو یا بری، صحیح یا غلط، سچ یا جھوٹ..... لیکن اس ساری صورت حال میں عوام ہمارے ذرائع ابلاغ سے دن بہ دن بدظن ہوتے جا رہے ہیں۔ ریٹنگ کی دوڑ میں آگے بڑھتے ہمارے ذرائع ابلاغ کھرے اور کھوٹے کی فکر کیے بنا بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ 2000 سے لے کر 2014 یعنی پورے چودہ سال پاکستان کے عوام نے نئے آنے والے تمام چینلز کو خوش آمدید کہا۔ اس میں دو رائے نہیں

ہو سکتیں کہ الیکٹرانک میڈیا نے عوام میں شعور کا بیج بویا۔ اور اب یہ بیج پھوٹ کر ایسا پودا بن گیا ہے جس کی ٹہنیوں پر رنگ برنگے پھول کھلنے لگے ہیں۔ عام پاکستانی باشعور ہوتے جا رہے ہیں، ان میں اپنے ملک کے معاملات، اپنے حالات اور اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی پہلے کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ چکی ہے اور یہ سب ہمارے ملک کے ذرائع ابلاغ کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔

بس ایک یہی مثبت تبدیلی ہے جو گذشتہ کوئی ایک عشرے کے دوران ہمارے یہاں آئی ہے۔ ورنہ ہمارے ملک میں نہ تعلیمی مسائل حل ہوئے، نہ عام شہری فکر روزگار سے آزاد ہوا۔ امن وامان اور انتظام کی بگڑی ہوئی صورت حال مزید ابتر ہوتی گئی۔ لیکن برقی ذریعہ ابلاغ کی بہ دولت عوام خاصی حد تک اپنے مسائل سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں اور ان میں ان مسائل کو حل کرنے کی خواہش اجاگر ہوئی ہے۔ ذرائع ابلاغ نے شعور کے جو بیج بوئے اس کی نگہداشت پر بھی خاطر خواہ توجہ دی اور بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزرے چودہ سال کا عرصہ پاکستان میں ذرائع ابلاغ کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ہمارے ذرائع ابلاغ نے شعور تو دے دیا ہے، سو اب عام آدمی ان ذرائع ابلاغ کی کارکردگی کو بھی اپنے شعور کی کسوٹی پر پرکھ رہا ہے اور ان کا مواخذہ اور احتساب کرنے کی فکر میں ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ کس طرح بعض چینل تمام تر

صحافتی ذمے داریوں اور اقدار کو تج کر موجودہ سیاسی صورت حال کے فریقین میں سے کسی ایک کا "بھونپو" بن گئے ہیں۔ ایسے میں وہ سامنے کی سچائیوں سے انکار کر رہے ہیں، یہی نہیں سفید جھوٹ بولنے کے سیاہ عمل سے بھی گریز نہیں کیا جارہا۔

یہ ایک نازک وقت ہے، اپنا اعتماد قائم رکھنے یا کھودینے کا وقت۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ان دنوں سب نہیں تو بعض ٹی وی چینلوں سے جو کچھ ہمیں دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے یا جو بتایا جارہا ہے، وہ بلاشبہ زرد صحافت کی تعریف پہ پورا اترتا ہے۔ لیکن اس پر آواز اٹھائی جائے تو آواز کو یہ کہہ کر دبا دیا جائے گا کہ یہ آزادی صحافت کے خلاف ہے۔

وقت آگیا ہے کہ ملک کے چوتھے ستون، کہی جانے والی صحافت کو، اپنی جڑوں کو مضبوط اور اس کی آبیاری کے لیے ذرائع ابلاغ کے ادارے صحافتی آزادی کی حدود کا ازخود جائزہ لیں اور اپنے کارکن صحافیوں کے لیے نئے سرے سے بدلتے وقت کی ضرورت کے تحت صحافتی قوانین کی تربیت کا اہتمام کریں۔

دوسری صورت میں ملک میں انقلاب آئے یا نہ آئے، پاکستان کے ذرائع ابلاغ خاموش عوامی انقلاب کی زد میں ضرور آجائیں گے۔

## امریکا سوشل میڈیا کو کنٹرول کرنے کے لیے کوشاں

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس ایک ایسا میڈیم ہیں جہاں نہ صرف لوگ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں، بلکہ اپنی مصروفیات بھی شیئر کرتے ہیں اور اپنے خیالات، نظریات اور جذبات پوسٹ اور کمنٹس کی صورت میں ان سائٹس پر سامنے لاتے رہتے ہیں۔

دوسری طرف کسی خاص فکر اور نظریے سے وابستہ افراد اور اس فکر اور نظریے کے تحت کام کرنے والے گروہوں کے ارکان بھی سوشل ویب سائٹس کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں۔ یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیاں اور دفاعی ادارے ان سائٹس میں دل چسپی رکھتے ہیں اور ان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

اس معاملے میں امریکا سب سے آگے ہے۔ حال ہی میں ہونے والے انکشاف کے مطابق امریکا انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کو کنٹرول کرنے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔ برطانیہ کے موقر اخبار ''گارجین'' میں شایع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق امریکا کے دفاعی ادارے پینٹاگون نے ایسی درجنوں تحقیقات کے لیے فنڈز جاری کیے ہیں جن کا مقصد سوشل میڈیا کی نوعیت اور رجحان کو سمجھ کر اس پر

کنٹرول حاصل کرنا ہے۔

گارجین میں شایع ہونے والی اس رپورٹ کے مطابق امریکا کے سائنسی تحقیق سے متعلق دفاعی ادارے DARPA(Defense Advanced Research Projects Agency) جو پینٹا گون کے زیر سایہ کام کرتا ہے، ٹوئٹر، Pinterest اور دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے متعلق تحقیقی مطالعوں کے Kickstarter، لیے بھاری رقوم پر مشتمل فنڈز جاری کرچکا ہے۔ سوشل میڈیا کو سمجھنے اور قابو پانے کے "ڈی اے آرپی اے" کے اس منصوبے کو "Social Media in Strategic Communications" کا نام دیا گیا ہے جس کا مخفف ہے "SMISC"۔

DARPA نے اس منصوبے کا مقصد بڑا سادہ اور مثبت قرار دیا ہے، جو یہ ہے کہ بہ ظاہر ایسے ٹول تیار کیے جائیں جن کی مدد سے غلط اور جھوٹی اطلاعات کی روک تھام کی جائے اور درست اطلاعات سامنے لائی جائیں۔ تاہم یہ صرف ظاہری مقصد ہے، درحقیقت پینٹا گون سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اس طرح دسترس حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان کے یوزرز کے ڈیٹا تک اس کی بہ آسانی رسائی ہوسکے اور ساتھ ہی یوزرز کی پوسٹس اور کمنٹس کے ذریعے ان کے رجحانات کا سائنٹیفک بنیاد پر تجزیہ کیا جاسکے، اور پھر ان معلومات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

پینٹاگون کے اس منصوبے میں جو ادارے شریک ہیں ان میں یونی ورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا، آئی بی ایم اور جارجیا ٹیک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شامل ہیں۔

DARPA کے تحت ہونے والی ان تحقیقی سرگرمیوں، جن پر کروڑوں ڈالر لگائے گئے ہیں، میں سے کچھ تحقیقی سرگرمیاں بڑی دل چسپ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ریسرچ جس میں سیلیبریٹیز جیسے لیڈی گاگا اور جسٹن بائبر کے ٹوئٹس کا تجزیہ بھی شامل تھا۔ اس تحقیق کا مقصد دراصل ٹوئٹر پر اثرپذیری کی صلاحیت کو سمجھنا تھا۔ دیگر تحقیق کاوشیں ٹوئٹس کا ڈیٹا مرتب کرنے اور دیگر نوعیت کی پوسٹس کے تجزیے پر منتج ہوئیں۔

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس ایک ایسی دنیا ہے جہاں ہر شخص اپنی بات کہہ سکتا اور اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرسکتا ہے۔ اسی طرح ان سائٹس پر ایسی خبریں، تصاویر اور وڈیوز آجاتی ہیں جنھیں مین اسٹریم میڈیا چھپاتا ہے۔ اس طرح سوشل میڈیا کے ذریعے کسی بھی معاملے اور تنازعے کا ہر رخ لوگوں کے سامنے آجاتا ہے۔

امریکا اور وہ تمام طاقتیں جو صرف اپنے مطلب کی اطلاعات ہی لوگوں تک

پہنچانا چاہتی ہیں، سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کے اس کردار سے خائف ہیں۔ ساتھ ہی وہ ان سائٹس پر موجود اپنے دشمن گروہوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور انھیں روکنا چاہتی ہیں، چناں چہ اس مقصد کے لیے ہر حربہ اور طریقہ آزمایا جارہا ہے۔ پینٹاگون کی تحقیقی سرگرمیاں کیا رنگ لائیں گی اور ان کی کام یابی کے بعد یوزرز کا ڈیٹا کس حد تک محفوظ رہ پائے گا؟ اس سوال کا جواب آنے والا وقت ہی دے گا۔

## سوشل میڈیا پر لگا بازار؛ برطانیہ میں اشیاء کی فیس بک پر خرید و فروخت کا رجحان

لوگوں کو ایک دوسرے سے رابطے میں لانے والے سوشل میڈیا کا کردار ہماری زندگیوں میں مختلف روپ دھارتے ہوئے بڑھتا جا رہا ہے۔ یوزرز کے درمیان خیالات کے تبادلے کے لیے وجود میں آنے والی سائٹس اب اشیاء کی خرید و فروخت کے مراکز میں بدل رہی ہیں۔ اس رجحان کا آغاز برطانیہ سے ہوا ہے۔

برطانوی اخبار ٹیلی گراف میں شایع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں لوگ اب خرید فروخت کے لیے مخصوص ویب سائٹس کے بہ جائے مختلف اشیاء خریدنے اور بیچنے کے لیے سوشل ویب سائٹس کا سہارا لے رہے ہیں اور فیس بک پر کاریں، فرنیچر یہاں تک کے مکانات بھی فروخت کر رہے ہیں۔

پورے برطانیہ میں کمیونٹی بیسڈ فیس بک کے پیجز اشیاء کی فروخت اور خریداری کا ذریعے اور اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والی دکانوں اور مارکیٹوں کا متبادل بنتے جا رہے ہیں۔ ان پیجز پر صرف چھوٹی موٹی چیزیں، جیسے سیکنڈ ہینڈ کپڑے اور کھلونے ہی نہیں بیچے جا رہے، بل کہ یوزر قیمتی اور مہنگی اشیاء جیسے مکانات اور گاڑیوں کی فروخت کے اشتہار بھی دیتے ہیں اور یہ اشیاء

بیچنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔

فیس بک پر خرید وفروخت کا یہ رجحان اشیاء بیچنے اور خریدنے والے دونوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر 52 سالہ John Hayes اور ان کی اہلیہ Mandy 36 کسی اسٹیٹ ایجنٹ کے مدد حاصل کیے بغیر فیس بک کے ذریعے اپنا مکان لاکھ 6,000 یورو میں فروخت کیا، اس طرح مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم میں سے ان کے 8 ہزار 800 یورو اسٹیٹ ایجنٹ کی جیب میں جانے سے بچ گئے۔ یہ جوڑا اب اپنا گاؤں میں واقع پانچ بیڈرومز پر مشتمل تین منزلہ مکان بھی فیس بک ہی پر فروخت کرنے کا سوچ رہا ہے۔

John Hayes اور ان کی بیوی "Grange Park, Northampton" کے نام سے بنائے گئے فیس بک کے پیج کے ممبر تھے، جو کمیونٹی کے لیے میسج بورڈ کے طور پر تشکیل دیا گیا اور آپریٹ ہوتا ہے۔ اپنے مکان کی سوشل میڈیا کے ذریعے فروخت کے بارے میں John Hayes کا کہنا ہے کہ جن جن جائیدادوں کی فروخت کے معاملات میں وہ شامل رہے ہیں، ان کے مقابلے میں یہ سودا سب سے کم جھنجھٹ والا ثابت ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''ہم نے اس سلسلے میں کسی ایجنٹ کے ذریعے بات چیت نہیں کی، چناں چہ سارے معاملات ہموار انداز میں طے پا گئے۔''

جیسی کاروباری مقاصد کے لیے قائم کردہ روایتی ویب سائٹس Gumtree اور eBay چیزوں کی آن لائن خرید وفروخت کا مرکز رہی ہیں، لیکن ان کی ''سیلرز فیس'' اور دھوکا دہی جیسے مسائل کی وجہ سے بہت سے یوزرز خرید وفروخت کے لیے دوسرے ذرائع کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں۔ ان یوزرز میں سے ایک بڑی تعداد نے اپنی فیس بک فرینڈ لسٹ میں سودا کرنا زیادہ اطمینان بخش سمجھتے ہیں۔

سامان کی خرید وفروخت کے لیے عمومی طور پر فیس بک پر بنائے جانے والے ''لوکل کمیونٹی پیجز'' استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ان پیجز پر لوگ اپنی مختلف اشیاء بیچنے کے لیے اعلانات پوسٹ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ان پیجز پر مختلف سروسز کے حوالے سے بھی اعلانات پوسٹ کیے جاتے ہیں، جیسے پلمبرنگ، house removals اور بیوٹی ٹریٹمینٹ کی سروسز۔ کچھ مقامی تجارتی کمپنیاں فیس بک کے ان پیجز کو اپنی سروسز کی تشہیر کے لیے بروئے کار لاتی ہیں۔ تاہم اس نوعیت کے اعلانات اور اشتہارات میں غالب حصہ عام یوزرز کا ہوتا ہے۔

فیس بک پر اشیاء کی خرید وفروخت کے لیے بنائے جانے والے گروپس میں سے کچھ ''کلوز گروپ'' ہیں۔ واضح رہے کے فیس بک کے قواعد کے مطابق کلوز گروپ وہ ہوتا ہے کا رکن بننے کے لیے آپ ایڈمنسٹریٹر کو ریکویسٹ بھیجتے ہیں، جب کہ اوپن گروپ وہ ہے جس کی پوسٹس فیس بک اکاؤنٹ رکھنے والا کوئی بھی یوزر دیکھ

"Battersea and سکے۔ اشیاء کی خرید وفروخت کے لیے بنایا جانے والا گروپ
ایک کلوز گروپ ہے، جس کے ممبرز کی تعداد "Wandsworth selling site
ہے۔ اس گروپ میں بہ طور پوسٹ آنے والی برائے فروخت اشیاء کی 1,900
فہرستوں میں کاروں سے سلے ہوئے کپڑوں، فرنیچر اور بچوں کے مختلف کھلوں تک
مختلف سامان شامل ہوتا ہے۔

اس گروپ کی خرید وفروخت کا دائرہ جنوب مغربی لندن کے علاقے تک محدود ہے۔ اس
نوعیت کے گروپس کے ساتھ برطانیہ میں فیس بک پر اشیاء کی خرید وفروخت ایسے گروپ
بھی موجود ہیں جہاں صرف مخصوص اشیاء بیچی اور خریدی جاتی ہیں، جیسے "Buy,
جو ایک اوپن ، "Sell, Swap Camera and Photography Gear – UK
گروپ ہے۔ اس گروپ کے ارکان کی تعداد 1,400 ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے
ظاہر ہے کیمروں کی خرید وفروخت سے متعلق اس گروپ پر ڈیجیٹل SLR کیمروں سے
کے ساتھ مختلف کیمرے اور ان سے متعلق اشیاء accessories لے کر لینس اور
فروخت کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

فیس بک پر خرید وفروخت جہاں مڈل مین کے نہ ہونے کے باعث فائدہ مند اور سادہ عمل
ہے، لیکن اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے۔ فیس بک پر تجارتی عمل میں خریدار کے مفادات
کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں۔ اگر آپ فیس بک پر کسی سے کوئی چیز خریدتے ہیں وہ
انھیں حاصل نہ ہو سکے یا وہ خراب نکلے یا کچھ دن بعد ہی

ناکارہ ہو جائے تو آپ کچھ نہیں کر سکتے، کیوں کہ اس حوالے سے کوئی ضمانت نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس اشیاء کی خرید وفروخت کے لیے بنائی جانے والی ویب سائٹس میں یہ خطرہ کہیں کم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نوعیت کی ویب سائٹ eBay اپنے یوزرز کو جو اس سائٹ کے ذریعے خریداری کرتے ہیں، یہ ضمانت دیتی ہے کہ اگر انھیں خریدا گیا سامان موصول نہ ہو تو وہ اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکتے ہیں۔

لندن میں فیس بک کے ذریعے خرید وفروخت بیچنے والوں اور خریدنے والوں دونوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو رہی ہے۔ آن لائن اسٹیٹ ایجنٹس کی ویب سائٹ Housesimple.co.uk پر سامنے آنے والی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق 2013 میں اپنے مکان فروخت کرنے والے مکان مالکان نے فیس کی مد میں اسٹیٹ ایجنٹس کو مجموعی طور پر 3 بلین یورو کی خطیر رقم دی۔ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ اسٹیٹ ایجنٹس جائیداد کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کا 1.75 فی صد کے علاوہ ویلیو ایڈڈ ٹیکس کی رقم بھی فروخت کنندہ سے وصول کرتے ہیں۔

دوسری طرف اپنی جائیداد فیس بک کے ذریعے فروخت کرنے والے براہ راست سودا کرنے کے باعث اسٹیٹ ایجنٹس کو رقم کی ادائیگی سے بچ جاتے ہیں۔ فی الحال تو ہمارے ہاں فیس بک اور دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ذریعے مکانات اور قیمتی

اشیاء تو دور کی بات چھوٹی موٹی اشیاء کی فروخت اور خریداری کا سلسلہ بھی شروع نہیں ہوا ہے، لیکن سوشل میڈیا جس تیزی سے ہمارے زندگیوں پر اثر انداز ہو رہا ہے اس سے لگتا ہے کہ بہت جلد یہ رجحان پاکستان سمیت پوری دنیا میں فروغ پائے گا۔ تھوڑا انتظار کیجیے، جلد سوشل ویب سائٹس پر دکانیں کھلنے کو ہیں اور بازار لگنے والے ہیں۔

## سوشل میڈیا کا عالمی دن

دنیا کے جس گوشے تک تعلیم اور ٹیکنالوجی کی رسائی ہو چکی ہے وہاں سوشل میڈیا بھی موجود ہے۔
دنیا کے چھے آباد براعظموں میں بسنے والی اقوام میں سے کون سی ایسی قوم ہو گی جس کے افراد کی ایک بڑی تعداد کسی نہ کسی سوشل ویب سائٹ سے وابستہ نہیں۔ حکمراں، سیاست داں، کھرب پتی سرمایہ دار، نام ور اداکار اور گلوکار، مذہبی شخصیات، شاعر، ادیب، مصور، غرض یہ کہ ہر پیشے اور شعبے کے معروف اور غیر معروف لوگ سوشل میڈیا سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں۔
سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس نے بکھرے ہوئے خاندانوں کے افراد اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کا بہت آسان ذریعہ فراہم کیا ہے اور دنیا کے ہر فرد کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود اپنے ہم خیال اور یکساں ذوق و شوق کے حامل افراد سے دوستی کرے اور رابطے میں رہتے ہوئے باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیال کرے۔

اس کے ساتھ سماجی ویب سائٹس نے اپنے یوزرز کے لیے ان کے خیالات، احساسات اور صلاحیتوں کے اظہار کا دریوں وا کیا ہے کہ اب کوئی بھی یوزر اپنی فکر، کسی معاملے پر اپنی سوچ اور احساسات اور اپنی کسی مہارت کے نمونے، جیسے شاعری، کوئی نثری کاوش، پینٹنگ، کو دنیا کے کسی بھی خطے تک پہنچا سکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ سوشل ویب سائٹس کے ذریعے ایک عام یوزر کی رسائی ان شخصیات تک بھی ہو گئی ہے جن سے براہ راست رابطے کے وہ خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔

چناں چہ اب آپ اپنے پسندیدہ کھلاڑی، اداکار، سیاست داں یا ادیب سے کسی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر بنے اس کے پیج یا اکاؤنٹ کے ذریعے براہ راست رابطہ کر سکتے ہیں۔ مواقع، تفریح اور رابطوں کا ایک جہان بسا دینے والے سوشل میڈیا کا یہ کردار سوشل ویب سائٹس کے یوزرز سے تقاضا کرتا ہے کہ سوشل میڈیا کا شکر گزار ہوا جائے اور اس کی ستائش کی جائے۔ اسی جذبے کے تحت دنیا کے مختلف ممالک میں ''سوشل میڈیا کا عالمی دن'' بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔

سوشل میڈیا کے دن یا ''یوم سماجی میڈیا'' کی شروعات 2010 میں کچھ تقریبات سے ہوئی تھی، پھر رفتہ رفتہ یہ ایونٹ عالمی سطح کا دن بن گیا، جسے دنیا کے مختلف ممالک میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ دنیا کے 20 شہروں میں یہ دن 30 جون کو منایا جاتا ہے، جن میں امریکا اور کینیڈا کے شہروں میں یہ دن

منانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ امریکا کی ریاست ایریزونا وہ پہلی امریکی ریاست ہے جس نے سوشل میڈیا کا دن سرکاری طور پر منانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اب مزید دو امریکی ریاستیں نویڈا اور میسوری بھی ایریزونا کی پیروی کرتے ہوئے یہ دن مناتی ہیں۔

سوشل میڈیا کا دن منانے کا آغاز 2010 میں ایک برٹش امریکن نیوز ویب سائٹ mashable.com نے کیا۔ یہ ویب سائٹ دراصل ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا سے بنایا جانے والا ایک بلاگ ہے۔ اس ویب سائٹ کی جانب سے سوشل میڈیا کا دن منانے کی شروعات کرنے کا مقصد اس ڈیجیٹل انقلاب کے بارے میں آگاہی کا فروغ اور شعور اجاگر کرنا تھا، جو ہماری نظروں کے سامنے رونما ہو رہا اور اپنے گہرے اور دور رس اثرات مرتب کر رہا ہے۔ اس دن آسٹریلیا سے فلپائن اور سری لنکا سے مراکش تک دنیا کے مختلف خطوں میں موجود لاتعداد یوزرز اپنے اپنے شہروں میں جمع ہو کر اس دن کے حوالے سے تقریبات منعقد کرتے ہیں۔

mashable.com نے سوشل نیٹ ورکنگ کے یوزرز سے کہا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں تیس جون کو سوشل میڈیا کا دن منائیں اور اس سلسلے میں ایک جگہ جمع ہو کر خصوصی تقریبات کا اہتمام کریں۔ اس دن کے حوالے سے ایونٹس کے انعقاد کے لیے یوزرز Mashable Meetup Everywhere کے پیج پر سائن اپ ہو کر اپنے ایونٹ کا

اہتمام کر سکتے ہیں۔

آیئے! ہم پاکستانی یوزرز بھی اس مہینے کی تیس تاریخ کو سوشل میڈیا کا دن منائیں۔ اس دن فیس بک، ٹوئٹر اور دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اپنی پوسٹس اور ٹوئٹس وغیرہ کے ذریعے سوشل میڈیا کی اہمیت اجاگر کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہم اس دن یہ عہد کریں کہ ہم سوشل ویب سائٹس پر منافرت پر مبنی، کسی کا دل دکھانے والی اور دوسروں کو نقصان پہنچانے والی کوئی تصویر، وڈیو یا تحریر پوسٹ نہیں کریں گے نہ ہی کسی ایسی پوسٹ کو شیئر کریں گے جو کسی بھی گروہ یا طبقے کے خلاف مغلظات اور نفرت انگیز مواد پر مشتمل ہو۔ ایسے کسی مواد کو پوسٹ کریں نہ شیئر جو ہماری مذہبی اور اخلاقی اقدار کے منافی ہو یا جو ہمارے ملک کے مفاد کے خلاف ہو۔ نہ ہی ہم کسی پوسٹ پر اشتعال انگیز اور نفرت پر مبنی کمنٹس دیں گے۔

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے منفی استعمال نہ کرنے اور اس کے منفی استعمال کی کسی کوشش کا حصہ نہ بننے کے ساتھ ہمیں سوشل ویب سائٹس کی اہمیت اور دنیا میں ان کے بڑھتے ہوئے کردار کو سمجھنا چاہیے اور اس حوالے سے دوسروں میں شعور اجاگر کرنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے یومِ سماجی میڈیا پر ہم انفرادی یا اجتماعی طور پر آگاہی مہم شروع کر سکتے ہیں۔ یوم سماجی میڈیا ہم اس پہلو

پر غور کرتے ہوئے اور اسے اجاگر کرتے ہوئے بھی منا سکتے ہیں کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ذریعے پاکستان کے بارے میں مثبت تاثر کیسے فروغ دیا جائے، کیسے ہم اپنی ثقافت، مصنوعات اور تفریحی مقامات سے دنیا کو متعارف کرائیں۔

## سوشل میڈیا ہر مرض کی دوا

کمیونیکیشن کی دنیا میں سوشل میڈیا موثر ترین ذرائع ابلاغ میں سے ایک بن چکا ہے اور ہر شعبے میں غلبہ حاصل کر رہا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ انٹرنیٹ تک رسائی کی سہولت رکھنے والا دنیا کا ہر باسی فیس بک، ٹوئٹر، انسٹا گرام یا کسی دوسرے سوشل نیٹ ورکنگ پلیٹ فارم کے ذریعے اپنے دوستوں اور خاندان سے رابطے رکھے ہوئے ہے۔ لوگ مختلف ضروریات اور وجوہات کے تحت سوشل ویب سائٹس استعمال کرتے ہیں، ان میں سماجی ویب سائٹس کو صحت سے متعلق معاملات کے حوالے سے استعمال کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

ایک تحقیقی مطالعے کے مطابق سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے یوزرز کی ایک تہائی تعداد جسمانی و ذہنی صحت سے متعلق مسائل کے حل اور آگاہی کے لیے ان سائٹس کو استعمال کرتی ہے۔ اس طرح یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ سوشل میڈیا کا فروغ ''ہیلتھ کیئر انڈسٹری'' میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لا رہا ہے، جو مریضوں، ڈاکٹروں اور اسپتالوں سمیت اس شعبے سے متعلق تمام افراد اور اداروں پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔

سوشل میڈیا ڈاکٹروں کو یہ سہولت فراہم کر رہا ہے کہ وہ مریضوں سے اس طرح طویل فاصلے کے باوجود رابطے میں رہیں جو ماضی کے برسوں میں ممکن نہیں تھا۔ امریکا کے ڈاکٹروں سے کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق اس سروے کا حصہ بننے والے ساٹھ فی صد ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ سوشل میڈیا نے مریضوں کی ہیلتھ کیئر کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہتر بنایا ہے۔ سماجی ویب سائٹس جس طرح اس شعبے میں خدمات انجام دے رہی ہیں ان میں سب سے نمایاں خدمت یہ ہے کہ اس کی بہ دولت فریقین یعنی ڈاکٹر اور مریض کے درمیان رابطوں کو فروغ ملا ہے۔

سوشل ویب سائٹس کے ذریعے مریض ڈاکٹروں سے اپنے کسی مرض، اس کے علاج اور دیگر متعلقہ معاملات کے بارے میں سوالات کر سکتے اور تفصیلات جان سکتے ہیں۔ یہ ڈاکٹروں پر منحصر ہے کہ وہ فوری طور پر یا سوال آنے کے ایک خاص وقت کے بعد ان کا جواب دیں۔ اسی طرح سوشل میڈیا ٹولز، جیسے Google Hangouts ( میسیجنگ اور وڈیو چیٹنگ کا ایک پلیٹ فارم ) کے ذریعے ڈاکٹر مریضوں سے پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ براہ راست انداز میں رابطے میں رہ سکتا ہے۔ یہ کھلے پن کی صفت رکھنے والا اور بروقت کمیونیکیشن مریض کو ڈاکٹر سے مزید مطمئن کرتا اور طبی مشورے دینے والے مسیحا پر اس کا اعتماد بڑھاتا ہے۔

ہیلتھ کیئر کے حوالے سے سوشل میڈیا کے ذریعے آنے والی تبدیلیوں کا زیادہ

تر انحصار اس پر ہوگا کہ مختلف امراض کا شکار افراد سماجی ویب سائٹس کو کس طرح برت رہے ہیں۔ دنیا میں مختلف بیماریوں میں مبتلا افراد اس وقت بھی سوشل ویب سائٹس، جیسے فیس بک، کو ایک دوسرے سے اپنے اپنے مرض، اس کے علاج اور اس کے نسخوں کے بارے میں معلومات کے حصول کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

یوزرز کی بہت بڑی تعداد صحت کے حوالے سے پوسٹس آن لائن شیئر کرنے کی سرگرمی تندہی اور پورے ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق صرف فیس بک پر آنے والی پوسٹس میں سے 24 فی صد صحت کی بابت ہوتی ہیں، اور یوزرز میں سے 27 فی صد ان پوسٹس پر کمنٹس کی صورت میں اپنی رائے دیتی ہے۔ یہ تحقیق بتاتی ہے کہ لوگ صحت سے متعلق ان مشوروں اور تجاویز پر اعتماد کرتے اور ان سے متعلق پوری سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو سوشل میڈیا پر ان کے دوستوں اور اہل خاندان کی طرف سے سامنے آتی ہیں۔

صحت سے متعلق معلومات فراہم کرنے اور ان کے حصول کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی مرض میں مبتلا مریض کسی ویب سائٹ پر اپنا ایک گروپ بنالیتے ہیں۔ جو لوگ اس گروپ میں شامل یوزرز کی طرح کے صحت سے متعلق مسائل کا شکار ہوتے ہیں وہ خود اور ان کے اہل خانہ اس گروپ سے ناتا جوڑ لیتے ہیں۔ کسی خاص مرض کے علاوہ اس طرح کے پیجز کسی ڈاکٹر، جدید طریقۂ علاج اور ادویات کے متعلق بھی

ہوتے ہیں۔ سوشل ویب سائٹس کے یہ پیجز ایک ایسی جگہ بھی ہوتے ہیں جہاں کسی ایمرجینسی کے وقت جاکر مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

ان پیجز اور گروپس میں عام یوزرز ہی کی شیئر کی ہوئی پوسٹس نہیں ہوتیں، بل کہ ان کے لیے کلینکس اور طب سے متعلق تنظیمیں بھی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ صرف مریض ہی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر ایک دوسرے سے وابستہ نہیں ہوتے، بل کہ ڈاکٹر بھی اس سائٹس کے ذریعے باہم رابطے میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹوئٹر، فیس بک اور لنکڈان پر اپنے ہم پیشہ افراد کو ''فالو'' کرتے ہیں اور ان سے رابطے میں رہتے ہوئے صحت، امراض اور علاج سے متعلق معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے وابستہ ہر ڈاکٹر طب سے متعلق مواد فراہم نہیں کر رہا، تاہم ان میں سے ہر ایک دیگر طبّی ماہرین کی فراہم کردہ معلومات پڑھ کر اور اس نوعیت کی وڈیوز کا مشاہدہ کرکے اپنی پیشہ ورانہ استعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس طرح وہ طب کی نئی تحقیقی کاوشوں، علاج کی جدید تیکنیکوں اور آئیڈیاز سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح سوشل میڈیا ڈاکٹروں کو یہ سہولت فراہم کر رہا ہے کہ وہ اپنے شعبے کے نئے رجحانات سے واقفیت اور معلومات حاصل کریں اور ان کے مطابق خود کو جدید تحقیق اور معلومات سے ہم آہنگ کرتے رہیں۔

سوشل میڈیا کی رابطوں اور تعلقات کی دنیا سے مختلف ممالک کے اسپتال بھی بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق امریکا میں ہر چار میں سے ایک اسپتال سوشل میڈیا سے وابستہ ہے اور صحت سے متعلق اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس طرح یہ ادارے سوشل ویب سائٹس کے ذریعے اسپتال کی دیواروں سے باہر مریضوں سے رابطے کے نئے راستے بنا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے بہت سے اسپتال اس قابل ہوگئے ہیں کہ وہ اپنے زیر علاج مریضوں یا وہ افراد جنھوں نے کبھی اسپتال میں علاج کروایا تھا، سے رابطے میں رہ سکیں۔ اسی طرح یہ اسپتال اپنی ویب سائٹس اور اپنے ڈاکٹروں کے لکھے ہوئے بلاگز کی تشہیر کر رہے اور ان کے ویورز کی تعداد بڑھا رہے ہیں۔

یوٹیوب پر بنائی جانے والی اسپتالوں کی سائٹس مریضوں کو ان اسپتالوں کے بارے میں آگاہی دینے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ سوشل میڈیا پر ہونے والی مریضوں، ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی یہ سرگرمیاں ہمیں صحت کے معاملات اور مسائل اور مختلف امراض کے بارے میں گھر بیٹھے آگاہی دینے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ تاہم پاکستان میں اس حوالے سے سرگرمیاں بہت محدود ہیں۔ جس طرح طب سے متعلق تنظیمیں اور فلاحی ادارے مفت میڈیکل کیمپ لگاتے ہیں، اسی طرح اگر ڈاکٹر اور اسپتال مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اپنے پیجز اور اکاؤنٹس

بنا کر کچھ وقت مریضوں کے لیے وقف کردیں، صحت کے حوالے سے کسی ایمرجینسی کی صورت حال میں مسئلے کا شکار شخص کی مدد کے لیے آن لائن ہیب کا سلسلہ شروع کریں یا مناسب فیس کے ساتھ آن لائن مشوروں کا اہتمام کریں تو اس سے لاتعداد لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے اور ملک میں صحت کے حوالے سے شعور میں اضافہ ہوگا۔

# افغانستان کے انتخابات: دھاندلیاں بے نقاب

ایک زمانہ تھا کہ تیسری دنیا میں ممالک میں الیکٹرانک میڈیا حکومت کی ملکیت ہوتا تھا اور اخبارات کو بھی سرکاری دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا تھا، پھر نجی ٹی وی چینلز کا سلسلہ شروع ہوا، مگر یہ چینلز بھی مجبوریوں، دباؤ اور ذاتی پسند ناپسند کے رجحان کے باعث اپنے ناظرین کو پورا سچ دکھانے میں ناکام رہے۔

یہاں تک کے مغرب کے ترقی یافتہ اور آزاد ترین معاشروں کے ذرائع ابلاغ پر بھی یہ الزام ہے کہ ان کی خبریں اور تجزیے بڑی حد تک مخصوص لابیز اور اپنے اپنے ملک کی اسٹبلیشمینٹ کے مفادات اور احکامات کے تابع ہوتے ہیں، اور جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے تو ان میں سے تو بہت سے ملکوں کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اب تک پابندیوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس صورت حال میں سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس ایک ایسے میڈیا کے طور پر سامنے آئی ہیں جس کے ذریعے عام آدمی براہ راست واقعات اور خبریں دنیا تک پہنچا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ حقائق چھپانے کے لیے کوشاں حکومتیں سوشل میڈیا اور اس کے یوزرز سے خائف اور ناراض رہتی ہیں۔

سوشل میڈیا کی اثر انگیزی اور طاقت کیا ہے، اس کا اندازہ افغانستان میں حال ہی میں ہونے والے انتخابات کے موقع پر بھی ہوا۔ جن انتخابات کو افغانستان کی کٹھ پتلی حکومت اور اس کے ہم نوا شفاف، منصفانہ اور غیر جانب دارانہ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، سوشل ویب سائٹس پر ان انتخابات کے حوالے سے سامنے آنے والی پوسٹس بتاتی ہیں کہ ان میں کس پیمانے پر اور کس کس طرح کی دھاندلیاں کی گئی ہیں۔

کئی عشروں سے جنگ اور بدامنی کے عذاب سہتا اور پس ماندگی کی مثال سمجھے جانے والے افغانستان کے یوزرز سوشل میڈیا پر بہت بڑی تعداد میں الیکشن میں ہونے والی مختلف نوعیت کی دھاندلیوں کے ثبوت وڈیوز اور تصاویر کی صورت میں سامنے لائے ہیں اور انھوں نے افغان حکام سے اس سلسلے میں نوٹس لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ اسمارٹ فونز سے ملک کے مختلف پولنگ اسٹیشنز پر بنائی جانے والی افغان یوزرز کی یہ وڈیوز اور تصاویر جعلی ووٹ بھگتانے، رائے دہندگان کو پولنگ بوتھ سے باہر ہراساں کرکے ان کی مرضی کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور کرنے اور گلیوں میں بکھرے بیلٹ پیپرز کے مناظر پر مشتمل ہیں۔

سوشل میڈیا پر آنے والی ان وڈیوز نے افغانستان کے حالیہ انتخابات پر سوالیہ نشان لگادیا ہے۔ افغانستان کے ''الیکشن کمپلینٹس کمیشن'' کے ترجمان

نادر محسنی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر آنے والی ان وڈیوز کے حوالے سے کہتے ہیں کہ سوشل ویب سائٹس پر آنے والی زیادہ تر وڈیوز ان جگھوں یا علاقوں کی ہے جہاں حکومت کی رسائی نہیں تھی۔

افغان یوزرز کی جانب سے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر آنے والی وڈیوز میں سے ایک میں تین نوجوان اور ایک کم عمر لڑکا بہت تیزی کے ساتھ اور مضطربانہ انداز میں ایک کے بعد ایک بیلٹ پیپرز پر ٹھپے لگاتے نظر آرہا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ٹھپے صدارتی امیدوار اشرف غنی احمدزئی کی حمایت میں لگائے جارہے ہیں، تاہم کچھ ٹھپے افغانستان کی صدارت کے دوسرے امیدوار عبداللہ عبداللہ کے لیے بھی لگائے جارہے ہیں۔ یہ وڈیو فیس بک پر تیرہ سو مرتبہ سے زیادہ شیئر کی گئی ہے۔

افغانستان کے انتخابات کے حوالے سے سوشل میڈیا پر آنے والے ایک اور وڈیو کلپ میں، جو بہت بڑے پیمانے پر شیئر کی ہے، میں ایک عورت انتخابی قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسری عورت سے کہہ رہی ہے کہ وہ ایک مخصوص امیدوار کے حق میں ووٹ دے، جب کہ جس خاتون سے مخصوص امیدوار ووٹ دینے کو کہا جارہا ہے وہ برہمی کے ساتھ جواب دے رہی ہے، ”قانون مت توڑو، مجھے یہ مت بتاؤ کہ میں کیا کروں، یہ میرے لوگ ہیں۔“

افغانستان جیسے پس ماندہ اور جنگ زدہ ملک میں یوزرز کی جانب سے اسمارٹ فونز اور سوشل میڈیا کے ذریعے انتخابات کی دھاندلیاں اور بے قاعدگیاں سامنے لانے کا عمل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کا باہمی ربط کس طرح ان حقائق کو آشکار کر سکتا ہے اور کر رہا ہے جو کسی اور ذریعے سے سامنے آنا ممکن نہیں، یوں جن مقامات تک الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی رسائی ممکن نہیں، سوشل میڈیا وہاں بھی موثر انداز میں کام کر رہا ہے۔

## وہ پانچ مہمات

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کو مختلف حوالوں سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔
ان سائٹس کے منفی پہلو اپنی جگہ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماجی ویب سائٹس کا جہاں، جسے ہم سوشل میڈیا کے نام سے جانتے ہیں، بہت سے مثبت پہلو بھی رکھتا ہے، جس کا ایک ثبوت سوشل میڈیا پر شروع کی جانے والی مختلف تحریکیں اور مہمات ہیں۔
اس مضمون میں ہم سوشل میڈیا پر شروع کی جانے والی ایسی پانچ مہمات کا تذکرہ کر رہے ہیں جو کسی مثبت اور انسان دوست مقصد کے تحت چلائی گئیں، انھوں نے زبردست پذیرائی حاصل کی یا وہ کسی منفرد اور بہت اچھے مقصد کے لیے چلائی جا رہی ہیں۔
سوشل میڈیا پر چلائی جانے والی ایسی مہموں اور تحریکوں کے بارے میں جاننا ضروری ہے، جس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم اور آپ بھی کسی بلند مقصد کے لیے سوشل میڈیا کی طاقت کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

Movember

مونچھوں والی تحریک

یہ مردوں کی صحت کے معاملات سے آگاہی پھیلانے کے لیے چلائی جانے والی ایک سوشل میڈیا مہم تھی۔ اس مہم کی شروعات 2003 میں ہوئی۔ اس دل چسپ مہم کا مقصد

مردوں اپنی صحت بہتر بنانے اور برقرار رکھنے کے لیے مونچھیں رکھنے پر آمادہ کرنا تھا۔
مونچھ) اور نومبر کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ اس مہم کے ( "moustache" اس مہم کا نام
تحت ایک کمیونٹی وجود میں آگئی تھی، جس کے ارکان آپس میں پُرمزاح اور شگفتہ پوسٹس
شیئر کرتے تھے۔

اس مہم کی کام یابی اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے
مردوں کے صحت کے ضمن میں اب تک 63.9 ملین یورو کی خطیر رقم پر مبنی فنڈ جمع کیا
جاچکا ہے۔ گذشتہ سال یعنی 2013 میں اس مہم کے فیس بک پیج تک رسائی اور ٹوئٹر پر
اس کے ری ٹوئٹس کی تعداد میں پینتالیس فی صد اضافہ ہوا۔ اس مہم کے شروع ہوتے
ہی پہلے دن اس کے پیج پر 35,000 پوسٹس کی گئیں اور گذشتہ سال اس مہم کے سلسلے
میں پوسٹ کی گئی تحریروں اور تصاویر کی تعداد ایک اعشاریہ دو ملین تک جا پہنچی تھی۔
اگرچہ ''مومبر'' مردوں کی صحت کے معاملات اور انھیں لاحق ہونے والی سرطان کی
دیگر اقسام کے حوالے سے شعور اجاگر کرنے میں بھی سرگرم ہے، تاہم اس مہم کی توجہ کا
مرکز Prostate کینسر ہے اور اس مہم کے ذریعے Prostate کینسر کے علاج کے سلسلے
میں فنڈ جمع کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اس مرض سے بچنے کے لیے آگاہی فراہم کی جاتی
ہے۔ یہ مہم مومبر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام چلائی جارہی

کے پلیٹ فارم پر چیریٹی ایونٹ منعقد کرتی ہے۔ اس مہم Movember.com ہے، جو کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے، ''مردوں کی صحت کا چہرہ بدل دو'' اور مونچھیں رکھنے کا عمل صحت کے چہرے کی اسی تبدیلی کا اظہار یا علامت ہے۔

International Man of اس مہم کے تحت ہر سال دنیا بھر سے اکیس منتخب کیے جاتے ہیں۔ ان منتخب کردہ افراد کو تاج پہنائے جاتے ہیں اور Movember یہ پورے سال کے لیے مومبر مہم کا چہرہ قرار پاتے ہیں۔ 2011 میں گوگل کروم اور مومبر مہم کے اشتراک سے ایک وڈیو بنائی گئی، جو یہ دکھاتی ہے کہ مومبر مہم کے ارکان کو استعمال کرتے ہوئے کس طرح اپنے مقصد یعنی مردوں کی Movember.com صحت کے حوالے سے شعور اجاگر کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مومبر مہم مختلف اداروں اور کمپنیوں کے اشتراک سے اپنے مقصد کو آگے بڑھنا کے لیے سرگرمیاں انجام دے رہی ہے۔

Action on Hearing Loss

سماعت سے محروم افراد کے لیے

یہ مہم برطانیہ سے تعلق رکھنے والے ان 9 ملین افراد کے لیے شروع کی گئی جو پیدائشی طور پر بہرے ہیں یا کسی حادثے یا بیماری کے باعث سماعت سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ بہت سادہ مگر بڑی پُراثر سوشل میڈیا مہم ہے۔ اس مہم سے وابستہ ارکان نے گذشتہ برس کرسمس کے حوالے سے بنائے جانے والے ٹی وی کے

اشتہارات کے ساتھ ''سب ٹائٹلز'' کا سلسلہ محض ٹوئٹر پر ٹوئٹس کے ذریعے شروع کروادیا تھا۔

کے تحت برطانیہ میں سماعت سے محروم افراد کے ضمن Action on Hearing Loss میں قوانین اور پالیسیاں تبدیل کرنے کی مہم جاری ہے۔ ''ایکشن آن ہیئرنگ لوس'' کے کاآن لائن سلسلہ بھی free, confidential online hearing check تحت شروع کیا گیا ہے، جہاں یوزرز اپنی سماعت کی آزمائش کر سکتے اور اس حوالے سے چیک اپ کروا سکتے ہیں۔

nomakeupselfie

اے بی بیو! میک اپ نہ کرو

اس مہم کا آغاز خواتین کی میک کے بغیر اپنی تصاویر مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر پوسٹ کرنے سے ہوا۔ یہ مہم میک اپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے صحت کے مسائل کے بارے میں شعور اجاگر کرنے اور خواتین کو میک اپ سے گریز پر مائل کرنے کے لیے چلائی جارہی ہے۔

اس مہم کے تحت خواتین سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بغیر بناؤ سنگھار کی تصویریں پوسٹ کرنے، جو کسی خاتون کے لیے یقیناً بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس مہم کے تحت اس کے شروع ہوتے ہی صرف ایک ہفتے کے دوران اب تک آٹھ ملین یورو بہ

طور فنڈ جمع کر لیے گئے۔

UNICEF- Likes Don't Save Lives

لائیکس کافی نہیں

بچوں سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کی سویڈن کی شاخ نے بیتے سال ایک مہم چلائی، جس کا مقصد سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے یوزرز کو یہ باور کرانا تھا کہ بچوں کی صحت بچانے کے لیے یہ کافی نہیں کہ بس فیس بک پر موجود یونیسیف کے پیج کو لائیک کر دیا جائے۔ اس حوالے سے چار وڈیوز بنا کر یوٹیوب پر لائی گئیں، جن میں سے ایک وڈیو میں ایک بچہ طنزیہ طور پر کہہ رہا ہے کہ وہ (اپنی زندگی کے حوالے سے پُرامید ہے کیوں کہ فیس بک کے یونیسیف کے پیج کو ملنے والے لائیکس کی رقم آچکی ہے۔ ان وڈیوز میں سے ہر ایک کا اختتام اس پیغام پر ہوتا ہے کہ لائیکس ویکسینیشن کے لیے فنڈ کی صورت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس مہم کے دوران ان وڈیوز کو 195 ملکوں میں 750 مرتبہ دیکھا گیا اور ان کے حوالے سے ٹوئٹر پر 10,500 ٹوئٹس کیے گئے۔ 000 ,

Rethink- #FindMike

محسن کی تلاش

Jonny اس مہم کا آغاز ذہنی عارضے شیزوفرینیا کے خطرناک حالت کو پہنچے ہوئے ایک کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ وہ ایک Jonny Benjamin نے کیا تھا۔ Benjamin

پل سے کود کر جان دینے والا تھا، مگر اسے بچالیا گیا۔ جونی نے یہ مہم اس شخص کی تلاش کے لیے فیس بک اور ٹوئٹر پر شروع کی تھی جس نے اس کی جان بچائی اور اس کی زندگی بدل ڈالی۔ جونی کو اپنے محسن کا نام تک معلوم نہ تھا، تاہم اس نے اسے مائیک کا نام دے کر یہ مہم شروع کردی تھی۔

چھ سال پہلے شروع ہونے والی اس مہم کے دوران دیگر ذرائع ابلاغ کے ساتھ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کا بھی بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا۔ اس مہم کے فیس بک پیج کو 5,000 لائیکس ملے اور اس کے ٹوئٹر پر بنائے گئے اکاؤنٹ کو2,600 فالوورز مل گئے۔ ساتھ ہی اس ایشو پر ٹوئٹر پر ٹوئٹس اور ری ٹوئٹس کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

کئی ملین افراد نے جونی کی کہانی سوشل ویب سائٹس پر شیئر کی۔ آخر کار Neil Laybourn نامی وہ محسن مل ہی گیا جس کی جونی کو تلاش تھی۔ نیل نے جونی سے رابطہ کیا، ان کی ملاقات ہوئی، یوں جونی کی بھرپور طریقے سے شروع کی جانے والی محسن کی تلاش کی یہ مہم سوشل میڈیا کے لاتعداد یوزرز کی مدد سے کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

# سارا بکھرا سامان جمع کریں ایک جگہ

ہم جنھیں سوشل میڈیا کا یوزر کہتے ہیں ان کی بھاری اکثریت عموماً کسی ایک ہی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ سے وابستہ ہوتی ہے یا کم از کم یہ یوزرز کسی ایک ہی سائٹ پر متحرک ہوتے ہیں۔

مثلاً جن خواتین و حضرات کو فیس بک کی لت لگ گئی ہے، وہ ٹوئٹر اور دیگر سماجی ویب سائٹ پر اکاؤنٹ بنانے کے باوجود ان ویب سائٹس کا رخ کم ہی کرتے ہیں، اسی طرح جن کے سروں میں ٹوئٹر کا جنون سمایا ہوا ہے وہ کبھی کبھار ہی اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر لاگ ان ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کی اپنی اہمیت ہے۔ سوشل میڈیا اب محض تفریح، دل بستگی، فرصت کے لمحات میں بے زاری مٹانے اور روابط بڑھانے کا ذریعہ نہیں، بل کہ یہ آپ کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی کارآمد ثابت ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، اسی طرح سوشل ویب سائٹس کے ذریعے آپ اپنے فن، اپنی صلاحیت، ذہانت اور کسی مہارت کا اظہار بھی بھرپور طریقے سے کر سکتے اور اس سے ایک دنیا کو متعارف کرا سکتے ہیں۔

سوشل میڈیا کے یوزرز، خاص طور پر وہ افراد جو سماجی ویب سائٹس کے ذریعے اپنی کسی مہارت یا صلاحیت کا اظہار چاہتے ہیں، کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہوتا

ہے کہ وہ وقت کی کمی کے باعث کئی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر متحرک نہیں رہ سکتے۔ اگر ایسا کوئی یوزر فیس بک پر متحرک ہے تو اس کا ٹوئٹر اکاؤنٹ خاموش ہی رہتا ہے، اگر اس کی توجہ کا مرکز یوٹیوب ہے تو وہ فیس بک اور ٹوئٹر پر سرگرمیاں جاری نہیں رکھ پاتا، اگر وہ انسٹا گرام، لنکڈان یا فلکر پر اپنی صلاحیتوں کے اظہار اور مہارتوں کو سامنے کے لیے متحرک ہے تو یوٹیوب اور دیگر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے دور رہتا ہے۔ دراصل کم ہی یوزرز جانتے ہوں گے کہ ایک ذریعہ ایسا بھی ہے جسے استعمال کرتے ہوئے ہم اپنی کاوشیں ایک ساتھ مختلف سماجی ویب سائٹس پر سامنے لا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے ذوق اور شوق کے مطابق یہ بھی جان سکتے ہیں کہ مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر موجود اپنے مطلب کی پوسٹس اور شیئرنگز دیکھ سکتے اور ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے ایک ساتھ استفادہ کرنے کا یہ عمل یا ذریعہ سوشل میڈیا کی دنیا میں Social network aggregation کے نام سے معروف ہے۔ Social network aggregation دراصل ایسا پروسیس ہوتا ہے جس کے ذریعے مختلف سوشل نیٹ ورکس پر موجود کسی ایک یوزر کا کونٹینٹ یا یکساں نوعیت کا حامل مواد جمع کرکے ایک ہی جگہ پر لے آیا جاتا ہے۔ یہ ہدف پورا کرنے والے کو سوشل میڈیا کی دنیا کی اصطلاح میں ''سوشل نیٹ ورک ایگریگیٹر'' کہا جاتا ہے، جو تمام متعلقہ معلومات ایک ''سنگل لوکیشن'' پر جمع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ

ہی ''سوشل نیٹ ورک ایگریگیٹر'' مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر بنائے جانے والے پروفائلز کو ایک ہی پروفائل کی صورت میں یک جا کرنے میں یوزر کی مدد کرتا ہے۔

اس سلسلے میں بہت سی ایگریگیشن سروسز اپنی خدمات فراہم کرتی ہیں۔ یہ سروسز یوزرز ایسی ونڈو یا ٹیکسٹ باکس جہاں یوزر بہ آسانی مواد کو تبدیل widget ) کو ٹولز اور کرسکے ) فراہم کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ یہ سروسز یوزرز کو ان کے میسیجز منضبط کرنے، دوستوں تک رسائی، بک مارکس ایک جگہ لانے اور کسی مواد یا دوست کی ایک ساتھ کئی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر تلاش کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان سروسز کے فراہم کردہ ٹولز کی مدد سے یوزر مختلف سماجی ویب سائٹس پر آر ایس ایس ویب فیڈز ) بھی حاصل کرسکتے ہیں اور یہ بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ کسی سائٹ پر ان ) کا نام کسی کمنٹ یا پوسٹ وغیرہ میں کہاں آیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی یوزر ان سروسز کی مدد سے مختلف سہولتیں حاصل کرسکتے ہیں۔

کے نام سے سرگرم پلیٹ فارمز یوزرز کو یہ Social network aggregators ڈگ، ڈیلیشیس پر کی ،Stumbleupon ، موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ یوٹیوب، ٹوئٹر جانے والی اپنی سرگرمیاں دیگر اہم اور مقبول سماجی ویب سائٹس پر ایک ساتھ شیئر کریں۔ یوزرز کا تمام کونٹینٹ ایک ساتھ ایک ہی وقت میں اس مخصوص کمیونٹی میں

سامنے آتا ہے جسے یوزرز سبکرائب کرتے ہیں، جس کی وجہ سے یوزر اپنے مواد کو ایک سے زیادہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر لانے کے لیے ایک سائٹ سے دوسری سائٹ پر جانے کے جھنجھٹ سے بچ جاتا ہے اور یوں اس کے وقت کی بچت ہوتی ہے۔

APIs'' تیکنیکی طور پر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کی جانب سے فراہم کردہ

کے ذریعے یوزر اس سہولت (Application programming interface) ''

سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یوزر کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ سوشل ایگریگیشن پلیٹ فارم کو اپنی آئی ڈی اور پاس ورڈ فراہم کرے۔ اس کے مشترکہ پروگرام "data portability workgroup" حوالے سے کچھ سائٹس کے تحت کام کر رہی ہیں، جب کہ اس سلسلے کی دیگر سائٹس ''سنگل سائن آن سسٹم'' کے کہا جاتا ہے، یوزرز کو یہ سہولت فراہم کر رہی ہیں۔ OpenID تحت، جس

سوشل نیٹ ورک ایگریگیشن سروسز کے ذریعے یوزر اپنی سوشل میڈیا ایکٹیویٹیز کا دائرہ کار بڑھا سکتا ہے اور ایک ساتھ کئی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر بہ یک وقت سرگرم رہ سکتا ہے۔ یہاں ہم کچھ سوشل نیٹ ورک ایگریگیشن پلیٹ فارمز کا تعارف بھی دیے دیتے ہیں تاکہ اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے خواہش مند یوزرز کو اپنی خواہش کی تکمیل میں آسانی ہو۔

Flipboard

فلپ بورڈ ایک سوشل آن لائن میگزین ہے، جس کا ایڈریس ہے

https://flipboard.com/۔ یہ سائٹ آئی پیڈ، آئی فون اور آئی پوڈ ٹچ پر بہترین کام کرتی ہے، ساتھ ہی اس کی سہولت Android فون کے بیٹا ورژن پر بھی دست یاب ہے۔ یہ ایک فری ایپلیکشن ہے جسے آپ بہ آسانی ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔اس پلیٹ فارم پر اپنا اکاؤنٹ بنانے کے بعد یوزر کو ہر اس ویب سائٹ پر لاگ آن ہونا ہوگا جہاں اس کا اکاؤنٹ ہے، جس کے بعد فلپ بورڈ یوزر کا ان سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر موجود مواد مختلف سائز کی تصاویر اور مختلف فونٹ کی پوسٹس کو یک جا کرکے سامنے لے آئے گی۔ ساتھ ہی اس مواد پر مبنی پیج خودکار طریقے سے خوب صورت لے آؤٹ اختیار کرتے ہوئے ڈیزائن بھی ہوجائے گا۔ اس ایپلی کیشن کے ذریعے یوزر تمام سائٹس جن پر اس کا اکاؤنٹ ہے کا مواد ایک جگہ پائے گا، یہ پیج اپ ڈیٹ ہوتا رہے گا اور یوزر ان سائٹس پر کمنٹس بھی کرسکے گا۔

Glossi

گلوسی پانچ ویب سائٹس پر موجود یوزر کا مواد یک جا کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے۔

http://glossi.com/ اس سائٹ کا ایڈریس ہے۔ یہ سائٹ یوزر کو پروفائل اور پرسنل ہوم پیج کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ اس سائٹ پر تصاویر ہائی

کوالٹی میں سامنے آتی ہیں۔ اس پلیٹ فارم پر جن سائٹس پر موجود یوزرز کے کونٹینٹ کو یکجا کرنے کی سہولت فراہم کی جاتی ہے وہ یہ ہیں، ٹوئٹر، فیس بک، انسٹاگرام اور ٹمبلر۔ Foursquare،

RebelMouse

اس سلسلے کے دیگر پلیٹ فارمز کے مقابلے میں یہ سروس ابھی نئی ہے۔ یہ سروس صرف دو سوشل نیٹ ورکنگ سے مواد حاصل کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے، جن میں ٹوئٹر اور فیس بک شامل ہیں۔ یہ سائٹ یوزر کو سہولت فراہم کرتی ہے کہ وہ پوسٹس وغیرہ کو اپنی مرضی کا سائز دے سکے اور انھیں ری ارینج کرسکے۔ اس سائٹ کا ایڈریس

https://www.rebelmouse.com/۔ ہے

Hootsuite

Hootsuite دراصل ایک سوشل میڈیا ڈیش بورڈ ہے، جس کے ذریعے عام یوزر اور تجارت پیشہ افراد مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر کی جانے والی اپنی پوسٹس وغیرہ کو ایک ہی جگہ پر دیکھ سکتے اور ان کے بارے میں اپ ڈیٹ حاصل کرسکتے ہیں۔ یوزر کا مواد یکجا کرنے کے ساتھ یہ سائٹ انھیں ان کے کونٹینٹ کے حوالے سے جائزے اور تجزیے کی سہولت بھی فراہم کرتی ہے اور وہ یہ جان سکتے ہیں کہ ان کے کس ٹوئٹ یا پوسٹ کو کتنی پذیرائی ملی۔ اس سائٹ کا ایڈریس ہے

https://hootsuite.com/۔

## Flavors.me

اپنی نوع کی دیگر سائٹس کے مقابلے میں خاصی تاخیر سے سامنے آئی۔ Flavors.me تاہم یوزرز کے مختلف ویب سائٹس پر پھیلے مواد کو ایک جگہ جمع کرنے والے دیگر پلیٹ فارمز کے مقابلے میں یہ سائٹ ان سے آگے نکل گئی ہے۔ اس سائٹ کی مدد سے یوزر اپنا تمام آن لائن مواد ایک جگہ لا کر اسے اپنی ویب سائٹ کی صورت دے سکتا ہے۔ اس سائٹ کا ایڈریس ہے http://flavors.me/ ۔ یہاں یوزر پینتیس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر موجود اپنا مواد جیسے تصاویر، اپ ڈیٹس، وڈیوز میوزک اور دیگر کونٹینٹ ایک جگہ لا سکتا ہے۔ اس سائٹ کو استعمال کرنے والا یوزر کسٹمائز یوزر نیم بھی اختیار کرنے کی سہولت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سائٹ یوزر کو اس کے پیج کے لیے 222 مختلف فونٹس اور 7 لے آؤٹس اپنانے کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اپنی موجودگی یقینی بنانے اور ان سائٹس پر پھیلا ہوا اپنا کونٹینٹ ایک جگہ جمع کرنے کے خواہش مند یوزرز کے لیے Flavors.me کو ایک بہترین سائٹ تصور کیا جاتا ہے۔

## ”آنے والا ہے، ٹوئٹر کا ”لائی ڈیٹیکٹر

سوشل میڈیا جہاں تفریح کے ساتھ معلومات اور خبریں فراہم کر رہا ہے، وہیں اس کے ذریعے جھوٹ اور افواہیں پھیلانے کا مکروہ عمل بھی جاری ہے۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ مخصوص مفادات کے حامل گروہ، جن میں سیاسی، مذہبی، مخصوص افکار کے حامل، کاروباری مفادات رکھنے والے اور محض تفریحاً افواہ پھیلانے والے، سب ہی قسم کے گروہ شامل ہیں، جعل سازی اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کوئی پوسٹ بناتے اور پھیلاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسی پوسٹس سنگین نوعیت کے واقعات کا بھی سبب بن جاتی ہیں، جیسے گذشتہ دنوں پاکستان کے ایک واقعے کی تصویر کے بھارت کے کسی شہر میں مسلمانوں کے ہندو لڑکے پر تشدد کے جھوٹ کے ساتھ پھیلایا گیا، جس پر فسادات بھڑک اٹھے تھے۔

ان ویب سائٹس میں ٹوئٹر سرفہرست ہے جن کے ذریعے خبریں اور معلومات تیزی سے دنیا بھر میں پھیلتی ہیں۔ چناں چہ اسی ویب سائٹ کے ذریعے جھوٹا مواد اور افواہیں بھی پھیلائی جاتی رہی ہیں۔

اب تک تو یہ ہوتا رہا، مگر اب بہت جلد ایک ''لائی ڈیٹیکٹر'' تکمیل کے مراحل میں ہے۔ یہ سوفٹ ویئر یا سسٹم ابھی تیاری کے مراحل میں ہے، اور اسے خاص طور پر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ٹوئٹر کے لیے بنایا جارہا ہے۔ یہ سوفٹ ویئر ٹوئٹر پر دی جانے والی کسی پوسٹ کے اپ لوڈ ہونے سے پہلے ہی اس کا فوری طور پر تجزیہ کرکے اس کے بارے میں بتاسکے گا کہ اس میں جو کچھ دکھایا یا بیان کیا گیا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ پر مبنی۔ اس سوفٹ ویئر کے ذریعے یہ بھی معلوم کیا جائے گا کہ اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ پر موجود کوئی اکاؤنٹ محض جعلی پوسٹس کرنے ہی کے لیے تو نہیں بنایا گیا۔

سوشل میڈیا کے حوالے سے بنائے جانے والے اس لائی ڈیٹیکٹر کی تخلیق کا مقصد حکومتی اداروں، خاص کر قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ایمرجینسی سروسز کی مدد کرنا ہے۔

اس لائی ڈیٹیکٹر کے پروجیکٹ کی شروعات 2011 میں برطانیہ میں ہونے والے فسادات کے پیش نظر ہوئی، جو Mark Duggan نامی ایک شخص کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت سے شروع ہوکر پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔ ان فسادات کے پھیلنے کا بنیادی سبب سوشل میڈیا اور موبائل ڈیوائسز قرار پائی تھیں، اس لیے انھیں ''بلیک بیری رائٹس'' (BlackBerry riots) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ

پروجیکٹ یونی ورسٹی آف واروک میں سوشل انفاریمیٹکس کے پروفیسر روب پروکٹر سے متاثر ہے، جنھوں نے 2011ء میں لندن میں ہونے والے فسادات کے دوران ٹویٹر کے ذریعے پھیلنے والی افواہوں کا تجزیہ کیا تھا۔

لندن کے چڑیا گھر سے جانوروں کو آزاد کروانے اور ''لندن آئی'' کو نذرِ آتش کرنے کی خبریں افواہیں ثابت ہوئی تھیں۔ پروکٹر کی تحقیق کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ ٹوئٹر خود بھی افواہوں کے خاتمے کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کام کے لیے باقاعدہ ملازمین موجود ہیں، مگر انسانوں کے مقابلے میں یہ سوفٹ ویئر انتہائی کم وقت میں یہ کام انجام دے سکے گا۔

اس سلسلے میں تحقیقی کام برطانیہ کی یونی ورسٹی آف شیفلڈ میں Dr Kalina Bontcheva کی زیرِ سربراہی جاری ہے۔ نئے ٹوئٹر کے حوالے سے تحقیقی کام میں برطانیہ کی پانچ جامعات اور چار مختلف کمپنیوں سے وابستہ محققین تندہی سے مصروفِ عمل ہیں۔ اس ضمن میں ٹوئٹر اور فیس بک سمیت مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ڈیٹا کا تجزیہ کیا جارہا ہے۔

Dr Kalina Bontcheva کہتے ہیں کہ یہ سسٹم کسی پوسٹ کے ذرائع کی درجہ بندی

کرتے ہوئے اس پوسٹ کی اتھارٹی تک رسائی حاصل کرے گا۔ یہ سسٹم نیوز آؤٹ لیٹس، صحافیوں، ماہرین، چشم دید گواہ اور ایسے اکاؤنٹ جو خودکار طریقے سے پوسٹ تشکیل دے دیتے ہیں، کی درجہ بندی کرکے پوسٹ کی حقیقت کا پتا لگائے گا۔

اس کے علاوہ یہ سسٹم جھوٹ پر مبنی پوسٹ دینے والے اکاؤنٹ کے بارے میں تحقیق اور تجزیہ کرکے یہ پتا لگائے گا کہ کیا یہ اکاؤنٹ حقیقی ہے یا صرف افواہیں پھیلانے کے لیے بنایا گیا ہے۔

یہ پروجیکٹ جسے افواہوں کے پھیلاؤ کے حوالے سے شہرت رکھنے والے یونانی دیومالائی کردار Pheme کا نام دیا گیا ہے، امید کی جارہی ہے کہ اس کے ذریعے جھوٹ اور افواہوں پر مبنی پوسٹس کے تدارک کیا جاسکے گا۔

اس طرح یورپی ماہرین سوشل میڈیا خاص طور پر 'ٹوئٹر ورلڈ' کو جھوٹ سے پاک بنانے کے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ Pheme کے نام سے زیر تکمیل یہ پروجیکٹ خبروں کے مآخذ، ٹوئٹس کے ذریعے ہونے والی بات چیت، اور ٹوئٹس میں استعمال کی جانے والی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے معلومات کے صحیح اور غلط ہونے میں تمیز کرسکے گا۔ شیفلڈ یونی ورسٹی میں ٹیکسٹ مائننگ کی ماہر Kalina Bontcheva کا کہنا ہے کہ یہ سوفٹ ویئر ہیجان انگیز زبان اور احساسات کی

شناخت کر سکے گا جو عام طور پر لوگ مبالغہ آرائی کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ محققین اس امر کا تعین کرنے کے لیے تاریخی معلومات کا بھی جائزہ لے رہے ہیں کہ ماضی میں ٹوئٹر کے ذریعے کون کون سی اہم افواہیں پھیلیں، اور ٹوئٹر کے کون سے یوزر 'اسپام بوٹ' ہو سکتے ہیں۔ اسپام بوٹ سے مراد ٹوئٹر کے وہ اکاؤنٹ ہیں جنھیں کوئی انسان نہیں بل کہ مشینیں آپریٹ کرتی ہیں۔

فسادات کے دوران یہ سوفٹ ویئر خبروں اور افواہوں میں فرق کرنے میں مدد معاون ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ طبّی معلومات کی صحت کی تصدیق اور مختلف بیماریوں سے متاثر ہونے والے علاقوں کے بارے میں بھی اس کے ذریعے درست معلومات یوزرز تک پہنچ سکیں گی۔ محققین کا کہنا ہے کہ اس سوفٹ ویئر کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے، انھیں باہم مربوط کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دینے کا ذریعہ ہے۔ یوں اس کی حیثیت محض تفریح کے ذریعے کی نہیں رہتی، بل کہ یہ دنیا کو پُرامن بنانے اور لوگوں کو ایک دوسرے سے مکالمے کے راستے پر لانے کا بھی وسیلہ ہے۔ تاہم ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس میڈیا کو نفرت اور تشدد کو ہوا دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ معاملہ سوشل ویب سائٹس کے ذریعے اشتعال انگیز مواد پھیلانے تک محدود

نہیں ہے، بل کہ جعلی وڈیوز اور تصاویر کے ذریعے جھوٹ پر مبنی مواد پھیلایا جاتا اور متعلقہ فریقین کے مشتعل کیا جاتا ہے۔

خاص طور پر ایسے وقت میں جب کوئی ملک یا سماج کسی بھی قسم کے فسادات کا شکار ہو، اس قسم کا جھوٹا اور افواہوں پر مبنی مواد آگ اور بارود شابہت ہوتا ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں سوشل ویب سائٹس کو، ٹوئٹر کے حوالے سے زیر تکمیل سوفٹ ویئر کی طرح، کوئی میکنیزم تیار کرنا ہوگا، جس کے ذریعے جھوٹ اور افواہوں کا سدباب کیا جاسکے اور انھیں پھیلنے سے روکا جاسکے۔

## !بنت حوا کھلونا نہیں

ریاست کی طرف سے اپنے شہریوں کے جان ومال کی حفاظت کی طرح اس کی عزت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔

کسی کی طرف سے اگر کسی کا جان یا مال غصب کیا جاتا ہے، تو یہ ایک سنگین جرم ہے۔ اس کے باوجود ملزم کی طرف سے اس فعل کو کسی طرح جواز دے دیا جاتا ہے، کہ اس نے شدید مجبوری یا اضطراب میں اس کا ارتکاب کیا، لیکن کسی کی آبرو پر وار کرنے والے کے پاس اس کے سوا کوئی جواز نہیں ہوتا کہ وہ انسانیت کے آخری زمرے سے بھی نکل چکا ہے۔

قوانین کے مطابق زنا بالجبر کے مجرم کی سزا عمر قید ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ 24 سال قید۔ یہ عرصہ دن رات ملا کر 12 سال ہو جاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس درندگی کے مرتکب شخص کو سرعام پھانسی دی جائے، تاکہ آئندہ کوئی ”گدھ“ کسی کی زندگی کو نوچنے کی ہمت نہ کر سکے۔

کچھ دن پہلے آبرو ریزی کے حوالے سے بنائے گئے قانون میں ترمیم کا ایک بل سینیٹ میں پیش کیا گیا، جس کے تحت جنسی زیادتی کے مقدمات میں ناقص تفتیش پر

بھی سزائیں تجویز کی گئیں۔ اس تجویز کو قانون کی شکل اختیار کرنی چاہیے، مگر سزا تو آپ اس وقت تجویز کریں، جب ان پر عمل درآمد کیا جا رہا ہو، یہاں تو جرم ثابت ہی نہیں ہوتا۔

انسدادِ زنا بالجبر کے ترمیمی بل میں تجویز کیا گیا ہے کہ تھانے، اسپتال، دارالعلوم اور فلاحی اداروں سمیت کسی بھی جگہ کوئی سرکاری اہل کار اپنے زیر نگرانی کسی خاتون یا کسی بھی شخص کے ساتھ زنا بالجبر کا مرتکب ہو تو اسے سزائے موت کی عمر قید کی سزا دی جائے۔ اس بل میں کم عمر بچوں اور حاملہ خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والے اہل کاروں کے لیے بھی موت یا عمر قید کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ ترمیمی بل میں اجتماعی زیادتی کے مرتکب ایسے اہل کار جن کے عزائم مشترک ہوں، کے لیے بھی یہی سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ یہ بل کہتا ہے کہ اس مظلوم عورت یا متاثرہ شخص کا نام ظاہر نہ کیا جائے اور نہ ہی اخبارات میں شایع کیا جائے۔ ایسا کرنے والے کو دو سال قید یا جرمانے کی سزا دی جائے۔ ساتھ ہی زنا بالجبر کے مقدمے میں بطور تفتیشی افسر فرائض میں کوتاہی اور عدالت میں مقدمے کی مناسب پیروی نہ کرنے کے عمل کو جرم مانا جائے۔ ایسی کوتاہی کے مرتکب اہل کاروں کو تین سال کی سزا دی جائے اور ان پر جرمانہ عاید کیا جائے۔ ترمیمی بل کے اس مسودے کے تحت عدالتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ مقدمے کی کارروائی مکمل کرکے چھ ماہ کے اندر فیصلہ سنائیں۔

تاخیر کی صورت میں متاثرہ شخص کو متعلقہ ہائی کورٹ میں مقدمہ جلد نمٹانے کے لیے درخواست دائر کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

اس بل میں شامل تجاویز کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ درندگی کا شکار خاتون قانون کی مدد لینا چاہے تو تھانوں اور تفتیش گاہوں میں بھی وہ شدید عدم تحفظ کا شکار ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی خواتین چپ سادھنے میں ہی عافیت سمجھتی ہیں۔ اس لیے متاثرہ خواتین کے اس خوف کے تدارک کی ضرورت ہے، تاکہ مظلوم عورت بلاخوف و بلاجھجک قانون کے دروازہ کھٹکھٹا سکے۔ ساتھ ہی ایسے مقدمات کا کم سے کم وقت میں فیصلہ بھی نہایت ضروری ہے، تاکہ متاثرہ خواتین کو خود کے تماشا بننے کا احساس نہ ہو۔ ان تجاویز کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن اس مکروہ ترین فعل میں ملوث افراد کے لیے بھی سزائے موت کا قانون بنایا جانا چاہیے۔ ہمارے ہاں قوانین تو بہت بنائے جاتے ہیں، لیکن ان پر عمل کم ہی ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ قوانین بنانے اور انہیں موثر طور پر لاگو کرنے کے ساتھ کچھ اور اقدام بھی کیے جائیں۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق پاکستان میں ہر دو گھنٹے بعد ایک فرد جنسی زیادتی کا نشانہ بنتا ہے، جب کہ ہر چار سے آٹھ دنوں میں اجتماعی

زیادتی کا ایک واقعہ سامنے آتا ہے۔ یہ تو وہ واقعات ہیں جو درج کیے جاتے ہیں۔ واقعے کا سامنے نہ آنا یا متاثرہ خاتون کا خاموش رہنا بھی جرم کو چھپانے میں کردار ادا کرتا ہے۔

ہمارے ہاں آج بھی مرد کو عورت سے برتر سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص وڈیرانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت کے لوگ جب اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کا جرم ثابت نہیں ہوسکے گا اور ہوا بھی تو وہ اپنے اثر رسوخ کی بنا پر سزا سے بچ نکلیں گے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس پر کھل کر بات نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین میں اس حوالے سے شعور اجاگر کیا جائے، اور انہیں اس حوالے سے باخبر کیا جائے۔ دوسری طرف ماہرین اس گمبھیر ہوتی صورت حال کی وجہ، اس جانب مائل کرنے والے ابلاغی مواد کو بھی ٹھہراتے ہیں۔ بالخصوص انٹرنیٹ اور دیگر مطبوعہ، سمعی وبصری مواد پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ نفسیات و عمرانیات ان جرائم کی طرف اُکسانے کے لیے ان چیزوں کو بھی بہت زیادہ ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں سائنسی بنیادوں پر اس امر کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ کہیں حقوق نسواں کی کوئی راہ تو بالواسطہ یا بلاواسطہ بنت حوا کے اس استحصال کی وجہ نہیں بن رہی۔ یہ ایک سنگین ہوتا معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس سے

کسی طور نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔

# سماجی ویب سائٹس کے یوزر ہورہے ہیں بدتمیز

سماجی ویب سائٹس لوگوں کو باہم مربوط کرنے اور اجنبیوں کو دوست بنانے کے دعوے کے ساتھ سامنے آئیں اور بلاشبہہ یہ سائٹس یہ فریضہ بہ خوبی انجام بھی دے رہی ہیں، مگر اس کا کیا جائے کہ رابطے اور تعلق استوار کرنے کا یہ وسیلہ چپقلش، جھگڑوں اور نفرت کا ذریعہ بھی بن چکا ہے۔

یہ حقیقت ایک سروے میں سامنے آئی ہے۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والے کارپوریٹ ٹریننگ کے ایک ادارے ''وائٹل اسمارٹس'' کی جانب سے کیے جانے والے سروے کے مطابق سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر اکھڑپن کے مظاہروں اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے، جس کے باعث حقیقی زندگی کی دوستیاں اور تعلقات متاثر ہورہے ہیں۔ یہ سروے بتاتا ہے کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ہر پانچ میں سے دو صارفین ایسے ہیں جو ''آن لائن جھگڑے اور بدکلامی'' عملی زندگی میں اپنے کسی دوست یا ساتھی سے ترک تعلق کرچکے ہیں۔

اس سروے میں ڈھائی ہزار سے زاید افراد نے شرکت کی، جن میں سے 78 فی صد

شرکاء نے شکایت کی کہ ان کے دوست احباب کی آن لائن بد تمیزیاں بڑھتی جارہی ہیں۔
اس سروے میں شریک ہونے والے افراد کا کہنا تھا کہ حقیقی زندگی میں بالمشافہ ملاقاتوں کے دوران اخلاق اور تہذیب سے پیش آنے والے لوگ بھی سوشل ویب سائٹس پر آن لائن بات چیت اور بحث مباحثے کے دوران اکھڑپن کا مظاہرہ کرتے ہیں، بد تمیزی پر اتر آتے ہیں اور بے رخی کا اظہار کرتے ہیں۔
سروے کرنے والے ادارے کی شریک چیئرپرسن جوزف گرینی نے برطانوی خبر رساں ادارے ''رائٹر'' سے اس سروے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس سروے کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ آن لائن رنجشیں اور جھگڑے اب انٹرنیٹ کے صارفین کی حقیقی زندگی کے تعلقات اور دوستیوں کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔
جوزف گرینی کے مطابق سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے 19 فی صد صارفین ایسے ہیں جو آن لائن رنجش یا ناراض ہونے کی صورت میں اپنے کسی دوست یا ''کونٹیکٹ'' کو ان فرینڈ''، ''بلاک'' یا ''ان سبکرائب'' کر دیتے ہیں۔''
جوزف گرینی کا کہنا ہے کہ تیزی سے بدلتی دنیا میں رشتوں اور تعلقات کا بڑا حصہ آن لائن نبھایا جارہا ہے، لیکن انٹرنیٹ کے صارفین کو اپنے آن لائن رویے، حقیقی زندگی کارفرما میل ملاپ کے اصولوں کے مطابق ڈھالنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سماجی ویب سائٹس کے زیادہ تر صارفین آن

لائن بد تہذیبی کو برا تصور کرتے ہیں، اس کے باوجود ان لوگوں کے لیے اپنی ان رویوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔ انھوں نے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے استعمال کنندگان کو مشورہ دیا کہ کہ وہ اپنے دوست احباب کے ساتھ آن لائن بات چیت کے دوران غیر محتاط الفاظ استعمال اپنے مخاطب کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنانے سے گریز کریں۔

ایسا کیوں ہے کہ عام زندگی میں بہ اخلاق اور مہذب اور روبہ رو مکالمے کے دوران تہذیب، اخلاق اور برداشت کا مظاہرہ کرنے والے افراد سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر گفتگو کرتے ہوئے اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے بد تہذیبی پر اتر آتے ہیں، اس سوال کا جواب ماہرین نفسیات اور ماہرین سماجیات بہتر طور پر دے سکتے ہیں، لیکن سامنے کی بات یہ ہے کہ آن لائن بات چیت اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے جس سے بات یا بحث کی جارہی ہے وہ سامنے نہیں ہوتا، اس لیے سماجی ویب سائٹس کے یوزرز کو محفوظ سمجھے ہوئے غیر محتاط اور بد تہذیبی پر مبنی رویے اختیار کر لیتے ہیں۔

## نجی تعلیمی ادارے یا تجارتی جنس

پوری لگن، پوری محنت سے تعلیم حاصل کرکے سند یافتہ ہونے کے بعد اور عملی شعبے میں قدم رکھنے کے باوجود اگر کوئی آپ کی ڈگری ہی کو چیلینج کردے تو آپ کا رویہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے، آپ ''اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں'' کی تصویر بن جائیں گے۔ کچھ ایسا ہی حال موجودہ سالوں میں پاکستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کا بھی ہو رہا ہے۔

سرکاری اور نجی سطح پر قائم کی جانے والی یونیورسٹیوں میں مخصوص شعبہ جات کے حوالے سے مضامین کو مختلف انداز میں پڑھایا جاتا ہے۔ یعنی یوں کہیے کہ سرکاری یونیورسٹیاں جو مضامین ایک خطیر رقم لے کر پڑھا رہی ہیں انہیں نجی یونیورسٹیاں انگریزی کا تڑکا لگا کر پڑھاتی ہیں۔ اور جب ایک سرکاری یونیورسٹی کا طالب علم اپنی تعلیم مکمل کرکے اپنی ڈگری آزمانے نکلتا ہے تو اس کی تعلیم کو وقت کا ضیاع کہہ کر رد کردیا جاتا ہے۔ یہاں میں وضاحت کرتی چلوں کہ سرکاری جامعات اعلیٰ تعلیم مفت میں نہیں دیتیں، بلکہ اس کے لیے طلبہ اور طالبات کو اچھی خاصی رقم ادا کرنی پڑتی ہے، جو کم سے کم بھی پچیس ہزار اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کے قریب ہے۔

کئی خانوں میں بٹے معاشرے میں ہر چیز کے لیے دُہرے اور تہرے معیار ہونا اچھنبے کی بات نہیں۔ ہماری تعلیم بھی ایسی ہی تقسیم کا شاہ کار ہے، سرکاری سطح پر تو جیسی تیسی تعلیم ہمارے طالب علموں کو میسر آ ہی جاتی ہے، لیکن نجی سطح پر تو اسے عملاً ایک تجارتی جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اکثر نجی سطح کے اسکولوں کی بات کی جاتی ہے، کم ہی کسی نے اس سمت نشان دہی کی ہے کہ نجی شعبے میں تیزی سے خود کو مستحکم کرتی جامعات ہمارے لیے کیا گُل کھلا رہی ہیں۔

پرویز مشرف کے دور میں اعلیٰ تعلیمی کمیشن (ایچ ای سی) نے اپنی فعالیت کے زمانے میں ایک طرف جہاں سرکاری جامعات کو بھرپور وسائل فراہم کیے تو دوسری طرف نجی شعبے میں قائم ہونے والی جامعات پر بھی توجہ دی، ایچ ای سی کے مشکل پیمانے پر بہت سی جامعات پورا نہ اتر پائیں، جس کی بنا پر ان کی ڈگریاں اپنی وقعت کھونے لگیں۔ پھر نئی حکومتوں کو ایچ ای سی سے اللہ واسطے کا بیر ہوگیا۔ اب عالم یہ ہے کہ یہ ادارہ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ جب خود اس ادارے کے وجود پر ہی سوالیہ نشان ہے تو پھر یہ ادارہ نجی جامعات کے معاملات کی کیا نگرانی کرے گا۔

نجی جامعات کی صورت حال دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان کا مطمع نظر فقط زیادہ سے زیادہ پیسوں کے عوض ڈگریاں دینا ہے۔ اب اسی کو دیکھ لیں کہ شہر کی ایک نام ور نجی جامعہ میں ایک مضمون "میڈیا سائنس" کے نام سے پڑھایا جا رہا ہے۔ بظاہر تو یوں ہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری جامعات میں جو چیزیں "ابلاغ عامہ" میں پڑھائی جا رہی ہیں، قریب قریب یہ ان ہی مندرجات پر مشتمل ہوگا یا پھر یہ ہوگا کہ اہم ذرائع ابلاغ کے حوالے سے کچھ تخصیصی موضوعات پر مشتمل ہوگا، مگر جا کر دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ سے منسوب اس اہم مضمون میں اگر لکھنے سے متعلق کچھ چیز ہے تو وہ فقط اسکرپٹ" ہے! جی ہاں، ذرائع ابلاغ کیا محض اس صنف تک محدود کیے جا سکتے ہیں؟" یقیناً نہیں۔ ڈیجیٹل میڈیا کا لفظ سننے میں کانوں کو بھلا محسوس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن صرف اس کا چرچہ کرکے ہم اسے مکمل ابلاغ عامہ کے مضبون پر حاوی نہیں کر سکتے۔ یہ فقط ابلاغ عامہ کی ایک شاخ ہے۔ ابلاغیات کی ذرا سی بھی شد بد رکھنے والا اس کا جواب واضح نفی میں دے گا۔ ابلاغ کا عمل دنیا کی وسعت کو سمیٹتے ہوئے کئی خانوں میں تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے۔ صحافت بھی ابلاغ عامہ کا ایک شعبہ ہے۔

چلیے ایک لمحے کو ہم یہ مان لیتے ہیں کہ تجارتی ضرورت کے پیش نظر ابلاغیات

میں سب سے منہگی لکھت "اسکرپٹ" نامی صنف ہی کی رہ گئی ہے، چناں چہ یہ جامعات اسی کے بارے میں پڑھا رہی ہیں، مگر کیا اسکرپٹ فقط اس لفاظی کا نام ہے، جو کوئی بھی کردار کیمرے کے سامنے آ کر کرے اور چلا جائے۔ بالکل نہیں۔ ذرائع ابلاغ کے تو نام ہی سے واضح ہے کہ یہ مضمون ابلاغ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ اسکرپٹ ابلاغ ہی کا کام کر رہا ہے، مگر اس میں الفاظ کا چناؤ اور برتاؤ کیا ہوگا۔ کس موقع پر کس طرح کی بات کرنی ہے۔ معاشرے کے کس طبقے کی توجہ مرکوز کرنا ہے اور کن چیزوں سے گریز کرنا ہے، کس طرح اپنے ابلاغ کو ہمہ گیر اور موثر بنانا ہے۔ ان جامعات میں ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح اسکرپٹ کے لیے دسیوں قسم کی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مگر یہاں تو لگتا ہے کہ اسکرپٹ بھی ایک مجبوری ہے کہ جو بھی اور جیسا بھی کے فارمولے کے تحت جیسے تیسے نمٹادو۔

نہیں معلوم ایسے سطحی سے علم کو لے کر جب طالب علم میدان عمل میں آئیں گے تو ان کی اس ڈگری کی وقعت کیا ہوگی۔ اگر قبول کر بھی لی گئی تو ہمارے جیسے تباہ حال اور مسائل زدہ معاشرے میں یہ مزید کتنی قسم کی خرابیوں کا باعث ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ علم کو شعور اور سوچ میں گیرائی اور گہرائی کا ذریعہ بنانے کے بہ جائے ڈگری حاصل کرکے پیسے کمانے کی مشین بننے تک محدود کر دیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے سماجی علوم جیسے وسعت اور گہرائی کے حامل علوم کی

تعلیم دیتے ہوئے بھی "دو جمع دو" کا طریقہ اپنایا جا رہا ہے۔ یہ محض ایک جامعہ کے صرف ایک مضمون اور اس کی "علمیت" کی معمولی سی جھلک ہے۔ اگر ان جامعات کے نصاب اور ان کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً دیگر بھی بہت سی ایسی مثالیں یا شاید اس سے بھی بدتر مثالیں سامنے آ سکتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت نجی جامعات کو بے مہار نہ چھوڑے اور ان کے معیارِ تعلیم سے فیسوں کی وصولی تک ہر معاملے کی نگرانی کی جائے۔ کھمبیوں کی طرح اُگ آنے والی جامعات کی تعداد کو سامنے رکھ کر ہمیں اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ ہمارے یہاں تعلیم کے مواقع میں اضافہ ہوا ہے، علم اور شعور کی منزل پانے کے لیے ہمیں معیاری تعلیم کو اپنی ترجیح بنانا ہوگا، اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ نجی جامعات محض معاشرتی تفاخر اور طبقاتی تقسیم کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔

# پاکستان میں فیس بک کا منفی استعمال

ہر چیز کے مثبت اثرات بھی ہوتے ہیں اور منفی بھی۔

یہی کچھ سوشل میڈیا کا بھی ہے، جہاں سوشل ویب سائٹس انفرادی اور گروہی سطح پر باہمی رابطوں کا ذریعہ اور اطلاعات اور خبروں کی آزادانہ ترسیل کا موثر ترین وسیلہ بن کر سامنے آئی ہیں، وہی ان کی وجہ سے مختلف معاشروں میں بہت سی سماجی اور اخلاقی خرابیوں نے بھی فروغ پایا ہے۔ ایسے معاشروں میں پاکستانی سماج بھی شامل ہے، جہاں ہر ٹیکنالوجی کے منفی اثرات اس کے مثبت اثرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ شدت سے فروغ پاتے ہیں۔ پاکستان میں سوشل میڈیا کا منفی استعمال دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔

سوشل میڈیا کی دنیا کی مقبول ترین ویب سائٹ فیس بک اس صورت حال کی ایک اہم مثال ہے۔ یہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ موجودہ دور میں مفید اطلاعات کے پھیلاؤ، تفریح اور علم کے حصول کا موثر ذریعہ بن چکی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں یوزرز کی ایک بڑی تعداد اسے لوگوں کو بدنام کرنے، بے بنیاد اور گھڑی ہوئی خبریں پھیلانے اور تصاویر، خاکوں اور وڈیوز میں من مانی تبدیلیاں کرکے انھیں اپنے مقصد کے مطابق سامنے لانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

پاکستان میں چند سال پہلے تک جب فیس بک کے یوزرز کی تعداد محدود تھی تو اس سائٹ کو تاریخی، دل چسپ اور کارآمد اطلاعات اور تصاویر شیئر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، مگر اب صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔

پوری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی فیس بک کے صارفین کی تعداد ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ مخصوص مقاصد رکھنے والے افراد نے فیس بک پر مختلف ناموں سے ایک سے زیادہ اکاؤنٹ بنا رکھے ہیں۔ یہ جعلی فیس بک اکاؤنٹ اکثر بلیک میلنگ، پروپیگنڈے، غیر اخلاقی پوسٹس کی شیئرنگ اور بیہودہ کمنٹس جیسی منفی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

سوشل میڈیا کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بیشتر نوجوانوں کے لیے فرضی ناموں کا استعمال کشش رکھتا ہے، جس سے وہ جنسِ مخالف کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی لڑکیاں اداکاراؤں اور پرکشش چہرے والی خواتین کی گلیمرس تصاویر کو اپنی پروفائل پکچر بنالیتی ہیں، جس کی وجہ سے انھیں توجہ حاصل ہوتی ہے۔ ایسا عموماً فیک آئی ڈیز پر کیا جاتا ہے، جن کے ذریعے عموماً غیر اخلاقی اور ہماری اقدار کے منافی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔

معروف معنوں میں غیر اخلاقی سرگرمیاں تو خیر ایک انفرادی معاملہ ہے، لیکن سوشل میڈیا خاص طور پر فیس بک پر ایسی سرگرمیاں بھی عروج پر ہیں جو معاشرے کے مختلف طبقات اور مکاتب فکر میں ایک دوسرے نفرت کو پروان چڑھانے اور باہمی انتشار اور خلفشار کا سبب بنتی ہیں اور بن رہی ہیں۔ فیس بک پر مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستگی رکھنے والے افراد مخالف سیاست دانوں کے لیے نہایت نازیبا زبان استعمال کرتے ہیں۔ فیس بک سمیت سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اس طرح کی زبان استعمال کرنے اور اس نوعیت کی تصاویر اور ویڈیوز اپ لوڈ کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ اس رجحان کے باعث نہ صرف فیس بک پر بل کہ عملی زندگی میں بھی مختلف سیاسی اور مذہبی مکاتب فکر کے درمیان کدورت اور دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال میں سوشل میڈیا پر حکومت اور اس کے مخالفین کی جانب سے آنے والی پوسٹس اور کمنٹس اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں۔

فیس بک پر متحرک اکثر سیاسی کارکن اس سائٹ کو پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر ان کی سرگرمیاں اپنی جماعت کے نظریات اور پالیسیوں کی حمایت میں اور مخالفین پر اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے تنقید تک محدود ہوں تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ سیاسی کارکن، جن میں

مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے کارکن بھی شامل ہیں۔ یہ سیاسی کارکن اپنے مخالفین کے خلاف نہ صرف نہایت نازیبا زبان میں کمنٹس دیتے ہیں بل کہ مخالف سیاسی جماعتوں کے قائدین کی جعلی اور مضحکہ خیز فرضی تصاویر بنا کر پوسٹ کرتے ہیں۔ اس حوالے سے خاتون سیاست دانوں کا لحاظ بھی نہیں کیا جاتا۔ ایک حربہ یہ استعمال کیا جاتا ہے کہ مخالف سیاسی یا مذہبی راہ نما کی تصویر کو ایڈیٹنگ کے ذریعے اسے لڑکیوں کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی کردار کشی کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ یہی کچھ مخالف فرقے کے مذہبی راہ نماؤں اور علماء کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔

سوشل میڈیا پر یہ چلن بھی بہت عام ہے کہ کسی مشہور شخصیت کا قول اپنی من پسند شخصیت سے منسوب کردیا جاتا ہے اور شخصیات سے ایسے اقوال اور اشعار منسوب کردیے جاتے ہیں جو ان کے نہیں ہوتے۔ ایسی پوسٹ کو جانچ کیے بغیر آگے شیئر کردیا جاتا ہے۔

اسی طرح انٹرنیٹ اور سوشل ویب سائٹس پر موجود خواتین کی تصاویر کو اٹھا کر انھیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا شرم ناک رجحان بھی فیس بک پر عام ہے۔ ان تصاویر کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جن ان تصاویر کو فیک آئی ڈیز کی پروفائل پکچر بنانے کا مکروہ عمل سرفہرست ہے۔ عام طور پر

خواتین کے نام سے مرد فیک آئی ڈیز بناتے ہیں، جن کے ذریعے مردوں کے بے وقوف بنایا اور خواتین سے دوستی کی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان سرگرمیوں کو کیسے روکا جائے جو ہمارے معاشرے میں اقدار کی تباہی، غیراخلاقی سرگرمیوں کے فروغ اور انتشار پھیلانے کا سبب بن رہی ہیں؟ اس طرح کی زیادہ تر سرگرمیاں فیک آئی ڈیز کی مدد سے انجام دی جاتی ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جعلی آئی بنانے والے یوزرز کی لوکیشن کو ڈھونڈا جاسکتا ہے، مگر اس کے لیے وفاقی تحقیقاتی ادارے ایف آئی اے کے سائبر کرائمز یونٹ کو بھرپور کوشش کرنا ہوگی۔

سوشل میڈیا خاص طور پر مقبول ترین سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ فیس بک پر جاری منفی اور غیراخلاقی سرگرمیاں ہمارے معاشرے میں نفرت، انتشار اور بے راہ روی کو فروغ دینے کا سب بن رہی ہیں، لیکن متعلقہ ادارے اس حوالے سے خاموش ہیں۔ آخر وہ کب اپنا کردار ادا کریں گے؟

## ہر ہاتھ میں ہے زہر کا پیالہ

معاشرہ جس روش پہ چل رہا ہے، اس میں بیمار ذہنوں کی پیداوار ایک لازمی امر ہے۔ انتہاپسندی اور عدم برداشت کے رویے زندگیوں ہی کے چراغ گُل نہیں کر رہے یہ عفریت انسانیت، علم، ہم دردی، یگانگت اور علم و آگہی سمیت تمام روشن اقدار کو نگلے جارہے ہیں۔ 9 mm کی گولی ہر اُجالے کا نصیب بن جائے تو کہاں روشنی رہے گی۔ اور ہمارے دیس میں یہی ہو رہا ہے۔ انتہاپسندی کے اندھیروں کی یلغار اور تشدد کی کالی آندھی اس زور سے چل رہی ہے کہ سب چراغ بجھتے جارہے ہیں۔

نظریے اور عقیدے کی بنیاد پر کسی کی جان لے لینے کی خوف ناک روایت مذہبی حلقوں سے سیاسی جماعتوں تک ہر جا اپنے منحوس سائے پھیلا چکی ہے۔ اس صورت حال کا سب سے خوف ناک پہلو فرقہ واریت میں شدت اور تشدد کا عنصر آجانا ہے۔ مساجد کی ملکیت اور گلی محلوں میں ہونے والی سر پھٹول سے بڑھ کر اب فرقہ واریت امت مسلمہ کے لیے ماضی کے مقابلے میں کہیں بھیانک ہو چکی ہے۔ فرقہ واریت کو اسلام دشمن قوتیں اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔ اس ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے سیدھی سادی سیاسی اور جمہوری تحریک یا غیر ملکی طاقت کے غلبے کے خلاف جدوجہد کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتا ہے۔ یہی کچھ

عراق میں ہوا اور یہی شام میں ہو رہا ہے۔

بدامنی کا شکار دیگر ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں واضح ہے کہ کون کر رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، لیکن ہم اس بدقسمت ملک اور بدنصیب شہر کے باسی ہیں جہاں اکثر مرنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ اسے کیوں مارا گیا نہ اس کے ورثاء جان پاتے ہیں کہ ان سے ان کا پیارا کس جرم کی پاداش میں چھین لیا گیا اور نہ ہی عوام کے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ قتل کا سبب کیا تھا؟ ہمارے شہر میں قتل کرنا شاید سب سے آسان عمل ٹھہرا ہے۔ کسی کی بھی جان لے لو، خون مٹی میں جذب ہونے سے پہلے ہی قانون میں دب جائے گا اور لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو جائے گا۔ پھر کون قاتل کیسا قتل، ''نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا۔'' کراچی میں اس وقت صرف لاقانونیت کی صنعت پروان چڑھ رہی ہے۔ اہدافی قتل، دہشت گردی، ڈکیتیاں اور رہزنی کی وارداتوں سے اس شہر کا ہر باسی براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوا ہے۔ اس صورت حال کے باعث کراچی کی پچاس فیصد آبادی مختلف نفسیاتی امراض کا شکار ہو گئی ہے۔ یہ ان ہی حالات کا شاخسانہ ہے کہ ہمارے ملک میں ذہنی امراض وبائی امراض کے مقابلے میں دُگنی رفتار سے عوام کو دبوچ رہے ہیں۔

قتل اور لوٹ مار کے واقعات تو اب اس شہر کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب تو

ایک عرصے سے ایسے واقعات کی خبروں کو سرسری طور پر پڑھا اور دیکھا جاتا ہے، لیکن خون سے تر اس فضا اور بدامنی کے شکار اس ماحول میں بھی کوئی واقعہ دلوں کو دہلا جاتا ہے اور ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہم یہ سماج میں رہ رہے ہیں؟ ڈاکٹر شکیل اوج کا قتل بھی ایک ایسا ہی اندوہ ناک واقعہ ہے۔

ڈاکٹر شکیل اوج کا قتل فقط اُن کے اہل خانہ، احباب اور اُن کے ہزاروں طلبا ہی کے لیے ناقابل تلافی نقصان نہیں، یہ تو پوری قوم اور ریاست کا زیاں ہے۔ ایک اسکالر، ایک استاد، کئی کتابوں کے مصنف، جامعہ کراچی کے اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ، ڈی لٹ، تمغۂ امتیاز۔ گویا علم و آگہی اور اعزاز کا شہر مٹا دیا گیا۔ سسٹم یا ریاست کئی عشرے اور نہ جانے کتنے پیسے خرچ کرکے ایک اسکالر تیار کرتی ہے، اور اسے چند سو روپے کی گولی یک دم ختم کر دیتی ہے۔ ریاست کو اپنے اس ہول ناک نقصان کے بارے میں اب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔

یہ سب کہنا تو لایعنی ہوگا کہ قتل کی یہ روح فرسا واردات دن دیہاڑے اور بھری پری سڑک پر ہوئی، کہ ہمارے شہر میں قاتلوں کو نہ دن کی روشنی میں قتل کرتے خوف آتا ہے نہ کسی پُررونق علاقے میں خون کی ہولی کھیلتے ہوئے انھیں کسی کا ڈر ہوتا ہے۔ خوف اور دہشت تو بس اس شہر کے نہتے اور پُرامن باسیوں کا مقدر ہے، چاہے وہ قانون کا خوف ہو یا قاتلوں، ڈاکوؤں اور راہ زنوں کی

دہشت۔

دانش اور علم کا یہ چراغ بجھانے والے کون تھے؟ ڈاکٹر شکیل اوج کو کس ''جرم'' کی سزا دی گئی؟ ان کے قتل کے پیچھے کیا مقاصد اور محرکات کارفرما تھے؟ ان سوالوں کا جواب تو پولیس کی تفتیش کے بعد ہی سامنے آسکتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ صحیح معنوں میں تفتیش ہو اور مجرموں تک پہنچنے میں کوئی مصلحت نہ آڑے آئے، اور ہمارے یہاں ایسا کم کم ہی ہوتا ہے۔

خبروں کے مطابق ڈاکٹر شکیل اوج کے خلاف ایک فتویٰ جاری کیا گیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جس وقت یہ فتویٰ جاری ہوکر گردش میں آیا اس وقت حکومتی ادارے کہاں تھے؟ یہ ایس ایم ایس موبائل فونز پر گردش کر رہے تھے کہ ڈاکٹر شکیل اوج واجب القتل ہیں، اس وقت اس معاملے کا نوٹس کیوں نہیں لیا گیا۔ پی ٹی اے ایسے ایس ایم ایس روکنے کا انتظام کیوں نہیں کرتی جن میں کسی کو بھی واجب القتل قرار دے دیا جاتا ہے؟ موبائل میسیجز اور دیگر ذرائع سے نفرت انگیز، اشتعال انگیز اور کسی کو کافر اور واجب القتل قرار دینے کی عبارتوں کی روک تھام یقینی کیوں نہیں بنائی جاتی۔ کچھ نہیں تو کم ازکم ڈاکٹر شکیل اوج کو سیکیوریٹی تو فراہم کی جاسکتی تھی۔ اس سانحے کے بعد حکم رانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہییں اور ایسے فتوؤں کی روک تھام اور ڈاکٹر شکیل اوج کے

خلاف فتویٰ دینے والوں کے خلاف کارروائی یقینی بنانی چاہیے۔

یہ دردناک واقعہ جانے کب تک دل کو نڈھال اور روح کو گھائل کیے رکھے گا۔ کیا قیامت ہے، ڈاکٹر شکیل اوج جیسا نیک سیرت، وسیع المطالعہ، وسیع النظر اور امن پسند عالم اور دانش ور قتل کر دیا گیا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، ہمارے ملک اور خاص طور پر کراچی میں کتنے ہی علمائے دین، اساتذہ، ڈاکٹر اور وکیل خون میں نہلائے جا چکے ہیں۔ علم و دانش اور فکر کی اعلیٰ سطح صاحب الرائے افراد کو جنم دیتی ہے، اور ہمارے ہاں اختلاف رائے اور اظہار رائے ''واجب القتل'' قرار پائے ہیں۔ اگر یہی ہوتا رہا تو ہمارے یہاں کوئی دانش ور ہوگا نہ مفکر، علمی لحاظ سے بنجر ہو جانے والی اس سرزمین پر ہر طرف سہمی ہوئی خاموشی کا راج ہوگا۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پلانے کے لیے تو عدالت لگی تھی، لیکن ہمارے ہاں ہر شخص ہاتھوں میں زہر کا پیالہ لیے پلانے کو تیار کھڑا ہے۔ ہم تو عدم برداشت کے معاملے میں قبل مسیح کے یونانیوں کے دور سے بھی پیچھے جا چکے ہیں۔

# تیزاب گردی

کچھ دنوں پہلے گھر کا ضروری سامان لینے مارکیٹ جانا ہوا۔ دکان پر میرے ساتھ کھڑی خاتون نے دکان دار سے تیزاب کی بوتل مانگی۔ دکان دار نے چالیس روپے لے کر اسے تیزاب کی بوتل تھما دی۔ خاتون کچھ جلدی میں تھیں، سو تیزی سے پیچھے کی طرف مڑیں اور ان کا پیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ نتیجتاً ہاتھ میں تھامی ہوئی بوتل سڑک کے اوپر کاغذوں کے ڈھیر پر گر گئی اور لمحہ بھر میں سارا کوڑا جل کر راکھ ہوگیا۔ آس پاس کھڑے لوگ خاتون کی مدد کرنے دوڑے۔ اس بات کا اطمینان تھا کہ بوتل گرنے سے خاتون کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا ہے۔ ورنہ اس بات کا سو فیصد خدشہ تھا کہ خاتون اس تیزاب سے جھلس جاتیں۔

یہ فقط ایک معمولی سا حادثہ تھا، لیکن میں گھنٹوں اس سارے معاملے پر ششدر رہی۔ آخر اتنا خطرناک تیزاب عام دکانوں پر اتنی آسانی سے دست یاب کیوں ہے؟ جب کہ کچھ عرصہ قبل ہی پاکستان میں تیزاب گردی کے واقعات میں اضافے کے بعد حکومتی اداروں کی طرف سے گندھک کے تیزاب کی عام فروخت پر پابندی لگائی گئی تھی۔

اپنی کم عقلی پر آپ اپنا ہی تمسخر اڑانے کا جی چاہا۔ حکومت تو بہت سی چیزوں پر پابندی لگاتی آئی ہے۔ قانون بنانا تو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بہت عام ہے، لیکن عمل کرنا یا کروانا.... یہ تو شاید ہمارے قوم کے مزاج میں شامل ہی نہیں ہے۔

میرے لیے یہ سب کچھ حیران کن یوں بھی تھا کہ پچھلے دنوں تیزاب گردی کی بڑھتی ہوئی کاروائیوں پر مبنی ایک رپورٹ میری نظروں سے گزری جس کے مطابق سال 2009 میں پورے پاکستان میں 43 خواتین تیزاب گردی کا شکار ہوئیں، جب کہ 2010 میں 55 خواتین اس ظلم کا نشانہ بنیں اور 2011 میں یہ تعداد بڑھ کر سو فی صد اضافے کے ساتھ 155 ہو گئی۔ یہ اعداد و شمار پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں ہم حیوانیت کے کون سے درجے پر ہیں کہ کسی کا چہرہ مسخ کرتے ہوئے ہاتھ نہیں لرزتے۔ جانور تو اپنے شکار کو چیر پھاڑ کر ایک ہی وار میں ختم کر دیتے ہیں اور ہم انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کو اس طرح نشانہ بناتے ہیں کہ وہ سسک سسک کر جان دے۔ ہم آدمیت کی صورت میں شیطانیت کا روپ دھارے خدا کے عذاب سے بے خبر گناہوں کی گٹھڑی میں سامان جمع کیے جا رہے ہیں۔

ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ حد درجہ نرم رویہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جنگ کے میدان میں اور فتح حاصل کرنے کے بعد بھی بدترین دشمن ہونے کے باوجود عورتوں اور بچوں کو ایذاء پہنچانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے، لیکن ہمارا معاشرہ دینِ کامل کا پیروکار ہونے کا دعوے دار ہونے کے باوجود اپنے قہر کا پہلا نشانہ عورتوں ہی کو بناتا ہے۔ چہرہ ہر انسان کی بنیادی پہچان ہوتا ہے۔ یہ بدصورتی اور خوب صورتی ناپنے کا پہلا پیمانہ ہے۔ میرے رب نے فطرتاً ایک عورت میں اس کے چہرے اور ظاہری خدوخال کے لیے فکر کا مادّہ زیادہ رکھا ہے۔ ساتھ ہی ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بنت حوا کی ذہانت، صلاحیت اور سیرت پر اس کی صورت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چہرہ شناخت کی سب سے پہلی صورت ہے۔ کتنا عجیب ہے کہ کسی سے لمحہ بھر میں اس کی شناخت چھین لی جائے۔ خواتین سے بدلہ لینے کے لیے تیزاب سے چہرے کو جھلسا دینا درندہ صفت لوگوں کے لیے انتقام کا سب سے آسان حربہ ہے، جس سے انا کی آگ کو بجھایا جاتا ہے۔ تف ہے ایسی سوچ پر کہ جو کسی ذی روح سے بدلہ لینے کے لیے یہ سفاکانہ راستہ اپنائے۔

عورت پر ظلم کرنا سب سے بڑی بزدلی ہے۔ عموماً رشتے سے انکار کی صورت میں سزا چہرہ کو مسخ کرکے دی جاتی ہے، تاکہ وہ عورت کسی اور شخص کے قابل نہ رہے اور اسے بدصورت بنا دیا جاتا ہے۔ ایسی اور بہت سی وجوہات ہیں جن کا یہاں

تذکرہ کرنا ضروری نہیں۔ یہ صورت حال ہمارے معاشرے کی اخلاقی گراوٹ اور سفاکی کی آئینہ دار ہے۔

پاکستان میں سرکاری سطح پر ایسا کوئی ادارہ قائم نہیں جو تیزاب گردی کا شکار خواتین کی مدد کر سکے۔ پرائیویٹ اداروں کا ذکر کیا جائے تو چند این جی اوز متاثرہ خواتین کو معاشرے میں مقام دلانے کے لیے کام کر رہی ہیں، لیکن ان اداروں کو مالی مسائل کا سامنا ہے، جب کہ حکومت کی طرف سے ایسا کوئی فنڈ مختص نہیں کیا گیا ہے جو ان خواتین کی مدد اور ان کے بگڑے چہرے کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

سوال یہ ہے کہ آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا۔ مسخ شدہ لاشوں کی اصطلاح تو ہمارے یہاں عام تھی ہی اب مسخ شدہ زندہ لاشیں بھی ہمیں اپنے ارد گرد ن چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ تیزاب پھینکنے کے کئی کیس تو رجسٹر ہی نہیں ہوتے۔ اہل خانہ بدنامی کے ڈر سے ایف آئی آر درج ہی نہیں کرواتے۔ اخبار میں خبر چھپ جاتی ہے تو حقیقت کا علم ہوتا ہے، کہ بہت قریبی لوگ ، ایک شہر اور ایک گلی محلے میں رہنے والے بھی ایک دوسرے کے حالات سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں۔

ایک بات اکثر میرے ذہن کو پریشان کرتی ہے کہ یہ دل دہلا دینے والے واقعات آج

اس شہر میں رہنے والی کسی بنت حوا کے ساتھ پیش آیا ہے تو کل میری اور آپ کی بیٹی کے ساتھ خدانخواستہ یہی کچھ ہو جاتا ہے تو ہماری حالت کیا ہو گی۔ ہم کسی دوسرے کی تکلیف پر فقط افسوس کرتے ہیں، لیکن کسی ظلم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ ایسے واقعات کے تدارک کے لیے ہمیں اپنے بچوں میں برداشت کا مادہ پیدا کرنا ہوگا۔ انہیں انسانیت کا سبق سکھانا ہوگا۔ اولاد کی تربیت تو ہر ماں باپ کرتے ہیں، لیکن ہمیں اپنے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے بچوں کی ذہن سازی پر مزید توجہ دینی ہو گی۔ تیزاب گردی اور تشدد دورندگی کے دیگر بڑھتے ہوئے واقعات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہمارا ملک اپنی تہذیب کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ اس بیمار تہذیب نے جو بیماریاں ہماری نسل کو لگائی ہیں، ہمیں ان سے خود ہی انفرادی طور پر اپنے بچوں کو بچانا ہے اور اصلاح کا عمل اپنے گھر سے اپنی ذات سے شروع کرنا ہے۔

تیزاب گردی کی تیزی سے بڑھتی وارداتوں کی روک تھام نہ ہونے کی جہاں ایک وجہ تیزاب کی کھلے عام فروخت ہے، وہیں عدالت کی حدود میں ان جیسے انتہائی نوعیت کے کیسز کو دوسرے مقدمات کی طرح برتنا بھی ہے۔ یعنی درخواست گزار کورٹ کے چکر لگا لگا کر آخر کار اپنی عزت، وقت اور پیسہ بچانے کے لیے خود ہی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کیسز کو فوری طور پر خصوصی دہشت گردی کی عدالت میں لانا

چاہیے، تاکہ جلد از جلد فیصلہ سنا کر مجرم کو سزا دی جاسکے۔

گذشتہ برسوں کے دوران ہزاروں خواتین کا چہرہ مسخ ہوا، لیکن سزا فقط ایک مجرم کو ملی۔ اگر تیزاب گردی پر فوری اور موثر سزائیں نہ دی گئیں تو ظلم کا یہ سلسلہ چہروں کو جھلساتا رہے گا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جس طرح کسی کے چہرے کو تیزاب سے جھلسایا گیا ہے جرم ثابت ہونے پر ملزم کو بھی اسی طرح تیزاب سے جھلسایا جائے، لیکن یہ نہیں ہوسکتا تو کم از کم مجرموں کو وہ سزا تو دی جائے جو قانون کی کتابوں میں درج ہے۔

## ایک عجیب منظر

عید قرباں کے بعد کراچی کی ایک سڑک کے فٹ پاتھ پر مجھے عجب منظر نظر آیا۔ بہت سے لوگ جن میں عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی قربانی کے جانوروں کی آلائشیں ایک جگہ جمع کرکے انھیں کاٹ پیٹ کر اپنے مطلب کی چیزیں الگ کرکے رکھ رہے تھے۔اس جگہ تعفن اتنا زیادہ تھا کہ وہاں کھڑے رہنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن جب میں نے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو جب وہاں کھڑے دیکھا, جو اپنے کام میں پوری ایمان داری سے جُٹے ہوئے تھے تو میرے قدم خود بہ خود اس سمت.بڑھنے لگے۔

ایک عورت گندی چربی کے ڈھیر میں سے مختلف قسم کی چربیاں، گوشت کے چھوٹے ٹکڑے اور ہڈیاں الگ کر رہی تھی۔ میرا اس سے یہ سوال پوچھنا ہی فضول تھا کہ یہ طبیعت پر گراں گزرنے والا کام تم خود کیوں کر رہی ہو اور اپنے چھوٹے بچوں سے کیوں کروارہی ہو؟ کیوں کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرنا تو بہر حال اس کی مجبوری ہو گی۔ ورنہ بھلا کون اس تعفن زدہ ماحول میں کام کرنا چاہے گا۔

سوال یہ بنتا تھا کہ آخر یہ کام ہو کس مقصد کے لیئے رہا ہے؟ چھان بین کرنے

سے علم ہوا کہ آلائشوں سے چربی اور دیگر حصے الگ الگ کرکے بیچنے کے لئے تیار کیا جارہے ہیں، جنہیں بہ طور خام مال فروخت کیا جائے گا اور ان اشیاء کو مختلف فیکٹریاں اپنی مصنوعات بنانے کے لئے استعمال کریں گی۔ ان فیکٹریوں میں سے زیادہ تر صابن بنانے کے کارخانے شامل ہیں، جہاں یہ چربی صابن بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جب کہ اور بھی بہت سی مصنوعات کے لے غلاظت میں پڑی یہ گندی چربی اور آلائش کی دیگر چیزیں استعمال کی جاتی ہیں۔

جی یہ وہی فضلہ اور گندگی ہے جس سے اٹھنے والے تعفن میں ایک لمحہ بھی کھڑا رہنا محال ہے، لیکن ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کتنی ہی ایسی چیزیں استعمال کر رہے ہیں جو کہ اس جیسے گندے اور صحت کے لئے نقصان دہ مواد سے تیار کی جاتی ہیں۔ خاص کر غیر قانونی طور پر قائم کارخانوں میں کوکنگ آئل اور گھی بنانے کے لیے ان گندی چیزوں کا استعمال کیا جارہاہے۔ غور کرنے پر ایک اور انکشاف ہوا کہ جو آلائشیں وہاں ڈھیر کی صورت میں رکھی ہوئی ہیں ان میں کیڑے بھی پڑگئے ہیں۔ اب ظاہر ہے جو یہ خام مال اپنی مصنوعات کی تیاری میں استعمال کرے گا وہ حفظان صحت کے اصولوں پر تو عمل کرنے سے رہا۔ لہٰذا اس گندے مواد سے بنی چیزیں تیار کرکے نئی اور خوب صورت پیکنگ میں ہمیں دی جاتی ہیں اور ہم بے خبر انہیں بڑے ذوق وشوق سے استعمال کرتے ہیں۔

اور کسے کہتے ہیں اندھیر نگری چوپٹ راج۔ قانون کا کتنا رونا رویا جائے۔ ہمارے یہاں قوانین تو خیر کبھی عمل کرنے کے لئے بنے ہی نہیں، نہ ہم عوام نے خود کبھی کسی قانون پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔ قربانی کے جانوروں کی آلائشوں کا کاروبار آج سے نہیں عرصۂ دراز سے جاری ہے، لیکن اس کی روک تھام کے لئے اور شہریوں کو ناقص مواد سے تیار کی جانے والی مضر صحت اشیاء سے بچانے کے لے کوئی سنجیدہ اقدام کیا گیا نہ قانونی چارہ جوئی عمل میں لائی گئی، جب کہ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ جن غیر قانونی کارخانوں میں یہ کام ہو رہا ہوتا ہے، ان کے مالکان سے پولیس رقم لے کر ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے لئے جگہ فراہم کرتی ہے اور ان کے غیر قانونی کام سے چشم پوشی کرتی ہے۔ شہریوں کے جسم وجاں کی دشمن بنی ان سرگرمیوں کی ابتدا ہماری سڑکوں پر ہوتی ہے۔ عید قرباں پر سب کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شہر میں جتنی چاہے گندگی پھیلائیں، کھلی اجازت ہے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ سڑک کے بیچوں بیچ جانوروں کی آلائشیں ڈال دینا کہاں کی تہذیب ہے؟ گندگی سے دوسرے لوگوں کو پریشان کرنا کون سا مذہب سکھاتا ہے۔

میرے آقا حضرت محمد ﷺ نے صفائی کو نصف ایمان فرمایا ہے، لیکن ہم سنت ابراہیمی کو پورا کرتے ہوئے اس بات کا احساس بھی نہیں کرتے کہ ہمارے یہ چھوٹے چھوٹے فعل خدا کے سامنے کتنے ناپسندیدہ ہونگے۔

ایک اندازے کے مطابق اس سال پورے ملک میں تقریباً 63 ہزار گائے اور 16 لاکھ بکروں کی قربانی کی گئی اور اکثریت نے مخصوص مذبحہ خانے کا رخ کرنے کے بجائے سڑکیں پارک گلی محلے استعمال کئے، جس کے باعث جگہ جگہ قربانی کے جانوروں کی آلائیشیں اور گندگی بکھری نظر آتی ہے۔ اس گندگی کے نتائج فوری طور پر برآمد نہیں ہوتے لیکن تیزی سے جراثیم بڑھنا شروع ہوجاتے ہیں اور اس کا اندازہ آپ کو تب ہوتا ہے جب آپ کے اطراف میں موجود لوگ کسی وبائی بیماری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کی صفائی متعلقہ اداروں کا کام ہے، لیکن ہمارے یہاں کون سا ادارہ اپنا کام بروقت اور صحیح طریقے سے انجام دے رہا ہے۔ سو ان اداروں سے کیا شکایت کی جائے۔ یوں بھی ہماری حکومتوں سے لے کر عوام تک صحت و صفائی کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں۔ لیکن صحت و صفائی کا شعور بیدار کئے بغیر ہم ترقی کی منزل پانا تو دور کی بات مہذب کہلانے کے مستحق بھی نہیں ہوسکتے۔ کیا یہ صفائی سے غفلت اور صحت سے بے نیازی کی مثال نہیں کہ ہم صفائی پسند بنتے ہوئے بڑی کراہیت کے ساتھ جو آلائشیں سڑکوں کی زینت بناتے ہیں، وہی اپنی تمام تر غلاظت اور مضر صحت اثرات کے ساتھ مختلف مصنوعات کی صورت میں ہمارے گھروں میں واپس آجاتی ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم جانور خریدنے سے قربانی تک کے تمام مراحل کی طرح قربانی کے بعد اپنے گلی محلوں اور سڑکوں کی صفائی

کو بھی اسی مبارک عمل کا حصہ سمجھتے ہوئے کسی ادارے کے عملے کا انتظار کئے بغیر آلائشیں ٹھکانے لگانے کا انتظام از خود کریں تاکہ گھوم پھر کر دوبارہ ہمارے گھروں کی زینت نہ بن سکے۔

## ... حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا

شوہر کے لیے بیوی اور بیوی کے لیے شوہر دنیا کی چند بڑی نعمتوں میں سے ہیں۔ قرآن نے تو میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس بھی فرمایا ہے۔ خالق کائنات نے مرد وزن کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش کا سامان رکھا ہے اور اس فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مذہب نے نکاح جیسا خوب صورت تعلق انسان کو دیا۔ شادی نہ صرف تہذیب یافتہ معاشرے کی ضرورت بلکہ یہ زندگی کی حقیقت بھی ہے۔

شادی ایک نئی زندگی ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہوتا ہے کہ اپنے ڈھنگ سے ایک عمر گزارنے کے بعد کسی کا زندگی میں آنا ہر لمحے اُسے اپنے فیصلوں میں شامل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہی تو اس رشتے کا خوب صورت تقاضا ہے۔ رفیقِ حیات ایک ایسی ہستی ہے جسے محبت، دوستی، وفا، جیسے خوب صورت لفظوں کا پیکر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشوں سے یہ رشتہ پروان چڑھتا ہے۔ اگر اِس خوب صورت رشتے کی روزِ اوّل سے دیکھ بھال کی جائے تو کوئی شک نہیں کہ آخری سانس تک ابتدائی دنوں کی تازگی کے احساس کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

میاں بیوی ایک سے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں بلکہ ایک ہی کمرے میں خاصا وقت گزارتے ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتے بڑھتے یہ ایک کمرے میں ساتھ رہنے والے دو انسان رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ہی ان جان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر اختلاف کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن ایک سرد مہری کی سی کیفیت طاری ہوتی چلی جاتی ہے۔ دونوں فریق اپنی ذات کے علاوہ ہر موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہیں، مگر خود اپنی محبت ہی کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اور یوں بظاہر مضبوط نظر آنے والا یہ رشتہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نازک ہوتا چلا جاتا ہے۔ بعض حالات میں تو ایسا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے کہ جس کا ازالہ ممکن نہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ محبت ختم ہو گئی۔ اکثر لوگوں سے یہ جملہ سننے کو ملتا ہے کہ ''اب پہلے کی سی محبت کہاں'' حالانکہ ایسا سوچنا درست نہیں۔ ذرا سی سوجھ بوجھ سے اِس رشتے کی رنگینی کو برقرار رکھنا نہایت آسان ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ ہر جذبے کا اظہار ضروری ہے اب چاہے وہ محبت ہو، غصّہ ہو یا ناراضگی۔ شادی کو کام یاب بنانے کے لیے محبت اور اپنے رفیقِ حیات سے اِس کا اظہار ایک بنیادی شرط ہے۔ محبت اور وارفتگی کا اظہار ایک ایسا

ہتھیار ہے، جو شریکِ زندگی کو تمام تر ناراضگی کے باوجود مسکراہٹ کے بندھن میں باندھ دیتا ہے۔

محبت کے اظہار کا کوئی ایک طریقہ نہیں اِس کا انحصار ہم آہنگی اور تعلقات کی نوعیت پر ہے۔ کوئی لفظوں کی خواہش رکھتا ہے تو کسی کو معمولی سا تحفہ بھی خوش کر جاتا ہے۔ کوئی اپنے کیے گئے فیصلے کی تائید کو محبت کا اظہار تصور کرتا ہے۔ دراصل محبت کا اظہار اِس ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ اپنے شریکِ زندگی سے تعاون کے لیے نہ صرف تیار ہیں بلکہ اِس میں آپ کی خوشی اور راحت بھی پوشیدہ ہے۔ یہ احساس دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

ہمارے ہاں ویسے عام طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ محبت کا اظہار شوہر کی طرف سے ہو۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے، تو اظہار وہ بھی کرتی ہے تاہم اِس کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنی چال ڈھال، ناز و انداز، لباس، آنکھوں اور طرزِ گفتگو سے اِس کا اظہار کرتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات عورت اپنے اظہار کو اشاروں تک محدود کر دیتی ہے۔ دونوں ہی فریق محبت کے اظہار اور اپنی اہمیت کو تسلیم کرانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف زبان سے اظہار کافی نہیں ہوتا۔ اِس کے لیے عملی طور پر ثابت کرنا پڑتا ہے۔

زبان سے لاکھ کہا

جائے کہ آپ کو اپنے شریکِ حیات کے ہر دکھ اور پریشانی کا پوری طرح احساس ہے، لیکن وہ کبھی بیمار ہوگیا اور آپ نے اس کا حال نہیں پوچھا تو آپ کے الفاظ بے جان ہو جائیں گے۔ عملی طور پر جنسِ مخالف پر یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اُن کی خواہش اور دکھ سب اہم ہیں۔

جہاں محبت کا اظہار ضروری ہے، وہیں غصے اور ناراضگی کا اظہار بھی بے حد اہم ہے۔ اپنے جذبات کو اندر ہی اندر گھونٹتے رہنا اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا غلط ہے۔ اگر وہ فریق جسے تکلیف پہنچی ہے، خاموشی اختیار کیے رہے گا، تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ جھگڑے کے بعد مصالحت نہ کرنے کی صورت میں غصہ دبا دیا جاتا ہے اور یوں لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ بلاجواز طرزِ عمل یا غلط رویے کے سامنے چُپ رہنے کی بجائے گفتگو کے ذریعے باہمی اختلافات دور کرنے کی کوشش تعلق میں ایک نئی جان ڈالتی ہے۔

ہماری نئی نسل میں شادی کے بعد اولاد پیدا کرنے میں وقفے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بھی اختلاف کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اولاد ایک ایسا بیج ہے جو مرد و زن کے درمیان محبت کا ایک تناور درخت بن کر اِس رشتے کی حفاظت کرتا ہے۔ شادی کے بعد میاں بیوی کو اولاد پیدا کرنے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ شادی کے ابتدائی برسوں میں پیدا ہونے والی اولاد والدین کو جلد بوڑھا نہیں ہونے

دیتی۔ وہ نہ صرف جلد اُن کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے، بلکہ ماں باپ میں زیادہ مضبوط تعلق کا سبب بھی بنتی ہے۔ وہ لوگ جو جان بوجھ کر اولاد پیدا نہیں کرتے اِن کی زندگیوں کو اکثر بے سکون دیکھا گیا ہے۔ کم از کم ہمارے ہاں تو ایسا ہی ہے۔

محبت کا اظہار، ناراضگی، اولاد، جہاں یہ سب پہلو اِس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جاتے ہیں، وہیں ازدواجی تعلقات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذرا غور کیجیے۔ مرد و زن نکاح کرکے جب شادی جیسے بندھن میں بندھتے ہیں تو یہ صرف دو افراد کے درمیان رشتہ ہی نہیں بلکہ ایک خاندان کی بنیاد بھی بنتا ہے۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ روزِ اوّل سے حقوق و فرائض کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

میاں بیوی کے تعلق کو لفظ لباس سے تعبیر کیا گیا ہے، تو کیوں نہ اپنے لباس کو اپنے لیے پُر وقار بنایا جائے۔ یہ وہ خوب صورت رشتہ ہے جو ذہنی سکون، محبت، صحت، ایک دوسرے کی سچی ہم دردی اور رازداری جیسی نعمتیں عطا کرتا ہے۔ لہٰذا اپنے رفیقِ حیات کا خیال رکھیے۔

گدی فکس ہے۔

آج پھر میرا کراچی ایک وی آئی پی کی آمد پر یرغمال ہے، شہری زندگی مفلوج ہے۔
ہماری سیاسی جماعتیں، جو ہر وقت جمہوریت کا راگ الاپتی ہیں، جمہوریت کی چیمپیئن بنتی اور اس کے لئے قربانی کے دعوے کرتی ہیں، در حقیقت ان کے اندر اوپر سے نیچے تک جمہوریت کہیں نظر نہیں آتی۔ چند مثالوں کو چھوڑ کر خاص طور پر ہر بڑی جماعت کسی نہ کسی فرد یا خاندان کی ذاتی ملکیت نظر آتی ہے، جس میں موروثی نظام پوری ڈھٹائی کے ساتھ رائج ہے، جہاں یہ امر طے شدہ ہے کہ جماعت کی سربراہی فقط جماعت کے قائد کے خاندان کا کوئی فرد ہی کرے گا، چاہے پارٹی کا کوئی دوسرا راہ نما یا رکن کتنا ہی جاں نثار، قابل اور مخلص کیوں نہ ہو۔ باپ کے بعد بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی اور بہو یا داماد ہے جماعت کی قیادت کے اہل قرار پاتے ہیں۔
ہمارے دیس میں سیاسی قیادت بھی کسی جائیداد کی طرح بطور ورثہ دی جاتی ہے، جس کا معیار خونی یا قریب ترین رشتہ قرار پاتا ہے، صلاحیت نہیں۔ دیکھیے اور غور کیجیے ! سیاسی جماعتوں کے جو نام نہاد پارٹی الیکشن کئے جاتے ہیں ان کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ وہاں پارٹی قیادت کے من پسند اور خوشامدی اور راہنماؤں

کے باپ، بیٹا، بہن، بھائی ہی ''کام یاب'' قرار پاتے ہیں۔ اسی طرح جب عام انتخابات یا ضمنی الیکشن کے موقع پر ٹکٹوں کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو قربانیوں، صلاحیت اور دیرینہ وابستگی پر راہنماؤں کے رشتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یعنی کہ ''گدی فکس'' کے اصول پر پارٹی قائم ہے۔

یہی وجہ کے آج ہمیں ایک ویلایتی لیڈر مل رہا ہے جو کہ ہمارا نہیں تو ہمارے بچوں کا لیڈر ضرور بن جائے گا میں سوچتی ہوں کے جس طرح ہم اور آپ اس مورثی سیاست کی وجہ۔برباد ہوئے کیا ہماری آنے والی نسلیں بھی اس عذاب کو جھلیں گی؟ کیا یہ ہوتے ہیں لیڈر جنھیں عام عوام کے مصائب کا علم ہی نہیں ،ساری زندگی پردیس میں انگریزوں کے ڈھنگ سے جینے کے بعد کوئی اچانک آتا ہے اور ہمارا لیڈر بن جاتا ہے۔ میں یہ بات برملا کہتی ہوں کہ ایسے لیڈر ہمارے لئے بہتری کی نوید نہیں بلکہ باعثِ ننگ و عار ہیں۔

جب انٹرنشنل میڈیا اس خبر کو نشر کرتا ہے کہ ایک وی آئی پی کے جلسے کی خاطر سارا شہر تین دن سے ایک عذابِ مسلسل میں بتلا ہے تو آپ کیا توقع کرتے ہیں۔بحثیت قوم ہماری عزمت کو سلام کیا جائے گا یہ ہماری کم عقلی کے ڈھول پیٹے جائے گے۔

جیالے تو مرمٹنے کے لیے تیار ہیں اپنے لیڈر کی ایک جھلک دیکھنے کہ لئے، لیکن کیا یہ ولایتی لیڈر اُن کے وہی لیڈر ہے جس کے لئے کتنے ہی جیالوں نے

اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے نام کا چاپ کرنے والے یہ لیڈر ان کے قدموں کی دھول بھی نہیں۔ بی بی کی قربانیوں کا ذکر کرنے والے، بی بی کی ہمت کا ایک حصہ بھی نہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اور بینظیر بھٹو ایک سچے اور کھرے لیڈر تھے جن کے دل میں عوام کا درد تھا۔ لیکن آج کے حکمرانوں کو عوام کی تکلیفوں سے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے مزدور روز کماتے ہیں اور اگر ایک دن بھی دیہاڑی نہ لگے تو اس کے بچے رات بھوکے سوتے ہیں، لیکن کیا کیا جائے صاحب۔ کسی مزدور کی دیہاڑی اور اس کے بچوں کی خوراک سے زیادہ اہم وی آئی پی کی سکیورٹی ہے۔ بتایئے ایسے رہنما، ہم خود اس سب کے ذمہدار ہیں، پہلے ہم خود حکمرانوں کے ظلم و ستم پر روتے ہیں اور پھر انہی کو ووٹ دیتے ہیں جنھیں ہم نصف صدی سے آزما رہے ہیں۔

پارٹی کی بنیاد جس منشور پر رکھی گئی حالات کے ساتھ ساتھ چاہے پارٹی اس سے انحراف کر جائے یا قیادت الٹی قلابازی کھالے، پارٹی کے عہدے داروں اور کارکنوں میں سے کوئی اف تک نہیں کرتا۔ بہ طور حکمران جماعت کوئی سیاسی پارٹی اپنے منشور کے خلاف یا عوام دشمنی پر مبنی پالیسی اختیار کرلے، پارٹی کے اندر سے کوئی آواز اس کی مخالفت میں نہیں اٹھتی، بلکہ اس کے چھوٹوں بڑوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی اہلیت کے مطابق پارٹی قیادت کے طرز عمل کا دفاع پورے جوش وخروش کے ساتھ کرتا ہے، کیوں کہ سب مزے میں ہیں، اجارہ داری قائم

ہے، مقام مستقل ہے، اجی توبہ کیجیے کون پارٹی کو چھوڑے گا، جیسی بھی ہے آخر ہماری'' پارٹی ہے جیسا بھی ہے آخر ''ہمارا'' لیڈر ہے۔ اصول ضابطے کون دیکھتا ہے'' بس گدی اہم ہے۔

اصولوں اور نظریات کے بجائے افراد اور گروہوں سے غیر مشروط وابستگی ہمارے لوگوں کی اجتماعی نفسیات بن گئی ہے۔ ہم پارٹی کی وفاداری کو ملک سے وفاداری کے مقابلے میں زیادہ اہم گردانتے ہیں۔ کبھی بادشاہ ہوتا تھا اور سارے درباری اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، انکار کر بھی کون سکتا تھا، جو خوشامدی ہوتا اسے عہدہ اور انعام واکرام سے نوازا جاتا اور جو بادشاہ کے فیصلے پر آواز بلند کرتا اس کا ٹھکانا زنداں ہوتا یا تلوار اس کی اٹھے سر کو تن سے جدا کر دیتی۔ بس کچھ ایسا ہی ہے۔ بادشاہ گئے تو ہم نے غلامی کی صدیوں پرانی عادت کے تحت اپنے سر جاگیرداروں، سرداروں اور پھر لیڈروں کے سامنے جھکا دیے۔ بادشاہ اور جاگیردار کی غلامی تو عموماً حالات کے جبر کے تحت کی جاتی تھی، مگر لیڈروں کو خوشی خوشی غلامی کرنے والی رعایا اور ہر حکم مان لینے کو تیار مزارع میسر ہیں۔

یہ سیاسی پارٹی سے وفاداری کم اور پیری مریدی کے تماشے زیادہ لگتے ہیں۔ سیاسی لیڈر پیر اور سارے کارکن اس کے مرید، آواز احتجاج کون بلند کرے۔

البتہ کچھ موقع آتے ہیں جب یکایک کسی سیاسی جماعت سے وابستہ افراد کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور وہ اختلاف سے بھی آگے بڑھ کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جاوید ہاشمی صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہی ہے۔ کبھی مسلم لیگ سے ناراضگی کی بناء پر نواز حکومت پر انگلی اٹھائی اور آج عمران خان ان کے نشانہ پر ہیں۔ اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے پارلیمنٹ میں تحریک عدم اعتماد کی آمد ہو یا صدارتی انتخابات مرحلہ، ایسے مواقع پر منتخب ایوانوں میں بیٹھے مریدوں کی منڈی لگ جاتی ہے اور اس منڈی میں وفاداریاں بکتی ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ پارٹی پر برا وقت آتے ہی دور اقتدار میں ساتھ رہنے والے جو وفا کی علامت بنے رہتے ہیں، جھٹ سے دوسری جماعت کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن حکومت میں ہوتے ہوئے جب وزارتیں، عہدے، مراعات دان ہوتے ہیں تو کوئی حکومت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، چاہے جو اصول مرتب کیے جائیں چاہے جیسی پالیسی تشکیل دی جائے، لیکن گدی اہم ہوتی ہے۔ اور گدی اہم رہے گی کیوں کہ گدی فکس ہے۔

## نفسیاتی عوارض ہی مسائل کی جڑ ہیں

کچھ دن پہلے ایک خبر نظر سے گزری جس کے مطابق۔ ۱۰ اکتوبر پوری دنیا میں ذہنی صحت کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق دنیا کا ہر چوتھا فرد کسی نہ کسی سطح کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہے۔ یعنی عالمی آبادی کا ۲۵ فی صد ذہنی امراض میں مبتلا ہے۔ ولڈ مینٹل ہیلتھ کے اعداد و شمار کے مطابق ۲ کروڑ ساٹھ لاکھ افراد انفضام (schizopherinia) کے مرض میں مبتلا ہیں، جب کہ ۳۵ کروڑ افراد ڈیپریشن جیسے مرض کا شکار ہیں۔ WHO کے مطابق ہر سال ۱۰ لاکھ افراد یعنی ۴۰ سیکنڈ میں ایک شخص خودکُشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر رہا ہے۔ امریکی ادارے نیشنل الائینس فار مینٹل ایلنس کے مطابق امریکا میں ۶ کروڑ ۱۵ لاکھ افراد ذہنی بیماریوں کا شکار ہیں۔ خبر نظر سے گزرنے کے بعد شاید اپنی وقعت کھو دیتی ہے، لیکن راقم السطور کو یہ خبر تشویش میں مبتلا کر گئی کہ پاکستان میں اس حوالے سے کیا صورت حال ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں بنیادی حقوق، انسانی حقوق اور مساوی حقوق جیسے الفاظ کے معنوں سے ہی عوام ناواقف ہو وہاں اس حوالے سے صورت حال یقیناً تشویش ناک ہو گی۔

انسانی حقوق کی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی آبادی کے 34 فی صد لوگ کسی نہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں، لیکن ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ صرف کراچی کی آبادی کے تناسب کے

لحاظ سے یہاں اس مرض کی شرح 34 فی صد سے زائد ہے۔

ذہن کے کسی گوشے میں خطرے نے نقب لگائی اور ایک نیا سوال پیدا ہوا کہ کیا ہمارے ملک میں ذہنی امراض وبائی امراض کے مقابلے میں دُگنی رفتار سے عوام الناس کو دبوچ رہے ہیں۔ یہ یقیناً لمحۂ فکریہ ہے۔ گذشتہ پانچ برسوں کے دوران نفسیاتی امراض کی شرح میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ یہ مرض غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ متاثرہ فرد خود اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ابتدائی کیفیات میں مایوسی، اُداسی، غم کا شدید احساس، اضطراب، بے چینی یا خلل کی کیفیت، بے خوابی یا نیند کی زیادتی، بھوک کی کمی یا زیادتی، وزن میں اُتار چڑھاؤ، موت وہلاکت کے تخیلات اور خودکُشی کے تصّور کا ذہن میں پایا جانا قابلِ ذکر ہیں۔

اگر کراچی جیسے بڑے شہر کی بات کی جائے تو تقریباً ایک کروڑ افراد مختلف نفسیاتی بیماریوں، ڈیپریشن، بے چینی (انزائٹی) اور ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔

شہر میں جاری کشیدگی، اہدافی قتل، دہشت گردی اور بڑھتی ہوئی لوٹ مار اور راہ زنی کی وارداتوں کے باعث کراچی کی 50 فی صد آبادی مختلف نفسیاتی امراض کا شکار ہے۔

ساتھ ہی معاشی فرق یا تفریق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر

پہ چڑھ کر بولتے۔برقی ذرائع ابلاغ کے سحر نے خواہشات کی پیاس سے ہر شخص کو ہوس زدہ کر دیا ہے۔ وسائل کی کمی اور مسائل کی زیادتی۔ ہر شخص مصروف ہے ہر کوئی اپنی جنگ کے محاذ پہ تنہا سپاہی۔ لیکن یہ جنگ بھی عجیب ہے، جس میں فرد واحد آپ ہی اپنی ذات کو نشانہ بناتا ہے اور بس بھاگتے رہنا چاہتا ہے۔ جہاں شہر میں جاری لسانی وفرقہ وارانہ آگ نے اس بیماری کے جانور کی پرورش کی، وہیں بجلی کے بحران نے اسے پروان چڑھایا۔ یومیہ اجرت پر کام کرنے والے لاکھوں مزدور توانائی کے بحران کے باعث بند فیکٹریوں کی وجہ سے بے روزگار ہوئے، پھر روز کی دیہاڑی پر کام کرنے والے افراد کو اور بھی بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ ہم تو اس دیس کے باسی ہیں جہاں فقط ایک وی آئی پی کے جلسے کے باعث اس ملک کی معاشی شہ رگ کو بند کر دیا جاتا... پھر سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ آخر عوام میں بے چینی پائی کیوں جاتی ہے۔ کہیں آئے دن کے نشانہ وار قتل کی وجہ سے شہری زندگی مفلوج ہو جاتی ہے۔ کبھی کسی سیاسی جماعت نے ہڑتال کی کال دی تو کبھی کوئی علاقہ بند کروانے کے لیے اپنے چیلوں کو دندناتا چھوڑ دیا گیا۔ بند کرو بند کرو" کی آوازیں آئیں۔ ایسے میں کوئی کیا کمائے گا اور کیسے اپنے خاندان کی" کفالت کر سکے گا۔ ایسے میں لوگ ہمت ہار رہے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔

اس کی ایک وجہ ذرائع ابلاغ خصوصاً برقی ذرائع ابلاغ پر دکھائے جانے والے پر

کی صورت میں منظر کشی ہے، (Dramatization) تشدد واقعات کی تمثیل کاری
جس کے باعث ایک عام فرد خود کو اس صورت حال میں رکھ کر سوچنا شروع کر دیتا
ہے۔ یوں ایک اَن جانا خوف اس کے نفس پر حاوی ہونے لگتا ہے۔ لوگ تشدد کا شکار نہ
میں مبتلا ہو کر بے چینی اور خوف کے شکنجے post stress disorder ہوں، تو بھی
کی panic attack میں جکڑے جاتے ہیں۔ اس طرح افواہیں ہمیں ہراساں کرکے
کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ایسے میں بظاہر ایک انسان نارمل نظر آتا ہے، لیکن
کی کیفیت رہتی ہے۔ یہ مرض غائب دماغی سے شروع ہوتا (Anxiety) اضطراب
ہے۔ متاثرہ فرد زیادہ تر شدید غصے اور اضطراب کی حالت میں مستقل لڑنے جھگڑنے لگتا
ہے، چوں کہ اس مرض سے آگاہی اور شعور ہمارے معاشرے میں نہ ہونے کے.برابر
ہے، چناں چہ متاثرہ فرد کی ذہنی کیفیت اور اُلجھن کو سمجھنے کی بجائے اُسے مزید تنقید کا
نشانہ بنایا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ مرض شدت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ مرض موروثی
بھی ہو سکتا ہے، جب کہ انسانی جسم میں موجود مختلف کیمیائی تبدیلیاں بھی اس کا سبب
بنتی ہیں۔ اس مرض میں مبتلا فرد بعض اوقات خود سوزی کی کوشش کرتا ہے اور بعض
اوقات اس کیفیت میں اپنے اطراف کے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

اس کی چند مثالیں کچھ عرصے سے ہم اپنے معاشرے میں دیکھ رہے ہیں ۔ معمولی نوعیت
کی ناچاقی کی بنیاد پر قتل جیسا انتہائی سنگین قدم اُٹھانا۔ اولاد کا

ماں باپ کو مار دینا۔ معصوم بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دینا۔ ایک ماں کا اپنے بچوں کو پانی کے ٹینک میں پھینک کر خود بے ہوش ہو جانا۔ قبرستان میں خواتین کی لاشوں کی بے حرمتی کرنا۔ یہ تمام واقعات انتہائی افسوس ناک مگر تلخ حقیقت ہیں جو ہمارے معاشرے کی بدحالی کا ثبوت ہے۔ معاشرہ جس روش پہ چل رہا ہے، اس میں بیمار ذہنوں کی پیداوار ایک لازمی امر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آگاہی دی جائے اور اسباب تلاش کیے جائیں، تاکہ نفسیاتی امراض کے شکار افراد کو بروقت سمجھ کر ابتدا ہی میں علاج کیا جا سکے۔

عوام امن و امان کی خراب صورت حال کے باعث تفریحی مقامات کا رُخ نہیں کر رہے۔ حبس زدہ ماحول میں ایک عام فرد کے لیے یہ صورت حال قطرہ قطرہ زہر کی صورت اثر انداز ہوتی ہے اور نتیجتاً ایک عام فرد ڈیپریشن کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ اطراف کا ماحول ہے۔

گرچہ ایسی کسی صورت حال کا ذمہ دار حکم رانوں کو نہیں ٹھرایا جاتا۔ لیکن اگر ہم ان عوامل کا جائزہ لیں جو ذہنی امراض میں اضافے کی بنیاد بنتے ہیں تو کسی طور حکومت کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معیشت بہتر بنا کر افلاس زدہ طبقے کو غربت کے گڑھے سے نکالنا، اقتصادی سرگرمیوں کو فروغ دے کر بے

روزگاری کا انسداد، تشدد اور زیادتی کے شکار افراد کو انصاف کی فراہمی، یہ سب حکومت اور حکومتی اداروں کے بنیادی فرائض ہیں، لیکن ہمارے حکمرانوں کو اپنے فرائض سے دل چسپی ہے ہی کب۔

میرے اور آپ کے ارد گرد ایسے کتنے ہی لوگ ہوں گے جن کے چہروں پر چھائی اداسی اور آنکھوں کی ویرانی ہم سے دو حرف تسلی کے اور ذرا سی امید کی طلب گار ہوتی ہیں، لیکن ہمیں فرصت کہاں کہ ہم کسی کا دکھ بانٹ سکیں۔ ہم تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں، تو آس پڑوس اور گلی محلے میں بسنے والوں کی فکر کیسے ہوگی۔ اگر کسی ملک اور معاشرے کی ترقی کا پیمانہ امید اور مایوسی کو بنایا جائے تو پاکستانی سماج ناامید معاشروں میں سرفہرست جگہ پائے گا۔

## حصار کھینچیے، بند باندھیے

لکھنا تو بہت کچھ چاہتی تھی لیکن آج قلم اپنی سمت کا تعین کرتے ہوئے لفظ صفحہ قرطاس پر اپنے آپ ہی اتار رہا ہے۔ نفسا نفسی کا ہر طرف راج ہے۔ انسان خواہشات کے تعاقب میں اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ وہ خواب جن کی تعبیر کی خواہش وہ دوسروں سے اپنی زندگی وابستہ ہونے کی وجہ سے کرتا ہے، درحقیقت وہ اس کی اپنی ذات کا الجھاوا بن جاتے ہیں۔

ورنہ جن لوگوں کے لیے ہم اپنے خواب پورے کرکے انھیں خوشیاں دینا چاہتے ہیں اُنھیں ہی فراموش کرنے کا کیا جواز بنتا ہے۔ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد بعد فراغت کے لمحات یا تو دوستوں کے ساتھ گزار دیے جاتے ہیں یا سوشل نیٹ ورکس کی نظر ہو جاتے ہیں۔ میں پہلے بھی اس موضوع پر قلم اٹھا چکی ہوں اور آج پھر اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا، تو اسے کالم کا موضوع بنالیا۔

ہم سوشل ویب سائٹس کے شہر طلسم میں جی رہے ہیں۔ سماجی ویب سائٹس ایک جادو ہیں اور ہم روز بہ روز ان کے سحر میں جکڑے چلے جا رہے ہیں اور غیر محسوس طور پر ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں اینڈرائڈ فونز آ جانے

کے بعد اور عام آدمی کی اس دنیا میں رسائی حاصل کرنے سے جہاں شعور کے دروازے کھلے وہیں ان دروازوں سے مسائل کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں تعلیم و تربیت پر تو کم کم ہی توجہ گئی، لیکن ہاں ٹیکنالوجی ہر طرح کی فراہم کردی گئی۔ کچھ عرصے قبل اندرونِ سندھ سفر کے دوران ایک گاؤں میں کچھ دیر کے لیے رکنے کا اتفاق ہوا۔ ایک ڈھابے سے کھانے پینے کا سامان خرید رہی تھی کہ اچانک میری نظر وہاں بیٹھے بہت سارے لوگوں پر پڑی۔ حیرت اس بات پہ تھی کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود مکمل خاموشی تھی اور فقط ٹیلی وژن کی آواز آرہی تھی۔ ٹیلی وژن پر کیا چل رہا ہے؟ میں اس لیے اس بات سے بے خبر تھی، کیوں کہ وہ دور کافی اوپر ایک لکڑی کے تختے پر رکھا تھا۔ وہاں موجود تقریباً پچاس کے قریب لوگ بڑے انہماک سے اوپر کی طرف نظریں کیے ٹی وی دیکھنے میں محو تھے۔ میری نظر بھی ٹی وی اسکرین کی طرف اٹھ گئی۔ پڑوسی ملک کا ایک انتہائی بے ہودہ گانا چل رہا تھا۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگ اس ''تفریح'' سے محظوظ ہو رہے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی کا راگ الاپتی ہماری حکومت نے سب کچھ تو دیا لیکن تعلیم کی فراہمی پر توجہ نہیں دی۔ ایک شخص جو تعلیم اور شعور سے کوسوں

دور ہے، وہ اگر ایسی چیزوں کو دیکھے گا تو آپ کا کیا خیال ہے اس پر عقل ودانش کے دروازے کھل جائیں گے یا بے ہودہ خیالات اس کی سوچ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیں گے ؟

یہی حال ان دنوں سوشل نیٹ ورکنگ کا بھی ہے۔ انٹرنیٹ اور سستے موبائل فون پر اینڈرائڈ ٹیکنالوجی آج ہر شخص کی دسترس میں ہے، جس کے لیے ہم اپنے پڑوسی ملک اور دیرینہ دوست چین کے شکر گزار ہیں۔ یہ دوستی شاید یک طرفہ ہے، کیوں کہ ہم نے جس طرح چین کی مصنوعات کو اپنے ملک میں کھلی منڈی دی ہے، اس کی مثالیں چین کی تاریخ کے صفحات پر رقم ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے چین سے
ہر طرح کی ٹیکنالوجی خریدی مگر اس سے سیکھ کر خود کچھ نہ بناسکے۔

بندر کے ہاتھ ناریل لگ جائے تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جو ہماری قوم کر رہی ہے۔ ٹیکنالوجی ہاتھ لگ چکی ہے، لیکن اس کا درست سمت میں استعمال شاید بمشکل دس فی صد لوگ کر رہے ہوں۔

بات فقط ان پڑھ لوگوں کی نہیں۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔ اپنے بچوں کو سوشل نیٹ ورکنگ کی حقیقت سمجھائے بنا، انٹرنیٹ کے صحیح

استعمال کی با قاعدہ تربیت دیے بغیر ہم بڑی آسانی سے دوسرے کی دیکھا دیکھی اپنے بچوں کو ٹیبلٹ اور آئی فون تحفے میں خرید کر دے دیتے ہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ انٹرنیٹ کی سہولت دینے والی کمپنیوں کے اشتہارات میں نوجوان نسل کو ناچ ناچ کر اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ اب جو چاہو لوڈ کرو۔ اس اپ لوڈنگ اور شیئرنگ کے چکر میں کتنے ہی لڑکیاں اور لڑکے بلیک میل ہوئے اور کتنوں نے بدنامی کے خوف سے اپنی جان دے دی۔

اس حوالے سے ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے ہم کچھ بھی کرلیں ہم مغربی سماج کے ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ان کی روایات، اقدار اور ثقافت ہم سے بالکل الگ ہیں۔ جہاں ان کی آزادی شروع ہوتی ہے وہ مقام ہمارے عام گھروں میں آزادی کی انتہا کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسے میں ''کچھ بھی شیئر اور اپ لوڈ'' کرنے کے ضمن میں ایک معمولی سی لغزش کسی نوجوان کی زندگی تباہ کر سکتی ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم خود پر ''دقیانوسی'' ہونے کا ٹیگ نہیں لگانا چاہتے۔ لیکن ہم یہ بھی نیں جانتے کہ دقیانوسی ہونے کا تعلق معاشرے کی اقدار سے نہیں ہوتا۔ مذہب اور عقائد کو ایک طرف رکھ کر بھی سوچا جائے تب بھی ہر جگہ ہر علاقے کی اپنی معاشرتی حدود ہوتی ہیں اور ان حدود کی پاس داری نہ کرنے والوں کو معاشرہ قبول نہیں کرتا۔

ٹیکنالوجی اپنایئے، لیکن اپنے شعور

کے دروازے بھی ہر وقت کھلے رکھیے اور اپنی اقدار کو کسی قیمت پر نظرانداز نہ کیجیے۔ معاملہ انٹرنیٹ اور موبائل فون تک محدود نہیں۔ ٹی وی جو ہر گھر کی ضرورت ہے، اس کی اسکرین بھی ہمیں نظریں جھکانے یا چرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ خبریں یا کسی سنجیدہ پروگرام کے دوران چینلز پر جب کوئی نامناسب اشتہار چلتا ہے تو اسکرین کے سامنے بیٹھے گھر کے تمام لوگ اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، چینل بدلنے کا بھی کیا فائدہ، دوسرے چینل پر یہی یا شاید اس سے بھی زیادہ نازیبا اشتہار چل رہا ہو۔ ٹی وی بند کر نہیں سکتے، اس طرح آپ دنیا سے کٹ جائیں گے۔ رفتہ رفتہ ہم ان چیزوں کے عادی ہونے لگتے ہیں، اور شاید اس سب کا مقصد بھی یہی ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی گھر کے نوجوان بچے کیا ایک نشست میں بیٹھ کر ان مسائل کو زیر بحث نہیں لا سکتے جن کا آج پاکستان کے ہر گھر کو سامنا ہے؟ اور جن پر بات کرنا شعور اجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ہم ان موضوعات پر بحث کرتے ہیں کہ کون سا سیل فون یا ٹیبلٹ اچھا ہے، ہم اس پر بحث کیوں نہیں کرتے کہ اس ٹول کو ہمیں کیسے انفارمیشن کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ یہ اشیاء ہمارے لیے مثبت سرگرمیوں کے استعمال کا ذریعہ بن جائیں۔ ہم اس نکتے پر اپنے گھروں میں بات کیوں نہیں کرتے کہ وہ کون سی حد ہے جہاں ہمیں خود کو روک لینا ہے۔

انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور اینڈرائڈ فونز کی وسیع دنیا سے متعلق اشتہارات اور سلوگنز ہمیں آزادی کا وہ تصور دیتے ہیں جس کا انجام تباہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آزادی کو پابندیوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے خاندان، قبیلہ، معاشرہ، حکومت اور ریاست جیسے ادارے وجود میں آئے، تاکہ انسان ان کی بنائی ہوئی اقدار، ضوابط اور قوانین کے دائرے میں رہ کر آزادی سے لطف اٹھا سکے، اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو دنیا انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ بن جاتی جس کی کوئی منزل ہوتی نہ کوئی مقصد۔ فرد کو بے ہنگم اور تباہ کن آزادی سے بچانے کا فریضہ خاندان انجام دیتا ہے اور قوم، عوام یا شہریوں کو اس تباہی سے بچانے کے لیے ریاست کا ادارہ ذمے داری پوری کرتا ہے۔ ہمیں اپنی اقدار پر ہونے والی جس یلغار کا سامنا ہے اس مقابلہ خاندان ایک حد تک ہی کر سکتا ہے، سوال یہ ہے کہ ریاست کا ادارہ کہاں ہے؟ حکومت کہاں ہے؟ قوانین کے نفاذ، ان پر عمل درآمد اور آگاہی کی مہم کے ذریعے ٹیکنالوجی کے غلط استعمال کو روکا جا سکتا یا اسے محدود کیا جا سکتا ہے، لیکن حکومت اور اس کے متعلقہ ادارے اس ساری صورت حال میں خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ اس دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں جب مختلف ملکوں کی حکومتوں نے اپنی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے بچاؤ کے لیے انٹرنیٹ اور متعلقہ ٹیکنالوجیز کے ذریعے آنے والے طوفان کے سامنے بند باندھے، لیکن ہماری حکومت اور متعلقہ ادارے اپنی ذمے داری پوری

کرنے کو تیار نہیں دکھائی دیتے۔ بہرحال حکومت کچھ کرے نہ کرے، بہ طور فرد اور خاندان ہمیں اپنی اقدار کی حفاظت کے لیے خود حصار کھینچنا ہوگا اور بند باندھنے ہوں گے۔

# ڈھونڈ ہی لیا

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس آپ کو آپ کے دوستوں اور جاننے والوں سے تو رابطے میں رکھتی ہی ہیں، لیکن بعض اوقات ان کے ذریعے برسوں کے بچھڑے ہوئے لوگ بھی مل جاتے ہیں۔

ایسا کبھی تو اتفاق سے ہوتا ہے اور کبھی کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے کے لیے جستجو کرنی پڑی ہے۔ ایسی ہی جستجو کراچی سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی منیزہ طلعت نے کی اور بڑی کوششوں کے بعد کامیابی سے ہم کنار ہو گئی۔ یوں منیزہ طلعت نے فیس بک کے ذریعے اپنی برسوں کی بچھڑی ہوئی پھوپھی اور ان کے اہل خانہ کو تلاش کرلیا۔

بچھڑنے اور ملنے کی اس کہانی کا آغاز تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے ساتھ ہوا۔ منیزہ طلعت کے والد ولی الحق، اور ان کے دو بھائی رفیع الحق اور شبیہ الحق بھارت کے شہر پٹنہ سے ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور ان کی دو بہنیں اور دو بھائی ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے اس خاندان کے افراد کا 80 کی دہائی تک رابطہ رہا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب منیزہ طلعت

دنیا میں نہیں آئی تھیں۔ آخر یہ زندگی کے جھمیلے اور دونوں ممالک کے درمیان رابطوں کی صورت حال کی وجہ سے ربط کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

منیزہ نے جب ہوش سنبھالا تو وہ گھر میں اپنی پھپھیوں اور بھارت میں مقیم دیگر رشتے داروں کا ذکر سنتی تھیں، لیکن یہ بات انھیں ملول کر دیتی تھی کہ پھوپھی جیسا پیارا رشتہ میسر ہونے کے باوجود وہ اس رشتے سے محروم ہیں اور اپنی پھوپھی سے رابطہ نہیں کر سکتیں۔ 2002 میں منیزہ کے بڑے بھائی کا دہلی جانا ہوا۔ تمام اہل خانہ خوش تھے کہ یہ سفر وہ رابطہ بحال کر دے گا جو برسوں پہلے ٹوٹ چکا تھا، لیکن ایسا نہ ہو سکا، منیزہ کے بھائی نے اپنی پھوپھی کو بہت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر انھیں کام یابی نہ ملی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دور پیچھے رہ گیا جب خط اور ٹیلی فون ہی رابطوں کا ذریعہ ہوا کرتے تھے۔ انٹرنیٹ اور ای میل کا سلسلہ شروع ہوا، پھر سوشل میڈیا کا ظہور ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان میں بھی سوشل ویب سائٹس نے مقبولیت حاصل کر لی، جن میں فیس بک سرفہرست ہے۔

بہت سے دیگر پاکستانی نوجوانوں کی طرح منیزہ نے بھی فیس بک پر اپنا اکاؤنٹ بنایا۔ اس اکاؤنٹ کا مقصد محض وقت گزاری، تفریح اور گپ شپ نہیں تھا، بل کہ ان کے سامنے ایک واضح مشن تھا۔ انھیں اس سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کے ذریعے

بھارت میں مقیم اپنے رشتے داروں کو تلاش کرنا تھا۔ آخر کار منیزہ نے فیس بک کے ذریعے اپنی ایک پھوپھی کی تلاش شروع کر دی۔ انھیں اپنے پھوپھی زاد بھائیوں مشرف عالم اور منور عالم کے نام معلوم تھے، چناں چہ ان ہی ناموں کے سہارے انھوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ منیزہ کہتی ہیں، ''ان دنوں فیس بک پر ان ناموں (مشرف عالم اور منور عالم) کے پروفائلز دیکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔'' وہ ان ناموں کے تلاش کرتیں، ان کے پیجز پر جا کر تفصیلات کا جائزہ لیتیں، لیکن پھر انھیں مایوس ہونا پڑتا۔

آخر ایک دن انھیں لگا کہ ان کی محنت رنگ لائی ہے اور ان کی مہم کام یابی سے ہم کنار ہونے کو ہے۔ ان کے سامنے مشرف عالم نام کا ایک پروفائل کُھلا، جائزہ لیا تو پتا چلا جس مشرف عالم کا یہ ہے وہ پٹنہ میں مقیم ہے، یعنی اسی شہر میں جہاں سے منیزہ پھوپھی کا تعلق تھا۔ یہ دیکھ کر منیزہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور انھیں پختہ یقین ہو گیا کہ یہی اس کے کزن ہیں۔ انھوں نے فوراً مشرف عالم کو فرینڈ ریکویسٹ بھیج دی، ساتھ ہی میسیج بھی کر دیا، لیکن دو دن تک کوئی جواب نہ آیا اور مکمل خاموشی چھائی رہی۔ اس دوران منیزہ بے کار نہیں بیٹھیں، وہ مشرف عالم کے پیج اور اس پر آنے والی پوسٹس کا جائزہ لیتی رہیں۔

اس دوران انھیں مشرف عالم کے پیج پر سب سے زیادہ کمنٹس محمد انیس نامی ایک صاحب کے نظر آئے جو اسلام آباد میں رہتے تھے۔ منیزہ نے محمد انیس کو فرینڈ ریکویسٹ اور ''ہیلو'' کا پیغام بھیج دیا۔ محمد انیس نے منیزہ کی فرینڈ ریکویسٹ قبول کر لی اور ان کے پیغام کا جواب دیا، اس کے ساتھ ہی دونوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ منیزہ نے اپنی تلاش کا ذکر محمد انیس سے کیا۔ انھوں نے منیزہ سے ان کے والد کے موبائل فون کا نمبر لیا، جس پر اسی رات منیزہ کو منور عالم کا میسیج ملا۔ میسیجز کے ذریعے پتا چلا کہ یہ منور عالم منیزہ کے کزن نہیں ہیں۔ منیزہ کو دکھ ضرور ہوا مگر وہ مایوس نہیں ہوئیں اور اپنی مہم جاری رکھی۔ ناکامی تو ہوئی، مگر اس بہانے منیزہ کو محمد انیس کی صورت میں ایک اچھے دوست مل گئے، جن کے بارے میں وہ کہتی ہیں،''بالکل میرے ابو کی طرح، بہت شفیق۔''

منیزہ کے والدین اور محمد انیس اور ان کی اہلیہ کے درمیان رابطوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ منیزہ کے والد نے انھیں بھارت میں مقیم اپنے رشتے داروں کے بارے میں بتایا۔ محمد انیس کو ان سب میں مشرف عالم تک رسائی آسان لگی، کیوں کہ منیزہ کے اہل خانہ کو یہ معلومات کسی طرح حاصل ہوچکی تھیں کہ مشرف عالم بھارت کے سرکاری ٹی وی چینل دوردرشن سے وابستہ ہیں، ادیب ہیں اور ان کا قیام دہلی میں ہے۔ محمد انیس نے بھارت میں مقیم اپنے رشتے داروں کو یہ

ذمے داری سونپی کہ وہ مشرف عالم سے رابطہ کریں۔ یہ سلسلہ شروع ہونے کے تقریباً چار ماہ بعد اتوار کی صبح منیزہ سو رہی تھیں کہ ان کا موبائل فون بجنے لگا۔ منیزہ نے کال ریسیو کی۔

دوسری طرف محمد انیس تھے۔ انھوں نے کہا، ''تمھارے لیے خوش خبری ہے۔ تمھارے کزن مشرف عالم سے میری بات ہوئی ہے۔ ان کا نمبر لکھو۔ بے پناہ مسرت کے ساتھ منیزہ کے دل میں یہ خوف بھی تھا کہ اگر یہ بھی اس کے کزن نہ نکلے تو امید کا دیپ ایک بار پھر بجھ جائے گا۔ اس دن مصروفیات کے باعث فون کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ اگلے روز صبح منیزہ جب فیس بک پر لاگ آن ہوئیں تو وہاں ان کے لیے ذوقی عالم کے نام سے فرینڈ ریکویسٹ آئی ہوئی تھی، جن کے پروفائل پر شہر کے خانے میں دہلی لکھا ہوا تھا۔ منیزہ نے ریکویسٹ قبول کرلی۔ اس کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد منیزہ کے پاس ذوقی عالم کا میسج آیا۔ چند جملوں کا تبادلہ ہوا، اور پھر یہ جان کر منیزہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ اپنے پھوپھی زاد بھائی مشرف عالم سے گفتگو کر رہی ہیں۔ پھر کیا تھا۔ یادوں اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا گیا۔

اب یہ سنیے کہ مشرف عالم نے منیزہ کو کیسے تلاش کیا۔ ہوا یوں کہ جب محمد انیس نے مشرف عالم کی کھوج لگا کر انھیں کال کی تو اس وقت مشرف عالم شدید

پریشانی سے دوچار تھے، کیوں کہ ان کا ڈینگی کے مرض میں مبتلا بیٹا اسپتال میں زیر علاج تھا۔ محمد انیس نے انھیں بتایا کہ آپ کو آپ کی ایک عزیزہ تلاش کر رہی ہیں، جن کا نام منیزہ طلعت ہے۔ محمد انیس انھیں منیزہ کے والد کا نام بتانا بھول گئے، اسی اثناء میں لائن کٹ گئی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو کال کرنے کی کوشش کی گئی مگر کال نہ لگی۔

مشرف عالم کو منیزہ کا نام یاد تھا۔ اسپتال سے گھر جا کر وہ فیس بک پر لاگ آن ہوئے اور ''منیزہ طلعت'' کی تلاش شروع کر دی۔ فیس بک پر اس نام کے کے کتنے ہی پروفائل موجود تھے۔ آخر ایک پروفائل پر آکر مشرف عالم کو اپنائیت محسوس ہوئی۔ جب انھوں نے فرینڈ لسٹ پر نظر دوڑائی تو وہاں منیزہ کے بھائیوں رضوان الحق، فرحان الحق اور اظفرالحق کے نام موجود تھے، انھیں لگا کہ یہ وہی منیزہ ہے جس کی انھیں تلاش ہے، کیوں کہ ان کے دادا کا نام بشیر الحق تھا۔ انھوں نے فوری طور پر منیزہ کو فرینڈ ریکویسٹ بھیج دی۔

یوں آخر کب کے بچھڑے ہوئے فیس بک کے توسط سے برسوں بعد مل گئے۔

## موبائل فون پڑھا رہا ہے

ایک زمانے میں ہماری دنیا میں فاصلوں کا یہ عالم تھا کہ بہت سی قومیں دوسری اقوام کے وجود ہی سے بے خبر تھیں۔

مہینوں کی صعوبتوں سے بھرپور مسافت کے بعد کوئی کسی دور دیس پہنچتا تھا تو وہ اس کے لیے حیرت کی ایک نئی اور انوکھی دنیا ہوتی تھی۔ جہاں گیری کے جوش اور تجارتی مقاصد نے مختلف قوموں کو دور دراز خطوں اور ممالک کی دریافت پر اکسایا، یوں پُرخطر مہمات شروع ہوئیں۔ لیکن آج ساری دنیا ٹی وی اور پھر کمپیوٹر سے ہوتی ہوئی چھوٹے سے موبائل میں سمٹ آئی ہے۔

موبائل فون جہاں سماجی رابطوں اور مختلف تفریحات کا سامان فراہم کر رہے ہیں وہیں یہ کتب بینی کا شوق رکھنے والوں کو مطالعے کی سہولت بھی دے رہے ہیں اور موبائل فونز پر کتابیں اور دیگر مختلف قسم کی تحریریں پڑھنے کا رجحان دن بہ دن ترقی کرتا جارہا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو جانب سے جاری کی جانے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان سمیت ایسے دیگر ممالک میں موبائل فون پر مطالعے کے رجحان میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے، جہاں

ناخواندگی کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔
اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے تیار اور جاری کی جانے والی یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ جن ممالک میں کتب خانوں میں جاکر یا خرید کر کتابیں پڑھنے کا رجحان بہت کم ہے اور وہاں لوگوں کی اکثریت تعلیم یافتہ نہیں ہے، ایسے ممالک میں مطالعے کے شوقین لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد موبائل فون ڈیوائس کی چھوٹی سی اسکرین پر اور انٹرنیٹ کے ذریعے پوری پوری کتابیں پڑھ ڈالتی ہے۔
موبائل فون مطالعہ'' کے عنوان کے تحت مرتب کی جانے والی اقوام متحدہ کی یہ'' رپورٹ اپنی نوعیت کی پہلی تحقیقی کاوش ہے۔ اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کے لیے موبائل فون رابطوں کا وسیلہ ہونے کے ساتھ معلوماتی مواد اور کتابیں پڑھنے کا ذریعہ بھی ہے۔
یہ تحقیق رپورٹ مرتب کرنے کے لیے جن لوگوں سے گفت وشنید کی گئی ان میں سے ایک تہائی سے زاید افراد نے بتایا کہ وہ بچوں کو موبائل فون پر کہانیاں پڑھواتے ہیں۔
اس رپورٹ کے مطابق ایک اہم بات یہ ہے کہ موبائل ڈیوائس پر

کتابوں اور دیگر مواد کا مطالعہ کرنے والوں میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔

موبائل فون کے ذریعے صرف مطالعہ ہی نہیں کیا جارہا بل کہ بہت سے افراد اس کی مدد سے اپنی علمی استعداد میں اضافہ بھی کر رہے ہیں۔ یہ تحقیق رپورٹ بتاتی ہے کہ جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں وہ موبائل فون کی مدد سے اپنے پڑھنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تحقیق رپورٹ مزید بتاتی ہے کہ جن ممالک میں کتابوں کی کمی اور غربت ہے، ان ملکوں میں موبائل فون ریڈنگ میں اضافے کے رجحان کو ایک عام سی بات تصور کیا جارہا ہے۔

واضح رہے کہ عالمی ٹیلی کمیونی کیشن یونین کی جانب سے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق دنیا بھر میں اس وقت چھے ارب موبائل فون زیر استعمال ہیں، جب کہ دنیا کی آبادی سات ارب کے لگ بھگ ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کی جانب سے موبائل فون پر مطالعے کے رجحان کے بارے میں کی جانے والی یہ تحقیق دنیا کے ایسے ممالک اور حکومتی وریاستی اداروں کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے جو اپنے ملک میں شرح خواندگی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ غربت اور ناخواندگی کے شکار ممالک اور ان کے ادارے

اس رپورٹ کی روشنی میں اپنے اپنے ملکوں میں موبائل فون ڈیوائس استعمال کرکے خواندگی اور مطالعے کے رجحان کو فروغ دے سکتے ہیں۔

یونیسکو کی جانب سے کی جانے والی اس تحقیق کے دائرے میں وہ ممالک شامل تھے جہاں ناخواندگی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ ان ممالک میں پاکستان کے علاوہ نائجیریا، بھارت، گھانا، ایتھوپیا، یوگنڈا اور زمبابوے شامل ہیں۔

## زندگی پر ایک اور راستہ بند

میرے ملک میں اور خاص طور پر میرے شہر میں اجل کے لیے ہزار راستے ہیں، وہ وارداتوں سے حادثات تک کسی بھی شکل میں آ کر ہم شہریوں کو اپنا تر نوالہ بنا سکتی ہے، لیکن زندگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس پر سارے راستے بند ہیں اور کوئی راہ کھلنے بھی لگے تو اس پر کانٹے اور پتھر بچھا دیے جاتے ہیں۔ سو بلدیہ عظمیٰ کراچی نے اگر اپنا ریسکیو منصوبہ ہم عوام کے علم میں لائے بغیر ختم کر دیا تو اس میں حیرت اور افسوس کی کیا بات ! ہم شہریوں کا یہی مقدر ہے۔

اب کراچی کے شہری بس یہ جان کر خوش ہو جائیں کہ ان کے لیے کتنا مفید اور ضروری منصوبہ بنایا گیا تھا، جس کا مقصد کراچی کے باسیوں کو کسی بھی ناگہانی آفت اور ہنگامی صورت حال میں محفوظ رکھنے اور ان کی زندگی بچانے کے لیے حفاظتی خدمات کی فوری فراہمی تھا۔ ریسکیو خدمات کی فراہم کے اس منصوبے کے تحت ابتدائی طور پر 10 کروڑ روپے کی 10 جدید مرسڈیز ایمبولینسیں بیرون ملک سے منگوائی گئی تھیں۔ بعد میں ان ایمبولینسوں اور ریسکیو رضاکاروں کی تعداد کو بڑھایا جانا تھا۔ اس کے ساتھ کراچی کے تمام اضلاع میں ریسکیو سینٹرز کا قیام بھی اس منصوبے کا حصہ تھا تاکہ کسی بھی نوعیت کی ایمرجینسی کی صورت

میں ایک ٹیلیفون کال پر اطلاع ملتے ہی ریسکیو عملہ صرف 7 منٹ کے اندر متعلقہ مقام پر پہنچ سکے اور زخمیوں کو اسپتال منتقل کرنے تک بنیادی طبّی امداد دے کر جان بچائی جا سکے۔

یاد رہے کہ یہ منصوبہ کس شہر کے لیے تھا۔ اس شہر کے لیے جہاں بم دھماکوں یا ہنگامی حالات میں رفاہی اداروں کے غیر تربیت یافتہ رضاکار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی خاطر جائے وقوعہ پر لڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور ایک زخمی یا میت کو اٹھانے کے لیے چھینا جھپٹی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی حادثے کی صورت میں ایمبولینسوں کا انتارش لگ جاتا ہے کہ رضاکاروں کو ریسکیو کے کام میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔

یہ منصوبہ اس شہر کے رہنے والوں کی سہولت کی خاطر بنایا گیا تھا جہاں ایک خبر کے مطابق سرکاری اسپتالوں کو فراہم کی گئی پچیس ایمبولینسوں میں سے اکثر جاں بہ لب اور شدید تکلیف میں مبتلا مریضوں کو لانے لے جانے کے بجائے ان اسپتالوں کی انتظامیہ کے لوگوں کے ذاتی استعمال میں ہیں۔

اس منصوبے کو کراچی کے شہریوں کے لیے زندگی کی نوید بننا تھا۔ کراچی جہاں ڈکیتی اور ،راہ زنی کی وارداتوں میں مال کے ساتھ جان لے لینا عام سی بات ہے

جہاں ٹارگیٹڈ کلنگ کی وارداتیں ہر ایک کو خوف زدہ کیے ہوئے ہیں، جہاں خوف ناک اور جان لیوا ٹریفک حادثات معمول ہیں، جس شہر میں آگ لگنے اور برسات کی صورت میں شعلے اور پانی جان کی بھینٹ لے کر ہی رہتے ہیں اور مصیبت زدہ افراد مدد کے لیے پکارتے پکارتے جان سے گزر جاتے ہیں۔ تو صاحب! موت کے اس پسندیدہ اور منتخب شہر سے زندگی کا تحفہ چھین لیا گیا۔ ریسکیو منصوبہ ختم کر دیا گیا۔ اس حوالے سے دل کو رلاتی اور خون جلاتی خبر کے مطابق اس ریسکیو منصوبے کے لیے 5 سال قبل خریدی گئی کروڑوں روپے مالیت کی ایمبولینسیں کھڑے کھڑے خراب ہو گئی ہیں اور بلدیہ عظمیٰ کراچی کے پاس ایمبولینسوں کی مرمت کے لیے فنڈز موجود نہیں ہیں، چناں چہ ایمبولینسوں کو شہری حکومت کے مرکزی دفتر سوک سینٹر میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سندھ کے 6 کروڑ عوام کے لیے سرکاری سطح پر ایمبولینس سروس سمیت کسی بھی قسم کی ریسکیو سروس موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے سندھ کے عوام فلاحی اداروں کی غیر معیاری، ناقابل اعتبار ایمبولینسیں استعمال کرنے پر مجبور ہیں، جن میں سے 90 فی صد سے زائد ہائی روف کو تبدیل کر کے بنائی گئی ہیں۔

اس منصوبے کے خاتمے پر نوحہ کرتے ہوئے یہ حقائق جاننا بھی ضروری ہیں کہ کراچی کے سرکاری اسپتالوں میں ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے درکار وسائل اور بنیادی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ شہر کے تین بڑے سرکاری اسپتالوں میں

دہشت گردی اور ناگہانی آفات کے نتیجے میں شدید زخمی اور ہلاک ہوجانے والے افراد کی مناسب دیکھ بھال اور علاج کی سہولتیں تقریباً ناپید ہیں۔ شہر کی دو کروڑ آبادی کے لیے بنائے گئے صرف 3 بڑے سرکاری اسپتالوں کے شعبہ حادثات میں 200 کے قریب بستر موجود ہیں، اسپتالوں کے پاس اپنی ایمبولینس سروس موجود نہیں ہے، صرف ایک سرکاری اسپتال کے پاس برنس وارڈ کے محض 60 بیڈ موجود ہیں۔

کراچی آبادی کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ بہت وسیع رقبے پر بے ہنگم انداز میں پھیلا شہر ہے جہاں مضافات میں رہنے والے مریضوں کو طویل فاصلہ طے کرکے سرکاری اسپتالوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ آلودہ پانی، فضائی آلودگی اور صحت کے دیگر مسائل تو اپنی جگہ دہشت گردی، حادثات اور قدرتی آفات بھی کراچی کے کتنے ہی خاندانوں کے اپنوں سے ہمیشہ کی جدائی کے غم سے دوچار کرجاتی ہیں۔ یہاں ریسکیو اور ایمرجینسی کے فرائض انجام دینے والے اداروں کا کیا حال ہے؟ اس کا اندازہ بلدیہ ٹاؤن کی ایک فیکٹری میں لگنے والی آگ میں پھنس کر درجنوں افراد کی ہلاکت اور گذشتہ دنوں جناح ایئرپورٹ پر ہونے والی دہشت گردی کے نتیجے میں محصور ہو کر مدد کے انتظار میں کتنے ہی زندگیوں کے جل جانے کے واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے واقعات اور روز کے حالات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ بلدیہ عظمیٰ کراچی کا یہ منصوبہ اس شہر

کے رہنے والوں کی کتنی بڑی ضرورت تھا۔ پھر ایسے ناگزیر منصوبے کو یکایک کیوں ختم کردیا گیا؟ ہے کوئی پوچھنے والا؟ دے گا کوئی جواب؟ اگر یہ بلدیہ عظمیٰ کے مالی وسائل کی کمی کا شاخسانہ ہے تو سوال یہ ہے کہ دو کروڑ سے زائد آبادی والے میٹروپولیٹن سٹی کو جو ملک کا معاشی مرکز ہے کی بلدیہ کے پاس اتنے مالی وسائل بھی نہیں کہ وہ اپنے شہریوں کو بنیادی سہولیات فراہم کرسکے؟

نہیں صاحب! نہ کوئی سوال اٹھے گا نہ کوئی جواب آئے گا کیوں کہ یہ معاملہ عام آدمی کی زندگی کا ہے، اور ہمارے ایوانوں سے اداروں تک اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ عام آدمی کو جینا ہے تو مکمل ’’خودانحصاری‘‘ کے ساتھ جیئے، ایوان اور ادارے اس کے لیے نہیں بنے، وہ جن کے لیے بنے ہیں ان کے کام آرہے ہیں۔

## ان معصوموں کا قصور کیا ہے؟

نا سر پر چادر نہ پیروں میں جوتی۔یہ وہی ماں ہے جس کا بچہ پشاور سانحہ میں ان سے الگ کر دیا گیا۔موت کی آغوش نے جب اس کے بچے کے وجود کو اپنے اندر سمویا تو وہ مزاحمت بھی نا کر سکی۔وہ اس دنیا سے اس کی خوشیوں کے لڑتی رہی۔دن رات ایک کر کے اس کی تعلیم پر توجہ دی اور اب وہ چھٹی جماعت میں پہنچ چکا تھا۔ہاں اسے اپنے اس بیٹے سے بہت پیار تھا یہ بڑا جو تھا۔پھر اس کے بعد بھی اس کے دو بیٹے
اور بھی تھے جس سے وہ پیار کے ساتھ ساتھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی رہتی تھی۔اور سارا دن گھر میں انہیں کی شرارتوں کے ساتھ گزر جاتا۔لیکن آج کوئی نہیں تھا۔کہیں نہیں تھا۔کل ہی تو تین جنازے اس کے گھر سے اٹھائے گئے تھے۔ہاں اس کے تینوں بیٹے مر چکے تھے۔لوگوں نے یہ کہہ کر بہت تسلی دی کے وہ شہید ہوئے ہیں تم غم نا کروں۔لیکن صبر کیسے آتا۔کیسے آئے ؟کیسے وہ خود کو روکے۔وہ بار بار گھر سے بار دوڑ نکلتی اور اسی جگہ پہنچ جاتی جہاں سے اس نے اپنے بچوں کے مردو وجود کی شناخت کی تھی۔پشاور کا وہ ہسپتال اب بھی زخمی بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ایک کونے میں بیٹھی وہ آتے جاتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔کہ شاید اس کے بچے ابدی نیند نہ سوئے ہوں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔اور یہ سب فقط ایک ڈراونا خواب ہو جس میں کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔۔۔۔

لیکن ایسا نہ تھا۔ اب تک کتنے ہی بچے موت کے منہ میں جا چکے تھے اور کتنے ہی زخمی تھے
۔ہاں یہ وہی پشاور کا سانحہ ہے کہ جس نے پوری قوم کے خون کے آنسو رولا دیا۔
اور کتنے امتحان ہم سے ہمارے پاکستانی ہونے کی پاداش میں لیے جاتے رہے گے۔ جن ماؤں کے کلیجے آج پھٹ گئے ہیں، وہ غم نہ کریں، ان کے بچوں نے قربانی دی ہے اور ان کی شہادت نے ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ یہ مذہب کے نام پر تماشا لگانے والوں کی ہار ہے۔ وہ ہار چکے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ ایک معصوم کا قتل اللہ کے نزدیک پوری انسانیت کا قتل ہے تو میرے رب کی عدالت میں ایک بچے کا قتل کتنا بڑا جرم ہوگا۔ یہ سوال بھی ذہن میں ابھر رہا ہے کہ خاص طور پر بچوں کو نشانہ بنانے کے پیچھے ان بھیڑیوں کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔
میں برملا کہتی ہوں کہ پشاور سانحہ پر دہشت گرد اپنی فتح کی خوشی نہ منائیں، کیوں کہ ا ب وہ ہار گئے ہیں۔ اس ملک کے وہ معصوم عوام جو مذہب کے نام پر ان کے پیروکار بنے بیٹھے تھے اور انھیں حق پر سمجھتے تھے، آج اُنھیں دہشت گردوں کی حقیقت کا اندازہ ہوگیا ہے۔ یہ لوگ مذہب کے نام پر شیطانیت کا روپ دھارے ہمارے بچوں کو کسی بھیڑیے کی مانند دبوچ کر بیٹھے ہیں۔

دہشت گردو! خدا کے لیے درندے مت بنو ہمارے بچوں کو بخش دو۔ ان معصوموں کا کیا قصور ہے۔ کس اسلام اور کس مذہب کی بات کرتے ہو۔ یہ اسلام نہیں ہے، یہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ میرا دین نہیں تم لوگ کس کی کٹ پتلی بن کر یہ سب کر رہے ہو۔ خدارا! ہمارے بچوں کو بخش دو۔ یہ وہی بچے ہیں جن سے نبی ﷺ نے سب سے زیادہ محبت کی، یہ وہی بچے ہیں جو فرشتوں کی طرح معصوم ہوتے ہیں۔ اسلام کا نام لینے والو! کبھی سوچا ہے ایک لمحے کے لیے بھی کہ جس دین کی تم پیروی کرتے ہو جس کا ماننے والا ہونے کے تم دعوے دار ہو۔ کیا اس دین نے اس طرح سے فتح حاصل کی؟

یہ ہماری حکومت کی مکمل ناکامی ہے، جو وہ اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کر رہی کہ یہ دہشت گرد ہمارے ہر شہر ہر قصبے میں موجود ہیں۔ یہ خاموش قاتل اب ہماری نسلوں کو قتل کرنے کا منصوبہ لیے ہمارے گھروں تک آ چکے ہیں۔ ٹی وی اسکرین جو منظر دکھا رہی ہے اسے میں قیامت کہوں یا اس سے بڑھ کر کچھ کہا جائے۔

اسلام کا نام لینے والے یہ نام نہاد مسلمان کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ میرا مذہب تو وہ دین برحق ہے کے جس میں جنگ کہ دوران عورتوں اور بچوں کے

اوپر ہتھیار اٹھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ جن لوگوں نے یہ کیا ہے ان کا کوئی دین نہیں، کوئی مذہب نہیں، یہ میرا دین نہیں ہو سکتا۔

یہ کام کرنے والے جانور ہیں، بل کہ جانور سے بھی بدتر کہ جنھیں بوکھلاہٹ میں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کریں۔

حکومت اب مرنے والے بچوں کے والدین کو معاوضہ دے کر اپنا ''اولین فرض'' پورا کرے گی۔ کیا کسی کی جان کی قیمت کاغذ کے کچھ ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ نجانے ایک گھر کے کتنے چراغ بجھ گئے۔ کتنی ماؤں کی گود اجڑ گئی۔ انھوں نے کتنے ارمانوں سے اپنے بچوں کو صبح اسکول تیار کرکے بھیجا ہوگا۔ کتنے معصوم چہرے ہیں جو میرے نظروں کے سامنے سے گزر رہے ہیں، جیسے میں خود اپنے بچوں کو بڑے پیار بڑے ارمان کے ساتھ اسکول سے بھیجتی ہوں۔ کیا میں اس بات کا تصور بھی کر سکتی ہوں کہ اسکول سے واپسی پر جس مسکراتے چہرے کا میں انتظار کر رہی ہوں اس کی خون میں لت پت گولیوں سے چھلنی لاش میرے سامنے رکھ دی جائے یا میں بہت سارے بچوں کی لاشوں میں سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو ڈھونڈوں کہ کہاں گئی وہ معصوم آواز جو مجھے ماں کہہ کر پکارتی تھی۔ یہ تحریر لکھتے ہوئے میری آنکھیں اشک بار ہیں۔

میری قوم کے بچوں کو شہید نہیں کیا گیا بلکہ میری پوری قوم کو ختم کرنے کی سازش کی گئی ہے۔ ہر شخص رو رہا ہے۔ اب کہاں ہیں حکومت کے دعوے، کہاں ہیں وہ لوگ جو غیر ملکی دوروں پر زیادہ اور اپنے ملک کے مسائل پر کم توجہ دیتے ہیں۔ اب حکومت عوام کو نہ روک سکے گی۔ غم و غصہ ہر گھر میں ہے۔ ہر گھر شدید دباؤ میں ہے اور حکومت سے سوال ہے کہ کہاں ہیں اس کو چلانے والے یا کوئی حکومت ہے ہی نہیں یہاں۔۔۔۔

## ... چین سے دوستی ہماری طاقت، لیکن

دو کشتیوں میں سواری کی کوشش لے ڈوبتی ہے مگر بھارتی بڑی مہارت سے ایک پاؤں اس کشتی اور دوسرا دوسری کشتی پر رکھ کر سفر کر لیتے ہیں۔ جس دور میں دنیا کمیونسٹ اور امریکی بلاگ میں بٹی ہوئی تھی اور امریکا اور سوویت یونین اپنی پوری خونخواری کے ساتھ اور کسی برفستان کے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سامنے والے کی ذرا پلک جھپکنے کے منتظر، آمنے سامنے کھڑے تھے، اقوام متحدہ کے ایوانوں سے مختلف ممالک کے دارالحکومتوں تک سفارت کاری، معیشت، تجارت، ثقافت، حکومتیں گرانے اور بچانے اور پراکسی وار سمیت ہر میدان میں یہ دونوں عالمی طاقتیں مدمقابل اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے کوشاں تھیں، اس وقت بھی دہلی سرکار نے ایک ہاتھ سے ماسکو کی انگلی تھام رکھی تھی تو دوسرے ہاتھ سے واشنگٹن کا دامن۔ اب اسے آپ دوغلاپن کہیں، حکمت عملی یا کامیاب خارجہ پالیسی، بھارت کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے پیش رو بھارتی حکم رانوں نے "ناوابستگی" کا پُرکشش اور خوب صورت نعرہ لگا کر امریکا اور سوویت یونین دونوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اندرا گاندھی مشرقی پاکستان کو ہم سے الگ کرنے کی سازش میں مصروف تھیں تو روس ان کا پشت پناہ تھا اور امریکا خاموش تماشائی۔

بھارت آج بھی اپنی اسی روش پر قائم ہے، اس بار وہ جن دو باہم مخالف طاقتوں کے ساتھ چلنے اور دونوں سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی پر گام زن ہے وہ ہیں امریکا اور چین۔ امریکا کے صدر باراک اوباما نے گذشتہ دنوں بھارت کا دورہ کیا تو وزیراعظم نریندر مودی سفارتی قواعد کو بالائے طاق رکھ کر ان سے یوں گلے ملے یا گلے پڑے کہ اوباما کو حیرانی پریشانی کی حالت میں انھیں سنبھالنا پڑا۔ اور پھر امریکی صدر کے قدموں میں نظریں بچھانے کا سلسلہ ان کی روانگی تک چلتا رہا۔ اس دورے نے جہاں بھارت کو بہت سے معاشی، سیاسی اور عسکری فوائد سے ہم کنار کیا وہیں اسے اپنے ہم سائے اور امریکا کے حریف چین کی خفگی سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے، جو پاکستان کی طرح بھارت اور امریکا کے تعلقات اور امریکا کی جانب سے بھارت کی پیٹ ٹھونک کر اسے چین کے مقابل لانے کی کوششوں کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس دورے کے حوالے سے چین کا ردعمل بھارت کے لیے تشویش ناک ہے، جو فی الوقت چین کو ناراض کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا، چناں چہ بھارتی وزیراعظم مئی میں چین کا دورہ کرنے والے ہیں، جس کی تاریخ ابھی طے نہیں ہوئی ہے۔ ظاہر ہے یہ دورہ بیجنگ کو مطمئن کرنے اور امریکی صدر کے دورۂ بھارت اور اس دورے میں ہونے والی سرگرمیوں پر چینی قیادت کی تشویش دور کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔

چین اور بھارت کے باہمی تعلقات کی تاریخ بین الاقوامی رشتوں کی پیچیدگیوں اور ان کے نشیب وفراز کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ بھارت کے پہلے وزیراعظم اور تحریک آزادی کے راہ نما پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک سوشلسٹ لیڈر کے طور پر حکومت سنبھالی اور اپنے ملک میں سوشلسٹ اصلاحات کیں، جب کہ اس کے کچھ عرصے بعد عوامی جمہوریہ چین ایک کمیونسٹ ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر ایک نئی پہچان
کے ساتھ ابھرا۔ یوں شروع دن سے دونوں ملکوں میں نظریاتی تال میل نظر آیا۔
یہاں تک کہ فضا ہندی چینی بھائی بھائی کے نعروں سے گونج اٹھی، لیکن جلد ہی یہ رومان حقائق کی تلخیوں کی نذر ہوگیا۔ تبت کا تنازعہ، سرحدوں کے تعین کا معاملہ اور تبت کے بدھسٹ کے روحانی پیشوا دلائی لامہ کو بھارتی سرزمین پر پناہ دینے کا ایشو دونوں ممالک کے تعلقات کو خراب کرتے کرتے انھیں باہمی ٹکراؤ کی صورت حال پر منتج ہوا، یہاں تک کہ 1962 میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔
دشمنی کے اس پس منظر کے ساتھ بھارت کی امریکا اور روس سے وابستگی اور چین کی پاکستان سے قربت نے بھی دہلی اور بیجنگ میں فاصلے پیدا کیے، لیکن اس سب کے باوجود سرد جنگ کے خاتمے کی بعد کی دنیا کے حقائق دونوں ریاستوں نے

تسلیم کیے اور معیشت اور تجارت کو پہلی ترجیح دینے کی حکمت عملی اپنائی۔ چناں چہ 80 کی دہائی میں دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات نے فروغ پانا شروع کیا اور آج صورت حال یہ ہے کہ چین بھارت کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے، ساتھ ہی ایک ایک ارب نفوس سے زیادہ آبادی رکھنے والی یہ دونوں قومیں اپنے اسٹریجک اور عسکری تعلقات کو بھی فروغ دے چکی ہیں۔ ان تعلقات کی ایک اہم بات یہ ہے کہ چین اور بھارت کی باہمی تجارت مسلسل فروغ پذیر ہے تاہم باہمی تجارت کے شعبے میں عدم توازن پایا جاتا ہے اور پلڑا چین کے حق میں ہے۔ اس صورت حال میں دہلی سے اپنے تمام تر تنازعات اور تلخیوں کے باوجود بھارت کو نظرانداز کرنا یا اس سے تعلقات بگاڑنا زیرک اور ٹھنڈے دل ودماغ کی حامل چینی قیادت کے لیے ممکن نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس خدشے کے پیش نظر کہ امریکا بھارت اور مشرقِ بعید میں اپنے حلیف ممالک سے مل کر چین کی معاشی طاقت تباہ کرنے کے لیے تبت، سنکیانگ یا انسانی حقوق کی پامالی کو جواز بناتے ہوئے چین پر سمندری راستے بند کردے، بیجنگ کی قیادت پاکستان سے اپنے دیرینہ تعلقات استوار رکھنا اور انھیں مضبوط بنانا چاہتی ہے۔ گوادر پورٹ کا قیام اور چائنا پاکستان اکنامک کوریڈور چین کے اسی خدشے کے باعث وجود میں آنے والے منصوبے ہیں۔

یعنی یہ ہمالہ اونچی اور سمندر سے گہری دوستی نہیں، بل کہ وہ زمینی حقائق

ہیں جن کی بنا پر چین ہمارے قریب ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ضرورت اور مفاد ہی بین الاقوامی تعلقات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ورنہ جس چین کے دورے پر نریندر مودی جارہے ہیں اور جو چین بھارت کا سب سے بڑا تجارتی حلیف ہے، اس کے 45 فی صد باشندے، گذشتہ سال کیے جانے والے بی بی سی کے سروے کے مطابق بھارت کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں، جب کہ صرف 23 فی صد چینیوں کی رائے بھارت کے بارے میں مثبت ہے۔

اس سارے پس منظر میں یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ ہماری جغرافیائی پوزیشن اور قدرتی وسائل ہماری طاقت ہیں، لیکن ہمارے حکم رانوں، سیاست دانوں اور ملک کے دیگر بااثر افراد نے اپنے حکمت عملیوں اور طرز عمل سے اس طاقت کو بے اثر بنا کر رکھ دیا ہے۔ چین کا پاکستان سے مفاد یا دوستی ہمارے لیے بہت سے فوائد کا حامل ہو سکتا ہے، لیکن بدعنوانی، دہشت گردی، بلوچستان میں بدامنی، بجلی اور گیس کا بحران جیسے مسائل اس راہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، اور یہ مسائل کسی اور کے نہیں ہمارے ہی پیدا کردہ ہیں۔ ان مسائل سے نکل کر ہی ہم چین کی دوستی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ پاک چین دوستی کے نعرے سے صرف دل خوش کیا جا سکتا ہے۔

## اتھارٹی کی جنگ

اس وقت ہماری ساری توجہ گلوبل ٹیررازم پر ہے، آرمی چیف اس حوالے سے بہت فعال کردار ادا کررہے ہیں۔ ان کے افغانستان، ترکی اور متحدہ عرب امارات کے دورے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ آپریشن ضرب عضب اور دہشت گردوں کے خلاف فوج کی کارروائیاں پاکستانیوں ہی کے لیے نہیں امریکا سمیت انتہاپسندی سے خائف دیگر ممالک کے لیے بھی اطمینان بخش ثابت ہوئی ہیں، لیکن جہاں تک لوکل ٹیررازم، فرقہ وارانہ تشدد ودہشت گردی کا تعلق ہے صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی، جس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہم شہری اداروں کو مضبوط نہیں کرسکے ہیں۔ پولیس اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

عالمی دہشت گردی اور فرقہ وارانہ تشدد ودہشت گردی ملک، خاص طور پر کراچی میں ہونے والی جرائم کی دیگر نوعیت کی وارداتوں سے گہرا تعلق رکھتی ہیں، بھتا، ڈکیتیاں اور اغواء برائے تاوان کی وارداتیں دہشت گردوں کو مالی معاونت فراہم کرنے کااہم ذریعہ ہیں اور ان وارداتوں کو روکنا پولیس کا کام ہے، لیکن پولیس نفری نہ ہونے، ٹیکنالوجی سے محرومی، غیر فعالیت اور ایسی ہی دیگر وجوہات کی وجہ سے ایک ناکام ادارہ بن چکی ہے۔

پولیس کی ناقص کارکردگی کی سب سے اہم وجہ اس ادارے کا ناجائز استعمال ہے۔ منتخب نمائندوں اور بااثر شخصیات کی جانب سے اپنے علاقوں میں پسندیدہ پولیس افسران کی تعیناتی، پولیس افسران کی تقرریوں اور تبادلوں میں مداخلت ایک عام سی بات ہے۔ منتخب نمائندے اور بااثر شخصیات کو اپنی اور اپنے لوگوں کی غیر قانونی سرگرمیوں کے سلسلے میں پولیس کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ الیکشن کے دوران انھیں کام یابی کے لیے پولیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی ضرورت کے باعث سندھ پولیس میں سیاست در آئی ہے اور یہ حقیقت سب جانتے ہیں کہ کراچی کے حالات اس وقت تک بہتر نہیں کیے جاسکتے جب تک سندھ پولیس کو سیاست سے الگ نہ کردیا جائے۔

2011 میں سپریم کورٹ نے سندھ گورنمنٹ کو پولیس کو سیاست سے پاک کرنے اور دیگر اقدامات کی ہدایت کی تھی، لیکن صوبائی حکومت نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔

کراچی کے حالات خراب ہوتے گئے اور بالآخر رینجرز کو کراچی سونپ دیا گیا۔ دو سال سے تو رینجرز کراچی میں بہت فعال ہے، اس کے مقابلے میں پولیس غیر فعال نظر آتی ہے۔ ایسے میں جب کراچی میں صورت حال سیکیورٹی ہائی الرٹ پر ہے پولیس کے معاملات پر توجہ نہ دینا حیرت انگیز اور افسوس ناک ہے۔

سندھ گورنمنٹ نے دہشت گردی کی کارروائیوں کے لیے جو نمایاں اقدام کیا ہے وہ ہے برٹش راج سے آج تک قائم ادارے سی آئی ڈی یعنی Crime Investigation Department کے نام کی تبدیلی، جسے Counter Terrorism Department سی ٹی ڈی کا نیا نام دیا گیا ہے۔ ایک نوٹیفیکیشن کے مطابق سی ٹی ڈی National Counter Terrorism Authority نیکٹا کے تحت اپنے فرائض انجام دے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ادارے کی صرف نام کی تبدیلی کافی ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ صوبے کے امن وامان سے براہ راست تعلق رکھنے والی پولیس کا انٹیلی جینس کا شعبہ مضبوط اور فعال کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے گئے ہیں؟

سندھ پولیس میں پچیس ہزار بھرتیوں کا معاملہ ایک عرصے سے رکا ہوا ہے۔ وزیراعلیٰ سید قائم علی شاہ نے گذشتہ دنوں پولیس افسران کے تبادلوں اور تقرریوں پر تین ماہ کے لیے پابندی عاید کرکے گویا سندھ پولیس کے بارے میں آرمی چیف کی اس ہدایت کا جواب" دیا ہے کہ سندھ میں پولیس کی تقرری اور تبادلے صرف اپیکس کمیٹی کے" ذریعے کیے جائیں۔ وزیراعلیٰ نے اس اقدام سے اپنے بہ اختیار ہونے کا اعلان تو کردیا مگر کیا پولیس کی صوبے خاص طور پر کراچی کی آبادی کی مناسبت سے نفری بڑھائے بغیر اس محکمے سے نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں؟

جہاں تک سندھ پولیس کا تعلق ہے اس کے اہل کار عام جرائم اور جرائم پیشہ

افراد سے ڈیل کرتے ہیں، لیکن دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے نہ انھیں تربیت دی گئی ہے نہ نفسیاتی طور پر وہ اس کے لیے تیار ہیں۔ چناں چہ کاؤنٹر ٹیررازم کے ضمن میں پولیس وہ کردار ادا نہیں کرپارہی جو اسے کرنا چاہیے۔ پولیس کی بہتری کے لیے پولیس پالیسنگ پلان بنانے کی بات ہر سال ہوتی ہے، لیکن ایسے کسی پلان پر عمل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ایک طرف پولیس اہل کاروں کا کردار دوسری طرف نفری، تربیت اور ٹیکنالوجی کے فقدان کی وجہ سے پولیس کے پاس دہشت گردی کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنا اور امن وامان قائم کرنا ہے تو ہمیں پولیس کی تعمیر نو کرنا ہوگی اور اس میں صلاحیت پیدا کرنی ہوگی کہ وہ دہشت گردی اور اس سے جُڑے جرائم کو جڑ سے اکھاڑ سکے۔ ایک موثر پولیس پالیسنگ پلان نہ صرف بنانا ہوگا بلکہ اس پر پوری طرح عمل درآمد بھی کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے صوبائی اور وفاقی حکومت اور تمام متعلقہ اداروں کو ایک دوسرے کے ساتھ مکمل کوآرڈینیشن کرنا ہوگا۔ ہمیں ضد، انا اور اتھارٹی کی بحث سے نکلنا ہوگا، یہی حالات کا تقاضا ہے۔

اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے وزیراعظم نواز شریف اور آرمی چیف راحیل شریف نے اپنے حالیہ دورۂ کراچی کے موقع پر حکومت سندھ کو ہدایت کی تھی کہ

پولیس کو سیاست سے پاک کیا جائے۔ آرمی چیف نے پولیس کو سیاست سے پاک کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ جرائم پیشہ افراد کے خلاف بلاامتیاز کارروائی کی جائے پولیس میں تقرریاں اور تبادلے صرف اپیکس کمیٹی کے ذریعے کیے جائیں۔

یہ تو بعد کی بات ہے کہ وزیراعظم اور فوج کے سربراہ کی اس ہدایت پر عمل درآمد شروع ہوسکا ہے یا نہیں، یہاں تو یہ معاملہ بھی متنازع ہوچکا ہے یا کردیا گیا ہے۔

اپیکس کمیٹی کے ذریعے تبادلوں اور تقرریوں کی ہدایت پیپلزپارٹی کو پسند نہیں آئی۔ چناں چہ خورشید شاہ نے کہا کہ اپیکس کمیٹیوں کا کام حکومت کرنا نہیں نگرانی کرنا ہے اور اگر اپیکس کمیٹیوں کے ذریعے صوبوں کے معاملات چلانے کی کوشش کی گئی تو یہ خطرناک ہوگا۔ گویا یہ پیپلزپارٹی اور سندھ میں قائم پارٹی کی حکومت کا موقف ہے جو خورشید شاہ کے ذریعے سامنے آیا ہے۔ دوسری طرف وزیراعلیٰ کی جانب سے تقرریوں اور تبادلوں پر پابندی عاید کرنا اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

پیپلزپارٹی کی جانب سے اپیلیکس کمیٹیوں کے ذریعے صوبائی معاملات چلانے کی بات صحیح ہے یا غلط اور موجودہ حالات میں جب پیپلزپارٹی نے زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اکیسویں ترمیم پر دستخط کرکے فوجی عدالتوں کے قیام کی

منظوری دے دی ہے، تو ان ہی زمینی حقائق کے پیش نظر دیگر اقدامات سے گریز کیوں کیا جارہا ہے؟ اس قسم کا بیان ایک مختلف صورت حال سامنے لارہا ہے۔

اتھارٹی کا ایشو کتنی اہمیت رکھتا ہے، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ صوبائی معاملات میں مداخلت کا شکوہ کرنے والی پارٹی جو پانچ سال صوبے پر حکومت کرنے کے بعد دوبارہ لگ بھگ دو سال سے صوبے کا اقتدار سنبھالے ہوئے ہے، سندھ میں امن وامان کی بہتری اور پولیس کی اصلاح کے لیے کیا کر سکی ہے؟ کراچی میں لاقانونیت کا سلسلہ عرصۂ دراز سے جاری ہے لیکن صوبائی حکومت نے دعوؤں سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہے۔

دہشت گردی کے خاتمے کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں اور مختلف انسٹی ٹیوشنز کے درمیان کوآرڈینیشن کی بات تو اب پیچھے رہ گئی، اب تو لگ رہا ہے کہ سندھ پولیس کا معاملہ متنازعہ ہوچکا ہے اور پیپلزپارٹی اس ایشو کو صوبائی خودمختار سے جوڑ سکتی ہے۔

جب معاملہ اتھارٹی ہاتھ میں رکھنے اور اختیارات کی دوڑ کا ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے میں جب ہم دہشت گردی کے خلاف اتنی بڑی جنگ لڑ رہے ہیں، ہمارے شہر، ہماری بستیاں دہشت گردی کا شکار ہیں، بدقسمتی سے ہمارے اداروں اور صوبائی

اور وفاقی حکومتوں کے درمیان رابطہ کا فقدان نہیں تو اس حوالے سے کھنچاؤ ضرور نظر آتا ہے۔ رابطوں اور تعاون کے اس فقدان کو دور کرنا ہوگا۔ جہاں تک نیشنل ایکشن پلان کا تعلق ہے تو لگتا ہے کہ اسے تشکیل دیتے ہوئے ترجیحات طے نہیں کی گئی ہیں، لہذا نیشنل ایکشن پلان پر از سر نو غور کرنے اور ترجیحات طے کرنے کی ضرورت ہے۔ ری پلاننگ کرتے ہوئے ایپیکس کمیٹیوں اور ان کے اختیارات کا معاملہ بھی طے کرنا ہوگا۔ صوبوں میں امن وامان کی صورت حال اور اس حوالے سے صوبائی حکومت اور اداروں پر نظر رکھنے کے لیے بنائی گئی ان کمیٹیوں کے اختیارات کا معاملہ حل نہ کیا گیا تو صوبائی خودمختاری کا سوال لے کر تنازعات پیدا ہوں گے، اور اس وقت جب ہم حالت جنگ میں ہیں ہم کسی ایسے تنازعے کے متحمل نہیں ہو سکتے جو اس جنگ میں ہمیں کمزور کرے اور وقت ضائع کرنے کا سبب بنے۔

# جمہوریت کی نرسری ویران کیوں؟

بلدیاتی اداروں کے ذریعے عوام کے بنیادی مسائل فوری حل ہوتے ہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے باسیوں کو عوام سمجھا ہی کب گیا ہے۔ آج ایک عام شہری جن مسائل کا شکار ہے اس میں حرف شکایت زبان پہ لانا بھی اب شاید بھول گیا ہے۔ فکر روزگار میں پھنسا عام شہری بس جینا چاہتا ہے، اس بات سے بے خبر کے آخر اس کے حقوق کیا ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستانی عوام بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم ہیں۔ پورے ملک میں پانچ سال گزر جانے کے باوجود بلدیاتی انتخابات نہیں کروائے جاسکے اور وجہ سیاست دانوں کے ذاتی مفادات سے بڑھ کر کچھ اور نہیں۔ بلدیاتی اداروں کو جمہوریت کی نرسری کہا جاتا ہے، کیوں کہ کونسلرز، چیئرمین، میئر یا ناظم کی صورت میں یہ ادارے نئی قیادت کو جنم دیتے ہیں۔ پاکستان میں بلدیاتی انتخابات ہمیشہ آمرانہ حکومتوں میں کرائے گئے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں فوجی حکم رانوں کی خواہش تھی کہ سیاسی جماعتوں کا عوام میں اثرورسوخ کم ہو اور نئی قیادت سامنے آئے۔ فوجی حکومتوں میں قومی اسمبلی نہ ہونے کی وجہ سے ایسے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کے بنیادی مسائل حل کریں اور حکم راں کے لیے خطرہ بھی نہ بنیں۔ اسمبلیوں کا کام قانون سازی اور قوانین میں ترمیم ہے، بنیادی شہری مسائل کا حل ان کا کام نہیں، یہ

کام بلدیاتی اداروں کا ہے، بلدیاتی اداروں کے نمائندوں تک عوام کی رسائی آسان ہوتی ہے، لیکن حکم راں اور اسمبلیوں میں منتخب ہونے والے چاہتے ہیں کہ انھیں ترقیاتی فنڈ کے نام پر رقوم ملتی رہیں۔ اس لیے وہ بلدیاتی اداروں کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں خطرہ ہوتا ہے کہ بلدیاتی اداروں سے نئی قیادت ابھرے گی جو عام انتخابات میں انھیں چیلینج کر سکتی ہے، اس لیے وہ بلدیاتی اداروں کو اپنے لیے خطرناک تصور کرتے ہیں۔

بلدیاتی اداروں سے نئی قیادت جنم لینے کی مثال عالمی سطح پر ایران کے سابق صدر احمدی نژاد اور ترکی کی برسراقتدار جماعت کی ہے۔ اسی طرح فلسطین میں حماس نے بلدیاتی انتخابات میں کام یابی حاصل کرکے کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور خود کو منوایا اور عام انتخابات میں فتح یاب ہوئی۔ پاکستان میں بلدیاتی اداروں کے ذریعے قیادت سامنے آنے کی مثال ڈاکٹر فاروق ستار اور مصطفیٰ کمال ہیں۔

کراچی جیسے دو کروڑ کی آبادی والے شہر میں منتخب بلدیاتی قیادت نہ ہونے سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اس صورت حال میں سپریم کورٹ کا حکم امید کی کرن بن کر ہمارے آسمان پر دمکا ہے۔

جسٹس جواد خواجہ کی زیر صدارت قائم سپریم کورٹ کی تین رکنی بینچ نے بلدیاتی انتخابات کے لیے حکومت کا دیا گیا شیڈول مسترد کرتے ہوئے سندھ اور پنجاب کی حکومتوں کو اسی سال ستمبر میں بلدیاتی اداروں کے الیکشن کرانے کا حکم دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صوبائی حکومتیں بلدیاتی انتخابات کرانے سے کیوں گریزاں ہیں اور کیا سپریم کورٹ کے اس حکم پر عمل درآمد ہوپائے گا یا کوئی نیا بہانہ اور نیا جواز سامنے آجائے گا۔ سندھ اسمبلی نے گذشتہ دنوں سندھ لوکل گورنمنٹ (ترمیمی) بل بیس سو پندرہ اتفاق رائے سے منظور کرکے بلدیاتی حلقہ بندیوں کا اختیار الیکشن کمیشن کو دے دیا ہے، جب کہ انتخابات کا طریقۂ کار بھی تبدیل کردیا گیا ہے۔ یہ ترمیمی بل اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ اس کی منظوری سے عوام کو یہ امید ملی ہے کہ آخرکار حکومت نے بلدیاتی انتخابات کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

بلدیاتی ادارے نہ ہونے سے پورے ملک ہی میں عوام کو مسائل کا سامنا ہے، لیکن دو کروڑ سے زیادہ آبادی والے صنعت و تجارت کے مرکز کراچی میں منتخب بلدیاتی قیادت نہ ہونے سے صورت حال زیادہ سنگین ہوگئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی سڑکیں، ہر طرف لگے کوڑے کے ڈھیر، بہتے گٹر، بڑھتی ہوئی تجاوزات... یہ سب مسائل عوام کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، بچے کی ولدیت کا فارم بنوانا ہو یا کسی کی

وفات کا سرٹیفیکٹ، زندگی کے معمولات کے لیے ضروری ترین ان دستاویزات کا حاصل کرنا بھی بلدیاتی اداروں کے نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات سے پُر مرحلہ بن چکا ہے۔

کراچی کے معاملات اس وقت ایک ایڈمنسٹریٹر کے ذریعے چلائے جارہے ہیں اور صورت حال یہ ہے کہ اس وقت خبروں کے مطابق شہر کے مختلف بلدیاتی اداروں کے سنگین مالی بحران کا سامنا ہے، جس کے باعث وہ اپنے ملازمین کو تنخواہ بھی ادا نہیں کرپا رہے۔ ایسے میں عوام کے مسائل کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔

کراچی کا انتظام ایڈمنسٹریٹر کے حوالے کرنے کا مطلب گویا جمہوریت سے عشق کرنے والے حکمراں کراچی جیسے دو کروڑ کی آبادی والے شہر کو منتخب بلدیاتی اداروں کے بہ جائے ایک عدد ایڈمنسٹریٹر کے سپرد کرکے مطمئن ہوگئے ہیں۔ یہ غیر جمہوری رویے ہی ہمارے ملک میں جمہوریت کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ آخر وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر سندھ حکومت صوبے میں بلدیاتی انتخابات نہیں کرانا چاہتی۔

سندھ میں بلدیاتی انتخابات نہ کرانے کی وجوہات میں سے ایک پیپلزپارٹی کے اندرونی اختلافات بھی ہیں۔ پارٹی کے اہم راہ نما مخدوم امین فہیم ان دنوں پارٹی سے ناراض ہیں۔ ایک سنیئر اور مؤثر سیاست داں ہونے کے ساتھ ایک روحانی حلقے کے پیشوا اور حضرت مخدوم نوح کی درگاہ کے گدی نشین کی حیثیت سے بھی

مخدوم امین فہیم اپنے آبائی شہر ہالا سمیت پورے سندھ میں سیاسی اثرورسوخ رکھتے ہیں۔

دوسری طرف ذوالفقار مرزا آصف زرداری کے باغی کے طوپر سامنے آئے ہیں اور انھوں نے پارٹی کی قیادت پر سخت الزامات عاید کیے ہیں۔ یہ اطلاعات بھی ہیں ذوالفقار مرزا قوم پرستوں کے ساتھ مل کر سندھ میں پیپلزپارٹی کے لیے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ یوں بھی پیپلزپارٹی کی صفوں میں انتشار نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم عہدے پر فائز شخصیت کو ان کے منصب سے ہٹانے کی بات بھی کی گئی، جس پر اس شخصیت نے کہا کہ اگر اسے منصب سے ہٹایا گیا تو سندھ سے پیپلزپارٹی کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

پی پی پی کی قیادت جانتی ہے کہ بلدیاتی انتخابات کی صورت میں پارٹی کے اندر اختلافات اور معرکہ آرائی کا ایک سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ ہر علاقے کے بااثر پارٹی راہ نما، خاندان، ایم این اے اور ایم پی اے چاہیں گے کہ بلدیاتی انتخابات میں ان کے من پسند لوگوں اور خاندان کے افراد کو امیدوار نام زد کیا جائے۔ یوں پارٹی میں موجود گروہ بندی صف بندی میں تبدیل ہوجائے گی، ایسے میں پارٹی سے تعلق رکھنے والے امیدوار آمنے سامنے آکر الیکشن میں پیپلزپارٹی کو نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتے ہیں۔

دوسری طرف شہری سندھ کی نمائندہ جماعت متحدہ قومی موومنٹ گراس روٹ لیول پر

بہت مضبوط ہے۔ ایم کیو ایم دو بار کراچی اور حیدآباد میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کرچکی ہے۔ تاہم دو ہزار ایک میں ہونے والے مقامی حکومتوں کے نئے نظام کے تحت ہونے والے بلدیاتی انتخابات کا ایم کیوایم نے بائیکاٹ کیا تھا۔ شہری سندھ میں متحرک اور فعال دیگر جماعتیں پاکستان تحریک انصاف اور جماعت اسلامی بھی بلدیاتی انتخابات کی صورت میں اندیشوں سے زیادہ امکانات رکھتی ہیں۔

اس حوالے سے ایک اہم مسئلہ مردم شماری کا بھی ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی اور اس کے عوام کا معیارِزندگی بہتر بنانے کے لیے مردم شماری لازمی ہے، لیکن ہمارے ملک میں مختلف وجوہات کی بناپر مردم شماری التوا کا شکار ہوجاتی ہے یا ہوتی بھی ہے تو اس کے اعدادوشمار پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے تو مردم شماری کے صحیح اعدادوشمار صوبے میں ہر سطح پر تبدیلی لاسکتے ہیں، جس میں اہم ترین حلقہ بندیوں کا ازسرنو عمل ہے۔ اگر مردم شماری کے نتائج کے تحت آبادی کے اعتبار سے حلقہ بندیاں کی جائیں تو اربن سندھ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے حساب سے اس کی نشستوں میں اضافہ ہوجائے گا، جس سے دیہی سندھ میں مقبولیت رکھنے والی پیپلزپارٹی کو نقصان ہوگا۔ اس نقصان کو سامنے رکھتے ہوئے پیپلزپارٹی کی حکومت بلدیاتی اداروں کے لیے بھی ایسی حلقہ بندی چاہتی ہے جو عام انتخابات میں اس کے لیے نقصان کا سبب نہ

بنے اور اس کی سیٹیں کسی طرح بھی کم نہ ہونے پائیں۔

عوام نہ جانے کب سے منتظر ہیں کہ اختیارات کو عوام کی نچلی سطح تک منتقل کیا جائے، تاکہ ان کے بنیادی مسائل حل ہوں، ایسے میں یہ حقیقت کتنی کرب ناک ہے کہ جمہوریت کے بنیادی اداروں کی راہ میں جمہوریت کے ذریعے حکم راں بننے والے ہی رکاوٹ ہیں۔

# نئی قیادت کے لیے طلبہ یونینز ناگزیر

ہمارے یہاں سیاست اور جمہوریت کے حوالے سے جب بھی بات کی جاتی ہے، سیاسی جماعتوں کی خامیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان کی کارکردگی پر سوال اٹھتے ہیں ان پر لگائے جانے والے الزامات کا تذکرہ ہوتا ہے، تو سیاسی جماعتوں کے قائدین زیر بحث آتے ہیں، ان کے راہ نماؤں، اقدامات اور پالیسیوں کا تذکرہ ہوتا ہے، ہر پہلو پر مباحثہ ہوتا ہے، لیکن سیاست اور جمہوریت کے اہم ترین عنصر کو موضوع نہیں بنایا جاتا اور یہ عنصر ہے سیاسی کارکن۔

جلسے جلوس اور مظاہرے ہوں، نعرے لگانے کا عمل ہو یا انتخابی سرگرمیاں، سیاست کی ساری چہل پہل اور سیاسی جماعتوں کی تمام گہماگہمی کارکنوں ہی کے دم سے ہے، اس لیے سیاسی کارکنوں کی تبدیلی ہماری سیاست اور سیاسی جماعتوں کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے سیاسی کارکن ملک تو کیا اپنی جماعتوں میں بھی کوئی تبدیلی لانے کی اہلیت نہیں رکھتے، جس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر سیاسی کارکن تعلیم سے محروم ہیں یا بہت کم تعلیم یافتہ، یہ کمی سیاسی جماعتیں کارکنوں کی ذہنی تربیت کے ذریعے پوری کرسکتی ہیں لیکن ایک تو سیاسی قائدین کو اس کی فرصت نہیں، دوسرے

نھیں روبوٹ جیسے کارکن چاہییں جو ان کی ہر ہدایت اور ہر فیصلہ سوچے سمجھے بغیر تسلیم کریں اور اس پر عمل کریں۔ بد قسمتی سے ہماری سیاسی جماعتوں میں سے کم کم ہی ہیں جن میں کارکنوں کے لیے یہ امکانات ہوں کہ وہ کارکن کی سطح سے بلند ہو کر پارٹی کی قیادت سنبھالیں یا کم از کم مرکزی قائدین کی صف میں شامل ہوں۔ وراثت کی سیاست اور شخصیت پرستی کی فضا میں کارکنوں کا کام بس نعرے لگانا اور دریاں بچھانا رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں گلو بٹ کے سامنے آنے سے آج تک اور اس بھی پہلے سے آنے والی افسوس ناک خبریں بتاتی ہیں کہ سیاسی کارکنوں کا کن کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کیا جارہا ہے۔

سیاسی کارکنوں کو ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ سیاسی شعور کا مالک ہونا چاہیے، لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں اور ہم قیادت کے فقدان کا شکار کیوں ہیں؟ ان دونوں سوالوں کے جواب میں جہاں دیگر وجوہات پیش کی جاسکتی ہیں وہیں ایک اہم وجہ ہے ہماری درس گاہوں میں طلبہ یونینز کا خاتمہ۔

نوجوانوں کو ہمارے راہ نما ملک کا مستقبل کہتے نہیں تھکتے، انھیں قوم کی امید قرار دیا جاتا ہے ان کی روشن آنکھوں سے آس لگائی جاتی ہے کہ وہ ہمارے وطن سے اندھیرے دور کردیں گے، لیکن جہاں یہ نوجوان کسی کے لیے امید کی کرن ہیں تو کسی کے لیے خوف کا سایہ بھی ہیں، یہی خوف ہے جو ہمارے تعلیمی اداروں

میں طلبہ یونینز کے قیام میں رکاوٹ ہے۔ سوال یہ ہے کہ طلبہ یونیننز طلبہ کے لیے خطرہ ہیں یا ان سے کسی اور کو خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی ملک کے سیاسی شعور رکھنے والے اور قومی مقاصد کے لیے متحرک ہونے والے طلبہ نے ملک میں تبدیلی لانے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خود ہماری تاریخ بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔. برصغیر میں طلبہ سیاست کا باقاعدہ آغاز سن 1905 میں تقسیم بنگال کے موقع پر. برطانوی راج کی مخالفت کے باوجود شروع ہوا۔ اس تحریک میں پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے پہلے سپیکر مولوی تمیز الدین خان نے بطور طالب علم حصہ لیا۔ جواب میں سرکار نے اس سال ہونے والے میٹرک کے امتحانات میں نصف سے زیادہ طلباء کو فیل کر دیا۔ اس کے علاوہ پنجاب میں 1905 میں ہی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلبہ نے ہندوستانی طلبہ سے امتیازی سلوک کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کی، جس کی قیادت مستقبل میں کانگریس پارٹی کے راہن ما ڈاکٹر ستیہ پال نے کی۔ کچھ سال بعد تحریک ہجرت (1920) میں بھی بہت سے مسلمان طلبہ نے حصہ لیا۔ رولٹ ایکٹ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے سانحہ جلیانوالہ باغ نے بھی طلبہ پر اثر ڈالا اور جلیانوالہ باغ کی راکھ سے بھگت سنگھ اور اسکے ساتھی نمودار ہوئے۔ 1936 میں ہندوستان کی پہلی طلبہ جماعت 'آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن' لکھنؤ میں قائم کی گئی۔ اس موقع پر منعقد کردہ کانفرنس سے قائداعظم اور جواہر لال

نہرو نے خطاب کیا۔اس تنظیم میں ہندو طلباء کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی۔
اس مسئلے کے تناظر میں 1937 میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام کلکتہ میں عمل میں آیا، جس نے قیام پاکستان کی تحریک میں انتہائی موثر حصہ ادا کیا۔
تشکیل پاکستان کے بعد طلبہ تحریک کا از سر نو آغاز مشرقی پاکستان اور صوبہ سندھ سے ہوا۔ پاکستان بنتے ہی مختلف مسائل پر طلبہ نے احتجاج کا علم بلند کیا۔
زبان کے مسئلے کو بنیاد بنا کر ایسٹ پاکستان مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی گئی جس کے عہدے داروں میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شیخ مجیب الرحمن بھی شامل تھے۔
میں راولپنڈی میں کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن ) 1949 قائم کی گئی جس کی ایک شاخ 1952 میں سندھ میں قائم ہوئی۔ اس تنظیم نے مختلف تعلیمی اداروں کی غیر مناسب فیسوں کے مسئلے پر بھی احتجاج کیا مگر انتظامیہ کی ہٹ دھرمی کے باعث بات ہنگاموں اور گرفتاریوں تک جا پہنچی۔1954 میں اس تنظیم پر پابندی لگادی گئی۔ ایوب خان نے مارشل لا لگانے کے بعد طلبہ تنظیموں کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ پابندی کے باوجود ایوب دور کے دوران

البتہ طلبہ کسی نہ کسی طور حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے۔ معاہدہ تاشقند کے بعد ایوب کابینہ چھوڑنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے طلبہ کو ایوب مخالف تحریک میں موثر طور پر استعمال کیا اور اسی وجہ سے 1968 میں شروع ہونے والی اس عوامی تحریک میں طلبہ نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ جماعت اسلامی کے زیر اثر طلبہ جماعت 'اسلامی جمیعت طلبہ' کی ابتدا پاکستان کے قیام کے چند ماہ بعد ہوئی۔ اس تنظیم نے بھی اپنے نظریات کے مطابق نہ صرف طلبہ سیاست میں فعال کردار ادا کیا بل کہ قومی معاملات کے حوالے سے بھی سرگرمیوں کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔

ایوب خان کے بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں طلبہ یونینز کا باب بند کردیا گیا جو اب تک بند ہے۔

دنیا خاص طور پر برصغیر اور پاکستان میں طلبہ کا فعال سیاسی کردار تھا جس نے ہمارے ملک کے ہر آمر کو طلبہ سے خائف کیے رکھا۔ آمر ہی نہیں جمہوری حکم رانوں نے بھی طلبہ یونینز قائم نہ کرکے ثابت کردیا ہے کہ وہ بھی طلبہ کے شعور اور ان کے سیاسی کردار سے خوف زدہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ طلبہ یونینز ہوں یا طلبہ تنظیمیں، یہ نوجوانوں کی سیاسی

نرسری ہوتی ہیں، جہاں طلبہ سیاست کے رموز سمجھتے ہیں اور ان کے ذریعے نئی قیادت جنم لیتی ہے۔ پاکستان میں طلبہ تنظیموں سے جن راہ نماؤں نے جنم لیا ان میں معراج محمد خان، شیخ رشید احمد، الطاف حسین، ڈاکٹر فاروق ستار، قاضی حسین احمد، سراج الحق، جاوید ہاشمی اور دیگر سیکڑوں سیاسی قائدین شامل ہیں۔ جامعات اور کالجوں میں انتخابات کے ذریعے طلبہ یونینز کا قیام طلبہ میں جمہوری سوچ پیدا کرتا ہے۔ یونینز کے ذریعے مختلف امور سنبھالنے والے طلبہ میں قیادت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

جب تک طلبہ یونینز پر پابندی عاید نہیں کی گئی تھی طلبہ تنظیموں کے درمیان تصادم اور تعلیمی اداروں میں تشدد کے واقعات پابندی کے بعد کے مقابلے میں کہیں کم ہوتے تھے، کیوں کہ طلبہ تنظیمیں طلبہ یونین کا الیکشن جیتنے کے لیے اپنے رویوں، کام اور نظریات کی بنیاد پر طلبہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی تھیں، لیکن جب طلبہ یونینز کے الیکشن کا سلسلہ ختم ہوگیا تو طلبہ تنظیمیں طاقت کے بل پر تعلیمی اداروں میں اپنی حیثیت منوانے کے رجحان کی طرف مائل ہوگئیں، جس کا نتیجہ باہمی تصادم اور بیسیوں طلبہ کی شہادت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

نظریاتی بنیاد پر بننے والی طلبہ تنظیموں کے کارکنوں کا ایک دوسرے سے

نظریات پر بحث ومباحثہ مکالمے کی فضا پیدا کرتا ہے اور اس سے طلبہ میں سیاسی شعور بلند ہوتا ہے۔ یوں معاشرے کو باشعور نوجوانوں کا وہ گروہ ملتا ہے جو ان کی راہ نمائی کرتا ہے، مگر طلبہ یونینز نہ ہونے اور طلبہ تنظیموں کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے ہم اس گروہ سے محروم ہوگئے ہیں۔

جہاں تک تعلیمی اداروں میں تشدد کا تعلق ہے تو اسے روکنا حکومت کا کام ہے، کیا سیاسی جماعتوں کے درمیان پُرتشدد تصادم کے واقعات، جو ہوتے رہتے ہیں، کو جواز بنا کر سیاسی عمل اور سیاسی اداروں پر پابندی عاید کی جاسکتی ہے؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اہم مسئلے پر اب بات ہی نہیں کی جارہی ہے۔ ملک میں قیادت کے فقدان کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن اس تذکرے میں یہ نکتہ زیر بحث نہیں لایا جاتا کہ طلبہ یونینز کا نہ ہونا بھی قیادت کے فقدان کا ایک اہم سبب ہے۔ سیاسی طور پر باشعور طلبہ ملک کی ضرورت ہیں اور اس کے لیے طلبہ یونینز کا قیام اور ان کے انتخابات ناگزیر ہیں۔

## جائیں کہیں تو کیسے جائیں؟

قتل و غارت گری، بھتا خوری، لوٹ مار کی وارداتیں اور جرائم پیشہ افراد کی دیگر گھاتیں، یہ ہے کراچی کی زندگی، ایسے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کراچی والے آخر کہاں جائیں اور ذکر جب آنے کا چھڑتا ہے تو یہ سوال پیچھے رہ جاتا ہے اور ایک دوسرا مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیسے جائیں؟ یہ سوال جُڑا ہے کراچی میں ٹرانسپورٹ کی خوف ناک صورت حال سے۔

خواب و خیال ہوئے وہ دن جب جب اس شہر میں سفر سرکاری بسوں پر ہوتا تھا، جب یہاں لوکل ٹرین چلتی تھی، جب شہر قائد کی سڑکوں پر ٹرام چلا کرتی تھی۔ اب حکومت اس شہر کو بجلی کی فراہمی کی طرح ٹرانسپورٹ فراہم کرنے کی ذمے دار سے بھی فارغ ہوچکی ہے اور لوگوں کو سفری سہولت کی فراہمی ٹرانسپورٹرز کی ذمے داری قرار پائی ہے، جن کی بسوں کی حالت ویسے ہی خراب ہے، اس پر چنگچی رکشے آنے اور سی این جی کے بحران کے بعد ان کی تعداد کم ہوگئی ہے اور دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔

اب ہم آتے ہیں چنگچی رکشوں کی طرف۔ پرویز مشرف کے دور میں سی این جی متعارف

کرائی گئی، جس کے بعد بہت بڑی تعداد میں بسوں سمیت پبلک ٹرانسپورٹ اور نجی گاڑیاں سی این جی پر کنورٹ ہو گئیں۔ حکم رانوں نے اس حوالے سے کوئی فیوچر پلاننگ نہیں کی، جس کا نتیجہ سی این جی کے بحران کی صورت میں نکلا ہے۔ گذشتہ چند سال کے دوران سی این جی رکشے اور چنگچی شہر میں متبادل ٹرانسپورٹ کے طور پر سامنے آئے اور پھر یہ پورے شہر میں چلنے لگے۔ پہلے ان کے روٹ اندرون علاقہ تک محدود اور مختصر ہوتے تھے، لیکن اب یہ بسوں اور کوچز کی طرح بہت طویل مسافت طے کرتے ہیں۔ یہ شکایت عام ہے کہ ان کی وجہ سے شہر میں ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ سی این جی پر چلنے والے یہ رکشے چلتے پھرتے بم ہیں۔ پھر ان کا بے ڈھنگے انداز میں چلنا اور تیز رفتاری بھی حادثات کا سبب بنتی ہے، لیکن عام آدمی کے لیے کراچی جیسے شہر میں یہ رکشے بھی نعمت سے کم نہیں۔ تاہم یہ رکشے بسوں کے مقابلے میں مسافروں سے دگنا کرایہ لیتے ہیں۔ ان رکشوں پر پیچھے ایک خاتون کو نہیں بٹھایا جاتا اگر تین ہوں تو بٹھایا جاتا ہے، کیوں کہ اگر ایک عورت بیٹھی ہو گی تو مرد نہیں بیٹھ سکتے۔ یوں صنفی امتیاز اس سواری کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔

ملک کے سب سے بڑے شہر اور صنعتی و تجارتی حب کراچی کے عوام ایک عرصے سے ٹرانسپورٹ سے متعلق مسائل کا شکار ہیں جو دن بہ دن بڑھتے اور گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں، مگر عوام کی اس بنیادی ضرورت کا کسی کو خیال نہیں۔ کراچی میں

پبلک ٹرانسپورٹ کے مختلف منصوبے فائلوں کی نظر ہوتے رہے ہیں یا شروع ہو کر پراسرار طور پر ختم ہو جاتے ہیں، جیسے گرین بسز۔

حکم رانوں کی آسائش پر اربوں روپے خرچ ہوتے ہیں لیکن پبلک ٹرانسپورٹ کے اداروں کو بوجھ قرار دے کر ختم کر دیا جاتا ہے، جیسے کراچی ٹرانسپورٹ اتھارٹی کو ختم کر دیا گیا، جس کی بسیں شہریوں کے لیے بہت بڑی سہولت تھیں اور لوکل ٹرینیں بند کر دی گئیں۔ ماس ٹرانزٹ پروجیکٹ کی باتیں ہم طویل عرصے سے سن رہے ہیں لیکن اب تک اس منصوبے کے حوالے سے کوئی اقدام سامنے نہیں آیا ہے۔

کراچی ماس ٹرانزٹ پراجیکٹ کئی سال سے زیر التوا ہے۔ اس سلسلے میں تمام سروے، اسٹڈیز، نئے قوانین، لوگوں کی منتقلی، انٹرنیشنل مالیاتی ادارے کی مالی معاونت سمیت بہت سے دیگر کام پہلے ہی سے مکمل کیے جا چکے ہیں اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پراجیکٹ کو خلوص نیت کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے، لیکن شاید خلوص نیت ہاتھ نہیں آرہا۔ کراچی ماس ٹرانزٹ پراجیکٹ ملکی تاریخ کے ان بدقسمت منصوبوں میں سے ایک ہے جو غیر معمولی تاخیر کا شکار ہے اور کئی سال گزرنے کے باوجود بیوروکریسی کی رکاوٹوں کی وجہ سے آج تک شروع نہیں ہو سکے۔ 15 سال پہلے کراچی کا ٹرانسپورٹ سسٹم کچھ شکایات کے باوجود

کی بسیں اور پرائیویٹ KRTC ، خاصی حد تک اطمینان بخش تھا، جس میں سرکلر ریلوے کوچز اور ٹیکسیاں شامل تھیں، سرکلر ریلوے اور بڑی بسیں متعلقہ حکام کی طرف سے دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بتدریج تباہ ہوگئیں ،آج 15 سال گزرنے کے بعد بجائے ٹرانسپورٹ سسٹم بہتر ہونے کے کراچی کے لاکھوں لوگ رکشہ اور چنگچی رکشوں کے رحم وکرم پر رہ گئے ہیں۔

کراچی میں سڑکیں بنیں،پُل بنے، مگر ٹرانسپورٹ کے مسئلے پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس حوالے سے کوششیں ہوئیں، لیکن یہ ساری کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں، ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ ایک ایسے شہر میں جس کی آبادی دو کروڑ کے قریب ہے، جس کی غالب اکثریت ہر روز دفاتر، کارخانوں، تجارتی مراکز، درس گاہوں اور شاپنگ سینٹرز جانے کے لیے عازم سفر ہوتی ہے، وہاں ٹرانسپورٹ کے حکومتی منصوبے ناکامی سے کیوں دوچار ہوجاتے ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ حکومت کی جانب سے فراہم کردہ پبلک ٹرانسپورٹ کی سہولت ٹرانسپورٹرز کے مالی فوائد کم کردیتی ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ٹرانسپورٹ کے مسئلے کے باعث شہر میں کاروں اور موٹرسائیکلوں کی خریداری میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ جو شہری ذرا سی بھی استطاعت رکھتا ہے وہ جمع جوڑ کرکے یا بینکوں سے قرضے لے کر کار یا موٹرسائیکل خرید لیتا ہے۔ یوں ٹرانسپورٹرز کی طرح کار اور موٹرسائیکل کی اسمبلنگ کرنے والے بھی کراچی میں ٹرانسپورٹ کے مسئلے سے

فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ کوئی الزام نہیں سامنے کی حقیقت ہے۔ کسی بھی شعبے کا تجارتی اور صنعتی طبقہ اپنے لیے فوائد تلاش کرتا اور صورت حال سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے لیے قانون اور اخلاقیات سے ماورا طریقے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ کام تو حکومت اور ریاست کا ہے کہ وہ عوام کو ہوس زر رکھنے والے طبقوں کی خواہشات کی بھینٹ نہ چڑھنے دے۔

ٹرانسپورٹ کے مسائل شہریوں کی معیشت ہی پر اثرانداز نہیں ہو رہے اور صرف ان کے وقت کے ضیاع ہی کا سبب نہیں بن رہے، بل کہ یہ مسائل شہریوں کی نفسیات پر بھی اثرات مرتب کر رہے ہیں اور ان کی وجہ سے جھنجھلاہٹ اور غصہ لوگوں کے مزاج کا حصہ بنتا جارہا ہے۔ ساتھ ہی یہ مسئلہ سماجی نوعیت بھی اختیار کرچکا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ میسر نہ آنے یا کرائے زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا کم ہوتا جارہا ہے۔ چناں چہ اس سنگین مسئلے کو فوری اہمیت دیتے ہوئے ہنگامی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔

# انتخابی مہم، ہماری سیاست کا چہرہ

سردی، گرمی، خزاں اور بہار کے ساتھ ہمارے دیس میں ایک اور موسم بھی آتا ہے، انتخابات کا موسم، جوش وجذبات اور آس اور امید کی رُت، اس موسم کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا، کبھی یہ پانچ سال بعد آتا ہے اور کبھی اس عرصے سے بہت پہلے وارد ہوجاتا ہے، اسی طرح یہ رُت بعض علاقوں میں جنرل الیکشن اور ضمنی انتخابات کی صورت میں کئی بار آتی ہے۔ مختصر دورانیے کا یہ موسم ہماری سیاست اور سماج کے بہت سے منفی پہلو سامنے لے آتا ہے، انتخابی مہم کی صورت میں، لیکن ایک اور بہت اہم مدعا یہاں یہ ہے کہ اس موسم کے رسیلے پھل کا مزہ صرف وہی پارٹی اٹھا سکتی ہے جس کے پاس پیسہ ہو۔ یعنی پھل رسیلا ضرور ہے لیکن منہگا بھی بہت ہے۔ اور اگر جیب میں مال ہے تو پھر منہگے سستے کی فکر کسے! پاکستان میں حکومت اگرچہ اپنے وسائل کی کمی کا رونا روتی رہتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہاں کے سیاست دانوں کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ سو انتخابات کے موسم کا پھل کھانے سب ہی تیار بیٹھے ہیں۔

الیکشن کے قوانین اور قواعدوضوابط کے تحت صوبائی اسمبلی کا امیدوار انتخابی مہم پر دس لاکھ روپے اور قومی اسمبلی کا امیدوار پندرہ لاکھ روپے تک خرچ

کرنے کا مجاز ہے، لیکن انتخابی مہم شروع ہوتے ہی ہر پاکستانی کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ صوبائی و قومی اسمبلیوں اور سینیٹ کے امیدوار اپنی انتخابی مہمات پر کروڑوں روپیہ بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ کھلم کھلا الیکشن قوانین کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ پارٹی سے ٹکٹ کی خریداری سے لے کر اسمبلی میں پہنچنے تک کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ اسمبلیوں میں پہنچنے والے اراکین صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ زرِ کثیر خرچ کر کے پارٹی سے ٹکٹ خریدتے ہیں، ووٹروں کو ووٹ کی منہ مانگی قیمت دیتے ہیں، اور لوکل ایڈمنسٹریشن اور متعلقہ عملے کے ذریعے جعلی ووٹ ہتھیانے پر بے تحاشا دولت خرچ کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی لگائی ہوئی رقم پر منافع کمانا تو ان کا حق بنتا ہے۔ اس کاروباری ذہنیت کے ساتھ چل کر الیکشن جیتنے والا امیدوار جب قانون ساز اسمبلی کے اندر داخل ہوتا ہے تو روزِاول سے ہی اس کی نیت دولت کا حصول ہوتی ہے۔ یہ سب بے ضابطگی، بے قاعدگی اور بدعنوانی نظام انتخابات چلانے کے ذمہ دار ''الیکشن کمیشن'' کے سامنے ہوتی ہے، لیکن سیاسی دباؤ اور مقتدر شخصیات کے خوف کی وجہ سے قانون نافذ کرنے والا یہ ذمہ دار ادارہ انتخابی دھاندلیوں پر خاموش تماشائی بن جاتا ہے۔

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ جس قومی آئینی ادارے الیکشن کمیشن کے جن قواعد و ضوابط کی مالا جپی جاتی ہے، انہیں کوئی قانونی حیثیت حاصل ہے ہی نہیں۔

یہ ایسے ہی بنے ہیں کہ کچھ سیاسی جماعتوں نے مل بیٹھ کر قوانین مرتب کر لیے اور بس....ارے صاحب! ہمارے ہاں تو ان ضابطوں پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا جن کو قانونی حیثیت حاصل ہے تو ان قوانین کو کیسے کوئی پوچھے گا جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اور پھر وہی جملہ جو اکثر آپ ہمارے کالم میں پڑھتے ہیں، اندھیر نگری چوپٹ راج۔

الیکشن کمیشن کے قواعد و ضوابط کے مطابق اسمبلی کے امیدوار کا، کسی قسم کے دَھن، دھونس اور دھاندلی سے کسی ووٹر کو ہراساں کرنا اور زبردستی یا اُس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ووٹ حاصل کرنا ممنوع ہے، لیکن ناجائز سرمایہ، جاگیرداری، پیری مریدی، عقیدہ، برادری اور نری بدمعاشی سے بے بس اور مجبور ووٹروں سے ووٹ ہتھیانا معمول بن چکا ہے۔ پولنگ بوتھوں پر ہاتھا پائی، لڑائی جھگڑا، فتنہ فساد کے علاوہ بعض دفعہ قتل و غارت گری کے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ ووٹ کے بکسوں کو پہلے سے تیار کردہ ووٹوں سے بھرنا سیاست کاروں کے بائیں ہاتھ کا چمتکار ہوتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ قانون ساز اسمبلیوں کے امیدوار اپنے حلقۂ انتخاب میں ہزاروں لاکھوں جعلی شناختی کارڈ اور بوگس ووٹ بناتے رہتے ہیں۔

انتخابی مہم ہماری سیاست اور سماج کا اصل چہرہ سامنے لے آتی ہے۔ عدم برداشت

کا رویہ، گالی گلوچ، ایک دوسرے پر نازیبا الزامات ان کا لازمی حصہ بن گیا ہے۔
امیدوار، جیتنے کے لیے ہر حربہ اور ہتھکنڈہ استعمال کیا جاتا ہے۔ قواعد کے خلاف انتخابی مہم میں تعصب کے نعرے لگائے جاتے ہیں، ذات برادری، قومیت، زبان، علاقائی تعصب اور فرقے کی بنیاد پر لوگوں کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔
ایک دوسرے کے جلسوں جلوسوں، ریلیوں اور کیمپوں پر حملے کیے جاتے ہیں، جلسوں کا ماحول خراب کیا جاتا ہے، پوسٹر اور جھنڈے پھاڑ دیے جاتے ہیں۔ طاقت ور امیدوار اور گروہ مالی اور سماجی اعتبار سے کمزور امیدواروں کو ڈرا دھمکا کر الیکشن سے باہر کر دیتے ہیں یا ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ الیکشن کمیشن کے قواعد اور آئین کی دھجیاں اُڑا دی جاتی ہیں، لیکن کسی امیدوار اور جماعت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ اس صورت حال کی ایک وجہ ہمارے یہاں موجود جاگیردارانہ اور قبائلی سوچ ہے، جو ہر قیمت پر اپنی فتح چاہتی ہے۔
ہمارے یہاں جمہوریت کا تسلسل نہیں رہا، اس لیے جب بھی الیکشن ہوتا ہے ہر جماعت اور امیدوار کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر قیمت پر کامیابی حاصل کی جائے

پتا نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے۔ جمہوری سوچ اکثریت کی رائے کے احترام کا نام ہے، جمہوریت کے استحکام اور اس کا تسلسل برقرار رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہار تسلیم کرنا جانتے ہوں۔ مگر ہم ہار کو ذلت سمجھتے ہیں، جو غیر جمہوری رویہ ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ووٹر بھی تعصبات کا شکار ہو کر ایسی جماعتوں اور امیدواروں کو ووٹ دیتے ہیں جو کھلے عام مخالفین کے خلاف غیر اخلاقی زبان استعمال کرتے ہیں اور جن کی طرف سے انتخابی مہم کے دوران ہر طرح کی دھونس دھاندلی کی جاتی ہے۔

تبدیلی لانا ہے تو سب سے پہلے عام آدمی کو اپنا رویہ بدلنا ہوگا، اور اسے صحیح غلط میں فرق کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ الیکشن کمیشن کو اپنے قواعد وضوابط پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے اور کسی بھی قسم کے دباؤ میں آئے بغیر انتخابی قوانین کی خلاف ورزی پر فوری ایکشن لینا ہوگا۔

ہم بات تو کرتے ہیں جمہوریت کی لیکن جب کہیں بھی انتخابات کا موسم آتا ہے تو ہم اس جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لیے فوج کو آواز دیتے ہیں، آخر ایسا کیوں ہے۔ کراچی کے حلقہ این اے 246 میں ہونے والے انتخابات کا بھی کچھ ایسا ہے احوال ہے۔ اخوت اور بھائی چارہ کا درس دینے والی سیاسی جماعتوں کے درمیان آئے دن ہونے والی جھڑپوں کے سبب یہاں فوج بلانے اور علاقے کو رینجرز

کے حوالے کرنے کے بھی مطالبات کیے جارہے ہیں، اور الیکشن کمیشن رینجرز کی طلبی کے ذریعے یہ مطالبہ مان چکا ہے۔

اتنی گہما گہمی تو وفاقی الیکشن کے وقت نظر نہیں آتی جتنی کراچی کے حلقہ ان اے 246 میں دیکھی جارہی ہے۔ چوہدری نثار علی خان ہوں یا سید قائم علی شاہ، شرجیل میمن ہوں یا شعیب احمد صدیقی پوری مشنری کسی نہ کسی حوالے اس گہما گہمی کے زیر اثر نظر آتی ہے۔ الزامات کے شور میں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کون صحیح ہے کون غلط۔ حقائق کچھ بھی ہوں 23 اپریل کو صورت حال مکمل طور پر واضح ہوجائے گی۔ اس ساری صورت حال میں ایک نہایت اہم پہلو جسے کراچی کی سیٹ پر سیاست کرنے والے سیاست داں نہیں سمجھ رہے وہ یہ ہے کہ اب عوام کو نہ کوئی الیکشن کمپین اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے اور نہ ہی دھمکی دھونس سے کسی کا ووٹ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لوگ اب اس سیاست کے سیاہ اکھاڑے سے عاجز آچکے ہیں۔ ضروری ہے کہ سیاسی جماعتیں ایسے رویے اختیار کریں کہ عوام سیاست، جمہوریت اور انتخابات کو اپنے مسائل حل ہونے کا ذریعہ سمجھیں، انھیں مسئلہ نہ سمجھنے لگیں۔

## ہم کب سمجھیں گے

چینی صدر شی چی پنگ کا دورہ ہمیں بہت سی خوشی اور ڈھیر سارا اعتماد لے کر آیا ہے۔ ثقافت، زبان، طرزِ حیات، نظامِ حکومت اور نظریات کے اختلاف کے باوجود پاکستان اور چین کے درمیان دوستی کا رشتہ بہت مضبوط رہا ہے۔ یہاں ''دوستی'' کا لفظ ہم اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی اور لفظ نہیں جو دو قوموں کے باہمی اچھے تعلق کی ترجمانی کر سکے، ورنہ ممالک کے درمیان دوستی، محبت اور وفا جیسا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ ملک بہت خوش نصیب ہے جسے کسی دوسرے ملک کی خالصتاً اور صحیح معنوں میں دوستی اور محبت میسر آ جائے، ہم ایک ایسی ہی خوش نصیب قوم ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی خوش نصیبی کو بدنصیبی میں بدل دینے کے عادی ہیں اور اپنی ہی صورت بگاڑ لینا ہمارا دیرینہ اور محبوب مشغلہ ہے۔ اس نکتے کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گی، پہلے بات ہو جائے پاک چین تعلقات اور چینی صدر کے دورے کی۔ چین کے صدر شی جی پنگ کی پارلیمینٹ میں تقریر سُن کر ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے خواب پورے کرنے جادونگری سے کوئی جادوگر آیا ہے۔ اس دورے میں مختلف پروجیکٹس کے سمجھوتے اپنی جگہ، لیکن چینی سربراہ کا یہ دورہ اس لیے بھی

اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے بھارتی وزیراعظم کے مئی کے وسط میں چین کے دورہ سے قبل چینی صدر کی بھارت سے متعلق سوچ کا بھی پتا چل سکتا ہے۔

بھارت ہمیشہ سے ہماری خارجہ پالیسی کا محور رہا ہے۔ ایسے میں جب دہلی میں مسلم دشمنی اور پاکستان سے عناد رکھنی والی مودی حکومت برسراقتدار ہے، امریکا ہم سے حسب منشا کام لے کر افغانستان سے جانے کو پر تول رہا ہے اور وہاں بھارت کے اثرورسوخ بڑھانے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے، مختلف ایشوز پر ایران سے ہمارے فاصلے بڑھ گئے ہیں اور وہ گوادر کے مقابلے میں بھارت کی مدد سے چاہ بہار پورٹ تعمیر کر رہا ہے، اور پھر سعودی عرب، جسے ہم حال ہی میں ناراض کر بیٹھے ہیں، چینی صدر کا دورہ، ان کی تقریر، وعدے اور ارادے پاکستان کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ہیں، معاشی اعتبار سے بھی اور عالمی تعلقات کے ضمن میں بھی۔

چینی صدر کے اس دورہ کا ایک اہم مقصد چین اور پاکستان کے درمیان مجوزہ اقتصادی راہداری ہے اور یہ اقتصادی راہداری کاشغر سے گوادر بندرگاہ کی تک ہوگی۔ تجزیہ کاروں کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ شی جی پنگ کا حالیہ دورہ پاکستان جنوبی ایشیا کی شکل تبدیل کر سکتا ہے، کیوں کہ چین بحیرہ عرب تک پاکستان کی زمین کا استعمال مشرق وسطی سے تیل حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔

چین کا منصوبہ ہے کہ مشرق وسطی سے آنے والا تیل پہلے گوادر کی بندرگاہ تک اور پھر وہاں سے مجوزہ راہداری سے سڑک اور ریل کے راستے سے اس کی سرحد تک آسانی سے پہنچایا جاسکے گا۔

اس مقصد کے لیے اسے ابھی تک تقریباً بارہ ہزار کلو میٹر کا طویل بحری راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ راہ داری چینی مصنوعات کی مشرق وسطی تک آسان رسائی کا باعث بھی بنے گی۔

اس راستے کے تعمیر کے ساتھ ہی اس راہداری میں بجلی پیدا کرنے والی تنصیبات بھی لگائی جائیں گی، جو بجلی کے شدید بحران میں پاکستان کی شدید ضرورت ہے۔

اس پاک چین راہداری کا پہلا مرحلہ سنہ 2006 میں اختتام کو پہنچا تھا، لیکن اب تک معاملہ وہیں ہے، کئی سال گزر جانے کے باوجود اس کی خوبیوں یا خامیوں کا پتا نہیں چل پایا۔ اس لیے چین نے ایک بار اسے آزمانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس منصوبے کی تکمیل کے نتیجے میں خطے میں صنعتی اور تجارتی سرگرمیاں بڑھیں گی اور پاکستان خلیج سے توانائی کی منتقلی کا مرکز بھی بن جائے گا، جب کہ پاکستان میں معاشی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوگا۔

دوسری طرف اس راہداری کے مکمل ہونے کے نتیجے میں چین خلیجی علاقے، افریقہ، یورپ اور دنیا کے دیگر حصوں سے بہ آسانی اور کم وقت میں جُڑ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور چین کا یہ مشترکہ منصوبہ بھارت کو پریشان کیے ہوئے ہے جو ان دونوں ملکوں کی ترقی اور خوش حالی برداشت نہیں کر سکتا۔

معاملہ صرف اقتصادی پہلو نہیں رکھتا۔ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ گوادر جیسے گہرے سمندر کی بندرگاہ میں چین کی موجودگی آج تو صرف تجارتی وجوہات کی وجہ سے ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا امکان بہت غالب ہے کہ یہ چین کی بحریہ کے لیے ایک بحری اڈا بن جائے اور مستقبل میں یہاں چین پاکستانی بحریہ کے ساتھ مل کر کام کرے۔ چناں چہ بھارت اس حوالے سے بہت فکر مند ہے۔

پاک چین اکنامک کوریڈور کے اس منصوبے سے چین کو کتنے وسیع پیمانے پر فوائد حاصل ہوں گے، اس حقیقت کے پیش نظر ہمیں جان لینا چاہیے کہ یہ مفاد کا معاملہ ہے دوستی کا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس حوالے سے پاکستان اور چین دونوں کے مفادات ایک ہی کشتی پر سوار ہو گئے ہیں، جو پاکستان میں موجودہ حالات میں ہمارے لیے بہت سود مند ہے۔ مگر یہ ڈر ہے کہ ہم اپنی ''روایت'' کے مطابق ان فوائد سے محروم نہ ہو جائیں جو اس منصوبے سے ہمیں حاصل ہونا ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم دیگر ممالک سے تعلقات کو اپنے حق میں استعمال کرنا نہیں جانتے۔ پھر کچھ بیرونی طاقتوں کو بھی ہماری ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی، اس لیے وہ ہر اس راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے کوشاں ہوجاتے ہیں جو ہماری ترقی کی طرف جاتا ہو۔ پاک چین مشترکہ منصوبوں ہی کو لیجیے، چینی انجینئرز کا قتل اور بلوچستان کی صورت حال انھی قوتوں کی کارستانیاں ہیں، جن کا آلہ کار ہمارے ہی لوگ بن رہے ہیں۔ بہکاوے میں آکر اور اپنی اغراض کے لیے ایسا کرنے والے لوگ پاکستان کے خیر خواہ تو ہیں ہی نہیں وہ کسی ایسے طبقے کا بھلا بھی نہیں چاہتے جس کے نام پر وہ بدامنی کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی پاکستانی پاکستان کی ترقی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکا سکتا۔

دہشت گردوں کا تو معاملہ یوں الگ ہے کہ وہ بیرونی قوتوں کے آلہ کار بن کر پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچاتے ہیں، لیکن ہمارے حکم راں بھی اپنے ذاتی اور سیاسی فائدوں کی خاطر یا اپنی کم فہمی کی بنا پر یہی کچھ کرجاتے ہیں۔ پہلے ہم نے امریکا کا ''یس مین'' بن کر چین کا ناخوش کردیا تھا اور اب ہم سعودی عرب کو ناراض کر بیٹھے ہیں۔ میں نے کالم کے آغاز میں جس خوش نصیبی کا ذکر کیا تھا وہ پاکستان کو حاصل سعودی عرب کی دوستی ہے، جو صحیح معنی میں دوستی ہے۔ سعودی عرب نے ہمیشہ اور ہر معاملے میں ہمارا بے غرضی سے ساتھ دیا

ہے۔ ایسا تعلق کسی ملک کے لیے نعمت سے کم نہیں، لیکن یمن کے معاملے میں سعودی عرب کی درخواست قبول نہ کرکے اور پھر اس ایشو کو پارلیمنٹ میں لا کر ہم نے کوئی عقل مندی نہیں کی۔ ایسے دیرینہ دوست اور مددگار کے ساتھ غیر جانب داری کا رویہ، اخلاقیات کو تو چھوڑیے، ہمارے مفاد میں بھی نہیں۔ پاک چائنا اکنامک کوریڈور ہی کو لیجیے، اس حوالے سے بھی سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک سے اچھے تعلقات ہماری ضرورت ہیں۔ اگر بھارت ایرانی پورٹ چاہ بہار کے راستے مشرق وسطیٰ سے معاشی روابط.ڑھالے اور چین بھی گوادر کو بھول کر اس راستے کو اپنانے کی سوچے تو یہ صرف سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک سے ہماری دوستی ہوگی جو ہمارے کام آئے گی۔

ہمارے حکم راں فیصلے کرتے ہوئے صرف آج کا مفاد دیکھتے ہیں، اور نتیجہ ہمارے نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کاش ہمارے حکم راں اور سیاست داں سیاسی اغراض کو بھلا کر معاملات کو وسیع تناظر میں دیکھ سکیں اور فیصلے کر سکیں۔

## سانحے کے انتظار میں

دیواروں کو دیمک لگ جائے تو بوسیدہ دیوار گرنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، لہذا پہلے دیمک کا علاج کیا جاتا ہے پھر دیوار کی مرمت کے کام پر توجہ دی جاتی ہے۔ درجہ بہ درجہ کام کو سمجھتے ہوئے دیوار کی مضبوطی پر توجہ دی جاتی ہے۔ فرض کیجیے اگر میں دیوار میں سے دیمک کا خاتمہ نہ کروں اوپر سے دیوار پر پلستر کرکے مرمت کردوں، ایک بہترین پینٹ سے رنگ و روغن کرکے دیوار کو سجادوں تو دیکھنے والے اش اش کر اٹھیں گے، لیکن درحقیقت دیمک اس دیوار کو کھوکھلا کرکے اسے گرانے کا جو عزم کرچکی ہے، وہ اس میں کامیاب ہو کر رہے گی، کیوں کہ جلد بازی میں میں اندورنی مسئلے کو حل کرنے کا نہیں سوچا بس اپنی کارکردگی اور دکھاوے کے لیے دیوار بنا سجادی۔

سانحۂ پشاور کے بعد کراچی کی سیکیوریٹی کے حوالے سے عرصہ دراز سے خدشات ظاہر کیے جارہے تھے۔ کراچی ہائی سیکیوریٹی الرٹ پر تھا، لہذا نیشنل ایکشن پلان کے تحت ایپکس کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اجلاس ہوئے، بیانات دیے گئے، لیکن کام ہوتا نظر نہ آیا۔

جو کام ہوا وہ کچھ یوں تھا کے سب سے پہلے متحدہ قومی موومنٹ کے ہیڈ کوارٹر پر رینجرز کا چھاپا پڑا۔ پھر کچھ عرصہ صوالت مرزا کو میڈیا اور ادارے زیر بحث لاتے رہے۔ اس سے آگے بڑھے تو این اے 246 کے الیکشن کی گرما گرمی نے سب کو اس حلقے کے الیکشن میں الجھائے رکھا۔ دیمک اپنا کام کرتی رہی۔ مختلف پارٹیز نے بڑے زور و شور سے اپنے جلسے جلوس منعقد کیے۔ عمران خان اور الطاف حسین صاحب کے بیانات ہمارے میڈیا کی زینت بنتے رہے۔ دیمک اپنا کام کرتی رہی۔ جماعت اسلامی بھی اپنی تیاریوں میں مگن رہی۔ آخر این اے 246 میں متوقع نتائج سامنے آ گئے۔ کچھ دن نہ گزرے تھے کہ کنٹونمنٹ بورڈز کے الیکشن کی تیاریاں ہونے لگیں اور ساری پولیس اور رینجرز کو کبھی سیاست دانوں کے جلسوں کی رکھوالی کرنے اور کبھی الیکشن میں دھاندلی نہ ہونے دینے کا یقین دلانے کے لیے وقف کر دیا گیا۔ لیکن دیمک اپنا کام کرتی رہی۔ پیپلز پارٹی کیوں کر پیچھے رہتی۔ اس نے بھی اپنا ایک جلسہ کر ہی ڈالا۔ سندھ میں برسر اقتدار جماعت ٹھنڈے کمروں میں اپنے طور سے تمام مسائل کو ''خوش اسلوبی'' سے حل کرتی رہی۔ اور دیمک اپنا کام کرتی رہی۔

اور آخر اب یہ دیمک اس خوب صورت دیوار، جس پر ایپکس کیمٹیوں کے قیام اور کراچی میں کام یاب آپریشن کے خوب صورت پینٹ کرکے عوام کو خوش کیا گیا تھا، پنی بدصورتی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہو چکی ہے۔ افسوس صد افسوس، اور اس کی

بدترین مثال حال ہی میں کراچی میں ہونے والا سانحہ ہے جس نے پچاس لوگوں کو نگل لیا۔ آغا خانی کمیونٹی پر ہونے والا یہ حملہ قومی سانحہ ہے، جس نے ہر دل کو دکھ سے بھر دیا۔

کراچی میں رہزنی کے واقعات میں تو کچھ عرصے تک کمی دیکھنے میں آئی، لیکن ڈکیتی کی مزاحمت کے باعث قیمتی جانوں کا ضیاع ایک عام سی بات سمجھی جانے لگی۔ ابدافی قتل کا سلسلہ تھم جانے کے بعد کراچی میں مقیم امریکی خاتون ڈاکٹر ڈیبرا لوبو کے قتل کے بعد دوبارہ شروع ہوگیا، جس کے بعد ایک سماجی تنظیم کی سربراہ سبین محمود کی جان لے لی گئی۔ خیال تھا کہ شاید اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا، کیوں کہ سبین کا قتل ہی ایک بہت بڑا حادثہ تھا، لیکن نہیں۔ اس قوم کے دیواروں کو کھوکھلا کرنے کے مذموم عزائم رکھنے والوں نے معاشرے کے جسم پر ایسی ضرب لگائی کہ شاید ایک صدی تک اس گھاؤ کو مندمل نہ کیا جاسکے۔ سبین محمود کے قتل کے پانچویں روز ابدافی قاتلوں نے جامعہ کراچی کے شعبۂ ابلاغِ عامہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر وحید الرحمٰن المعروف یاسر رضوی کو سفاکی سے قتل کر دیا۔ ملک کو اپنے محسنوں سے دور کرنے اور معاشرے کو بانجھ بنانے کی گھٹیا سازش کا یہ پہلا واقعہ نہ تھا۔ اس سے پہلے صرف کراچی میں دہشت گردی کا نشانہ بننے والی اہم شخصیات میں ڈاکٹر شکیل اوج، مولانا مسعود بیگ، پروفیسر ڈاکٹر جاوید قاضی، پروفیسر سبط جعفر اور

پروفیسر مولانا تقی ہادی شامل ہیں۔ قوم اپنے اساتذہ سے محروم ہوتی گئی اور سیاست داں اپنے بند کمروں میں بیٹھ کر اجلاس کرتے رہے۔ کس کس کا نام لیا جائے اور کس کسی کی کا تعارف بیان کیا جائے ان لوگوں کو مارا جا رہا ہے، جو ہماری قوم کا سرمایہ تھے۔ اس پہلے ہیرالڈ پبلیکشنز کے ڈائریکٹر مارکیٹنگ مسعود حامد کو پراسرار انداز میں قتل کردیا گیا۔ ان میں سے قاتل کسی کے بھی گرفتار نہ ہوسکے۔ دہشتگردوں کو جب اپنے راستے صاف محسوس ہوئے تو انہوں نے پولیس کے اوپر ہی ہاتھ ڈال دیا اور آخر کار پولیس کا محکمہ بھی اپنے ایک بہت قابل آفیسر ڈی ایس پی عبدالفتح سے محروم ہوگیا اور ان کے ساتھ دو اہل کار بھی شہید کردیے گئے۔

یااللہ کیسی قیامت ہے۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی ہم پھر کسی ہونی کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ دہشت گرد اپنا کام کرتے رہے، کرتے رہے اور کر کے رہے۔

سیاسی جلسے ہوں یا سیاست دانوں کی سیکیوریٹی کی ساری مشنری دہشت گردی کے منڈلاتے سایوں سے نظریں چرائے ایک کام پر ہی جٹ جاتی ہے۔ ہم اداروں کے نام بدل کر سی آئی ڈی کی جگہ سی ٹی ڈی تو کر دیتے ہیں لیکن اداروں کی صلاحیت بڑھانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ ایپکس کمیٹی کے ارکان آرام دہ کمروں

میں بیٹھ کر ہائی ٹی انجوائے کرکے کاغذی کاروائی کرتے رہتے اور دوسرے دن سب کچھ سیاست کی نظر ہو جاتا، چناں چہ حالات جوں کے توں رہے۔ ایپکس کمیٹیوں کو تو کیا کارکردگی دکھانی تھی، لیکن ہاں رینجرز پورے دو سال سے کراچی میں تعینات ہے۔ دعوے بہت کیے گئے کہ کراچی آپریشن میں نوے فی صد کامیابی حاصل کرلی گئ ہے، لیکن عملی طور پر اس کا ثبوت تو کوئی نہیں ملتا۔ جہاں تک لوکل ٹیررازم، فرقہ وارانہ تشدد اور دہشت گردی کا تعلق ہے تو یہ مسائل جوں کے تو باقی ہیں۔

قیام امن کی ساری ذمے داری فوج پر ڈال کر سیاست داں چپ چاپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اگر فوج کو ہی سب کچھ سنبھالنا ہے تو یہ جمہوریت کی دیوی کو کیوں اسمبلیوں میں سجا کر رکھا ہوا ہے۔ مذمتی بیانوں سے کچھ نہیں ہونے والا۔ کسی کی جان کا بدلہ چند لاکھ دے کر حکم راں کیسے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ہم اور کس حادثے کا انتظار کر رہے ہیں اور کتنے سانحے دیکھی گی یہ قوم۔

نہ سانحۂ پشاور میں جان سے جانے والے معصوم بچوں کے چہرے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور بے گناہ جسے اس ملک میں ناکردہ گناہ کی سزا موت کی صورت میں دی گئی۔ نہ جانے ہمیں مزید کس سانحے کا انتظار ہے۔

## مبارک باد قبول ہو

افلاس کے باعث اپنے بھوک سے بلکتے کم سن بچوں کو تسلیاں دے کر سلا دینے والی ماں، دوا اور علاج کے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے تکلیف میں ہر لمحہ تڑپتے مزدور فیس دینے کی سکت نہ رکھنے پر اپنے بچوں کو اسکول سے اٹھا کر میکینک کا چھوٹا بنا دینے والے باپ بحران کے شکار اداروں کے مہنیوں تن خواہ سے محروم ملازمین اور غربت اور محرومی کے شکار ہر پاکستانی کی طرف سے اپنے معزز، محترم اور مستحق منتخب نمائندوں کو مبارک باد قبول ہو کہ ان کی تن خواہ میں اضافہ کی نوید مل گئی ہے اور اضافہ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں، ارکان قومی اسمبلی کی تنخواہیں 68 ہزار فی کس سے بڑھا کر ایک لاکھ تیس ہزار روپے کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے شایع ہونے والی خبر کے مطابق پانچ جون کو پیش کیے جانے والے بجٹ، جس میں غریب آدمی کی بچی کچھی کھال اُتارنے اور اسے مزید زیر بار کرنے کا اہتمام کیا جائے گا، قومی اسمبلی کے ارکان کی تن خواہیں بڑھانے کا اعلان بھی اسی بجٹ تقریر کا حصہ ہوگا۔

ہمیں یقین ہے کہ اس اقدام پر قومی اسمبلی میں موجود کسی جماعت کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، سب متفقہ طور پر اس تجویز کو منظور کرلیں گے۔ ابھی اس تذکرے کو

رہنے دیجیے کہ ہمارے یہاں اہل سیاست خاص طور پر منتخب نمائندوں کی اکثریت لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرکے اسمبلیوں میں پہنچنے کا بعد کس کس طرح اپنا لگایا ہوا سرمایہ وصول کرتی ہے، ان ایوانوں میں عوام کے ایشوز پر کتنی بات ہوتی ہے اسے بھی چھوڑیے، ارکان کی ایوان سے غیر حاضری کا ذکر بھی ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ معاشی بحران، بجلی، گیس اور پانی کی قلت کی شکار اور افلاس زدہ قوم کے نمائندوں کی تن خواہوں اور مراعات میں اتنے اضافے کا کیا جواز ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ بیرونی قرضوں کا بوجھ ہو، دفاعی بجٹ ہو یا معاشی بحران کا بار اسے اٹھانا صرف عام پاکستانی کا مقدر ہے، حکم راں اور منتخب نمائندے ایسی ہر فکر سے آزاد ہیں۔ یوں بھی یہ خواتین وحضرات اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں دولت جس کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس کے باوجود انھیں قومی خزانے سے اپنے حصے سے زیادہ رقم چاہیے، استحقاق کے نام پر انھیں ہر سہولت چاہیے۔ یہ نخرے کیوں نہ دکھائیں، یہ غریب قوم ہے نا ان کے ناز اٹھانے کے لیے، ہر کسی کی ہر خواہش اور آرزو پوری کرنے کے لیے۔ چناں چہ سندھ کے منتخب ارکان اسمبلی کے لیے چار ارب پچاس کروڑ روپے کی خطیر رقم سے صوبائی اسمبلی کی شان دار عمارت تعمیر کی گئی۔ یاد رہے کہ یہ وہی سندھ ہے جس کے ایک بدنصیب علاقے تھر میں معصوم بچے بھوک سے مر رہے ہیں، جہاں لاکھوں لوگ جھگیوں میں رہتے ہیں،

جہاں ہاریوں کی اکثریت کو غربت ہر روز نوچ کر کھارہی ہے۔ شکر ہے کہ اس صوبے کے حکم راں اور منتخب نمائندے ایک خوب صورت اورپُرآسائش عمارت میں بیٹھ کر مصائب کی دھوپ سے بچتے ہوئے صوبے کے غریبوں کے لیے زوردار تقریریں کرتے ہیں۔

حکمرانوں، سیاست دانوں اور عوام کے منتخب نمائندوں کی یہ روش کسی ایک صوبے تک محدود نہیں، پورے ملک میں یہی صورت حال ہے، جس کا عکاس قومی اسمبلی کے ارکان کی تن خواہوں میں اضافے کا فیصلہ ہے۔

یہ ہمارے کیسے نمائندے ہیں جو ہر معاملے میں ہم سے الگ ہیں۔ ان کا طرز زندگی کسی طرح بھی عام پاکستانی کے روزوشب سے مماثلت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی وہ ایسا چاہتے ہیں۔ کوئی اپنی کمائی سے کیا کیا سہولتیں حاصل کرتا ہے، کون کون سی آسائشیں خریدتا ہے، تعیشات کا کیا کیا سامان کرتا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن جب قوم کے پیسے اور قومی خزانے کی بات آئے تو اپنے دعوؤں اور وعدوں کا کچھ تو خیال رکھا جائے۔ لیکن خود کو غریبوں کا ہم درد کہنے اور ان کے لیے لمبی چوڑی تقریریں کرنے والے ہمارے حکم راں اور منتخب نمائندے یہ سامنے کی حقیقت بھول جاتے ہیں کہ قومی خزانے سے حاصل کی جانے والی ان کی تمام مراعات، چاہے وہ بیش قیمت گاڑیوں کی صورت میں ہوں، عالی شان عمارتوں کی صورت میں یا تنخواہ اور دیگر مالی سہولتوں کی شکل میں، ان

سب سے غریب پاکستانی اور عام آدمی ہی متاثر ہوتا ہے۔ حکمرانوں اور منتخب نمائندوں قومی خزانے سے دی جانے والی ہر رعایت ہر سہولت کتنے ہی اسکول ہڑپ کرجاتی ہے جہاں غریب کا بچہ پڑھ سکتا تھا، کتنے ہی اسپتال ان سہولتوں اور رعایتوں کا شکار ہوجاتے ہیں جہاں افلاس زدہ مریضوں کا مفت علاج ہوسکتا تھا، یہ سرکاری ملازمین کی تن خواہوں کے وہ معمولی اضافے کھاجاتی ہیں جو ان کے چھوٹے چھوٹے کتنے ہی مسائل حل کر سکتے تھے۔

شاید یہ طے کر لیا گیا ہے کہ اہل سیاست، حکم رانوں، فوج کے حکام، بیوروکریٹس اور منتخب نمائندوں ہی کو اس ملک میں جینے کا حق ہے، اس ملک کے وسائل اور قومی خزانے پر صرف انھیں کا حق ہے، اس دیس کے ہر راستے پر ان کا حق ہے، سو سرکاری سیکیوریٹی اور بلٹ پروف گاڑیاں ان کی قیمتی جانوں کو محفوظ بنانے کے لیے مختص کردی جاتی ہیں اور عام آدمی کی زندگی ہر تحفظ سے محروم رہتی ہے، یہ خواتین و حضرات کروڑوں اربوں روپے کی سرکاری مراعات ہضم کرجاتے ہیں اور عام لوگ چھوٹے چھوٹے شہری مسائل کے حل کے لیے احتجاج کرتے نظر آتے ہیں، ان کی سواری گزرے تو ہر راستہ ان کے لیے خاص ہوجاتا ہے اور عام شہری سے سڑک سے گزرنے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔

جو ملک ایک عرصے سے معاشی زبوں حالی کا شکار ہو، جہاں بجلی، گیس اور پانی

جیسی بنیادی ضروری کی قلت عذاب بن چکی ہو، جہاں ہر طرف غربت اور بے روزگاری نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں اس کے حکم رانوں اور منتخب قیادت کو قومی خزانے سے غیر ضروری طور پر ایک روپیہ بھی لینا زیب دیتا ہے؟ ہر گز نہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ طبقہ وسائل کا حق دار خود کو سمجھتا ہے اور مسائل کا سارا بوجھ عوام پر ڈال دیتا ہے۔ اور ہمارے عوام، اپنے اس استحصال پر آواز تک نہیں اٹھاتے، چناں چہ دوسروں کا بوجھ اٹھائے جی رہے ہیں۔

# اور اب پانی بھی نایاب

پاکستان کے باسی کسی بار پر متفق ہوں یا نہ ہوں اس بات پر عوام، حکمراں اور جمہوریت کی بانسری بجانے والے بھی اکثر متفق نظر آتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، کوئی سا بھی بحران آئے فوراً فوج کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا جائے، اور اس دفعہ تو حیرت بھی ہوئی اور تعجب کے ساتھ ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بھی آئی کہ واٹر بورڈ کا نظام فوج کے حوالے کرنے کی تجاویز دی جارہی ہیں۔ نہ صرف تجاویز دی جارہی ہیں بل کہ عمل کرنے پر بھی غور کیا جارہا ہے۔ واہ رے حکم راں، کوئی شعبہ تو ہو جس میں ان کی کارکردگی نظر آئے۔

واٹر بورڈ کے تذکرے پر ایک انوکھے خیال سے میرا ذہن روشن ہوگیا۔ سائنس داں عرصۂ دراز سے چاند پر آبادی کے خواب دیکھ رہے ہیں اور مسلسل اس کی کوشش جاری ہے۔ نہ جانے یہ کوشش کام یاب کیوں نہیں ہورہی، حالاں کہ یہ کوئی اتنا بڑا کام بھی نہیں کہ جس پر اربوں ڈالر صرف کردیے جائیں اور منصوبہ بندی کی جائے۔ ناسا والوں کو چھوٹا سا معصوم سا مشورہ ہے کہ وہ کراچی والوں کو چاند پر بسادیں۔ وہ بچارے بنا کسی حجت کے چاند پر خوشی خوشی رہنے کے تیار ہوجائیں گے۔ وجہ سمجھنا نہایت آسان ہے۔ شہر قائد کے باسیوں کے پاس نہ بجلی

ہے، نہ گیس اور نہ ہی پانی، الہٰذا ان کا چاند پر بہ آسانی گزارہ ہو جائے گا۔ انھیں چاند پر رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہاں کوئی اندھی گولی کبھی کہیں سے آنے کا خطرہ نہ ہوگا۔ لا اینڈ آرڈر کے مسائل بھی حل ہوئے۔ یہاں ادارے ہیں تو کام نہیں ہوتا وہاں تو ادارہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کہ بلا ضرورت قومی خزانے میں سے عوام کے دیے ہوئے ٹیکس سے تنخواہیں دینی پڑیں۔ رہا مسئلہ ہوا کا ! تو چاند پر بھی چائنا زندہ باد،

....بیٹریاں بھی بہت اور پنکھے بھی بہت چلیں جی تیار ہیں کراچی والے

کراچی کی ہر دیوار ایک کہانی سناتی ہے۔ ایک دعوت ایک اشتہار ہمارا منتظر ہوتا ہے، جیسے چلو چلو نشتر پارک چلو، چلو چلو کمری گراونڈ چلو، چلو چلو جناح گراؤنڈ چلو، اور نا سا والے کراچی آ کر صدا لگائیں گے چلو چلو چاند پر چلو اور سارے کراچی والے متفق ہو کر چاند پر پہنچ جائے گے۔

اب تک تو امکان تھا کہ بجلی اور گیس کی قلت کا شکار، ٹرانسپورٹ کے مسائل سے بے حال اور امن وامان کی صورت حال کے باعث ہر دم خدشات میں مبتلا چاند پر بسنے کی پیشکش پر کچھ سوچیں، لیکن شہر میں پانی کے شدید بحران کے بعد ایسا کوئی امکان نہیں رہا ہے۔

یہ صوبائی حکومت اور ادارہ فراہمی و نکاسی آب کراچی کی مجرمانہ غفلت اور نااہلی ہے جس نے کراچی کو پانی کے سنگین بحران سے دوچار کردیا ہے۔ شہر کو فراہمی آب کے ایک اہم ذریعے حب ڈیم کے بارشوں کی کمی کے باعث خشک ہونے کے باعث شہر میں پانی کا بحران دو سال سے جاری ہے اور شہر میں پانی کی قلت اب 700 ملین گیلن یومیہ تک پہنچ چکی ہے۔ 2 کروڑ سے زاید آبادی کے شہر کو صرف 400 ملین گیلن یومیہ پانی فراہم کیا جارہا ہے۔ شہریوں کو اس تکلیف سے دوچار نہ ہونا پڑتا اگر حکومت بروقت 4 منصوبے مکمل کرلیتی، جن میں دریائے سندھ سے 65 ملین گیلن پانی کی فراہمی اور ڈملوٹی کے کنوؤں کو فعال کرکے 16 ملین گیلن پانی کی یومیہ فراہمی کے منصوبے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دھابیجی پمپنگ ہاؤس کے پمپوں کی مرمت اور فراہمی آب کی لائنوں میں رساؤ کی مرمت کرلی جاتی تو مجموعی طور پر 230 ملین گیلن سے زاید پانی کی فراہمی ممکن بناکر اس بحران میں کچھ کمی لائی جاسکتی تھی۔ علاوہ ازیں زیرزمین لائنوں سے پانی کی چوری، سرکاری ہائیڈرینٹس کی بدانتظامی پر قابو پانے اور والز آپریشن نظام کو بہتر بناکر بھی کراچی کے مضافاتی علاقوں کو فراہمی آب میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ لیکن عوام کی مشکلات اور مسائل سے کسے غرض ہے، سو یہ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

کراچی جیسے شہر میں جہاں مختلف زبانیں بولنے والوں کی پوری پوری آبادیاں

ہیں، پانی کا بحران صرف شہریوں کے لیے ایک عذاب نہیں باہمی غلط فہمیوں اور تنازعات کی پیدائش اور فروغ کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے، جو ایک اور قیامت ہوگی۔ کراچی ملک کا سب سے بڑا صنعتی و تجارتی شہر ہے، جس کی صنعتوں کے لیے پانی کی فراہمی ناگزیر ہے، اس لیے یہ بحران ہماری معیشت کو بھی متاثر کر رہا ہے اور مزید متاثر کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ سامنے کے حقائق حکم رانوں کو کیوں نظر نہیں آتے؟ وہ ہر آتے بحران سے کیوں بے خبر رہتے ہیں؟ انھیں کیوں اندازہ نہیں ہوتا کہ ہر نوعیت کا بحران عوام کی مشکلات بڑھانے کے ساتھ دیگر بہت سے مسائل بھی ساتھ لاتا ہے۔ حکم رانوں کو اس سب کا اندازہ اور فکر تب ہو جب انھیں عوامی مسائل سے دل چسپی ہو۔ ان کے لیے تو حکم رانی بس دعوے اور وعدے کرنے کا نام ہے۔

ایک خاتون رکن صوبائی اسمبلی نے صورت حال کے حوالے سے اپنے اندیشے کا اظہار یوں کیا ہے کہ دنیا پیش گوئی کر رہی ہے کہ تیسری عالمی جنگ پانی کے مسئلے پر ہوگی، لیکن میں یہ پیش گوئی کر رہی ہوں کہ کراچی میں اب لسانی، فرقہ وارانہ فسادات نہیں بل کہ پانی پر فسادات ہوں گے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو، لیکن پانی سے مسلسل محرومی لوگوں کو کس طرح اشتعال میں مبتلا کر رہی ہے، اس سے شہر کا ہر باسی واقف ہے، یہ صورت حال کیا رنگ لا سکتی ہے، اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں، لیکن حکم راں ایسا کوئی اندازہ لگانے کو تیار نہیں

کیوں کہ اس سب میں نقصان عام آدمی اور غریبوں کا ہوتا ہے، حکمرانوں کا کیا بگڑے گا، لیکن وہ تاریخ سے واقف نہیں، ورنہ جان لیتے کہ عوام کی مشکلات حد سے بڑھ جائیں تو آخرکار اس کا نشانہ حکمراں طبقہ بنتا ہے۔ چناں چہ کچھ نہیں تو حکمراں اپنے بارے میں سوچ کر ہی عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے پر توجہ دیں۔ وہ شہریوں کو تحفظ نہیں دے سکتے، بجلی نہیں دے سکتے، گیس نہیں دے سکتے، روزگار نہیں دے سکتے، مگر پانی تو زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اگر یہ بھی نہ دے پائے تو ان کے ہونے کے جواز پر پانی پھر جائے گا۔

## کہاں ہیں حکمراں، کہاں ہیں انتظامیہ

دیکھ کر چل وہاں بھی لاش ہے،

ارے پیر تو مت رکھ مردے پر، بیچارے کو تکلیف ہو گی اُسے،

اب نہیں ہوتی تکلیف اَسے جتنی ہونی تھی ہو گئی اور مر گیا،

تُو تو ایسے بات کر رہا ہے جیسے تجھے مرنا ہی نہیں۔ خدا کا خوف کر ایک مردہ ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے اور باقی زمین پر پڑے ہیں۔ سارے اسٹریچر بھر چکے ہیں۔ اب اس کی جگہ بنا، کہاں رکھنا ہے اِسے۔ ابھی تو اور بھی میتیں آئیں گی۔

تجھے یقین ہے کہ اور بھی آئیں گی۔ اور مریں گے؟ اب تو مردہ خانے والوں نے بھی منع کر دیا ہے کہ یہاں جگہ نہیں کہیں اور لے کے جاؤ مردوں کو، یہاں تو برف کی سلیں بھی کم پڑ گئی ہیں۔ کھڑا رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ لاشوں میں سے بدبو آنے لگی ہے۔ ساری ہی لاوارث ہیں یا شاید اب سلسلہ شروع ہوگا ورثہ کے آنے کا، جو لے کر جائیں گے لیکن وہ جو شہر میں دوسرے شہروں سے کام کرنے آئے تھے وہ تو سارے کے سارے لاوارث لاشوں کے قبرستان میں دفن ہوجائیں گے۔ ان کے پیاروں کو تو پتا ہی نہیں ہوگا کہ ان کا بندہ مرگیا ہے۔

ہائے مولا کیا زمانہ آگیا ہے قیامت ہے قیامت.....

یہ منظر کشی نہ برما کی ہے نہ غزہ کی اور نہ ہی شام اور یمن کی۔ یہ احوال ہے پاکستان کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر کراچی کا۔ حیران ہونے کی ضرورت ہے نہ ہی افسوس کرتے ہوئے رحم بھری آہ کرنے کی، کہ کراچی میں موسم کی شدید ناگہانی آفت نے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 625 لوگوں کو نگل لیا اور غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق ایک ہزار سے زائد سے زیادہ جانیں ضائع ہو گئیں۔ حکام بالا موسم کو قصوروار ٹھہرا کر آرام سے یہاں وہاں ہو لیے، جن کے پیاروں کے جنازے اٹھے ہیں وہی جان سکتے ہیں غم کی شدت کیا ہوتی ہے یا وہ لوگ جو اب بھی شہر کے مردہ خانوں کے رجسٹر میں مردہ افراد کی تصویروں میں اپنے کسی، بہت اپنے، بہت پیارے کا عکس دیکھ رہے ہوں گے اور تلاش کی شدید ذہنی اذیت سے گزر رہے ہوں گے۔ اور ہاں ان میں وہ معصوم لوگ بھی ہیں جو اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنے روزی کی تلاش میں کراچی آئے تھے۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ کہ شہر اماں نے انھیں امان نہیں دی۔ کسی کی پیاری گڑیا اب بھی اپنے بابا کے شہر سے لوٹنے کا انتظار کر رہی ہو گی کہ بابا عید پر نئے کپڑے لے کر آئے گا۔ وہ پاگل تو جانتی ہی نہیں کہ محنت مزدوری کرنے والا اس کا بابا کراچی کے کسی مردہ خانے میں لاوارث لاشوں کے ساتھ اپنی گڑیا کے ارمانوں کو لے کر ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے۔

موسم تو ہمیشہ عام آدمی کو متاثر کرتا ہے۔ ہر آفت کے نتیجے میں ہونے والے

جانی نقصان کو فقط یہ کہہ کرٹال دینا کہ یہ تو خدا کی طرف سے تھا سراسر ظلم ہے۔
خدا ظالم نہیں۔ ظالم تو وہ لوگ ہیں جو اقتدار کا مزہ لوٹ رہے ہیں مگر انھیں عوام کے مصائب اور مسائل کی کوئی پرواہ نہیں، یخ بستہ کمروں میں میٹنگز کرنے والے فقط ایک دفعہ اس گرمی میں اپنا اے سی آف کردیں تو ان کا بی پی شوٹ کر جاتا ہے۔ یہاں تو عوام گھنٹوں بجلی کے بنا رہنے پر مجبور ہیں۔ دوسری طرف پانی ہے کہ شہر قائد کے باسیوں کے لیے نایاب کر دیا گیا ہے۔ تو ایسے میں زندگی کیوں کر میسر آتی۔ یہ بجلی اور پانی کا نہ ہونا بھی کیا کسی قدرتی آفت کا نتیجہ ہے؟ تو پھر یہ اموات بھی محض موسم کا سبب نہیں کہی جاسکتیں، لیکن انھیں بہت آرام سے موسم کا ستم کہہ کرٹال دیا گیا۔ ماہ رمضان میں اچھے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے دستر خوان مہنگائی کی وجہ سے محدود ہو گئے ہیں۔ تو ذرا سوچیے وہ لوگ جو مشکل سے گزارا کرتے تھے ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پھر کہا جاتا ہے کہ لوگ گھر سے نہ نکلیں، موسم خراب ہے۔ ارے حکمرانوں ! عام آدمی گھر سے مزدوری کرنے نہیں نکلے گا تو کھائے گا کیا۔ کسی نے ایک دفعہ بھی یہاں اعلان کیا کہ اشیائے خورونوش کی قیمتیں چند دنوں کے لیے مخصوص مقامات پر کم کردی گئی ہیں تاکہ اگر کوئی شخص اپنی ضرورت پوری نہیں کرپا رہا تو وہاں جا کر خریداری کر سکے۔ لیکن نہیں اس شدید گرمی میں بھی وہ عام آدمی فکر روزگار کے لیے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے۔ ہر ادارہ ہر جگہ بے دردی سے مزدوروں کے حقوق

کا استحصال ہو رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ موسم کی سختی کے باعث جانیں ضایع ہوئیں۔

افسوس صد افسوس۔

چلیے مزدور تو سڑکوں پر میدانوں میں کھلے آسمان تلے جلتے سورج کا سامنا کر رہے تھے، لیکن کتنے ہی بچے گھروں میں بجلی نہ ہونے کے باعث چل بسے، لیکن یہ تو موسم کا ستم ہے

!ناں

!گھر میں پانی بھرتے بھرتے خاتونِ خانہ چل بسیں، لیکن یہ تو موسم کا ستم ہے ناں

ڈیوٹی آورز شدید گرمی میں بھی کم نہ کیے گیے اور ایک جوان لڑکا آفس سے واپسی پر

!مرگیا، لیکن یہ تو موسم کا ستم ہے نا

مزدور اپنی کدال زمین پر مارتے مارے وہیں بھر ڈھیر ہوگیا، کوئی نہیں تھا جو اس گرمی

!میں اسے کام کرنے سے روک دیتا، لیکن یہ تو موسم کا ستم ہے ناں

بجلی کی بدترین لوڈشیڈنگ کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے باعث شہر بھر میں شدید

،ٹریفک جام ہے، چناں چہ ایک بزرگ کار چلاتے چلاتے اللہ کو پیارے ہوگئے

!یہ تو موسم کا ستم ہے ناں

کراچی میں گاڑیاں زیادہ ہوگئیں، ان کے دھوئیں نے فضا کو مزید آلودہ کردیا، اور درخت کم ہوگئے، لہٰذا گرمی اور بڑھ گئی، لیکن اس سب میں کسی کا کیا قصور، یہ تو موسم !کیا ستم ہے بس

بارش ہو، سیلاب، آندھی ہو یا زلزلہ، کوئی بھی قدرتی آفت ہو، ہمارے ملک کا عام آدمی اور غریب ان آفات کا براہ راست نشانہ بنتے ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان آفات سے بچ نہیں سکتے تھے، نہیں صاحب ! ایسا بالکل نہیں، ان کی زندگی کو اتنی حیثیت دی ہی نہیں جاتی کہ اس بچانے کی تدابیر کی جائیں، یہاں حکم راں جانتے ہیں کہ قدرتی اور موسم کے ستم کی ذمے داری قرار دے کر وہ صاف بچ جائیں گے۔ یہی کچھ کراچی میں بھی ہوا ہے، پانی ناپید اور بجلی غائب کرکے جیسے آسمان سے برستی گرمی کو پیغام دے دیا گیا تھا کہ آؤ اور اس شہر کو جہنم بنادو۔

ہمیں آج لاشیں نظر آرہی ہیں، اپنے پیاروں کے روتے لوگ نظر آرہے ہیں، بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خلاف احتجاج کرتے لوگ نظر آرہے ہیں، اس صورت حال سے زندگی مزید اجیرن بناتے حالات نظر آرہے ہیں، مگر بس وہ نظر نہیں آرہے جنھیں اس

صورت حال میں نظر آنا چاہیے، کہاں ہے حکم راں، کہاں ہے شہری انتظامیہ کیا اتنے بڑے شہر کے عوام کو لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے؟ کچھ نہ کریں بس اس حقیقت کا اعتراف کرلیں، تاکہ عوام کو صبر آجائے کہ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

## وہ حقیقت پھر سامنے آگئی

تو ثابت ہوا کہ ابھی آزادی اور خودمختاری کی منزل سے ہم کوسوں دور ہیں۔ یہ حقیقت تو بار بار ثابت ہو چکی ہے اور ہر بار ظاہر ہو کر ہمیں شرمندہ کر جاتی ہے۔ تازہ ترین اظہار بچوں کے تحفظ کے لیے سرگرم ایک این جی او کی پاکستان میں بندش کے بعد ہوا۔ عوام اس فیصلے پر حیران تھے کہ ہمارے حکم رانوں نے ایسی جرات کا مظاہرہ کیسے کر دکھایا، لیکن چند ہی دنوں میں یہ خوش گوار حیرت خاک ہو گئی۔۔برطانیہ سے تعلق رکھنے والی یہ "نان گورنمنٹل آرگنائزیشن" ترقی پذیر ممالک میں بچوں کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہے، جس کا مقصد اچھی تعلیم، حفظانِ صحت اور معاشی مواقع کی فراہی کے ذریعے پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں بچوں کے حالات بہتر بنانا ہے۔ مقصد تو بہت نیک ہے، اور یقیناً ایسے ہی مقاصد کے لیے ملک بھر میں کام کرتی دیگر غیر ملکی این جی اوز کی طرح یہ این جی او بھی اپنے اس نیک مقصد کے لیے فعال رہی ہے، لیکن نیک مقاصد اور خیر کے کام کرنے والے کسی ادارے یا تنظیم کو بھی یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی بیرونی قوت کی آلہ کار بن جائے، اور اس این جی او نے یہی کچھ کیا۔

اس ادارے کی پاکستان میں سرگرمیاں اس وقت مشکوک قرار پائیں جب یہ انکشاف ہوا کہ سی آئی اے کے منصوبے کے تحت اسامہ بن لادن کی موجودگی کا سراغ لگانے کے لیے ایبٹ آباد میں ویکسینیشن مہم چلانے والا ڈاکٹر شکیل آفریدی اس این جی او سے وابستہ ہے، جس کے بعد حکومتی اداروں کی جانب سے اس این جی او پر نظر رکھی جانے لگی۔

آخرکار گذشتہ ماہ پاکستان مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا الزام عاید کرتے ہوئے اس این جی او کی سرگرمیوں پر پابندی عاید کردی گئی، اس کے دفاتر سربہ مہر کردیے گئے اور اس این جی او کے پاکستان میں تعینات غیرملکی حکام اور عملے کو پندرہ روز کے اندر پاکستان چھوڑنے کے احکامات جاری کردیے گئے۔ خبروں کے مطابق اس این جی او کی سرگرمیوں کی کافی عرصے سے نگرانی کی جارہی تھی اور وفاقی وزارت داخلہ کے ایک اہل کار کے مطابق، ’’وہ کچھ ایسا کر رہے تھے جو پاکستان کے مفاد کے خلاف تھا۔

ابھی بچوں کے حقوق اور تحفظ کے نام پر متحرک اس این جی او پر پاکستان میں پابندی عاید ہونے کی خبر حکومت کے اس فیصلے پر عوام کو حیران کیے ہوئے تھی کہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر یہ خبریں تواتر کے ساتھ آنے لگیں کہ حکومت پر دباؤ ہے کہ وہ مذکورہ این جی او پر پابندی عاید کرنے کا فیصلہ واپس لے۔ ان خبروں کے سامنے آتے ہی اپنے ملک کے حالات اور ہماری حکومتوں کی حالت سے واقف ہر پاکستانی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ این جی او پر پابندی کا جو فیصلہ

سینہ تان کر اور سر اٹھا کر سامنے آیا ہے، بہت جلد سر جھکائے، شرمندہ اور خوف زدہ واپس جا رہا ہوگا۔ اور یہی ہوا، حکومت نے بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور مذکورہ این جی او سے پابندی اٹھالی، اس کے سربہ مہر کیے جانے والے دفاتر کھول دیے گئے۔ تاہم یہ شرط عاید کردی گئی ہے کہ یہ ادارہ فاٹا سمیت ملک کے حساس علاقوں میں کام نہیں کرسکے گا۔ چلیے، کچھ حدود تو متعین کی گئیں، مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت ملک کا کون سا علاقہ حساس نہیں؟ کیا ملک کا دارالحکومت اسلام آباد، جہاں اس این جی او کا دفتر واقع ہے، غیر حساس علاقہ ہے؟

حکمرانوں نے نہ اس این جی او پر پابندی لگاتے وقت یہ بتایا کہ آخر وہ کون سی سرگرمیاں تھیں جن کی بنا پر اس ادارے کو پاکستان مخالف سرگرمیوں میں ملوث قرار دیتے ہوئے بوریا بستر گول کرنے کا حکم صادر کیا گیا، اور نہ ہی یہ فیصلہ واپس لیتے وقت عوام کو آگاہ کرنے اور حقائق سامنے لانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ عجیب بات ہے کہ عوام جو حکمرانوں کے ہر فیصلے اور ہر پالیسی سے متاثر ہوتے ہیں اس امر سے اکثر بے خبر ہی رکھے جاتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کیا گیا تو کیوں اور واپس لیا گیا تو کیوں۔ چلیے صاحب ''ملکی مفاد'' میں عوام کو کچھ نہ بتایئے، لیکن اتنا پوچھنے کا تو ہم حق رکھتے ہیں کہ جس ادارے کا ملک کی مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونا ثابت ہوچکا ہے اسے اس سرزمین

پر کام کرنے کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے اور کیوں دی گئی ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ ایسی تنظیموں سے عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو فائدہ ہوتا ہے جو ان کے تعلیم، صحت اور دیگر سماجی مقاصد کے لیے کیے جانے والے اقدامات سے استفادہ کرتے ہیں، لیکن کیا اس بنیاد پر ہم اپنے دیس میں بیرونی قوتوں اور غیر ملکی ایجنسیوں کے جال بُننے کی اجازت دے سکتے ہیں؟

مذکورہ این جی او پر پابندی لگا کر واپس لینے کا فیصلہ ایسے ہی دباو کا نتیجہ ہے جس کا ہم بار بار شکار ہوئے ہیں اور نہ جانے کب تک ہوتے رہیں گے۔ اس دباو کے تحت ہماری بستیوں سے لوگوں کو اٹھا کر لے جایا گیا، ڈرون حملے دہشت گردوں کے ساتھ کتنے ہی معصوم پاکستانیوں کے گھروں کو اجاڑ گئے لیکن ہم انھیں روک نہ پائے، اور پھر سی آئی اے کے بھیجے ہوئے جاسوس ریمنڈ ڈیوس نے شاید ہم پاکستانیوں کو ہماری خود مختاری کا احساس دلانے کے لیے لاہور میں دو پاکستانیوں کو مار ڈالا۔ بہت شور ہوا، بڑے نعرے لگے، عوام اپنے ہم وطنوں کے قاتل کے خلاف سراپا احتجاج تھے، لیکن پھر ایک پُراسرار چکر چلا اور دو معصوم پاکستانیوں کا قاتل ریمنڈ ڈیوس ہماری آزادی اور خود مختاری کا مذاق اڑاتا جیل سے نکلا اور اپنے ملک جا پہنچا۔ اب تو اس سانحے کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا۔

یہ سچ ہے کہ سیاسی آزادی اور خود مختاری معاشی آزادی، استحکام اور خود مختاری کے بغیر صرف نعرہ اور دعویٰ ہی ہو سکتی ہے، لیکن کیا بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ معاشی استحکام اور آزادی کی منزل آنے دیں گی؟ بدعنوانی سے نجات ہی ہمیں دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنا سکتی ہے، ورنہ جس این جی او کو ہم ملک سے نکالنا چاہیں گے وہ پوری شان سے یہاں کام کرتی رہے گی اور جس ریمنڈ ڈیوس کو ہم ملک میں روکنا چاہیں گے وہ ہمیں چڑاتا اپنے وطن پرواز کر جائے گا۔

جو آواز میرے کانوں کو چھو رہی تھی، وہ کس پروگرام کی ہے؟ اس پر میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی، کیوں کہ وہ آواز دور رکھے ٹیلی وژن کے ذریعے مجھ تک پہنچ رہی تھی، لیکن ہاں اس آواز پر کان دھرنے کی وجہ کچھ یہ تھی کہ جو لفظ ادا کیے اور جو زبان بولی جارہی تھی وہ قطعاً اس قابل نہیں تھی کہ کسی مہذب اور اخلاقی اقدار پر یقین رکھنے والے گھرانے میں یہ پروگرام دیکھا جاسکے۔ میں نے ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا، جہاں میری گیارہ سالہ بڑی بیٹی ایک نجی ٹی وی چینل پر عید کی ٹرانسمیشن میں دکھائے جانے والا ایک ڈراما دیکھ رہی تھی۔ ذرا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈرامے میں کراچی کا کلچر دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ افسوس رہ رہ کر اس بات کا ہو رہا تھا کہ یہ کون سا کلچر ہے جسے دکھایا جارہا ہے۔ کیا ہمارے شہر میں یہ زبان بولی جاتی ہے؟ یا اس شہر کے باسی اس حد تک اخلاقی زوال کا شکار ہو چکے ہیں جو اس ڈرامے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ لاحول پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے، فقط ایک آدھ ڈرامے میں ایسا ہوا ہے اور میں خوامخواہ رائی کا پہاڑ بنا رہی ہوں۔ وقت کی کمی کے باعث ٹی وی ڈرامے دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی، لیکن اب سوال اس بات کا تھا کہ میرے اپنے ٹی وی پر کیا دیکھتے ہیں؟ تو میں نے کچھ دن ٹی وی ڈراموں کا جائزہ لیا۔ اس

دوران پاکستان میں بننے والی فلموں کے حوالے سے بھی کچھ خبر ہوئی کہ میڈان پاکستان کا نعرہ دینے والی فلمیں کس کلچر کو دکھا رہی ہیں؟ اس جائزے کے دوران اندازہ ہوا کہ ایک نہیں دو نہیں تقریباً تمام چینلز نے جیسے بیہودگی اور مزاح کے نام پر پھکڑ پن کا بیڑ اٹھا رکھا ہے۔ رہی سہی کسر نیوز چینل پر آنے والے سنسنی خیز ڈراموں نے پوری کر دی ہے، جن میں جرم کے آئیڈیا دینے سے لے کر اس کے چھپانے اور انجام دینے تک سب کی بڑی خوب صورتی سے تربیت دی جاتی ہے۔

زندگی میں تفریح کا عنصر ہونا بہت ضروری ہے۔ کوئی انٹرٹینمنٹ نہ ہو تو زندگی کی یکسانیت اور روز و شب کی مشقت ہمیں بے زار اور گھٹن کا شکار کر دیتی ہے۔ ہر کسی کی کوئی اپنی من پسند تفریح ہوتی ہے، لیکن کچھ تفریحات مشترکہ ہوتی ہیں، جیسے فلم اور ڈراما وغیرہ، یہ اور کچھ دیگر شعبوں سے مل کر بنتی ہیں۔ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری دنیا میں اب فقط تفریح کا ذریعہ ہی نہیں رہی بل کہ ملکوں کی پہچان اور ان کی معیشت کا اہم حصہ بھی بن چکی ہے، ایسے میں ہمارے یہاں یہ انڈسٹری کس حال میں ہے، اس کا اندازہ آج کے پاکستانی ڈراموں اور میڈ ان پاکستان کا نعرہ دینے والی فلموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اچھا کام نہیں ہو رہا۔ ماضی میں اچھی فلمیں پاکستان فلم انڈسٹری نے دنیا کے سامنے پیش کیں۔ ہدایت کار ہوں یا فلم ساز عوام کو معیاری تفریح

کا سامان دیتے رہے۔ ساتھ ہی ہماری ڈراما انڈسٹری تو شاندار تاریخ رکھتی ہے۔ ٹی وی ڈراموں کی معیاری کہانیاں اور عکس بندی کئی عشروں سے دنیا بھر میں ہمارے لیے باعثِ فخر رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ سالوں کے دوران ہماری انٹرٹینمنٹ انڈسٹری نے بہت ترقی کی ہے، لیکن کیا ہم اسے ترقی کہہ سکتے ہیں؟

نجی ٹی وی چینلز آنے کے بعد لاتعداد پروڈکشن ہاؤس قائم ہو گئے ہیں اور بڑی تعداد میں ڈرامے بن رہے ہیں، لیکن ان ڈراموں کا معیار کیا ہے؟ تقریباً سب ڈراموں میں امیر کبیر گھرانے اور ان کا پُرتعیش لائف اسٹائل دکھایا جاتا ہے۔ انڈین ڈراموں کی تقلید میں ہمارے ڈراموں میں بھی گھریلو سازشیں جگہ پا چکی ہیں۔ بیہودہ زبان کا استعمال ایک عام سی بات ہے۔ وہ لفظ جو ہمارے گھروں میں غلطی سے اگر کوئی ادا کر دے تو کڑی سزا دی جاتی تھی، آج وہی الفاظ ہمارے ٹی وی ڈرامے ہمارے بچوں کو سکھا رہے ہیں۔ ڈرامے، فلمیں، آرٹ کسی بھی معاشرے کو بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عام اذہان کی آبیاری کرتے ہیں۔ ایک ڈراما نگار، ایک فلم رائٹر، ایک شاعر، ایک ادیب اپنے کام کے ذریعے عام لوگوں پر اثرانداز ہوتا ہے اور معاشرہ بناتا ہے۔ آخر ہم کس کلچر کو فروغ دینا چاہتے ہیں؟

جدیدیت اپنانا اور اذہان کو بدلنے کا خواب دیکھنا غلط نہیں، لیکن جدیدیت کی آڑ میں
! جان بوجھ کر یا انجانے میں نئی نسل کے کردار تباہ کرنا کہاں کی جدیدیت ٹھہری
اس سے کون کافر انکاری ہے کہ آج ایک عام پاکستانی بھی اس تیز دنیا کے بارے میں اپنے غربت اور مسائل کے باوجود بہت کچھ جانتا ہے۔ الہٰذا یہ عذر پیش کرنا کہ ایک عام پاکستانی شہری کو تفریح دینے کے لیے یہ سب دکھانا بہت ضروری ہے جو دکھایا جا رہا ہے، سراسر غلط ہے۔ کسی اور ملک سے متاثر ہو کر ایسی زبان پیش کرنا جو ہمارے یہاں غیر معیاری اور غیر اخلاقی ہے، اپنی تہذیب و ثقافت سے دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کسی اور ملک کے کلچر کے مطابق کسی ڈرامے اور فلم کی زبان غلط نہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے یہاں بھی صحیح ہے۔

اپنے جائزے کے دوران میں نے ایک ڈرما دیکھا، جس میں ایک امیر بوڑھے آدمی سے ایک جوان لڑکا اس کی بیوی کے ساتھ شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ بوڑھا بہت اچھے موڈ میں سگار سلگاتے ہوئے مسکراتا ہے اور اپنی بیوی کی خوب صورتی کے قصیدے پڑھتے ہوئے کہتا ہے کہ ہاں وہ جوان ہے خوب صورت ہے تم یقیناً اس سے شادی کر سکتے، ہو میں بس کل تک اس طلاق دے دوں گا۔ کیا مجھے کوئی اس بات پر

قائل کر سکتا ہے کہ یہ ہمارا کلچر ہے! یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوّا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔

آخر ہمارے قلم کاروں، اداکاروں اور ہدایت کاروں میں کیا کمی ہے کہ ہم دوسرے ممالک کے نہ صرف ڈرامے امپورٹ کر رہے ہیں بل کہ ان کے اسکرپٹ کو کاپی کرکے یہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت کمال کر دیا ہے۔ تقریباً تمام ڈراموں کی کہانیاں یکساں ہیں، جس سے لگتا ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔

جہاں تک فلموں کا تعلق ہے تو ہم اچھے اداکاروں، ہدایت کاروں، کہانی نویسوں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی کھیپ رکھنے کے باوجود اس شعبے میں اپنے پڑوسی ملک ہی نہیں دیگر بہت سے ممالک سے بھی بہت پیچھے ہیں۔

پاکستانی سنیماؤں میں بھارتی فلمیں چلانے کی اجازت ملنے سے سنیما مالکان کو تو فائدہ ہوا ہے، لیکن ہماری بچی کھچی اور تباہ حال فلمی صنعت کو نقصان ہوا ہے۔ چند سالوں کے دوران کچھ اچھی فلمیں بنائی گئی ہیں، لیکن ان سب کا موضوع دہشت گردی ہے، اور انھیں خاص مقاصد کے لیے سرمایہ لگا کر بنایا گیا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اچھی فلم بنانے کے لیے سرمایہ نہیں، مگر یہ کہنا غلط ہے، آپ اچھی کہانی، اچھی اداکاری، اور ہدایت کاری کے ذریعے شان دار فلمیں بنا سکتے ہیں۔ پڑوسی ملک میں بہت کم سرمائے سے بننے والی مزاحیہ فلم ''بھیجا فرائی'' اس کی ایک مثال ہے۔ ہمارا مزاح لکھنے والوں کا معیار اور مزاحیہ اداکاری بھارت کے اس شعبے سے کہیں بلند ہے، تو ہم اچھی مزاحیہ فلمیں کم سرمائے سے کیوں نہیں بنا سکتے؟

فلم میں انٹرٹینمنٹ کے نام پر پاکستانی کلچر کو غلط رنگ دے کر پیش کرنا نہ صرف اپنے پیشہ سے ساتھ بددیانتی ہے بل کہ ملک کی نسلوں کے ساتھ بھی کھلواڑ ہے۔ ہمیں فلموں کے ذریعے اپنے خوب صورت کلچر کو فروغ دینا چاہیے، نہ کہ اس مسخ کرکے دکھایا جائے۔

اب بات کرتے ہیں موسیقی کی۔ ہمارے گلوکار آج بھی بھارت سے آگے ہیں، گلوکاری اور موسیقی میں ہم نے نہ صرف بھارت کا مقابلہ کیا ہے بل کہ اسے پیچھے چھوڑ دیا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گلوکاروں اور موسیقاروں کو اچھی فلموں کا پلیٹ فارم میسر نہیں ہے۔

جہاں تک اسٹیج ڈراموں کا تعلق ہے تو بہت کم معیاری اسٹیج ڈرامے ہو رہے ہیں،

زیادہ تر ڈرامے پھکڑپن اور بے ہودگی کا نمونہ ہوتے ہیں۔

انٹرٹیمنٹ انڈسٹری ملکوں کی معیشت کا بھی اہم ذریعہ ہوتی ہیں، اگر حکومت توجہ دے، اس شعبے میں سرمایہ کاری کرے، گائڈلائن دے تو بڑی تعداد میں اچھی فلمیں بن سکتی ہیں، ایسا کرنے سے ملک میں بڑی تعداد میں فلمیں بننے کا سلسلہ شروع ہوگا، ہم معیاری فلمیں بنائیں تو انھیں بھارت میں بہت بڑی مارکیٹ میسر آئے گی، اس کے علاوہ امریکا، یورپ اور یو اے ای میں رہائش پذیر پاکستانیوں اور بھارتیوں کی صورت میں بھی ہمیں مارکیٹ ملے گی۔

بڑی تعداد میں فلمیں بننے اور انھیں بڑی مارکیٹ میسر آنے کی صورت میں براہ راست اور بالواسطہ طور پر لاکھوں لوگوں کو روزگار میسر آئے گا۔ اچھی فلم کسی ملک کی ترجمان بھی ہوتی ہے، اگر ہم معیاری فلمیں بنائیں جنھیں دنیا میں دیکھا جائے تو اس سے پاکستان کا عالمی سطح پر سوفٹ امیج ڈیولپ ہوگا۔ ملک میں پھیلے تعصب نسل اور زبان کی وجہ سے ہونے والے تشدد کو کم کرنا ہو، اقلیتوں سے اچھے سلوک کا پیغام ہو، سیاسی شعور کو اجاگر کرنا ہو، نوجوانوں کے دلوں میں ملک کی محبت کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نئی نسل کو تعلیم کی طرف راغب کرنا ہو، انتہاپسندی کو کم کرنا ہو یا عام فرد کی ذہنی سطح کو بلند کرنا ہو، بلاشبہ کسی بھی ملک کی فلم، تھیٹر اور ڈراما انڈسٹری اس حوالے سے

اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ ہماری انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کی صورت حال ان لوگوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی دعوت دیتی ہے جو انٹرٹینمنٹ کے حوالے سے مثبت اور معیاری کام کر سکتے ہیں اور پاکستان کو بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

## کھلونے ہتھیاروں پر پابندی

انسان کی ابتدائی عمر اس کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہوتی ہے، شخصیت کے خدوخال اس عمر میں ہی ابھرتے ہیں، یہ شخصیت کی بنیاد ہوتی ہے، جس پر آگے چل کر عمارت بنتی ہوتی ہے۔ زندگی کے اس دور میں بچے کی ساری سرگرمیاں اہمیت رکھتی ہیں، جن میں کھیل بھی شامل ہیں اور کھلونے بھی۔

جب میں ان لوگوں کی تحریریں پڑھتی ہوں جو ماضی ہو چکے تو حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ کون سے پاکستانی تھے جن کی سوچ کی وسعت اب کم یاب ہے۔ بہت کم لوگ اپنے اردگرد ایسے نظر آتے ہیں جو کہ مسائل کو باریکی سے دیکھ کر ان کی جڑوں تک پہنچتے ہیں اور ساتھ ہی ان مسائل کو حل کرنے کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں۔ آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ نہ ہماری نسل میں، مجموعی طور پر، غوروفکر کرنے کی طرف مائل ہے اور نہ ہی آنے والی نسل سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ویسے تو ہمارا معاشرہ تعلیم یافتہ ہوتا جا رہا ہے اور شرح خواندگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ناخواندہ فرد بھی اپنے مسائل کو سمجھنے لگا ہے، لیکن ساتھ ہی تنگ نظری کا پہرا ہماری سوچ کو قید کیے دیتا ہے۔

آج ہم فکری اعتبار سے اس گہرائی سے محروم ہیں جو ہم سے پہلے کے لوگ اپنی سوچ میں رکھتے تھے۔ ہم بہت سطحی باتیں کرتے ہیں، سطحی علم رکھتے ہیں، جسے انگریزی میں جرنل نالج کہا جاتا ہے وہ ایک عام پاکستانی کے پاس نایاب ہے۔ میں نے اس صورت حال کی وجوہات پر بہت غور کیا اور سب سے اہم وجہ جو میرے سامنے آئی وہ ہمارے عام گھروں کا ماحول ہے۔ گھروں میں ہم اپنے بچوں کے سامنے ادب پر بات کرتے ہیں نہ شاعری پر نہ تاریخ کا تذکرہ ہوتا ہے اور نہ ہی بین الاقوامی سیاست کا۔ مجھے یاد ہے ہمارے گھر میں مذہب پر بہت کھلے لفظوں پر بحث ہوتی تھی۔ مختلف مذاہب پر بات کی جاتی تھی۔ مسلک کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ انڈو پاک ہسٹری ہو، موسیقی ہو یا کوئی اور اہم موضوع، گھر کی ایک جگہ پر کسی عام لائبریری میں میسر کتابوں جتنی کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ ہم بچے تھے لیکن پھر بھی چلتے پھرتے یہ باتیں ہماری سماعتوں سے ٹکراتی رہتیں۔ ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ غیر شعوری طور پر جاننے لگے تھے۔ کتابوں میں موجود لفظ مشکل لگتے تھے، لیکن جب اپنی والدہ یا تایا جان کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک کتاب دیکھتے تھے تو خود ہی کھیل کے دوران کتابوں کو ہاتھ میں لینے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

یہ وہ چیزیں تھیں جنھوں نے رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے ذہن سازی کی۔ اور

آج ہم بہت اس قابل ہوئے کہ مختلف ایشوز پر سوچ سکتے ہیں اور ان کے بارے میں آگاہی حاصل کر کے ان پر لکھ سکتے ہیں، بل کہ ان کے بارے میں سوچنے کا عمل دل دماغ کو یوں اپنی گرفت میں لیتا ہے کہ قلم خود بہ خود کاغذ پر رواں ہو جاتا ہے۔

اب صورت حال یکسر مختلف ہے۔ بزرگوں کی کتابیں گھر میں موجود ہوں تو انھیں گھر کا فالتو ترین سامان اور بوجھ تصور کیا جاتا ہے، باقاعدہ کتابیں خریدنے کی تو بات ہی نہ کیجیے۔ ان حالات میں ہماری آنے والی نسلوں کی ذہن سازی کیوں کر ہو سکے گی۔ چاہے وہ میرا اپنا گھر کیوں نہ ہو، ایک عام گھر کے لوگ اتنے زیادہ مصروف ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے سے مسائل پر تبادلہ خیال نہیں کرتے۔ ہم کبھی فارغ اوقات میں ایک ساتھ بیٹھتے ہیں تو نہ ادب پر گفتگو کرتے ہیں نہ تاریخ پر اور نہ ہی عالمی حالات و واقعات، ایسے میں زیر بحث آتے ہیں، کیوں کہ ہمارا علم بہت محدود ہے، جس کی وجہ سے ہماری فکر اور موضوعات بھی محدود ہو گئے ہیں، ایسے میں ہم اپنے بچو ں کو کیا دیں گے۔

ہزاروں لاکھوں روپے اسکول فیس پر صرف ہو جاتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک ٹیبلٹ، کمپیوٹر اور موبائل فون خرید کر اپنے بچوں کو دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اسکول بھیج کر اور ٹیوشن اور کوچنگ سینٹرز میں پڑھا کر ہم سمجھتے ہیں

کہ ہم نے اولاد کے حوالے سے اپنے فرائض پورے کر دیے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ اس طرح ہم اپنے بچوں کو اچھی زندگی، سہولتیں اور اچھے کیریر کا امکان تو دے رہے ہیں، لیکن انھیں باشعور اور اچھا انسان نہیں بنا رہے۔ تعیشات سے زندگی سہل ضرور ہو جاتی ہے، لیکن ذہن سازی نہیں ہو پاتی۔ ایسی بہت سی روایات ہیں جن کو ہم نے دقیانوسی جانتے ہوئے بہت پیچھے دھکیل دیا، لیکن درحقیقت یہی روایات ہماری پہچان ہیں اور ہمارے معاشرے کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ گھر میں ایک ساتھ کھانا کھانا، ایک دوسرے کے مسائل پر توجہ، مختلف موضوعات پر سب سے بات کرنا۔ اب یہ سب نہیں ہوتا۔ اگر تمام گھر والے ایک جگہ جمع ہو بھی جائیں تو ٹی وی آن کر دیا جاتا ہے اور سب ٹی وی کی رنگینیوں اور سنگینیوں میں کھو جاتے ہیں۔

چلیے ہم نے کتابوں سے ناتا توڑا، اپنی بہت سی اقدار کو مصروفیات کی نذر کر دیا اور یہ سب کرتے ہوئے اپنی آئندہ نسل کی شخصیت سازی کے فرض سے غافل ہو گئے، لیکن ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو منفی رجحانات دے رہے ہیں، جن میں سب سے خوف ناک تشدد کا رجحان ہے۔ ظاہر ہے ذرا بھی سلجھے ہوئے اور ہوش مند والدین اپنے بچے کو قتل و غارت گری کی تعلیم نہیں دیں گے، لیکن یہ کھلونا ہتھیار کیا ہیں؟ یہ کھلونے بچوں کے ہاتھ میں دے کر دراصل ان کے معصوم ذہنوں میں تشدد کے بیج بوئے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں سندھ اسمبلی نے ان

ہتھیاروں پر پابندی عاید کرنے کی قرارداد منظور کرکے بہت اچھا اقدام کیا ہے، دیر آید درست آید۔ حیرت ہے کہ جس صوبے میں تشدد سے ہزاروں لوگ مارے جاچکے ہیں اور کتنے ہی گھرانے اُجڑ چکے ہیں، اس کے منتخب ایوان میں بیٹھنے عوامی نمائندوں کو برسوں بعد یہ قرارداد لانے اور منظور کرنے کا خیال آیا، چلیے آ تو گیا۔ اب یہ صوبائی حکومت کی ذمے داری ہے کہ اس قرارداد پر عمل کرے اور ان کھلونوں کے بنانے اور فروخت پر مکمل پابندی عاید کرے۔

مگر بات صرف حکومت کے فیصلے اور عمل کی نہیں، ہم والدین کو بھی یہ سوچنا ہوگا کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں تشدد اپنی انتہا پر پہنچ کر خوف ناک صورت اختیار کرچکا ہے، جہاں مذہب اور مسلک کا فرق اور سیاسی اختلاف کا نتیجہ خون بہانے کی صورت میں نکلتا ہے، جس سماج میں بندوق لہرانا لوگوں کی شان ہے اور جہاں کلاشنکوف کلچر کتنی ہی جانوں کو نگل چکا ہے وہاں بچوں کو کھلونے ہتھیار دینا اس صورت حال کو برقرار رکھنے کے عمل کے سوا کیا ہے۔۔۔! اگر والدین بچوں کو ایسے کھلونے نہ دلائیں تو انھیں بنانے والے کارخانے خود بند ہوجائیں گے۔ بچوں کے ہاتھ میں وہ کھلونے ہونے چاہیں جو ان کی شخصیت اور کردار پر مثبت اثر ڈالیں۔ ہم اپنے بچوں کے ہاتھوں میں فکر کو وسعت دیتی کتابیں نہیں دے سکتے تو کم از کم اتنا تو کرسکتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں کا ہتھیاروں کا عادی نہ بنائیں۔

## ڈیمیان موران کی پٹیشن

ڈیمیان موران برطانیہ کا شہری ہے، مسیحی ہے یا لامذہب... ہم نہیں جانتے، مسلمان بہرحال نہیں، ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک دردمند، انصاف پسند اور جرات مند انسان ہے۔ اس کے دردِدل، انصاف پسندی اور دلیری کی عکاس وہ پٹیشن ہے جو اس نے برطانیہ کی سرکاری ویب سائٹ پر لاؤنچ کی ہے۔ اس درخواست میں موران نے اپنی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آئندہ ماہ برطانیہ کا دورہ کرنے والے اسرائیل کے وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کو ان 2 ہزار فلسطینیوں کے قتل میں ملوث ہونے پر گرفتار کیا جائے، جنھیں اسرائیلی فوج نے 2014 میں غزہ پر اکیاون روزہ یلغار کے دوران قتل کیا تھا۔ اس آن لائن پٹیشن پر اب تک 80 ہزار سے زیادہ برطانوی شہری دستخط کرچکے ہیں۔

برطانیہ کے قوانین کے مطابق ملک کا کوئی بھی شہری سرکاری ویب سائٹ پر کسی معاملے پر پٹیشن دائر کرسکتا ہے، جس میں وہ حکومت اور پارلیمنٹ سے ایکشن لینے کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اس پٹیشن پر دستخطوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جاتی ہے (یقیناً اب تک یہ تعداد اس ہدف کو پاچکی ہوگی) تو اس معاملے کو پارلیمنٹ میں بحث کے لیے لایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ میری اور آپ کی طرح خود

موران کو بھی امید نہیں کہ اس درخواست پر کوئی ایکشن لیا جائے گا اور برطانوی حکومت نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ برطانیہ میں غیر ملکی حکومتوں کے سربراہوں قانون سے تحفظ حاصل ہے اور انھیں گرفتار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس معاملے کا خوش کُن اور امید افزا پہلو اس پٹیشن پر ہونے والے 80 ہزار سے زیادہ دستخط ہیں۔ واضح رہے کہ اس پٹیشن پر صرف برطانیہ کے شہری دستخط کر سکتے ہیں۔

ڈیمیان موران اور اس کی دائر کردہ درخواست کی دستخطوں کے ذریعے حمایت کرنے والے لوگ ایک ایسے ملک کے شہری ہیں جس کے حکم راں صہیونیت کا ساتھ دیتے ہوئے اسرائیل کا قیام عمل میں لائے تھے اور نسلی تعصب، فریب اور دہشت کی بنیاد پر بنے اور اپنا وجود برقرار رکھنے والی اس ریاست کی کُھل کر سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ برطانوی سلطنت کا سورج غروب ہونے اور امریکا کے عالمی طاقت بن کر ابھرنے کے بعد اگرچہ امریکا اسرائیل کو برطانیہ سے گود لے چکا ہے، لیکن اب بھی لندن کا حکم راں طبقہ صہیونی ریاست کی ہر ممکن مدد کرتا ہے۔

برطانیہ کے انسان دوست اور انصاف پسند افراد کی جانب سے ایسی کوشش پہلی بار نہیں کی جارہی، فلسطینیوں کے حامی برطانوی وکلاء نے اسرائیل کے وزیر انصاف

کے دورہ برطانیہ کے موقع پر بھی ایسی ہی کاوش کی تھی، جسے ناکامی کا Tzipi Livn سامنا کرنا پڑا تھا۔ مظلوم فلسطینیوں کا معاملہ ہو یا افغانستان اور عراق کے خلاف امریکی جارحیت، ہمیں جہاں اس سب میں مغربی ممالک کے حکم رانوں، ان کی افواج، سیاست دانوں اور میڈیا کا سیاہ کردار نظر آتا ہے، وہیں ان ہی دیسوں میں بسنے والے لاکھوں افراد کے روشن چہرے بھی دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے ان مظالم اور جارحیتوں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی بل کہ عملی طور پر جو ممکن تھا کیا۔ عراق اور افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف جتنے بڑے مظاہرے مغربی ممالک کے شہروں کے ہوئے اس کے آدھے بھی مسلم دنیا میں نہیں ہوسکے۔

یہ حقائق مسلم دنیا، خاص طور پر پاکستان میں مغرب کے حوالے سے موجود سوچ کی نفی کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں خصوصاً مذہبی طبقے میں مغرب کو خاص نظر سے دیکھا جاتا ہے اور یہ غلط فہمی عام ہے کہ مغرب کا ہر خاص وعام مسلمانوں کا دشمن ہے، یہ حقیقت ہے کہ امریکا اور یورپ کے طاقتور لابیز، جو اقتدار کے معاملات چلاتی ہیں، مسلم دشمنی کی روش پر گام زن ہیں، لیکن جہاں تک ان ممالک کے عام لوگوں کا تعلق ہے، تو وہاں انسان دوست اور امن دوست افراد کی بہت بڑی تعداد آباد اور اس رجحان کے ہمارے لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فعال ہے، جس کا اندازہ برطانیہ میں سامنے آنے والی اس آن لائن پٹیشن اور اس

پر ہونے والی دستخطوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سرگرمیاں اس کے باوجود ہوئی ہیں کہ مغربی میڈیا بڑی مہارت کے ساتھ حقائق چھپاتا اور عوام کو دھوکا دیتا ہے۔

فلسطینیوں کا قتل عام ہو، عراق اور افغانستان پر حملے ہوں یا گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کا معاملہ، مغربی میڈیا کا کردار ہمیشہ منافقانہ اور حقائق کی پردہ پوشی پر مبنی ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ غیر جانب داری کا سوانگ رچاتے ہوئے مظلوم کے بجائے ظالم کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود مغرب کے وہ لوگ جو سچائی کی تلاش کرکے اس کی حمایت میں نکل کھڑے ہوتے ہیں قابل ستائش ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مغربی ممالک کے عوام کو فلسطین پر اسرائیلی مظالم، کشمیر میں بھارت کے ظلم وجبر اور امریکا کے مسلم ممالک افغانستان اور عراق پر حملوں اور ایسے ہی دوسرے اقدامات کے خلاف رائے عامہ ہم وار کرنے کے لیے ہم نے کیا کیا۔

برطانیہ وہ ملک ہے جس نے اسرائیل قائم کیا اور پھر اس کی سرپرستی کرتا رہا ہے، ایسے ملک کے ہزاروں شہریوں کا وہاں ہماری طرف سے کسی کوشش کے بغیر اس طرح کا اقدام کرنا خوش آئند اور قابل داد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم امریکا اور یورپ کے عوام کے سامنے حقائق لائیں تو وہاں مسلمانوں کے موقف کے

حق میں رائے عامہ ہموار ہو سکتی ہے، اور عوام کا دباؤ حکومتوں کو مکمل طور پر نہیں تو خاصی حد تک مسلم اور اسلام مخالف پالیسیاں تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، کیوں کہ مغرب میں بہرحال رائے عامہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح کی تبدیلی مسلم دنیا میں سرگرم انتہاپسندوں کے دہشت گردی کے جواز اور اس نیریٹیو کو بھی چیلینج کرے گی کہ ہم ہتھیاروں اور تشدد کے ذریعے ہی اپنا موقف منوا سکتے ہیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا امریکا اور یورپ کے عوام کو سچ بتانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ یہ کام میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے، مگر عالمی سطح پر مسلمان اس شعبے میں بہت کم زور ہیں، بل کہ مسلم ممالک کے لوگ دوسروں کی بابت خبریں بھی مغربی میڈیا کے ذریعے جان پاتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس شعبے پر پوری توجہ دینی ہوگی، ہمیں امریکا اور یورپ میں انگریزی اور مقامی زبانوں میں چینل اور اخبارات لانے ہوں گے، یہ عمل کچھ طویل ضرور ہے لیکن اس کے اثرات دوررس اور دیرپا ہوں گے۔ اس حوالے سے مسلم ممالک کی حکومتوں سے کوئی توقع رکھنا بے کار ہے، لیکن ہم میں سے وہ لوگ جو کشمیر سے فلسطین تک جاری مظالم پر دل جلاتے ہیں، جو اس معاملے میں مغربی دنیا اور عالمی طاقتوں کے رویے کا شکوہ کرتے ہیں، وہ سوشل میڈیا کا ذریعے اپنا موقف مغربی دنیا کے عام آدمی تک پہنچا سکتے ہیں۔ صرف پاکستان کے دس ملین سے

زیادہ شہری فیس بک سے وابستہ ہیں، اگر دیگر مسلم ممالک کے سوشل میڈیا پر موجود افراد کا شمار کیا جائے تو یقیناً یہ تعداد کروڑوں تک جا پہنچے گی، ان میں سے کیا چند لاکھ افراد بھی یہ کوشش نہیں کر سکتے۔ سوال یہ نہیں کہ حالات بدلنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، یہ دلیل، منطق اور حقائق ایسے ہتھیار ہیں جنھیں استعمال کرکے آپ حالات میں بڑی حد تک تبدیلی لا سکتے ہیں۔ یہ کوشش صبر آزما اور وقت طلب ضرور ہے، لیکن اس کے اثرات مسلم ممالک اور دنیا کے لیے خیر کا باعث ہوں گے۔ تو آیئے خیر اور سلامتی کی تلاش میں کوششوں کا آغاز کریں۔

## ایک چٹھی نریندر مودی کے نام

نریندر مودی صاحب!

غربت کے دن دیکھنے والے سے امید کی جاتی ہے کہ وہ افلاس کی ہول ناک زندگی کے مصائب سمجھتا ہوگا اور اگر اسے کوئی اہم منصب حاصل ہوتا ہے تو وہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ سے بھی آپ کے ہم وطنوں کو یہی آس تھی۔ ہم پاکستانیوں کو تو آپ سے بھلے کی کوئی امید نہیں تھی۔ بہ طور وزیر اعلیٰ گجرات جس طرح آپ نے مسلمانوں کا خون بہایا اس سے ہر ایک کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلم دشمنی آپ کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہے اور وزیر اعظم کی گدی سنبھالنے کے بعد آپ بھارت کے مسلمانوں اور پاکستان سے کس قسم کا سلوک کرنے کے خواہش مند ہوں گے۔ لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ نفرت اور تعصب عقل پر اس طرح حاوی ہو جائیں گے کہ آپ اپنے ہم مذہب بھارتیوں کے لیے بھی اچھے حکم راں ثابت نہیں ہوں گے۔

بھارتی پردھان منتری جی! ہم سمجھتے تھے کہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے زندگی کی شروعات کرنے کے باعث آپ نے بھارتی عوام کی اکثریت کے روز و شب کو قریب سے دیکھا ہے اور سے دکھ درد کے آشنا ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ ساری زندگی آپ کی آنکھیں دشمنی کے تیور لیے اپنے ہم وطن مسلمانوں پر گڑی رہیں یا پاکستان کو

نفرت سے دیکھتی رہیں، چناں چہ آپ عام بھارتی جنتا کے مسائل پر نظر ڈال ہی نہ سکے۔ تو ہم نے سوچا کہ بھارتی وزیراعظم کو ان کے دیش کا اصل چہرہ دکھا دیں اور عرض کریں کہ جناب! پاکستان کو ڈرانے، دھمکانے، جھکانے اور دبانے کی کوششیں چھوڑیے، یہ لاحاصل ثابت ہوں گی، جو وقت آپ ان کوششوں میں لگاتے ہیں وہ اپنے ملک کے مسائل حل کرنے پر صرف کیجیے، اگر آپ کو دیگر ممالک کے دوروں اور ان دوروں میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے سے فرصت مل چکی ہو تو کبھی اپنے مہان دیش کی یاترا بھی کرلیجیے اور دیکھیے کہ آپ کے ''شائننگ انڈیا'' میں کیسا اندھیر مچا ہے۔ چلیے ہم آپ کو آپ کے بھارت کی تصویر دکھاتے ہیں۔

مودی جی! آپ کو پتا ہے آپ کے دیش میں کسانوں کی خودکشی کے واقعات سال بہ سال بڑھتے جارہے ہیں۔ بھارتی ادارے نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے جاری کردہ اعدادوشمار کے مطابق گذشتہ سال 5 ہزار 650 کسانوں نے اپنے حالات اور مسائل سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔ گویا اوسطاً بھارت کے ہر 100 دیہات میں ایک کسان نے خود کو موت کے حوالے کردیا۔ اور جناب! ان واقعات میں ریاست مہاراشٹر سرفہرست ہے، جہاں آپ کی صنعت وتجارت کا مرکز اور دنیا کو بھارت کا نہایت رنگین اور چمکتا دمکتا چہرہ دکھانے والا بولی وڈ واقع ہیں۔ خودکشی کے ان واقعات کے پیچھے اہم ترین وجہ بینکوں سے قرضے لے کر دیوالیہ ہوجانا ہے۔ یہ تو تذکرہ تھا پچھلے برس کا، اس سال جنوری سے 31 تک صرف ریاست کرناٹک میں

کسان موت کو گلے لگا چکے ہیں۔400

یہ خودکشیاں اس خوف ناک افلاس کا نتیجہ ہیں جس نے بھارت کو عفریت کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ غربت لاکھوں افراد کو ممبئی اور بھارت کے دیگر بڑے شہروں کی فٹ پاتھوں پر سلاتی ہے اور ان کی رگوں سے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ لیتی ہے۔

اقوام متحدہ کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق ایک ارب 25 کروڑ کی آبادی والے بھارت میں 30 کروڑ سے زائد افراد کی زندگی افلاس کی انتہا پر ہے۔ یہ لوگ تعلیم، صحت، پانی، سیوریج سسٹم اور بجلی جیسی بنیادی انسانی ضروریات سے محروم ہیں۔ اس غربت ہی کے باعث بھارت میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے اور ہر سال ایک کروڑ 40 لاکھ بچے اپنی پانچویں سال گرہ منانے سے قبل ہی موت کی کالی گھاٹیوں میں اتر جاتے ہیں۔ شدید ترین غربت کا شکار بھارتیوں میں سے ساٹھ فی صد افراد گھر سے محروم ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے زندگی بِتا رہے ہیں۔

بھارت میں معاشی، معاشرتی اور ذاتوں سے متعلق کئے گئے تازہ سروے سے ثابت ہوا ہے کہ بھارتیوں کی اکثریت اس وقت شدید غربت کی شکار ہے۔ نریندر مودی

صاحب! اُس دیش کے بارے میں مزید کچھ حقائق جان لیجیے جس کے آپ حکم راں ہیں، لیکن پاکستان کے خلاف فضا ہموار کرنے اور پاک چائنا اقتصادی راہداری کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کی خاطر کیے جانے والے غیر ملکی دوروں کی وجہ سے جس ملک کے طول وعرض میں آپ کا آنا جانا کم کم ہی ہوتا ہے۔

ایک سروے کے مطابق بھارت کی 73 فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے جس میں سے صرف 5 فی صد ٹیکس دینے کی سکت رکھتی ہے۔ اس آبادی میں سے محض ڈھائی فی صد افراد چار پہیوں کی سواری رکھتے ہیں اور 10 فی صد تنخواہ دار ملازم ہیں۔ بھارت کے دہی علاقوں میں صرف ساڑھے تین فی صد افراد گریجویٹ ہے اور پینتیس فی صد آبادی لکھنے پڑھنے سے نابلد ہے۔ مجموعی طور پر بھارت کی 73 فی صد آمدنی پانچ ہزار بھارتی روپے سے بھی کم ہے۔

اب آیئے دیگر مسائل کی طرف۔ عورتوں سے زیادتی.... مودی جی! جس دیس میں سیتا کے احترام میں سر جھکتے ہیں جہاں دیویوں کی پوجا کی جاتی ہے، وہاں عورتیں غیر محفوظ ہیں۔ چھوٹے شہروں اور دیہات کا تو ذکر ہی چھوڑیے۔ دارالحکومت دہلی میں گذشتہ کچھ عرصے کے دوران خواتین سے زیادتی کے واقعات میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ بھارتی راج دہانی کو ''ریپ کیپیٹل'' کہا جانے لگا ہے۔

گذشتہ برس پندرہ دسمبر سے پہلے کے بارہ مہینوں کے دوران دہلی میں خواتین کے ساتھ جنسی زیادتیوں کے مجموعی طور پر 2069 واقعات ریکارڈ کیے گئے۔ اس عرصے سے پہلے کے ایک سال کے دوران عورتوں اور لڑکیوں کے ریپ کے واقعات کی یہی تعداد 1571 رہی تھی۔ دہلی کے پولیس کمشنر کا کہنا ہے کہ ایک سال کے دوران شہر میں ریپ کے واقعات کی شرح میں 6.31 فی صد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو سال قبل بھارتی دارالحکومت میں درندوں نے ایک چلتی بس میں میڈیکل کی ایک جواں سال طالبہ کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ بعدازاں یہ لڑکی جان سے گزر گئی تھی۔ دہلی ہی نہیں، ملک کے دیگر حصوں میں بھی بھارتی عورت غیر محفوظ ہے اور عمر کا کوئی بھی حصہ بھارتی نار کو محفوظ رکھنے سے معذور ہے۔ اسی سال مشرقی بھارت میں چھ درندوں نے ایک بوڑھی عیسائی نن کو زیادتی کا نشانہ بنایا۔

مودی جی ! یاد رہے کہ دہلی وہی شہر ہے جہاں بیٹھ کر آپ اور آپ کی کابینہ کے ارکان پاکستان پر گرجتے برستے رہتے ہیں، پاکستان پر دہشت گردی کے الزامات لگاتے رہتے ہیں، لیکن اپنی ناک کے نیچے ہونے والی اس بھیانک دہشت گردی کو روکنے سے قاصر ہیں۔

اور جناب وزیراعظم ! اپنی فوج کے بل بوتے پر پاکستان کو آنکھیں دکھاتے ہوئے

آپ یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ یہ فوج کشمیر میں پاکستان کے پرچم لہرانے سے نہیں روک سکی ہے اور نکسل باڑی باغی آپ کی سینا کے لیے عذاب بنے ہوئے ہیں، اور اب تو مشرقی پنجاب میں خالصتان کی تحریک پھر جنم لے چکی ہے۔

تو جناب! قدرت نے آپ کو جو موقع دیا ہے اسے بھارت واسیوں کے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کیجیے، اس موقع کو پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں ضائع مت کیجیے۔ آپ کی نظریں سرحد کے اُس طرف ہونی چاہیں جہاں آپ کا ملک آباد ہے، سرحد کے اِس طرف نہیں۔

## خواب کی قیمت

متوسط، نچلے متوسط اور خاص طور پر ملازمت پیشہ طبقے کے افراد کے خواب ان کے بچوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس طبقے کے خاندان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ان کا مستقبل سنور جائے۔ ہمارے ملک کے سرکاری اسکول والدین کی اس آرزو کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں، چناں چہ نجی اسکولوں کا در کھٹکھٹایا جاتا ہے، اور پھر آپ کی آمدنی کا بڑا حصہ ان نجی اسکولوں کی تجوریوں میں جاتا رہتا ہے۔

اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دینے کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے جسم کا لہو دان کرنا پڑتا ہے اور یوں فیس دینے کی آخری تاریخ یعنی ہر ماہ کی دسویں خون خشک کر جاتی ہے۔ جو نہ دے سکے تو پندرہ کو جرمانے کے بعد، 20 تاریخ کو ڈبل جرمانے کے ساتھ فیس جمع کروانا ضروری ہوتا ہے ورنہ 21 کو تو بچے کا نام ہی اسکول سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ کون ہوگا جو اپنے بچے کو اسکول میں رسوائی کا سامنا کرنے دے لہذا کہیں سے بھی رقم کا انتظام کرکے فیس ادا کی جاتی ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بڑا انگریزی میڈیم اسکول ہو یا چھوٹا، چونچلے اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ گوروں کے تمام تہوار منانا تو ہم پر فرض ٹھہرا۔ مذہبی "فنکشنز" میں بھی پیسے کو پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ دین کی اصل روح تو کہیں فنا ہو چکی ہے جب کہ اخراجات کی مد میں آنے والا تمام خرچہ والدین کی جیب سے پورا کیا جاتا ہے۔ 5 سو، ہزار، منگوانا تو عام سی بات ہے، پھر ارتھ ڈے سے لے کر بلو، گرین، بلو، ریڈ ڈے... ہر دن کی مناسبت سے لباس کی تیاری الگ۔ ان سب پر رقم خرچ کرنے کے بعد بھی سکون کا سانس لینا کسے نصیب ہے۔ کبھی بچے کو خرگوش بنانے کے لیے کپڑے ضروری ہیں، تو کبھی شیر اور بھالو کے مختلف اقسام کے فینسی ڈریس خریدنا۔ والدین کی مجبوری ٹھہری، جیب چاہے چیخ اٹھے لیکن اپنے بچے کو اسٹیٹس مینٹین رکھنے کی دوڑ میں شامل کرنا ضروری ہے۔ سو اس قسم کے فینسی ڈریس جن کی قیمت 500 روپے سے تین ہزار تک ہوتی ہے اور جنھیں بچہ فقط 15 سے 20 منٹ پہنتا ہے، خریدنا ہی پڑتے ہیں۔

یہ الگ بحث ہے کہ اسکولوں کے ساتھ اس طرح کے فینسی ڈریسز بنانے والوں کے باقاعدہ معاہدے ہوتے ہیں اور ہر لباس پر اسکول انتظامیہ اپنا کمیشن رکھتی ہے۔ جو اسکول کمیشن نہیں لیتے وہ پروگرام تو بہرحال ضرور منعقد کرتے ہیں تا

کہ اپنے اسکول کے طالب علموں کو جانوروں سے مشابہت رکھنے والی پرفارمینس دکھانے پر ان کی تصاویر بنائیں اور نئے آنے والے گاہکوں... میرا مطلب ہے والدین کو ان تصاویر کی مدد سے پھانسا جاسکے۔

اب لیجیے کورس کی کتابوں کو، جو ادارہ زیادہ مراعات اور کمیشن کی بات کرے جناب! اسی کی کتاب خریدنا ضروری ہے۔ میں آج تک یہ بات نہ سمجھ سکی کہ اردو اور انگریزی میڈیم اسکولز میں کتابوں کا معیار مختلف ہو سکتا ہے لیکن ہر انگریزی اسکول دوسرے سے مختلف کورس کیوں پڑھا رہا ہے؟ پیسے بٹورنے کا نیا حربہ یہ اپنایا گیا ہے کہ وہ اسکول جن کی لاتعداد برانچز ایک ہی شہر میں قائم ہیں، ان اسکولز میں سال شروع ہوتے ہی فیس چالان کے ساتھ ایک اور چالان تھما دیا جاتا ہے اور یہ چالان کتابوں کی خرید کی مد میں جمع کروائی جانے والی رقم کا ہوتا ہے۔

زیادہ پرانی بات نہیں کہ کسی کو یاد نہ ہو، کتابوں کی ایک فہرست اسکول کی طرف سے مہیا کی جاتی تھی اور وہ والدین جو نئی کتابیں خریدنے سے قاصر تھے وہ پرانی کتابیں اور نئی کاپیاں دے کر بچے کی پڑھائی کے خواب کو آگے بڑھاتے تھے۔ اب انھیں کتابوں کی فہرست ہی نہیں دی جاتی جس کی مدد سے وہ جان سکیں کہ کون سی کتاب خریدنی ہے اور کون سی نہیں؟ وہ اس پر مجبور ہیں کہ اسکول کے

بک اسٹور یا بتائے گئے مخصوص بک اسٹور ہی سے کتابیں خریدی جائیں۔ یہ بھی اچھی رہی کہ کتابوں کا نام ہی نہ بتایا جائے کیوں کہ اس صورت میں تو والدین پرانی کتابیں خرید لیں گے اور اس طرح نہ ہی اسکول انتظامیہ کی روزی میں برکت ہوگی اور نہ والدین پر مہنگائی کا عذاب نازل ہوگا۔

کتابوں کا معیار اتنا اعلیٰ ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ چھوٹا سا بچہ کس طرح اس فلاسفی کو سمجھ سکے گا۔ اب مسئلہ سمجھنے نہ سمجھنے کا تو رہا ہی نہیں۔ سمجھانے کی ذمے داری تو ماں باپ کی ہے لہذا ٹیوشن کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ٹیوشن کی فیس کی ادائیگی ایک چھوٹے اژدہے کی مانند گلے میں لٹکی ہوتی ہے اور اسکول کی فیس کا بڑا اژدہا دو دو ماہ کی اکٹھی فیسوں کے ساتھ زبان لٹکائے ڈرا رہا ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی سالانہ فیس دینے کا مہینہ یعنی اپریل شروع ہوتا ہے، یہ اژدہا پورا منہ کھول کر والدین کو نگلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسکول وین کی فیس ادا کرنا تو واجب قرار پایا۔ اب ہمارا وین ڈرائیور جون جولائی میں اپنا گھر کیسے چلائے گا سو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا اس کے لیے بھی لازم ٹھہرا۔ پہیہ چلے نہ چلے دو ماہ کی تعطیلات میں یہ فیس ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک اور رواج چل نکلا ہے، اسکول کی امتحان کی کاپیاں فائلیں رنگ اور رنگ برنگی شیٹیں جو کہ اسٹیشنری کے زمرے میں آتی ہیں، وہ بھی اسکول سے سال شروع ہوتے ہی خریدنا ہوتی ہیں۔ اب اس سامان سے

بچہ فائدہ اٹھاتا ہے یا اسکول کا مالک، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

اب تک ایک معیاری انگریزی میڈیم اسکول کی فیس کم سے کم ڈھائی ہزار روپے تھی، جو حالیہ اضافے کے بعد مزید بڑھ گئی ہے، جب کہ اس سے کم فیس والے اداروں کو معیار کی فہرست میں ہم والدین ہی نہیں لاتے اور زیادہ سے زیادہ فیس 17 ہزار تھی، جس میں نمایاں اضافہ ہوچکا ہے۔ اتنی فیس لینے کے باوجود ان ٹیچرز کو بھرتی کیا جاتا ہے جو کم سے کم تنخواہ میں کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اپنے اپنے شعبے میں مہارت رکھنے والے اساتذہ تو جیسے ناپید ہو چکے ہیں۔ آج سب سے آسان دھندا اسکول کھول کر کمائی کرنے کا بن گیا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ایسے مخلص لوگ بھی موجود ہیں جو اس شعبے سے ایمان داری برت رہے ہیں، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

انگریزی میڈیم اسکولز کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں پرائیویٹ اسکولوں کی تنظیموں سے سوال کرتی ہوں کہ آخر کیوں ایسے اصول و ضابطے مقرر نہیں کیے گئے جن کی رو سے اسکول انتظامیہ جواب دہ ہوں کہ وہ فیس کس پیمانے پر مقرر کرتے ہیں۔ کتابیں کیوں اسکول سے خریدنا ضروری ہیں۔ آئے دن ہونے والے فنکشنز پر اٹھنے والا پیسہ کس کی جیب سے جاتا ہے۔ چلیں آپ کچھ نہ کریں اتنا تو بتا دیجیے کہ انگریزی اسکولز کو آپ جتنی کیٹگریز میں تقسیم

کرتے ہیں، آخر ان کیٹیگریز کی فیسیں کیوں مختلف ہوتی ہیں؟

اس اندھیر نگری میں اسکول کا کاروبار کرنے والوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ تو اب کوئی بھی میٹرک فیل بے روزگار اپنے گھر کے احاطے میں اسکول کھول سکتا ہے، کیوں کہ یہاں قابلیت کون پوچھتا ہے۔ ہر بچہ اس بھٹی میں قابلیت کی آگ میں نہیں جلتا، بلکہ اسکول مالکان کے ہاتھوں میں ایک نئے کرارے نوٹ کی حرارت بنا رہتا ہے۔

## رویے بدلنا ہوں گے

یہ جملہ کتنی ہی بار سننے اور پڑھنے کو ملا کہ ملک بھر میں عیدالاضحی مذہبی جوش و جذبے سے منائی گئی۔ تہوار آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن ہر دفعہ ان گنت سوالات ہمارے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ سوچنے والے ذہن سوچتے ہیں اور دیکھنے والی آنکھ دیکھتی ہے۔ محسوس کرنے والے کرتے ہیں، جو نہیں سوچنا سمجھنا چاہتے وہ بس یوں ہی آگے بڑھ جاتے ہیں اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر آگے بڑھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ غلط رویوں پر آنکھ بند کرکے گزر جانا ہو سکتا ہے ان کے لیے تو کوئی خاص مسئلہ بن کر سامنے نہ آئے، لیکن ان کی آنے والی نسل کو وہ غلط رویے کسی عذاب کی طرح بھگتنے پڑیں گے۔

عیدالاضحی کے موقع پر جگہ جگہ بکھرا اور جما ہوا خون، آلائشوں کی گندگی، آس پاس سڑکوں سے اٹھنے والا تعفن آخر کس مذہبی جوش و جذبے کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے؟ عیدیں اور دیگر مذہبی تہوار تو روحوں کو پاک کرتے ہیں، انسان اندر سے خود کو صاف ستھرا محسوس کرتا ہے۔ یہ ہم کس طرح تہواروں کو منا رہے ہیں کہ گندگی کے ڈھیر جگہ جگہ ہمیں منہ چڑا رہے ہیں۔ روح کی پاکیزگی حاصل کرنے

کے لیے سارے جہاں کو گندا کرنا کون سا مذہب سکھاتا ہے۔

میرے آقا حضرت محمد ﷺ نے صفائی کو نصف ایمان فرمایا ہے، لیکن ہم سنت ابراہیمی کو پورا کرتے ہوئے اس بات کا احساس بھی نہیں کرتے کہ ہمارے یہ بہ ظاہر چھوٹے چھوٹے فعل خدا کے سامنے کتنے ناپسندیدہ ہوں گے۔

ہماری سڑکیں عیدالاالضحی پر عجیب منظر پیش کررہی ہوتی ہیں۔ عید قرباں پر سب کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شہر میں جتنی چاہے گندگی پھیلائیں، کھلی اجازت ہے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ سڑک کے بیچوں بیچ جانوروں کی آلائشیں ڈال دینا کہاں کی تہذیب ہے؟ گندگی سے دوسرے لوگوں کو پریشان کرنا کس مذہب کی تعلیم ہے؟

ایک اندازے کے مطابق اس سال پورے ملک میں تقریباً 63 ہزار گائے اور 16 لاکھ بکروں کی قربانی کی گئی اور اکثریت نے مخصوص مذبح خانوں کا رخ کرنے کے بجائے سڑکیں، پارک، گلی محلے استعمال کیے، جس کے باعث جگہ جگہ قربانی کے جانوروں کی آلائشیں اور گندگی بکھری نظر آتی ہے۔ اس گندگی کے نتائج فوری طور پر برآمد نہیں ہوتے، لیکن تیزی سے جراثیم بڑھنا شروع ہوجاتے ہیں اور اس کا اندازہ آپ کو تب ہوتا ہے جب آپ کے اطراف موجود لوگ کسی وبائی بیماری کا

شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم ایک لاکھ کا جانور تو خرید سکتے ہیں لیکن اس کی صفائی کرنے کے لیے پانچ سو روپے خرچ کرنا ہمیں مشکل لگتا ہے اور تمام تر ذمے داری ہم حکومت پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

یہ بیان کبھی عیدِ قرباں کے بعد اور کبھی عیدِ قرباں سے پہلے حکومت کی جانب سے ضرور سننے کو ملتا ہے کہ حکومت کی خصوصی ہدایت پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر صفائی کی صورت حال کو یقینی بنانے، آلائشوں کو اٹھانے، امن و امان کی صورت حال بہتر بنانے اور شہریوں کو بھرپور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے تمام تر انتظامات کو حتمی شکل دے دی گئی ہے، لیکن اکثر مقامات پر اس ہدایت پر عمل ہوتا نظر نہیں آ سکتا۔

شہری سہولتوں کی فراہمی کے ذمے دار تمام ادارے ایک اپنے طور پر عوام کو احساس دلاتے ہیں کہ ان کے ادارے مربوط طریقے سے انھیں تمام تر سہولیات پہنچانے کے لیے کام کر رہے ہیں، اب چاہے لوڈشیڈنگ کا مسئلہ ہو یا پانی کا تمام مسائل حل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ دعوے کس حد تک درست ہوتے ہیں، یہ تو وقت ہی بتاتا ہے، لیکن بطور شہری ہم عوام اپنی ذمے

داری کس حد تک پوری کرتے ہیں۔ یہ سوال کئی سالوں سے اپنے جواب کی تلاش میں ہے۔ ہم چاہتے ہی نہیں کہ اس سوال پر بحث کریں کیوں کہ ہمارے خیال میں تمام تر ذمے داریاں حکومتی اداروں کی ہیں، سو یہ ان کا مسئلہ ہے کہ وہ شہر کی صفائی کا کیسے خیال رکھتے ہیں۔ یہ سوچ انتہائی غلط ہے۔

ادارے اپنے اپنے طور پر شہر میں سے آلائشیں اٹھانے اور صفائی کے کاموں کی ذمے دار ہیں، لیکن اگر حکومت کی طرف سے بھیجے گئے افراد اپنا کام کرکے چلے بھی جائیں تب بھی ہم عوام بعض نہیں آتے، جس جگہ سے صفائی کرنے والے عملے کی گاڑی گزری ہو وہیں پر مزید گندگی پھینک دیتے ہیں۔ قومیں یوں مہذب نہیں بنتیں بل کہ مزید غیر مہذب اور تنزلی کا شکار ہو جاتی ہیں اور ایسے افراد میں بدل جاتی ہیں جو اپنے آپ سے اور اپنی آنے والی نسل سے ہی مخلص نہ ہوں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حکومت نے کوئی کام نہیں کیا میں ان کا ساتھ نہیں دوں گی، کیوں کہ گذشتہ سال بقر عید پر کراچی میں فیومیگیشن کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا تھا۔ کیا ہم خود اہل محلّہ مل کر ایسے کام نہیں کروا سکتے جن سے ہم اپنے مہذب قوم ہونے کا ثبوت دے سکیں اور ہماری آنے والی نسلیں بھی اس عمل کو دہرائیں اور ہمارے تہوار ہمارے لیے مزید خوشی کا باعث بنیں!

اپنے گھروں کو صاف رکھتے ہوئے گندگی گلیوں اور سڑکوں پر پھیلانے کا عمل ہماری صفائی پسندی ہی پر سوالیہ نشان نہیں لگاتا بل کہ یہ رویہ ہمیں خود غرض بھی ثابت کرتا ہے۔ درحقیقت ایسے رویے ہی ہیں جنھیں تبدیل کرکے ہمارا معاشرہ وسیع پیمانے پر مثبت تبدیلیوں سے آشنا ہو سکتا ہے۔

صحت و صفائی کا شعور بیدار کیے بغیر ہم ترقی کی منزل پانا تو دور کی بات مہذب کہلانے کے مستحق بھی نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ صفائی سے غفلت اور صحت سے بے نیازی کی مثال نہیں کہ ہم صفائی پسندی کے دعوے دار بنتے ہوئے بڑی کراہیت کے ساتھ جو آلائشیں سڑکوں کی زینت بناتے ہیں، وہی اپنی تمام تر غلاظت اور مضرِ صحت اثرات کے ساتھ مختلف مصنوعات کی صورت میں ہمارے گھروں میں واپس آجاتی ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم جانور خریدنے سے قربانی تک کے تمام مراحل کی طرح قربانی کے بعد اپنے گلی محلوں اور سڑکوں کی صفائی کو بھی اسی مبارک عمل کا حصہ سمجھتے ہوئے کسی ادارے کے عملے کا انتظار کیے بغیر آلائشیں ٹھکانے لگانے کا انتظام از خود کریں، تاکہ غلاظت گھوم پھر کر دوبارہ ہمارے گھروں کی "زینت" نہ بن سکے۔

## ایک جرات مندانہ تقریر

وزیراعظم نواز شریف کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ کم زور شخصیت کے مالک ہیں، اور جب معاملہ کسی بڑی طاقت یا عالمی اداروں سے ہو تو ہمارے بڑے بڑے سورما بھی بھیگی بلی بن جاتے ہیں، ایسے میں جرات سے محرومی کی شہرت رکھنے والے وزیراعظم سے کسی بہادری کی امید رکھنا فضول ہی ٹھہرا، لیکن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جب انھوں نے بیانگ دہل کہا، "مسئلہ کشمیر کا حل نہ ہونا اقوام متحدہ کی کھلی ناکامی ہے" تو بڑی حیرت ہوئی، بہت خوشی ہوئی۔ پاکستان میں ہونے والے سیاسی خاص انتخابی جلسوں اور دیگر اجتماعات میں تو ہمارے راہ نما اپنے مخالفین کے خلاف آگ اگلتے ہیں، مسئلہ کشمیر اور دیگر قومی ایشوز پر لفظوں کی بم باری کرتے ہیں اور بڑی بے باکی سے عوام کے جذبات اور موڈ کے مطابق سب کہہ جاتے ہیں، لیکن کسی عالمی فورم پر، جہاں بولا جانے والا ایک ایک لفظ تولا جاتا ہے، ان راہ نماؤں کی گھگھی بندھ جاتی ہے یا وہ ڈرے سہمے الفاظ میں موقف بیان کرپاتے ہیں، ایسے میں وزیراعظم نواز شریف کی تقریر کیسے حیران نہ کرتی۔ کچھ ہو نہ ہو کم از کم یہ خوشی اور فخر تو میسر آیا کہ ہمارے وزیراعظم نے اقوام متحدہ کی منافقت اور دوغلے پن کو اس کے منہ پر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے نقاب کیا ہے۔

اقوام متحدہ کا ادارہ قوموں کے مابین تنازعات پُرامن طریقے سے حل کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد کم زور ممالک کو طاقت ور اقوام کی جارحیت سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس عالمی فورم کا کام تھا کہ یہ مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے بچائے، ان کی دادرسی کرے۔ لیکن کیا یہ ادارہ اپنے مقاصد پورے کرسکا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کچھ استثنائی مثالوں کے چھوڑ کر اقوام متحدہ زورآوروں کی آلہ کار کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ طاقت ور اقوام کے مفادات کی تکمیل اور کم زور قوموں کے ساتھ ہونے والے ظلم اور ناانصافی سے چشم کشائی اس ادارے کا وتیرہ بن گئی ہے۔

پاکستان کے وزیراعظم نے اپنے اس خطاب میں اقوام متحدہ میں جامع اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ''سلامتی کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مسلمانوں کے خلاف ناانصافیوں کو ختم کرنا ہوگا۔'' حقیقت یہ ہے کہ سلامتی کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا کر اور اس میں بھارت جیسے اپنے ہم سایہ ممالک کی سالمیت کے لیے مستقل خطرہ بنے رہنے اور اپنی اقلیتوں پر ظلم ڈھانے والے ملک کو اس میں شامل کرنے سے، اس ادارے کی افادیت مزید کم ہوجائے گی۔ سلامتی کونسل کی رکنیت حاصل کرنا بھارتیوں کا وہ سپنا ہے جو پورا ہوگیا تو برصغیر میں امن کا رہاسہا امکان بھی ختم ہوجائے

گا۔ اس کے علاوہ سلامتی کونسل کے ارکان سے ویٹو کا حق واپس لینا ہوگا۔ یہ ویٹو پاور ہی ہے جس کی وجہ سے فلسطین اور کشمیر جیسے سلگتے ہوئے مسائل پر آنے والی قرار دادیں ردی کی ٹوکری کی نذر ہوتی رہی ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور مظالم کا تعلق ہے تو وزیراعظم نے بروقت اور بالکل درست بات کی ہے۔ سوڈان میں مسیحی اقلیت آواز اٹھائے تو اسے فوراً علیحدہ ملک عطا کردیا جاتا ہے، لیکن فلسطینیوں کا خون بہتا رہے، کشمیر میں بھارتی فوج ظلم کے پہاڑ توڑتی رہے، برما میں مسلمان ظلم کی چکی میں پستے رہیں، اقوام متحدہ آنکھیں بند کیے رہتی ہے، ان مظلوم مسلمانوں کی درد میں ڈوبی صدائیں اسے مدد کے لیے پکارتی رہتی ہیں لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ اقوام متحدہ کا دوہرا معیار اور دوغلاپن ہی ہے جس نے مسلم ممالک میں انتہاپسندی اور دہشت گردی کو فروغ دیا۔ انتہاپسندانہ سوچ کے حامل اور مسائل کے تشدد سے حل کرنے کے حامی افراد کے لیے مسلم نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کا یہ ٹھوس جواز موجود تھا اور ہے کہ ظلم کا شکار مسلم اقوام کو بچانے کی کوشش کوئی عالمی ادارہ نہیں کرتا، مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر کسی عالمی فورم میں آواز نہیں اٹھائی جاتی، تو پھر کیوں نہ ہم خود ہتھیار اٹھا کر انتقام لیں اور اپنے بھائیوں کو ظلم سے بچائیں۔ اس فکر کے حامل لوگوں نے خود کیا کیا اور ان کی اس سوچ

اور انتہا پسندانہ اور پُر تشدد اقدامات نے مسلم امہ کو فائدہ پہنچایا یا نقصان، یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن اقوام متحدہ اور عالمی طاقتوں کی منافقت ایسے افراد اور تنظیموں کی فکر کو آگے بڑھانے میں معاون ومددگار ثابت ہوئی ہے۔ ایک پُر امن اور تشدد سے پاک دنیا کے لیے اقوام متحدہ کو اپنا یہ چلن بدلنا ہوگا اور فلسطین اور کشمیر جیسے مسائل پر توجہ دینی اور انھیں حل کرانا ہوگا۔

وزیر اعظم کے خطاب کا محور کشمیر اور پاک بھارت تعلقات تھا۔ انھوں نے اس حوالے سے جو تجاویز پیش کیں وہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ پاکستان ایک امن پسند ملک ہے جو دنیا اور خطے میں امن اور دوستی کا فروغ چاہتا ہے۔ وزیر اعظم نے کہا، ”کشمیر اور سیاچن سے فوجی انخلاء کیا جائے، اسے غیر فوجی علاقہ بنایا جائے، پاکستان اور بھارت کو کنٹرول لائن پر جنگ بندی معاہدے کا احترام کرنا چاہیے، دونوں ممالک کو کسی بھی صورت میں ایک دوسرے کو دھمکیوں اور طاقت سے گریز کرنا چاہیے، اُنھوں نے کہا کہ جھوٹے وعدوں اور سفاک مظالم نے کشمیر کی تین نسلیں اجاڑ دیں، مسئلے کے دو طرفہ حل کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی، پاکستان خطے میں ہتھیاروں کی دوڑ کا حصہ نہیں بنے گا، تاہم خطے میں ہونے والی ہر قسم کی تبدیلیوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔“ کشمیر میں بھارتی مظالم کا احاطہ کرتے ہوئے وزیر اعظم نے بھارت کو جنگ نہ کرنے کے

معاہدے کی پیشکش بھی کی۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کی وجہ سے دونوں ممالک کے دفاعی اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہے۔ اگر وزیراعظم کی تجویز مانتے ہوئے بھارت جنگ بندی کے معاہدے پر تیار ہوجائے اور ان کی پیش کردے دیگر تجاویز تسلیم کرلے تو ان اخراجات میں نمایاں حد تک کمی ہو سکتی ہے، جس کا فائدہ دونوں ممالک کے عوام کو ہوگا اور یہ رقم تعلیم، صحت، ترقی اور سماجی بہبود کے کاموں پر خرچ کی جاسکے گی۔ مگر دہلی کی مذہبی انتہاپسند اور جنگی جنون میں مبتلا سرکار نے یہ تجاویز مسترد کردی ہیں، جس سے ثابت ہوگیا کہ بھارت امن دشمن ہے۔ بھارت، خاص طور پر مودی سرکار سے یہی توقع تھی، لیکن پاکستان نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر اپنے موقف اور تجاویز سامنے لاکر دنیا میں بدامنی اور دہشت گردی کی وجوہات کی نشان دہی کردی ہے اور یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ وہ جوہری طاقت ہونے اور اپنی دفاع کی پوری صلاحیت رکھنے کے باوجود امن اور دوستی کا خواہاں ہے۔

# سرکاری اسکولوں سے سرکار کی بے اعتنائی

دونوں خبریں ایک ہی روز اخبار میں چھپیں۔ ویسے تو ہمارے یہاں ہر خبر کے لیے "زینت بنی" کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن میں کہوں گی کہ ان دو خبروں نے دل دکھی کرتی اور مایوسی پھیلاتی دیگر خبروں کے ساتھ مل کر اخبار کی سیاہی میں اضافہ کیا۔ ان دونوں خبروں کی سرخیوں میں ایک لفظ مشترک تھا، اور وہ تھا "محروم" ایک کی سرخی تھی "سندھ کے ہائر سیکنڈری اسکول سہولتوں سے محروم" اور دوسری بتا رہی تھی کہ "تین برس بھرتی کیے گئے اساتذہ اب تک تنخواہوں سے محروم"، یعنی کُل ملا کے بات یہ ہوئی کہ تعلیم کا شعبہ حکومت کی توجہ سے محروم، سرکاری اسکول سرکار کی سرپرستی سے محروم، سرکاری اداروں میں پڑھنے والے طلبہ پڑھنے کے حق سے محروم۔ محرومی کی یہ داستان کئی عشروں پر پھیلی ہوئی ہے اور روز بہ روز الم ناک تر ہوتی جا رہی ہے۔ ملک میں انتہاپسندی کا فروغ، مذہب کے نام پر ہونے والی دہشت گردی، خود کش حملہ آور، بچوں میں جرائم کی شرح کا بڑھنا... یہ ساری سیاہ کہانیاں اسی داستان سے نکلی ہیں۔ ہماری حکومتوں نے تعلیم کے شعبے کو ایک طرف کم بجٹ کے ذریعے ابتر صورت حال تک پہنچایا ہے دوسری طرف تعلیمی

اداروں، خاص طور پر اسکولوں میں ہر استحقاق اور اہلیت کو نظرانداز کرکے اپنے پیاروں کو نوازنے کے چلن نے ان اداروں کے حالات مزید بدتر کردیے ہیں، اور اب صورت حال یہ ہے کہ معاشی حالات سے مجبور والدین ہی اپنے بچوں کو سرکاری یا بہ الفاظ دیگر پیلے اسکولوں میں داخل کرواتے ہیں ورنہ جو والدین ذرا سی بھی استطاعت رکھتے ہیں اپنی اولاد کو نجی اسکولوں کے حوالے کرتے ہیں اور پھر اسکولوں سے اعلیٰ تعلیم کے اداروں تک فیسیں بھرنے اور دیگر تعلیمی اخراجات پورے کرنے میں عمر بتا دیتے ہیں۔

یوں تو ملک بھر کے سرکاری اسکول زبوں حالی کا شکار ہیں لیکن صوبہ سندھ میں ان کی حالت اور بھی خراب ہے۔ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں، بنیادی سہولیات ناپید، گھوسٹ اساتذہ، سفارش پر بھرتی کیے گئے نااہل استاد، اور کہیں کہیں تو اسکول صرف دستاویزات میں موجود.....ایسے میں سندھ کے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے بچوں کا مستقبل اپنے ماں باپ کے حال کے عکس کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔

گذشتہ سال سامنے آنے والی ایک رپورٹ کے مطابق، ''پاکستان وہ دوسرا ملک ہے جہاں اسکول نہ جانے والے بچوں کی شرح، دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے، جب کہ سندھ ملک کا وہ صوبہ ہے جہاں سرکاری اسکولوں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی کی صورتِ حال ابتر ہے۔''

یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایسے بچوں کی تعداد ڈھائی کروڑ ہے جو اسکول نہیں جاتے، جب کہ ان میں ستّر لاکھ بچے ایسے ہیں جو پرائمری اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کی عمر کو پہنچ چکے۔

اسکولوں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے حوالے سے رپورٹ کا کہنا ہے کہ ملک بھر میں پینسٹھ فی صد اسکولوں میں پینے کے پانی کی سہولت دست یاب ہے۔ باسٹھ فیصد میں واش روم ہیں۔ اکسٹھ فی صد اسکولوں کی چار دیواری موجود ہے اور اُنتالیس فی صد میں بجلی ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ملک کے پینتیس فی صد اسکول پانی جیسی بنیادی سہولت سے بھی محروم ہیں، اڑتیس فی صد اسکولوں میں واش روم تک نہیں، انتالیس فی صد اسکول چاردیواری کے بغیر ہیں، ظاہر ہے ان میں لڑکیوں کے اسکول بھی شامل ہیں، اور جناب! بجلی تو ہمارے یہاں ہے ہی عیاشی، تو اگر اکسٹھ فی صد اسکول اندھیرے میں ڈوبے ہیں تو حیرت کیسی اور مذمت کیسی۔

اس رپورٹ کے مطابق بنیادی سہولتوں یعنی انفرااسٹرکچر کے حوالے سے ملک بھر میں سب سے خراب صورتِ حال سندھ میں ہے، جہاں پینتیس فی صد سرکاری اسکولوں کی عمارتیں موجود نہیں اور اسکول ہیں تو زیادہ تر کی چار دیواری نہیں ہے۔

سہولتوں کی عدم فراہمی کی یہ شرح خیبر پختونخواہ میں تئیس، بلوچستان میں اٹھارہ اور پنجاب میں دس فی صد ہے۔

اس رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پورے پاکستان میں تیس ہزار سرکاری اسکول ایسے ہیں، جن کا عملی طور پر کوئی وجود نہیں، لیکن ان اسکولوں کو حکومت کی طرف سے بدستور فنڈز مل رہے ہیں۔

سرکاری اسکولوں کی یہی حالت ہے جس کے باعث والدین اپنے بچوں کو ان کے اچھے مستقبل کی آس میں نجی اسکولوں میں داخل کرواتے ہیں اور پھر ان اسکولوں کی من مانیاں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ حکومت تو گویا تعلیم کی نج کاری کر چکی ہے، اس لیے اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ نجی اسکول کس طرح اور کن کن طریقوں سے والدین کی کھال کھینچ رہے ہیں۔ حال ہی میں نجی اسکولوں کی جانب سے فیس بڑھانے کے اقدام پر کچھ واویلا ہوا، لیکن یہ اسکول اپنی منوا کر ہی رہے۔

نجی ادارے تعلیم فراہم کر رہے ہوں، صحت سے متعلق ہوں یا کوئی اور ایسی سہولت فروخت کر رہے ہوں جو دراصل حکومت اور ریاست کی ذمے داری ہے، ان سے گلہ کرنا فضول ہے، یہ ادارے سرمایہ لگا کر دولت کے ڈھیر بڑھانے کے لیے وجود

میں لائے جاتے ہیں، چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر ان اداروں کو صرف کاروباری مقاصد اور فوائد کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ شکوہ تو حکومت اور ریاست سے ہے جو عوام کے حقوق کی حفاظت اور ان بنیادی سہولتوں کی فراہمی کی ذمے داری سے عملی طور پر سبکدوش ہوچکی ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عام آدمی نجی اسکولوں، نجی اسپتالوں، نجی ٹرانسپورٹ، بورنگ کے پانی، منرل واٹر، جنریٹر اور یوپی ایس کی صورت میں وہ بنیادی سہولتیں جن کی فراہمی ریاست کی ذمے داری ہے خرید رہا ہے یا اپنے ذرائع سے حاصل کر رہا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو صرف حکم رانوں کے غیر ضروری اخراجات اور تعیشات کو کم کرکے سرکاری اسکولوں کی حالت بہتر بنائی جاسکتی ہے، لیکن حکم راں تعلیم کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں تب ہی یہ ممکن ہے۔ جس پاکستان کی تبدیلی اور جسے انقلاب سے آشنا کرنے کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اس کا سنہرا مستقبل اچھے سرکاری اسکولوں ہی میں تشکیل پاسکتا ہے، چار دیواری اور بجلی سے محروم اسکول تو غیر محفوظ مستقبل اور اندھیرے ہی جنم دے سکتے ہیں۔

## روح پر تشدد

انسان بھی عجیب ہے، اپنے غلط فیصلوں اور رویوں پر فطرت کا ٹیگ لگاتا ہے اور خود بری الزمہ ہوجاتا ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ تو عین فطرت ہے اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اپنے غلط فیصلوں کو خدا کی مرضی کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک لمحے کے لیے خدا کی بنائی ہوئی اس خوب صورت کائنات پر نظر دوڑائی جائے تو اس خدا کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے جو انسان سے ایک ماں کے مقابلے میں بھی ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ اتنی خوب صورت کائنات کا بنانے والا بدصورت فطرت کا خالق کیسے ہو سکتا ہے؟

فطرت کا ٹیگ لگانے کے جس عمل کی میں نے بات کی اس کا سب سے زیادہ شکار ہمارے معاشرے میں عورت ہوتی ہے۔ عورت جسے دین اسلام نے عزت دی، حقوق دیے، وہ آج اسی ملک میں رسوا ہو رہی ہے جس ملک کو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ جس ملک کے نام میں ہی لفظ اسلامی پہلے آتا ہے اور اس کا نام بعد میں، یعنی اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ آج اسی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں حوا کی بیٹی کی عزت کو پیروں تلے روندا جا رہا ہے۔ کبھی اس کے دوپٹے کو تار تار کیا جاتا ہے۔ تو کبھی اس کی روح کو معاشرے کے طعنے چھلنی کر دیتے ہیں۔ ہم

تو یہ بات ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ایسا کچھ ہوتا ہے، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ یہاں ہر دن کہیں نہ کہیں حوا کی بیٹی اپنی عزت اور وقار کو بچائے اپنے اندر ہی سسک سسک کر مر رہی ہے۔ اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں اور اگر کوئی سن بھی لے تو ہمارا معاشرہ ایسی خواتین کو برداشت ہی نہیں کرتا جو اپنے اوپر ہونے والی ظلم کی روداد معاشرے کے سامنے لائیں۔ اگر ایک عورت اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے ازالے کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹائے اور انصاف کی متلاشی ہو تو اسے بے شرمی کا طعنہ اور چپ رہنے کا درس دیا جاتا ہے، ایسی خواتین کو ہماری سوسائٹی قبول نہیں کرتی۔

مرد اگر عورت کے ساتھ کچھ غلط کرے تو اسے عین فطرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ان ''عین فطرت'' اعمال میں سڑکوں اور دفاتر میں خواتین کو ہراساں کرنے سے گھروں میں انھیں تشدد کا نشانہ بنانے تک ظلم کا ہر عمل شامل ہے۔ اس حوالے سے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ پاکستان مسلم لیگ ن کی رکن پنجاب اسمبلی عظمی بخاری کے مطابق تین سال کی تگ ودو کے بعد خواتین پر ہونے والے تشدد کی روک تھام کے لیے بل تیار کرلیا گیا ہے، جو اسمبلی کے اگلے سیشن میں منظور کرلیا جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بل کی رو سے تشدد کی شکایت سامنے آنے کے بعد کی کارروائی میں کہیں مرد اہل کار نہیں ہوں گے اور ڈیسک سے لے کر فارنسک لیبارٹری تک عورتیں ہی ہوں گی۔ متاثرہ خاتون کی شکایت پر ایف آئی آر کٹے گی اور اسے تحفظ بھی ملے گا اور اس کی پراسیکیوٹر بھی خاتون ہی ہوگی۔

عظمیٰ بخاری کہتی ہیں کہ یہ بل پیش کرنے کے سلسلے میں اُنھیں اپنے ہی ساتھیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ظاہر ہے یہ ساتھی سیاست داں ہی ہوں گے۔ ان کی جماعت کے منتخب نمائندے، جنہیں مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی منتخب کیا ہے۔ پھر ان کی جانب سے اس بل کی مخالفت کیوں؟ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت کو کمتر سمجھنے کی سوچ فقط ناخواندہ افراد ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی عورت کو اپنے جیسا انسان سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔ پاکستان کی نصف آبادی کے ایک بڑے حصے کے ساتھ یہ امتیازی اور ناروا سلوک ہمارے اسلامی ریاست ہونے پر بھی سوالیہ نشان لگاتا ہے اور جمہوری ملک ہونے پر بھی۔

صرف غریب اور ناخواندہ گھروں میں خواتین پر تشدد نہیں ہوتا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں میں اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان واقعات کے پیچھے عورت کو کمتر، عزت سے محروم اور باندی سمجھنے کی سوچ کارفرما ہے۔

یہ مکروہ سوچ گھروں میں تشدد اور تذلیل کی صورت میں سامنے آتی ہے تو گھر سے باہر خواتین کو ہراساں کرنے کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ہراساں کرنا بھی تشدد کا ایک خوف ناک عمل ہے، جس میں جسم پر کوئی نشان نظر نہیں آتا لیکن دل سے روح تک پورا وجود زخمی ہو جاتا ہے۔ صرف کسی راہ چلتی عورت پر آواز کس دینا

یا اس سے جان بوجھ کر ٹکرا جانا ہی ''ہراسمنٹ'' نہیں، روزگار کے لیے گھر سے باہر نکلنے والی عورت کو بڑے مہذب انداز میں معاشی مسائل حل کر دینے کی پیشکش کرنا، نہ ماننے کی صورت میں اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، کسی خاتون کی مجبوری دیکھ کر اس کی ناموس خریدنے کی کوشش کرنا... یہ سب'' ہراسمنٹ'' ہی ہے، اور اس سب کے لیے ہراساں کرنا بھی بہت چھوٹا لفظ ہے، یہ ایک عورت کی توہین ہے، یہ بہ حیثیت انسان عورت کی تذلیل ہے، حوّا کی بیٹی کو غلیظ گالی دینے اور اس کی روح پر تیزاب پھینک دینے کے مترادف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جسے کسی مرد کو پیسے دکھا کر غلام بن جانے یا اپنی بیٹی کا سودا کر لینے کی پیشکش کی جائے۔ ورکنگ ویمن کو قدم قدم پر اس ذہنی اور روحانی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے

ہمارے ملک میں خواتین کو ہراساں کرنے کے خلاف قوانین موجود ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس ظلم کا شکار ہونے والی عورت ثبوت کہاں سے لائے؟ گواہ کہاں ڈھونڈھے؟ اگر اس حوالے سے کوئی شکایت درج کرائی بھی جائے تو جواب میں الزامات اور بہتان اسے مزید گھائل کر دیں گے اور ہراساں کرنے کے خلاف ریاستی قوانین متاثرہ عورت کی بے بسی دیکھتے رہ جائیں گے۔ ان قوانین کو کس طرح مؤثر بنایا جا سکتا ہے اور ایسے واقعات کی روک تھام کیسے ممکن ہے؟ یہ سوال خواتین کی تنظیموں، وکلاء اور منتخب نمائندوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

قوانین اور ان کا نفاذ اپنی جگہ، مگر ہر عورت کو محض اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے والوں کو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ مجبوری کل ان کے گھر پر بھی دستک دے سکتی ہے اور ان کی بہن بیٹیوں کو بھی سڑکوں پر اور کارگاہوں کی طرف معاش کے لیے سفر کرنا پڑ سکتا ہے۔ آخر میں عورت کو انسان نہ سمجھنے والوں کے لیے ایک نظم:

یہ ہوں میں

....

دربار سے بل بورڈ تک

صورت، بدن، جلوہ، ادا

تفریح، تعیش، دل لگی

بس یہ ہوں میں؟

بس یہ ہے آزادی مری؟

میں کون ہوں اور کیا ہوں میں

کھیتوں میں جا کر دیکھ لو

محنت بھی میری دیکھو اور

موسم کے تیور دیکھ لو
!تم صنفِ نازک کہتے ہو
بختاورؔ سندھ کون تھی
جون آرک اور حضرت محل
تاریخ پڑھ کر دیکھ لو
نسل وزباں اور خانداں
تہذیب کے سارے نشاں
آغوش میں میری پلے
محفوظ میں نے ہی رکھے
مضبوط ہیں یہ کس قدر
نازک سے پیکر دیکھ لو
میں معاشرت کی پاسباں
سمجھو اسے گر تم گماں
پلٹو ذرا گھر دیکھ لو

دربار کی زینت نہیں
بل بورڈ کا ساماں نہیں
میں صاحبو! انساں بھی ہوں
بس بیوی، بیٹی، ماں نہیں
(محمد عثمان جامعی)